

READING SECTION

Online Library For Pakistan

READING SECTION

Online Library For Pakistan

انوکھے مہمان

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

PAK Society

LIBRARY OF
PAKISTAN

ONE SITE ONE COMMUNITY



Pakistanipoint

Learning Point

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

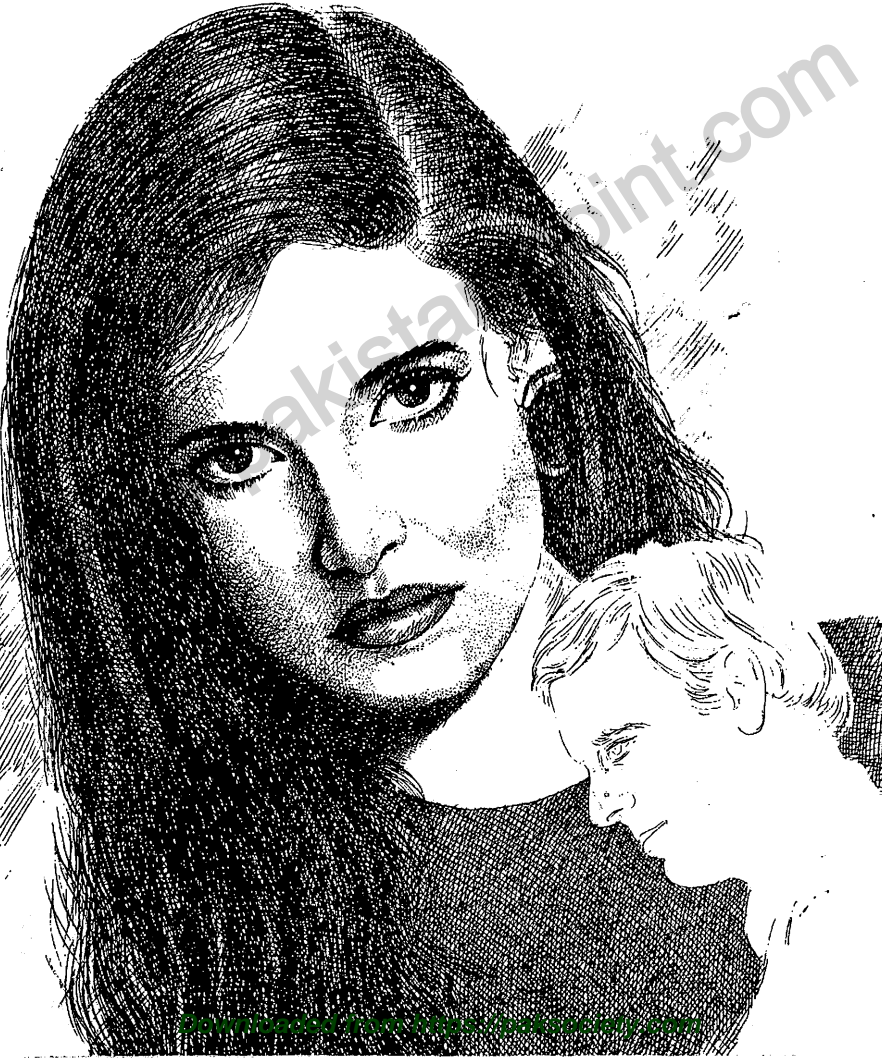


انوکھے رنگ

ایم اے راحت

دوسرے سارے سے آنے والے اُن
مجبور ویسے تیں مہمانوں کی دلچسپ
رُوداد، جو عارضی طور پر کمرۂ ارض
پر پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے

ایم اے راحت کے قلم سے مناج
کے ساتھ ایک سائنس فکشن



کا اعلان کر رہا تھا۔ کہ بس چند روز کی بات ہے، پھر دیکھ لی جائے گی آسمان کی بلندی بھی۔ یہ راکٹ ابھی آخری مراحل سے گزر رہا تھا۔ اور سائنسدانوں کو یقین تھا کہ بہت مختصر سے عرصے میں وہ اسے پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اوارے کی جانب سے پروجیکٹ سے تقریباً "چار میل" کی دوری پر پھونکی ہوئی صورت کالونی بنائی گئی تھی جہاں پروجیکٹ میں کام کرنے والوں کی رہائش تھیں اور اس کالونی کا سہارا مکان ڈاکٹر سلمان کا تھا۔

ڈاکٹر سلمان اوارے کے اہم رکن تھے اور بہت بڑی حیثیت کے مالک تھے۔ عموماً ان کے دن اور رات پروجیکٹ میں ہی گزرتے تھے۔ تیسرے چوتھے دن بھی وہ کچھ چند گھنٹوں کے لئے آتے تھے۔ بعض اوقات ہفتوں صرف فون پر ہی گھر سے رابطہ ہوا تھا۔ ان دنوں بھی یہی کیفیت تھی۔ اور وہ تقریباً "چھ دن" سے گھر نہیں آ سکے تھے۔ اور اسے برابری ضرورت کے مزادہ ہو رہی تھی۔ اور کالونی سے پروجیکٹ تک جانے والی سڑک بھی برف کے تودوں سے بند ہو گئی تھی۔ یہ سڑکی کی سڑک تین در تین پھاڑوں کے درمیان سے گزرتی تھی۔ دونوں جانب سرسہ فلک پہاڑ برف کے لہاؤں میں لمبے تھے۔ کالونی تک آنے کے بعد یہی سڑک دارالحکومت تک جاتی تھی۔ جو کالونی سے تقریباً سو گلو میٹر دور تھا۔ لیکن پروجیکٹ کی اہمیت کے پیش نظر حکومت نے یہ سڑک تعمیر کی تھی اور بلاشبہ محل وقوع کے لحاظ سے اس اہم پروجیکٹ کے لیے اس سے بہتر جگہ دوسری نہیں ہو سکتی تھی۔

دور کہیں برف کا کوئی تودہ لٹکا اور خوفناک دھماکے ساتھ بلندی سے پستی میں جاگرا۔ لیکن سستان رات میں دھماکے کی شدت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ انیلا کے ہاتھوں سے دور بین چھوٹے چھوٹے بجی تھی۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر دور بین سنہالی کی اور پھر قدموں کی چاپ پر پلٹ کر دیکھا۔ راشد شب خوابی کی حالت میں اندر آ گیا تھا۔ "خدا کی پناہ۔ اور تم اس موسم اور اس سے پیدا ہونے والے مناظر کو حسین ترین کہو گی؟" وہ ہونٹ پیچ کر بولا

"کیسا خوفناک دھماکا تھا؟" انیلا نے مسکراتے ہوئے کہا "انتہائی نامعقول" اس دھماکے نے مجھ سے میرا حسین ترین خواب چھین لیا۔" راشد منہ ہمارا کر بولا

خوابوں کی وادی کے پہلے مکان کی بلائی کھڑکی میں کھڑی انیلا دور بین کے شیشوں سے برف کے ذرات میں ڈوبے ہوئے ماحول میں آنکھیں پھاڑ رہی تھی۔ سارا دن برف میں غرق رہا تھا اور اب رات بھی سفید تھی۔

یہ دوسری شدید بر فباری تھی۔ یوں تو یہ وادی ہی برف کی وادی تھی۔ سال میں آٹھ دن میسے یہاں بر فباری ہوتی رہتی تھی۔ کبھی ہفتے عشرے کا وقت ہوتا۔ سورج نکلتا لیکن ایک ایسے مہمان کی مانند جو کبھی کبھی آجاتا ہے اور جس کی آمد باعث خوشی ہوتی ہے۔ سورج کے جانے کے بعد پھر وہی سفید اداسی چھا جاتی تھی۔

راشد کو تو یہ ماحول بالکل پسند نہیں تھا اور اس کا محبوب مشغلہ بھی تھا کہ کارے کر لمبی ڈرائیونگ پر نکل جائے اور کئی کئی دن کے بعد واپس آئے لیکن ڈاکٹر سلمان کو اس کی یہ طویل غیر حاضری قطعی ناپسند تھی اور وہ اسے سرزنش کرتے رہتے تھے۔ لیکن اس سرزنش کا اثر صرف چند روز رہتا تھا۔ اور اس کے بعد راشد دوسری ڈائٹ کھانے کی تیاریاں کرنے نکل جاتا تھا۔ باوجود اسے ڈاکٹر سلمان نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ سائنس کی تعلیم مکمل کرنے کے لئے اسے امریکہ بھیجوا دیں گے اور اس وعدے کے ایفا کے لئے تیاریاں بھی شروع ہو گئی تھیں۔ اس وقت سے راشد سنبھل گیا تھا اس احساس کے تحت کہ کہیں ڈاکٹر سلمان کی ناراضگی کوئی خطرناک رخ نہ اختیار کر جائے اور وہ اسے امریکہ بھیجوانے کا ارادہ ترک نہ کر دیں۔ چنانچہ آجکل وہ گھر پر ہی تھا اور موسم سے سخت بور تھا۔ جب کہ اس کے برعکس انیلا کو یہ ماحول برف کے ذرات میں ڈوبے ہوئے پہاڑ بے حد پسند تھے۔ دراصل وہ فطرتاً "اوباش" اور تفریح پسند تھا۔ حسین چہرے اس کی زندگی تھے۔ اور پروجیکٹ کالونی کے اس علاقے میں حسین چرواہا کا فقدان تھا۔ اول تو نوجوان لڑکیاں بہت کم تھیں اور انھیں بھی تو بقول راشد کے سنی سائنس دانوں سے سزا ڈھنگ کا کام کر ہی نہیں سکتے۔ انہیں تو اولاد پیدا کرنا بھی نہیں آتا۔ سو کبھی کسی غیر دلکش لڑکیوں کا پیدا ہونا کیا ضروری ہے۔

خلائی جہاز کی ادارے "پاکو" نے آج سے پانچ سال قبل یہ پراجیکٹ قائم کی تھی اور یہاں ایک زبردست خلائی مشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ایک دو ہیکل راکٹ دور ہی سے دیکھا جاسکتا تھا۔ جو آسمانوں کی جانب منہ اٹھائے اس بات

حیرت کے نقوش پیدا ہو گئے تھے۔ ”کیا برف کے تودے
گرنے سے شعلے اور چنگاریاں بھی بلند ہوتی ہیں۔“ انیلا
نے حیرت سے پوچھا
”تمہارے خط کا یہی عالم رہا تو یہ بھی ممکن ہو سکتا
ہے۔ برف کے شعلے واہ۔ کیا بات ہے اور عمدہ تصور ہے
”راشد ہنس پڑا“

”نہیں راشد میں درست کہہ رہی ہوں۔ شمالی
ہاٹوں پر میں نے شعلوں کی چمک دیکھی ہے۔ چنگاریوں
کی ایک پھواری اٹھتی ہوئی“

”آہ وہ میرے دل کی آواز تھی۔ جس کی عملی شکل
تمہیں نظر آئی۔ یقین کرو اس دیرانے میں میرا بھرپور وجود
شعلوں میں گھرا ہوا ہے۔ اور میرے دل سے ہمیشہ
چنگاریوں کی ایک پھواری اٹھتی رہتی ہے“
”تم غیر سنجیدہ ہو لیکن میں۔ میں درست کہہ رہی ہوں“

”کانوں میں روئی ٹھونس کر سونے کی کوشش کرتا ہوں
۔ بر فباری ہی کیا کم تھی کہ کہ یہ دھماکے بھی ہونے لگے۔
اور تم۔ میرا ایک مشورہ ہے کہ خلاؤں میں شعلے اور
چنگاریاں تلاش کرنے کے بجائے آرام کی نیند سو جاؤ
بر فباری تو اب بھی ہند نہیں ہوگی میرا دعویٰ ہے۔“
راشد نے کہا اور واپس دروازے کی طرف مڑ گیا۔

انیلا نے اسے دروازے سے نکلے ہوئے دیکھا اور پھر
تشویش زدہ انداز میں دور بین آنکھوں سے لگالی

کنگ سالوس نے تشویش زدہ نگاہوں سے کنٹرول بورڈ کو
دیکھا۔ سرخ شیشے چمک رہے تھے اور لمحہ بہ لمحہ ان کی چمک
بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی گھری سبز آنکھوں میں سفید
لیکرس گردش کرنے لگیں۔ یہ بریشانی کی لیکرس تھیں۔
تینارک جو کہ بارانی حسین نیلی آنکھوں سے بے لالان میں
ہونے والی سرخ روشنی کے جھماکوں کو دیکھ چکی تھی۔ اور
شوہر کی آنکھوں میں سفید لیکرس دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اور
اپنے بچوں کے نزدیک سے اٹھ کر سولوس کے قریب پہنچ
گئی۔ اس کی آنکھوں کی سفید لیکرس کنگ سالوس کی
آنکھوں کی سفید لیکروں سے ٹکرائیں۔ اور ایک سوال بنا
”یہ سب کیا ہے تم بریشاں کیوں ہو؟“

”ناممکن ہے۔ لیکن ممکن۔ اور ایک حقیقت۔ جس
کی موجودگی میں ناممکن کا لفظ مٹ جاتا ہے۔“ سالوس کا

”آپ سو گئے تھے؟“

”یہ جاننے کا موسم ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ
حکومت نے سائنس دانوں کے خاندانوں کیساتھ یہ ظلم
کیوں کیا ہے۔ خشک مزاج اور زمانے کی رنگینوں سے
نا آشنا لوگوں کے لیے تو ہر جگہ یکساں ہوتی ہے۔ اور وہ
کس بھی زندگی گزار سکتے ہیں۔ لیکن ان سے متعلق تمام
لوگ تو ان جیسے نہیں ہوتے بھلا ان کے خاندانوں کے لئے
بن باس کیا ضروری تھا؟“

”کیا خواب دیکھ رہے تھے؟“

”میں بالی وڈ میں تھا۔ میرے ساتھ لمبے سیاہ بالوں والی
ایک میکینک لڑکی تھی۔ اور ہم دونوں ایک چمکدار سرک
پر آہستہ آہستہ روئی سے جا رہے تھے کہ۔۔۔“

”چانک پاؤں پھسل گیا“ انیلا ہنس پڑی
”پاؤں نہیں تودہ پھسل گیا۔ اور تودہ پھسل پڑا تو خواب
بھی پھسل گیا۔ کھڑکی سے تمہاری خوابگاہ روشن نظر آئی
۔ اور میں نے سوچا کہ تم اپنے خط میں جلتا ہوگی“ راشد
دانت پیش کرولا۔ اور انیلا مسلسل ہنس رہی تھی۔

”مجھے افسوس ہے۔ لیکن یہ امر باعث تشویش بھی ہے
کہ آپ کی آنکھوں میں اب امریکہ کے خواب آ رہے ہیں
۔ آپ وہاں سیر و تفریح کریں گے؟ یا تعلیم مکمل کریں گے
؟“

”زندگی چاند سی عورتوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میں
عورتوں کا اچار نہیں کھاتا لیکن ماحول کا حسن حسین چروں
کے بغیر مکمل کہاں ہوتا ہے۔ اور پھر یہ جگہ؟ خدا کی پناہ
زندگی کی دلچسپیوں سے کس قدر خالی ہے۔ بالکل قیدیوں
کے کسی کیمپ کی مانند“

”چلیے، آپ کو تو اس قید سے رہائی مل جائے گی“
”ہاں۔ یہ چند روز بھی مجھ پر سخت ہیں۔ لیکن مجھے تم
پر حیرت ہے انیلا۔ تم اس ماحول میں کس طرح خوش ہو؟“

”مجھے انسانی صنایع سے زیادہ قدرت کے تشکیل کردہ
مناظرے دلچسپی ہے راشد صاحب اس لئے میری فکر نہ
کریں“

”خیر لڑکیوں کی حد تک تو مجھے بھی قدرت کی صنایع پسند
ہے۔ لیکن مناظرہ وغیرہ کی بات۔۔۔ راشد کا ہنسا اور حورارہ
گیا ایک اور خوفناک دھماکا ہوا۔ اور انیلا نے جلدی سے
دور بین آنکھوں سے لگالی۔ اس بار اس کے چہرے پر کسی

”خوف میرے حواس پر طاری ہو چکا ہے۔“ تیارک نے جواب دیا۔

”لیکن میں نے شکست قبول نہیں کی۔ کچھ بھی ہو جائے میں خلاء میں چمکنے والا بے جان نقطہ نہیں بنوں گا۔“

”آہ۔ کیا اس کی کوئی ترکیب ہے؟“ تیارک نے امیدو پیہم کے انداز سے پوچھا۔

”ہاں۔ ہم کمکشاں کے مدار سے نکلنے کے لئے دھماکے کریں گے۔ اور جب مدار ٹوٹ جائے گا تو کسی سیارے کی کشش ہمیں پھینچ لے گی۔ اس طرح ہم کسی بھی سیارے پر جا پڑیں گے اور خلاء کے تاحیات کائنات مسافر نہ بنے رہیں گے۔“

”خوف پھر بھی موجود ہے سالوس۔ تاہم مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟“

”دونوں بچوں کے پاس جاؤ اور ان کی نگرانی کرو۔ اس مصیبت سے بچنے کے لئے ہمیں ہر امکانی کوشش کرنی ہے۔“ تیارک نے لمبی صراحتی وار کردن بھائی اور آنکھوں کی زرد لکیروں کو ذائل کرتی ہوئی دونوں بچوں کے پاس پہنچ گئی۔ پھر اس نے ان کے بازو اٹھائے اور بازوؤں کے نیچے بغل میں لگے سفید بٹن دبائے۔ چٹ چٹ کی آوازیں کے ساتھ دونوں نے آنکھیں کھول دیں اور اپنی ماں کو دیکھنے لگے۔

”کیا بات ہے مادر؟ آپ نے ہمیں وقت سے پہلے کیوں جگا دیا؟“ انجی تو نیند کی سوئی نے آدھا سفر بھی طے نہیں کیا۔

”نوجوان لڑکی نے خوبصورت آواز میں پوچھا۔“ ایک ضرورت کے تحت بچو۔ پلے لان میں کچھ خرابی واقع ہو گئی ہے۔ تمہارے پیلا اسے درست کرنے جارہے ہیں۔“

”تو کیا اس کے لئے ہماری مدد کی ضرورت ہے؟“

”ہاں صرف اس حد تک کہ تم خود کو سنبھالو اور اپنے جسمانی نظام کی حفاظت کرو۔“ تیارک نے جواب دیا۔ دونوں بچوں کی آنکھوں میں ہلکی سی زردی چمک آئی۔ ”تو کیا اس سے ہمارے جسمانی نظام کو کوئی خطرہ ہے؟“

”اس کا امکان ہے۔ لیکن تم زرد لکیروں کا شکار نہ ہو اور ہمت رکھو۔“ تیارک نے کہا۔ اسی وقت سالوس کی آواز ابھری۔ ”تیارک کیا تم تیار ہو؟“

”ہاں میں اور سچے تیار ہیں۔“ تیارک نے کہا۔

جواب موصول ہوا

”میری سمجھ سے باہر ہے“

”سرخ چمک ایندھن کی غیر موجودگی پکارتی ہے اور ہم اپنے سیارے سے اتنی دور ہیں کہ کسی اور طرح اس تک پہنچنا کا تصور ناممکن ہے۔“

”لیکن کیوں؟ کیا اندازے کی غلطی ہے؟“

”ناممکن کوئی سازش۔ میرے دشمن ہمیں خلاء میں تیرنے، بیٹھ تیرنے والا چمکدار نقطہ دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ اور اس بار شاید وہ کامیاب ہو گئے۔“

”آہ۔ تو کیا اب ہم خلاء میں سو جائیں گے؟“ تیارک کی آنکھوں کی سفید لکیریں دھنساں سر ہو گئیں جو خوف کی نشاندہی تھی۔ کنگ سالوس نے اس سوال کا جواب محفوظ رکھا اور کنٹرول بورڈ پر اس کی لمبی انگلیاں گردش کرنے لگیں۔

”بست سی آواز میں نمودار ہو گئی تھیں اور تیارک کی آنکھوں کی زرد لکیریں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ بلکہ کبھی کبھی ایک آدھ لکیریں نارنجی رنگ بھی چمک آتا تھا جو

سے انتہا خوف کی علامت تھی۔ در تک کنگ سالوس کنٹرول بورڈ پر اپنی صلاحیتیں صرف کرتا رہا پھر اس کے نیلے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”دشمنوں نے حسین سازش کی ہے۔ ایندھن کی تمام فنکیاں پے لان سے منسلک ہیں اور ذائل ان کی موجودگی بتا رہے جو سب سے پہلی فنکی ایندھن خرچ کر رہی تھی وہ بھری ہوئی تھی باقی

فنکیاں ایندھن سے خالی ہیں۔ ہاں۔ انہیں متوازن کرنے کیلئے ان میں کوئی وزنی کیس بھر دی گئی ہے تاکہ

وائل کی سویاں ایندھن کا وزن بتاتی رہیں۔“

”آہ ہمارے دشمن ہمارے خلاف کامیاب ہو گئے۔ کمکشاں کی سیر ہمارے لئے موت بن گئی۔“ تیارک کی آنکھوں سے نارنجی شعاعیں خارج ہوتی رہیں۔ پھر اس نے رحم کی نگاہیں اپنے دونوں بچوں پر ڈالیں جو آنکھیں بند کئے، کھل جانے والی کرسیوں پر دراز تھے۔ خوابوں کے

خود خال کی مالک جو ان لڑکی جس کے بدن کی رعنائی لباس کو حسن بخش رہی تھی اور معصوم خود خال والا دس گیارہ سالہ بچہ دونوں سکون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ”آہ ہمارے

بچے جو اپنی زمین نہیں دیکھ سکیں گے۔“

”تم ایک شہنشاہ کی ملکہ کے شانان گفتگو نہیں کر رہے۔“ کنگ سالوس کے انداز میں کسی قدر ناگواری پیدا ہوئی۔

تھا۔ سالوس نے بک میں لٹکے لٹکے بے لان کے اندرونی منظر کا جائزہ لیا اور اس کے باریک ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر کھینچ گئی۔ کم از کم اس کے مخالفوں کا یہ منصوبہ تو پورا نہیں ہو سکا تھا کہ وہ بالید کمٹشال کے گرد چکراتا رہتا۔ وہ خلائی مدار سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب آئندہ جو حالات ہوں۔

البتہ بے لان کی ٹوٹ پھوٹ پریشانی کا باعث تھی۔ اس کا مختصر سا خاندان شکستہ ہو گیا تھا لیکن خود اس کی اپنی ذات میں کوئی ایسی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی تھی جو اسے کسی طور کا کارہ کر دیتی۔ چنانچہ وہ ان لوگوں کے لئے زیادہ فکر مند نہیں تھا۔ انہیں تو وہ کسی نہ کسی طور درست کر ہی لے گا۔ سارکت ہونے کے بعد اس نے اپنا جائزہ لیا اور پھر اپنے بدن کو جنبش دینے لگا۔ اس کے ہاتھ بک تک پہنچے اور پھر اس نے خود کو بک سے آزاد کر لیا اور نیچے آ رہا۔ اس بک نے اسے خلا میں معلق کر کے اس کی مدد کی تھی۔ ورنہ اگر وہ بھی بے لان کے فرش پر ہوتا تو یقینی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا۔ دوسری چیزوں کی جانب توجہ دینے کے بجائے پہلے وہ بے لان کی چھوٹی سی لیبارٹری کے نزدیک پہنچا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ چیزیں منتشر ضرور ہو چکی تھیں لیکن ضائع نہیں ہوئی تھیں۔ البتہ پورے بے لان کا بجلی کا نظام ناکارہ ہو گیا تھا یہ صورتحال پریشانی کا باعث تھی۔ وہ غور کرتا رہا اور پھر اس نے گردن ہلائی۔ ”ٹھیک ہے اس صورتحال سے بھی نمٹا جائے گا۔“ وہ لیبارٹری سے واپس چل پڑا اور سب سے پہلے اپنی بیوی تمارک کے نزدیک پہنچا۔ اس نے تمارک کے بدن کے مختلف حصوں پر انگلیاں رکھیں اور اندازہ لگائے لگا کہ اس کے کتنے فیوز خراب ہوئے ہیں۔ اور پھر اس نے سکون کی سانس لی۔ تمارک کے ذہن کا صرف ایک فیوز خراب ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے حواس معطل ہو گئے تھے۔ باقی وہ بالکل ٹھیک تھی۔ اس نے تمارک کے سر کے خوبصورت بال اٹھائے اور چند ساعت ایک مخصوص حصے کا جائزہ لیتا رہا پھر تمارک کے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اس نے باریک کام کرنے والے اوزار نکالے اور پھر تمارک پر مصروف ہو گیا۔ اسی نے تمارک کے سر کا اوپری حصہ کھول لیا اور دماغ کی مشینری سے خراب فیوز نکال لیا۔ جھٹکے کی وجہ سے فیوز کے دو باریک تار جل گئے تھے۔ ٹازک اور باریک تاروں کی جگہ سالوس نے تمارک کے سر کے بال استہان

تب سالوس نے گردن جھکائی اور پھر ایک ڈائل کے نیچے دو تار جوڑنے لگا جو اس دوران اس نے علیحدہ کئے تھے۔ تاروں کو جوڑنے کے بعد اس نے آخری باریتھارک کی طرف دیکھا اور پھر ایک مبن دیابا۔ بے لان کے ریڈیائی نظام میں تبدیلی ہوئی نیگٹو ریڈیائی سروسے سے لکرا اس اور ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ اس کا نچلا حصہ اڑ گیا۔ دھماکہ اتنا شدید تھا کہ پورے خلائی جہاز میں ردوبدل ہو گئی۔ کنٹرول بورڈ الٹ گیا اور سالوس اچھل کر اوپری منزل کے ایک بک میں پھنس گیا تمارک کی کرسی کنٹرول بورڈ کے اوپر جا پڑی اور دونوں بچے کئی بار بے لان کی دیواروں سے ٹکرائے۔ چھوٹے بچے شوخیک کے بدن کے مختلف حصوں سے چنگاریاں اڑیں اور اس کے دونوں بازوؤں کی جوڑیاں کھل گئیں۔ بازو الگ ہو کر دور جا پڑے۔ لڑکی شارت البتہ بہتر پوزیشن میں تھی۔

متنبوں ہوشمندوں کی آنکھوں سے نارنجی چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ خوف کی شعاعیں آنکھوں کے حلقے سے باہر نکل آئی تھیں۔ بے لان کا محور ٹوٹ گیا تھا اور اب وہ اتنی برق رفتاری سے ایک مخصوص سمت گرا رہا تھا کہ بے لان میں رکھی ہوئی چیزیں زوں زوں کی آوازوں کے ساتھ اپنی پوزیشن بدل رہی تھیں۔

”تیمارک“ سالوس کی گھٹی گھٹی آواز ابھری۔ ”اپنے فیوز بجانا۔ اعضا کی حفاظت کرنا وہ ٹھیک ہو سکتے ہیں۔“ لیکن پکڑنے کے لئے کیا چیز تھی جس شے کا سہارا لینے کی کوشش کی جاتی وہ اپنی جگہ چھوڑ کر کیس سے کیس پینچ جاتی۔ کئی باریتھارک اس بک کے نزدیک سے گزری تھی جس میں سالوس لٹکا ہوا تھا۔ شارت البتہ اب بول نہیں رہی تھی اور شوخیک کے سارے اعضا ایک دوسرے سے جدا ہو چکے تھے لیکن سالوس اس آخری دھماکے کا انتظار کر رہا تھا جو بے لان کے کسی سیارے کی زمین سے ٹکرانے کے بعد ہونے والا تھا اگر بے لان اس دھماکے کو برداشت کر گیا تو ان کی زندگی کی امید باقی رہ جاتی تھی ورنہ... اگر سب فیوز ہو گئے تو... اور اس دھماکے کے لئے اسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ بے لان کسی ٹھوس چیز سے ٹکرایا۔ لیکن نہ جانے کیا ہوا وہ ٹھوس چیز شاید اتنی ٹھوس نہیں تھی۔ بے لان اس میں دھستا چلا گیا۔ اور دھماکے میں وہ شدت نہ رہی جو متوقع تھی۔ ایک سکوت قائم ہو گیا۔ سارا بے لان تہہ و بالا ہو گیا

کار کردگی کا جائزہ لیتا رہا۔ دماغ کے نیچے کے فیوز درست کئے۔ ہر جگہ کے نٹ بولٹ کے اور شوٹنگ مکمل ہو گیا۔ دونوں عورتیں اس کے انتہاک کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کافی دیر کے بعد سالوس اس کام سے فارغ ہوا اور پھر اس نے ایک گہری سانس لی۔ میں صرف آخری کوشش میں ناکام ہوں۔“ اس نے کہا۔

”وہ کیا ہے؟“ بچے کی ماں نے مضطربانہ انداز میں پوچھا۔
 ”ایک شوٹنگ کا نظام مکمل طور پر ناکارہ ہو چکا ہے۔ میں اسے چارج نہیں کر سکتا۔ اس کی بیٹری ٹھیک ہے۔ بس اسے چارج کرنا ضروری ہے۔“
 ”اوہ۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن اب کیا ہو گا؟“ تیارک کی روپائی آواز ابھری۔

”کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔“ سالوس نے کہا۔
 ”لیکن کیا پے لان کا نظام درست نہ ہو سکے گا؟“

”یہ ناممکن ہے۔ اس میں اب کچھ نہیں رہا۔ البتہ یہ جگہ جہاں ہم ساکت ہیں ہماری مددگار ضرور ہوگی۔ چنانچہ تیارک تم شوٹنگ کو اسی حالت میں سنبھالو۔ میں پے لان سے باہر نکل کر حالات کا جائزہ لیتا ہوں۔“ سالوس نے کہا اور پھر وہ پے لان کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ باہر کھلتا تھا۔ لیکن سلاوس اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ تھوڑے دیر تک وہ سخت محنت کرتا رہا، دروازے میں صرف ایک جھری بن سکی تھی۔ اس نے باہر ہاتھ ڈالا اور کوئی سفید شے اندر آئی لیکن اندر آکر وہ پانی کے قطروں میں بدل گئی تھی۔

”سلمو نیک۔“ سالوس کے منہ سے نکلا۔ تب اس نے اپنا ہاتھ باہر نکالا اور دفعتاً اس کے ہاتھ کی انگلیوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ چند ساعت وہ یہی عمل کرتا رہا۔ اور دروازہ کھل گیا۔ اس کے سامنے کی برف پھل گئی تھی۔ تب اسے نیچے ڈھلوان نظر آئی۔ پے لان برف میں دفن تھا لیکن جس تودے میں وہ دفن تھا وہ پھسل رہا تھا۔ اور اس کے سامنے کی برف نیچے گر گئی تھی۔ جس کی وجہ سے پے لان ایک دیوار میں نصب ہو گیا تھا۔ لیکن نیچے کی ڈھلوان زیادہ گہرائی میں نہیں تھی۔ سالوس برف پر پھسلنے لگا اور نیچے آیا۔ تاحہ نگاہ سفید ماحول تھا۔ سلمو نیک کے باریک ذرات اب بھی پڑس رہے تھے۔ اس نے دور تک کا جائزہ لیا اور پھر آنکھوں کی پینائی کو دور دور تک دیکھنے کے قابل بنانے کے لیے اس نے کانوں کے نیچے کے ٹیمن

کے پے بال دیرپا نہیں تھے لیکن اس وقت تک کے لئے کام چل سکتا تھا جب تک باریک نارد سٹیپ نہ ہو جائے۔ فیوز باندھ کر اس نے اسے تیارک کے سر میں لگایا اور بولٹ کھینچ لگا آخری بولٹ کھینچنے کے بعد اس نے تیارک کی گردن کی ایک رگ دبائی اور تیارک نے آنکھیں کھول دیں۔ زبرد شعاعیں ان حسین آنکھوں میں اب بھی گردش کر رہی تھیں۔ لیکن سامنے ہی سالوس کے مسکراتے چہرے نے زردی کم کر دی۔ اور تیارک بھی مسکرائی۔
 ”کیا ہم ٹھیک ہیں؟“ اس نے سوال کیا۔

”بالکل ٹھیک ہیں۔ تم اپنی توانائی بحال کرو۔“ سالوس نے کہا۔ اور تیارک نے آنکھیں بند کر لیں۔ سالوس اس کے پاس سے اٹھ کر شارٹ کے پاس پہنچ گیا۔ لیکن حسین شارٹ جاگ رہی تھی۔ ”میرا خیال ہے میرے بعد تم سب سے بہتر حالت میں ہو۔ کیا تمہیں کوئی تکلیف ہے؟“

”نہیں ٹھیک ہوں۔“ شارٹ کی محترم آواز ابھری۔
 ”تب اٹھو اور میری مدد کرو۔“ سالوس نے کہا اور شارٹ اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر اس کی نگاہ شوٹنگ پر پڑی شوٹنگ مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا۔ شارٹ کے چہرے پر غم کی پرتھیاں نظر آنے لگیں۔
 ”تمہیں اس کے لئے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ لیبارٹری ٹھیک ہے میں اسے درست کر لوں گا۔ ہاں بس ایک دقت ہوگی لیکن اس پر بھی کچھ نہ کچھ کیا جائے گا۔ تم سامان میں اس کے اعضا تلاش کرو۔“

تیارک پہلے ہی اس کام میں مصروف ہو گئی تھی پے لان کے بکھرے ہوئے سامان میں شوٹنگ کے ٹکڑے تھے اعضا تلاش کر کے ایک جگہ جمع کئے جاتے رہے۔ دونوں ماں بی بی ان اعضا کو جمع کر رہی تھیں اور سالوس لیبارٹری میں تمام اوزاروں کی جانچ پڑتال کر رہا تھا۔ وہ شوٹنگ کی مرمت کی تیاریاں مکمل کرنے کے بعد دونوں عورتوں کی جانب دیکھنے لگا۔ ایک صاف جگہ چند چیزیں رکھی ہوئی تھیں جن میں شیشیاں مڑے مڑے اوزار اور ایسی ہی ”ہری چیزیں تھیں۔“

”تو شوٹنگ کے تمام اعضا سالوس کے سامنے لا کر رکھ دئے۔ اور سالوس ان کا معائنہ کرنے لگا۔ پھر اس نے شوٹنگ کے بازو ان کی جگہ فٹ کئے۔ پیروں کی مڑی ہوئی انگلیاں درست کیں۔ بن دبا کر اس کے اعضاء کی

جاری کیں اس نے کہا کہ پہلے انہیں سمجھایا جائے اور ان سے اختلاف نہ کیا جائے۔ اچھا رویہ اور نرمی دوست بنانے اور تعاون حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے اگر وہ تشدد پر آمادہ ہوں تو ان کے سامنے خود کو لاچار ظاہر کیا جائے۔ تاکہ اپنی صلاحیتیں اہم موقع پر استعمال کی جائیں۔ ہم ان سے جنگ کرنے نہیں ان کے درمیان پناہ لینے آئے ہیں۔ ساری ہدایات سمجھانے کے بعد سالوس نے بے جان بچے کو بازوؤں میں اٹھایا اور دو حسین عورتوں کے ساتھ بے لال سے باہر نکل آیا۔ باہر سفید ذرات کی چادر تھی ہوئی تھی اور وہ آنکھوں کو مخصوص روشنی کے لئے کشادہ کر کے اس بستی کی جانب چل پڑے جو اجنبی سیارے کے اجنبی لوگوں کی بستی تھی۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

رات کی تاریکی میں برف کے سفید ذرات کافی حسین لگتے ہیں لیکن دن کی روشنی میں بھی وہ برے نہیں لگ رہے تھے۔ البتہ صبح کو سرد ہوا میں بھی جلنے لگی تھیں۔ جن کی وجہ سے موسم اور بھی خراب ہو گیا تھا۔ موسم راشد کے لئے خراب تھا انلا کو یہ موسم بے حد حسین لگتا تھا۔ اور اس کی ممی اس کی ہم خیال تھیں۔ چنانچہ صبح کے ناشتے کے لئے انیلا نے تجویز پیش کی کہ وہ کھلے برآمدے میں کیا جائے جہاں سے برف پوش ماحول نمایاں رہتا ہے تو کیا حرج ہے اور ممی تیار ہو گئیں۔ چنانچہ موٹے موٹے لباسوں میں ملبوس ہو کر وہ برآمدے میں جا بیٹھے اور ملازموں نے ناشتے کی میز پر لگا دی پھر راشد کو طلب کر لیا گیا۔ راشد جس ہیئت میں وہاں پہنچا اسے دیکھ کر انیلا ہنس پڑی۔

”ممی یوں لگتا ہے جیسے کسی اجنبی سیارے کی مخلوق ہمارے درمیان آگئی ہو۔“

”میں خود بھی محسوس کر رہا ہوں جیسے میں کسی دوسرے سیارے پر ہوں میرے سیارے یعنی کہ زمین پر تو ایسے عجیب لوگ نہیں رہتے۔“

راشد نے کنبل اپنے بدن کے کھلے حصوں میں لپیٹتے ہوئے کہا۔

”یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے راشد؟ ناشتا کرنے آئے ہو یا؟“ ممی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”خدا ارامی مجھ سے کنبل اتارنے کے لئے نہ کہیں۔ فوراً“ نمونیہ ہو جائے گا۔“

دبائے اور ان کی روشنی بے حد تیز ہو گئی۔ اب وہ برف کی دیوار چادر میں میلوں دیکھ سکتا تھا۔ اور دوسرے لمحے اس کی آنکھوں میں فرحت کا سبز رنگ ابھر آیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”آبادی۔“ اس نے خوش ہو کر کہا۔ وہ مکانات کسی قدر مختلف طرز کے ضرور تھے لیکن ٹھیک آبادی ہی۔ اور یہ کافی تھا۔ سمجھنے کی حس اس میں موجود تھی اس لئے مقامی آبادی کو سمجھنا مشکل نہ ہو گا۔ پھر کیا کیا جائے؟ کیا پہلے آبادی میں جا کر وہاں کے لوگوں کا جائزہ لیا جائے یا سب لوگ ساتھ ہی چلیں۔ سالوس نے فیصلہ کیا کہ سب لوگوں کو لے جائے جیسے حالات ہوں گے دیکھا جائے گا۔ اس اجنبی سیارے پر زندگی دریافت ہو گئی تھی۔ بس دیکھنا یہ تھا کہ یہاں بسنے والے کیا ہیئت رکھتے ہیں اور ان کا طرز عمل کیا ہو گا چنانچہ سالوس واپس چل پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دوبارہ بے لال میں داخل ہو گیا۔ تیارک، اعضاء بریدہ شونیک کے نزدیک بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں غم کی شعاعیں نمایاں تھیں۔ البتہ باہمت شارٹ بے لال کے الیکٹریکل نظام سے ابھی ہوئی تھی۔ اس تصور کے ساتھ کہ ممکن ہے کسی طرح وہ اتنی بجلی حاصل کر سکے کہ شونیک کی بیٹری چارج ہو جائے۔ سالوس کو دیکھ کر وہ رک گئی۔ تیارک کی آنکھوں میں سوال ابھر آئے تھے۔

”سیارے پر آبادی موجود ہے۔“ سالوس نے بھاری لمحے میں کہا۔ ”اس کا اندازہ وہاں موجود مکانات سے ہو سکتا ہے۔ میں نہیں جانتا سفید ہوا میں کیا حیثیت رکھتی ہیں لیکن یہ ہمارے جسموں کے لئے نقصان دہ نہیں ہیں۔ گو میں اس سیارے کے کسی باشندے کو ابھی تک نہیں دیکھ سکا۔ لیکن طرز رہائش ذرا سا مختلف ہونے کے باوجود ہم جیسا ہے ممکن ہے وہ ہمارے لئے نقصان دہ نہ ہوں چنانچہ ہمیں ان کے درمیان چلنا چاہئے۔“

”اگر انہوں نے ہمیں ناپسند کیا تو؟“ تیارک نے تشویش سے پوچھا۔

”تو ہم واپس بے لال میں آجائیں گے۔ میں بھی اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ بے لال تو کنبل طور سے تباہ ہو چکا ہے۔ ناہم ہمیں اپنی صلاحیتیں بروئے کار لانا ہوں گی۔ ہم کسی حد تک تو محفوظ رہ سکتے ہیں۔“

تیارک تیار ہو گئی۔ تب سالوس نے انہیں ہدایات

”منہ بھی نہیں دھوا ہے شاید تم نے؟“ می بولیں۔
 ”اوہ می۔ خدا کے لئے ایسی خوفناک باتیں نہ کریں۔
 مجھے پانی کے تصور ہی سے وحشت ہوتی ہے مجھے تو اس
 بات سے ہی اختلاف ہے کہ آپ نے اس مٹھوس وقت کو
 دن ہی کیوں تسلیم کیا۔ کیا آپ کو دن کی روشنی کہیں نظر
 آ رہی ہے؟“

”ناشتا کرو“ می نے گرم سوپ اس کے سامنے رکھ
 دیا۔
 ”اور یہ تمہاری دور بین ابھی تک تمہارے پاس موجود
 ہے؟“ راشد نے بشکل کبل سے ہاتھ نکالتے ہوئے انیلا
 کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔ آپ کو کیا اعتراض ہے؟“
 ”مجھے تو تمہارے خط پر افسوس ہے آپ کو علم ہے
 می رات بھر یہ صابزادی دور بین ہاتھوں میں لئے برف پر
 لگاؤں بجائے بیٹھی رہی ہے۔“
 ”رات کو بڑے تودے گرے ہیں۔ میں نے کئی بار
 دھماکے سنے تھے ہر دھماکے پر آنکھ کھل جاتی تھی“ می نے
 جواب دیا۔

”لیکن اس لڑکی کے احمقانہ خوابوں پر آپ کو کوئی
 اعتراض نہیں ہے می؟“ راشد نے پوچھا۔
 ”کیسے خواب؟“ می نے پوچھا۔

”ان کا خیال ہے کہ یہ برف کی شنزادی ہیں۔ اپنے
 خاندان سے بھٹک کر ہمارے دور میں آ گئی ہیں۔ اور اب
 کوئی برف کا شنزادہ کسی تودے سے برآمد ہو گا اور اپنا سفید
 گھوڑا دوڑاتا ہوا ان کے پاس آجائے گا می ہمارے ہاں کی
 لڑکیاں خوابوں میں کیوں ڈوبی رہتی ہیں؟“

”لڑکے اور لڑکیوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے می۔
 ہاں دوڑ میں شاید ایسے ہی خواب دیکھے جاتے ہیں ابھی چھپلی
 رات کی بات ہے“ انیلا نے شرارت سے کہا اور راشد
 نے بوکھا کر کالی کا کپ پیچہ رکھ دیا۔

”وہ۔ وہ کون ہے انیلا۔“ اس نے خواہ مخواہ ایک طرف
 اشارہ کر دیا۔ انداز اتنا بے ساختہ تھا کہ انیلا بھی محسوس نہ
 کر سکی۔ حالانکہ راشد نے صرف انیلا کو خاموش کرنے
 کے لئے یہ بات کی تھی۔
 ”کہاں۔؟“ انیلا نے چونک کر پوچھا۔

”می آپ دیکھ رہی ہیں یا صرف میرا دم ہے۔ وہ برف
 کے اس تودے کے قریب“ راشد نے کہا اور دل ہی دل

جواب دیا

”ہاں مہمان دوست۔ ہم مصیبت کا شکار ہیں۔ ہمارے ساتھ دوسرا کوئی نہیں ہے۔ ہاں ہمیں تمہاری مدد درکار ہے“

”تب آئیے میری جیپ میں سوار ہو جائیں۔ کیا یہ بچہ سرور کا شکار ہے؟“

”ہاں۔ یہ سخت بیمار ہو گیا ہے۔ تم دونوں آؤ۔“
 سالوس نے عورتوں کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔ نوجوان نے خصوصاً ”شارت“ کو جیپ میں سوار کرانے کے لیے اپنا سہارا پیش کیا تھا شارٹ نے یہ سہارا بخوشی قبول کیا۔ اس کا سر ہاتھ کئی لمحے نوجوان کے ہاتھ میں رہا تھا۔ ان کا ذہنی رابطہ سالوس سے قائم ہوا تھا۔ اور اس کی وساطت سے وہ نوجوان کے خیالات اس کی زبان میں سمجھ رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھیں۔ کہ یہ طریقہ بہت آسان ہے۔ زبان کی جیش کا انداز بدل کر، اس بات کا پورا موقع فراہم ہوا ہے۔ کہ وہ خود کو اسی سیارے کا باشندہ ظاہر کر کے اپنے لیے تحفظ حاصل کر لیں

وہ سب جیپ میں بیٹھ گئے اور نوجوان نے جیپ اشارت کر کے آگے بڑھادی ”میرا نام راشد ہے اور میں ڈاکٹر سلمان کا بیٹا ہوں۔ میری بہن کو برف کے مناظر دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ اتفاق سے اس وقت اس کا یہ شوق کام آ گیا۔ اور ہم نے آپ لوگوں کو دیکھ لیا۔ لیکن کیا آپ اسی بستی کی طرف آ رہے تھے۔ کیا بستی میں آپ کا کوئی عزیز ہے؟“ راشد نے پوچھا

جس تیزی سے اس کی زبان چل رہی تھی۔ اسی رفتار سے سالوس کے ذہن کی گراہیاں گھوم رہی تھیں۔ اب وہ مکمل فیصلہ کر چکا تھا۔ کہ خود کو انہیں میں سے ظاہر کرے گا۔ اور انہیں یہ احساس نہ ہونے دے گا کہ اس کا تعلق کسی اجنبی زمین سے ہے۔ حالانکہ اس کے سامنے بے شمار الجھنیں تھیں۔ وہ ان کے طرز معاشرت۔ ان کے نام اور ان کے معاملات میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ لیکن صرف ایک قوت کی وجہ سے اس نے خود کو ان میں سے ظاہر کرنے کی ہمت کی تھی۔ اور اس قوت کا تجربہ سالوس نے ایک لمحے میں کر لیا تھا۔ اجنبی سیارے کی مخلوق کی سوچ اور احساسات کی روح کا جزو نکال لینا مشکل کام نہیں تھا۔ چنانچہ صرف احساس کا ترجمہ اپنے ذہن میں کر کے وہ الفاظ واپس کر سکتا تھا۔ اور یہی قوت اس کی کامیابی کا سبب بن

سالوس کے قدم رک گئے۔ تیارک اس کے شانے کے نزدیک تھی۔ ”کوئی آ رہا تھا۔ تیارک ہمیں دیکھ لیا گیا ہے۔ آہ وہ ہم سے مختلف نہیں ہیں۔ دیکھو ان کی سواری۔ ٹھوڑی سی مختلف ضرور ہے لیکن ضرورت کے مطابق“

”ان کے ارادے غلط نہ ہوں۔ وہ آتے ہی ہمارے ساتھ برا سلوک نہ کریں۔ ممکن ہے وہ ہمیں گرفتار کرنے آ رہے ہوں“

”مگر انہوں نے ہمیں گرفتار کیا تو ہم تعرض نہیں کریں گے۔ فی الوقت بہتر یہی ہے کہ ہم انہیں سمجھیں ان کی زبان سے واقفیت حاصل کریں اور خود کو ان میں ضم کر دیں“

نئے سیارے کی سواری قریب آتی جا رہی تھی۔ اور سالوس کی رفتار سست ہو گئی تھی۔ تب اس کی تیز آنکھوں نے کھلی سواری میں بیٹھ ہوئے انیان کو دیکھ لیا۔ اور اس کی آنکھوں میں حیرت کی شعاعیں رقص کرنے لگیں۔

”بالکل ہماری مانند۔ ہو بہو ہماری طرح۔ تیارک ہو شیار۔ بہتر ہے کہ ہم خود کو اسی سیارے کا باشندہ ظاہر کریں۔ یہ موقع ملا ہے تو اس سے پورا فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔ شارٹ تم سمجھ رہی ہو نا۔ ہر شخص کو ہوشیاری سے کام لینا ہو گا۔ ہمیں اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے بہت ذہانت کی ضرورت ہے۔“

برف پر دوڑنے والی جیپ ان کی قریب پہنچ گئی۔ اور مناسب جسامت کا نوجوان ان کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ جیپ سے نیچے اتر آیا تھا۔ سالوس تیارک اور شارٹ کے ذہن کی گراہیاں ہلکی آواز میں چل پڑیں۔ تب اچانک سالوس نے آہستہ سے کہا ”شارٹ“ میرے ذہن سے رابطہ رکھو۔ میں اس کے ذہن پر اثر انداز ہو رہا ہوں“ دونوں عورتوں نے گردن ہلا دی

”آپ لوگ۔ آپ لوگ برفانی طوفان کا شکار ہوئے ہیں شاید۔ لیکن فکر مند نہ ہوں۔ ہمارے مکانات یہاں سے بہت قریب ہیں۔ ہم آپ کی پوری مدد کریں گے۔ کیا آپ کے ساتھ کچھ لوگ اور بھی ہیں“ آنے والے کی ہمدرد آواز ابھری۔ زبان اجنبی تھی لیکن خیالات پر سالوس کی گرفت تھی۔ اور اسے ان خیالات اور احساسات کو اپنی زبان میں سمجھنے میں دقت نہیں ہوئی۔ اس نے فوراً

کتنی تھی۔
”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا“ راشد نے
سوال کیا

”نہیں اس بستی میں ہمارا کوئی نہیں ہے۔ اور نہ ہم
اس طرف آرہے تھے۔“

”کوئی بات نہیں۔ ہمارے ہاں آپ کو کافی آرام ملے
گا۔ اور ہم آپ کی پوری مدد کریں گے۔“ نوجوان نے کہا
اور سالوس نے گردن ہلا دی

تھوڑی دیر بعد چپ عمارت میں داخل ہو گئی۔ سالوس
اس کی بیٹی اور بیوی نے دیکھا کہ ان جیسی دو عورتیں اور
کھڑی ہیں۔ یہ بات باعث خوشی تھی کہ نئے سیارے کے
لوگ بھی ان کے جیسے ہیں۔ اندرونی نظام میں ممکن ہے
کچھ تبدیلیاں ہوں۔ بیوی ایک جیسا ہی تھا۔ دونوں
عورتوں نے آگے ہاتھ بڑھا کر تیار کر اور شارت کو چپ
سے اترنے میں مدد کی۔ ان کے ہاتھوں میں موٹے کمبل
تھے۔ جنہیں انہوں نے اچھی مہمان عورتوں کے بدن سے
لیٹ دیا۔ سالوس نے چونک کر ان کے خیالات بڑھے۔
اسے شبہ ہوا تھا کہ یہ عورتوں کو گرفتار کرنے کی کوشش تو
نہیں ہے۔ لیکن اسے اپنے سے پرشرمندگی ہوئی۔ یہ تو
ہمدردی کا ایک جذبہ تھا۔ اور سالوس ان مخلص عورتوں
سے بہت متاثر ہو گیا

وہ سب ہمدردی کے الفاظ ادا کرتے ہوئے اندر لے
گئے۔ دونوں عورتیں کسی قدر بدحواس تھیں۔ جب کہ
سالوس کافی مطمئن تھا۔ ”تمہارا بچہ غالباً“ سردی کا شکار
ہو گیا ہے؟“ میزبان عورت نے پوچھا

”ہاں شاید“ سالوس بولا
”میں ڈاکٹر کو فون کیے رہتا ہوں“ راشد نے کہا
”ڈاکٹر“ سالوس ہچکچایا ”میرا خیال ہے اس کی
ضرورت نہیں۔ میں بھی ڈاکٹر ہوں یہ ٹھیک ہو جائے گا“
”تب میں آپ کو ایک فرسٹ ایڈ بس دیتا ہوں“
”آپ لوگ - آپ سب مہمان لوگ، ہمارے
ہمدرد، ہمیں تھوڑی دیر کی تہائی دیدیں۔ ہم سب بد حال
ہیں“ سالوس نے کہا

”ضرور ہمیں احساس ہے“ معمر عورت بولی ”لیکن
بس تم لوگ ناشتا کرو۔ اس کے بعد ہم تمہیں اس وقت
تک پریشان نہ کریں گے۔ جب تک تم سب ٹھیک نہ
ہو جاؤ۔ بچے کی حالت تشویش کا تو نہیں؟“

”ہاں لوگ تو واقعی عجیب ہیں۔ سب ایک جیسی فطرت
کے مالک ہیں۔ میں نے اس لڑکی کو باہر لانے کی بہت
کرتی“
”راشد تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے وہ تمہیں
گھاس ڈال ہی دے گی۔ مجھ سے تو ٹھیک طرح بات نہیں
کرتی“
”مجھ نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت کا پیغام پڑھا
ہے“
”اس بات کا خیال رہے راشد صاحب کہ وہ ہمارے
مہمان ہیں اور مہمانوں کی دل شکنی ڈیڈی کبھی پسند نہیں
کریں گے“
”بس جمل گئیں اور ڈیڈی کی دھمکیاں دینے لگیں“
”چھوڑو کوئی اور بات کرو“
”ان لوگوں کے علاوہ کوئی اور بات کرنے کا دل کہاں
چاہتا ہے۔ سچ بتاؤ انہیں کیا وہ برف کی مخلوق معلوم نہیں
ہوئیں۔ یوں نہیں لگتا جیسے برف کے ذرات سمٹ کر
انسانی شکل اختیار کر گئے ہوں۔ عجیب بھٹکے بھٹکے سے لوگ
ہیں۔“

”ہاں لوگ تو واقعی عجیب ہیں۔ سب ایک جیسی فطرت
کے مالک ہیں۔ میں نے اس لڑکی کو باہر لانے کی بہت

کوشش کی۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ خوف زدہ ہوں۔
 ”اس کا نام بے حد غلط ہے۔ بھلا ایسا بھی کوئی نام ہے
 “راشد نے منہ بنا کر کہا۔

”اور اس کے باپ کا نام؟“ انیلا ہنس پڑی۔ راشد کا منہ بگڑ گیا۔
 ”یوں لگتا ہے جیسے وہ خود کو ہم سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ بہر حال ڈیڈی آج آرہے ہیں۔ اس کے بعد دیکھنا کیا ہوتا ہے؟“ راشد نے کہا۔

اور دونوں خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگے
مہینہ بے روزہ مہمانوں کو آئے ہوئے دوسرا دن تھا۔
خوش اخلاق میزبانوں نے ان کی دجلوئی کی ہر ممکن کوشش
کی تھی۔ لیکن نودار ان سے کھل مل نہیں سکے تھے۔ وہ
”فطرتاً“ عجیب تھے۔ کمرے میں گھسے رہتے تو ننگے کا نام
نہیں لیتے تھے۔ ناشتا جوں کا توں پڑا تھا۔ دوسرے کھانے
کے لیے بلایا گیا تو انہوں نے انکار کر دیا
مجبور ہو کر میکس سلمان نے مرد سے کہا ”ہم لوگوں نے
پورے خلوص سے تمہاری مدد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔
یہاں مہمانوں کی طرح رہو۔ تکلیف اٹھانے یا تکلف
کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ناشتا اور کھانا تو بہت
ضروری ہے۔“

”ہم سب اندرونی طور پر ٹھیک نہیں ہیں۔ میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ان سب کے لئے فائدے تجویز کر رہا ہوں۔ ہم آپ کے غلوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ یقیناً کریں کہ ہم کوئی تکلف نہیں کر رہے ہیں اور ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہے“

”کما سن ہمارے کونڈا نہیں دو گے۔“

”ہرگز نہیں۔ ورنہ یہ مرجائے گا“
 ”کمال ہے“ جیکم مسلمان گردن ہلا کر رہ گئیں۔ ان کے
 نام کو پوچھ گئے تو مرد نے اپنا نام بتایا اور لڑکی نے اپنا نام انام
 - نے کچھ کا نام شونیک اور بیوی کا نام تیارک۔ یہ دونوں نام
 کچھ سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ بہر حال انوکھے مہمان
 اپنے کمرے میں قید تھے۔ ڈاکٹر مسلمان کو فون پر ان مہمانوں
 کے بارے میں اطلاع دیدی گئی تھی اور انہوں نے اس
 نیک کام پر اظہار اطمینان کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ وہ کل گھر
 واپس پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ وہ بھی آج رات
 آ رہے تھے۔

پورے گھر میں سب سے زیادہ پریشان راستہ تھا۔ پہ

بار جب اس نے لڑکی کو دیکھا تھا تو اس کے دل میں گلزار
گھل اٹھتا تھا۔ اتنی حسین لڑکی کا تو اس نے تصور ہی نہیں
کیا تھا۔ بلاشبہ وہ کسی اجنبی پھول کی نو شکفتہ کلی کی مانند
تھی۔ لیکن یہ کلی راشد کے بورے وجود کے لیے خوشی کا
باعث بن گئی تھی۔ لیکن کئی گھنٹوں کی مسلسل کوشش کے
باوجود اس کی توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ تاہم وہ اتنی
حسین تھی کہ راشد اپنی کوشش جاری رکھنا چاہتا تھا۔ انیلا
سے کہو اس کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آیا۔ اور پھر
نئے منصوبے کے ایک ایک پہلو پر غور کرنے کے بعد ایک
بار پھر نئے سرے سے کوشش کرنے کے لیے اپنے کمرے
سے نکل آیا۔

سب پریشان تھے۔ سالوس سب سے زیادہ پریشان تھا کیونکہ ان سب کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر تھی۔ اس نے خود کو انہیں میں سے ظاہر کرنے کا فیصلہ تو کر لیا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں جس قدر مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ ان پر وہ بولھا اٹھا۔ ایک کے جانے کے بعد ایک پریشانی منہ کھول کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ حالانکہ کچھ آسانیاں بھی تھیں۔ مثلاً دیوار میں لگے ہوئے سوچ بورڈ۔ سب سے پہلے سالوس نے شوٹنگ کی کمر کے خانے سے سوچ نکال کر اس کا بیگ ساکٹ میں لگا کر بٹن آن کر دیا۔ اور شوٹنگ کے ٹیم جان بدن میں توانائی دوڑنے لگی۔ ذرا سی دیر میں اس کی سیٹری میں بجلی کا ذخیرہ ہو کر تھا۔ پھر اس نے تیارک اور شارٹ کے بدن میں توانائی بھری۔ آخر میں خوب بھی توانا ہو گیا۔ لیکن سامنے رکھنا تھا اس کے لیے پریشانی کا باعث تھا۔ اس نے ایک ایک چیز کو دیکھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ یہ فضول چیزیں اپنے بدن میں کس طرح داخل کی جائیں۔ اس کے علاوہ اگر وہ بدن کے اندرونی نظام میں داخل ہو بھی سکیں اس کی کارکردگی کو نقصان پہنچائیں گی۔ جب کہ ان لوگوں کو نے بورے خلوص سے یہ سب پیش کیا تھا

دوسری مشکل ناموس کی تھی۔ سالوس نے دو نام بتائے۔ راشد اور اینلا اور اس نے اپنے اور شارت کے بھی نام دہرائے تھے۔ اور مجبوراً "یتارک" اور شوینک کے اصل نام بتائے تھے۔ کیونکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ ان لوگوں میں ناموس کی شناخت اور کیا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار باتیں ہو رہی تھیں۔ بلکہ یتارک اور شارت بھی ایشیائی کاشکار تھے۔ اینلا نے شارت کو اپنے ساتھ چلنے

مصابہٴ ایجادات لئے بازے میں کافی دیر تک تفصیلات بتائیں اور سالوس کی آنکھوں میں مسرت کی شعائیں گردش کرنے لگیں۔ اس نے شارت اور تیارک کو بھی نزدیک بلا لیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ زمین کے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ سب سے زیادہ خوشی اسے اس بات سے ہوئی تھی کہ اس کی ذہنی قوت ان لوگوں پر حاوی تھی اور وہ اس کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ تب اس نے تیارک اور شارت کی طرف دیکھا۔

”ان سوالات سے تم نے بھی کوئی نتیجہ اخذ کیا؟“

”ہاں! بہت کچھ۔“

میرا خیال ہے اب تمہاری مشکلات کچھ کم ہو گئی ہوں گی۔“

”ہاں۔“

”یقیناً۔ لیکن سالوس۔ کیا ہم ان معلومات کے علاوہ اس سیارے پر زندگی بھی گزار سکتے ہیں؟“

”وقتی طور پر۔ میں یابوس نہیں ہوں۔ لیکن ایک کے بعد ایک عمل ہی مناسب ہوتا ہے۔ اور میں یہی کروں گا۔ اب ہمارے لئے پریشانی کم ہو گئی ہے، میرا خیال ہے اب ان معلومات کے سہارے تم محدود نہ رہو بہر حال بہتر لوگ ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ دونوں عورتوں نے جواب دیا۔ اور اچانک سالوس کی آنکھوں کی روشنائیاں بجھ گئیں۔ راشد کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ اور وہ لعوب سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ شارت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور راشد کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ بھول گیا ہو کوئی خاص بات بھول گیا ہو لیکن وہ بات اسے یاد نہ آئی کہ اس نے آخری بات کیا کہی تھی چنانچہ اس نے اچھے ہوئے انداز میں کہا۔ ”اب میں چلتا ہوں آپ کے آرام میں خلل انداز ہوا۔“

”نہیں، ہم لوگ اب خود کو بہتر محسوس کر رہے ہیں۔ جن حالات سے گزر کر ہم یہاں تک پہنچے ہیں ان سے گزر کر یہ ضروری تھا کہ ہم مکمل آرام کرتے۔“ سالوس بولا۔

”ہاں میں آپ کے چہرے پر بحالی دیکھ رہا ہوں۔“

”باہر کا موسم کیسا ہے؟“

”برفباری ہو رہی ہے۔ ہمیشہ ہوتی رہتی ہے، سورج بہت کم نظر آتا ہے۔“

”اُہ! مجھے یہ ماحول بے حد پسند ہے میری سواری

پیشکش کی تھی۔ وہ دل سے اس اجنبی سیارے کی لڑکی سے دوستی چاہتی تھی۔ لیکن اس بات سے خوف زدہ تھی کہ کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکل جائے جو سالوس کے مفاد کے خلاف ہو۔ بہر حال یہ پریشان حال خاندان شدید الجھن کا شکار تھا۔

دھتکتا دروازے پر دستک ہوئی اور سالوس نے ایک نگاہ سب کو دیکھا۔ پھر وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ راشد مسکراتا ہوا اندر آ گیا تھا۔ ”کیا کر رہے ہیں آپ لوگ؟“

اس نے بے تکلفی سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ ہمارے پاس کرنے کو کیا ہے۔“

”آج ڈنڈی آرہے ہیں۔ وہ بھی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے ہم نے انہیں فون پر آپ کے بارے میں بتا دیا تھا۔“

”ہمیں بھی ان سے مل کر خوشی ہوگی۔ تم ذرا اطمینان سے بیٹھو۔ تم سے کچھ باتیں کر لی جائیں۔“ سالوس نے کسی نئے خیال کے تحت کہا اور راشد بیٹھ گیا۔ اس دوران کئی بار اس نے شارت کی جانب دیکھا تھا۔ لیکن شارت گردن جھکا کر بیٹھی تھی۔ تب اچانک سالوس نے راشد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ان لوگوں کی آنکھوں کے رنگ راشد کو عجیب لگے تھے۔ لیکن اس وقت تو وہ حیران رہ گیا۔ مسمان کی آنکھوں میں کئی رنگ جم جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی رنگین چرخہ گھوم رہی تھی۔ یہ رنگ ایک سوئی سوئی سی چمک رکھتا تھا۔ نہ جانے کیوں راشد کی آنکھیں ان آنکھوں پر جم کر رہ گئیں۔ اس کا ذہن سو رہا تھا۔ سونا جا رہا تھا۔ اور پھر وہ ماحول سے بے خبر ہو گیا۔

”میرے دوست میں جو سوال کروں اس کا صحیح جواب دو۔“

اس سیارے کا نام کیا ہے؟“ سالوس نے پوچھا۔

”زمین۔ اترتے۔“ راشد کے منہ سے نکلا۔

”اس کی وسعت؟“

”بے پناہ۔“

”آبادی کتنی ہے؟“

”کئی ارب۔“ راشد نے جواب دیا۔

”طرز زندگی، طرز معاشرت، زمین پر رہنے کا انداز کیا ہے؟ تمہارے یہاں کی سائنس کہاں تک پہنچی ہے۔ تم کون کون سی چیزوں سے متاثر ہو۔ ان تمام باتوں کی تفصیل بتاؤ۔“ اور راشد کی زبان بے اختیار چلنے لگی۔ اس نے مذاہب، نام، رشتے، معیشت، ملکی حالات، انسانی

”آپ باتیں کر رہے ہیں میں سن رہی ہوں۔“
 ”مجھے آپ کی آواز بے حد پسند ہے۔ آپ کے یہ
 خوبصورت ہاتھ۔“ راشد نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں
 لے لیا۔ شرارت نے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ ”کیا تم نے
 کسی سے محبت کی ہے ایلا؟“
 ”نہیں۔“ اس نے مصدومیت سے کہا۔
 ”جانتی بھی نہیں ہوں گی؟“ راشد شرارت سے بولا۔
 ”نہیں۔“
 ”سیکھیں گی؟“ راشد نے پوچھا۔
 ”ہاں۔“

میں آپ کو سکھا دوں گا۔ وہ شاید ڈیڈی آرہے ہیں۔“
 اچانک راشد نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔ ایک ہیلی کاپٹر اسی
 طرف آرہا تھا۔ ”آئیے چلیں۔“ وہ جلدی سے پلٹ پڑا۔
 اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے شرارت کو اس کے کمرے
 میں چھوڑ دیا اور خود وہاں سے چلا گیا۔

”اس بار تو بر فباری نے سابقہ ریکارڈ توڑ دیے۔ تمام
 راستے متاثر ہوئے ہیں۔ ہاں تمہارے مہمان کہاں
 ہیں؟“ ان کی تفصیل کیا ہے؟“ ڈاکٹر سلمان نے پوچھا۔
 ”انوکھے لوگ ہیں۔ کسی پہاڑی علاقے کے باشندے
 معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے زبان تک ٹھیک سے نہیں بول
 سکتے۔ سب سے زیادہ حیرتناک بات یہ ہے وہ کھاتے پیتے
 کچھ نہیں۔“
 ”کیا مطلب؟“ ڈاکٹر سلمان تعجب سے بولے۔
 ”جب سے آئے ہیں انہوں نے چائے تک نہیں
 پی۔“

”اس شخص کا نام بھی راشد ہے ڈیڈی۔ کار سے سفر
 کر رہے تھے برف کا ٹودہ کار پر گر پڑا بڑی مشکل سے وہ اس
 سے بچ کر نکل سکے۔ اس وقت سے ان کے اعصاب
 کشیدہ ہیں۔ ڈاکٹر راشد کا خیال ہے کہ فائدہ کشی انہیں
 درست کر دے گی۔“
 ”کمال ہے۔ ذرا میں بھی تو ان ڈاکٹر صاحب سے ملوں
 جن کے نزدیک اعصاب کی کشیدگی کا علاج فائدہ کشی ہے۔
 ویسے راشد مشکوک لوگ تو نہیں ہیں؟“
 ”کیا مطلب؟“ راشد نے تعجب سے پوچھا۔

”بھئی یہ ایک ایسا علاقہ ہے جہاں حکومت کے ایک
 اہم پروجیکٹ پر کام ہو رہا ہے۔ راکٹ پرواز کے لئے بالکل

خراب ہو گئی تھی۔ پھر برف کا ایک بڑا ٹودہ ہمارے اوپر
 آ پڑا۔ بڑی مشکل سے میں اپنے اہل خاندان کو بچا کر نکل
 سکا۔ اور پھر تم جیسے مہمان لوگ مل گئے۔ ورنہ نہ جانے
 ہمارا کیا حشر ہوا۔“
 ”ہماری خوش بختی ہے کہ ہم آپ کے کچھ کام آسکے۔
 لیکن اب آپ کمرہ چھوڑیں، باہر چکیں اور اس ماحول
 سے لطف اٹھائیں۔ مس انیلا کیا میں آپ کو اپنا مکان
 دکھاؤں؟“

”میں نہیں۔ تم ان کے ساتھ چلی جاؤ۔“ سالوس نے
 شرارت سے کہا اور شرارت اٹھ گئی۔ راشد کو جیسے ہفت
 اقلیم کی دولت مل گئی۔ وہ بے انتہا مسرور شرارت کے ساتھ
 باہر نکل آیا اور پھر دوسروں سے بچاتے ہوئے وہ شرارت کو
 لئے عمارت کے مختلف حصوں میں گھومتا رہا۔ ”یہ ماحول
 کیسا لگا مس انیلا؟“

”بہت اچھا۔“ شرارت نے جواب دیا۔
 ”میں آپ کو باہر کے مناظر دکھاؤں گا۔ افسوس آپ
 لوگ حادثے کا شکار ہوئے لیکن اب آپ کو فکر مند نہیں
 ہونا چاہیے آپ آرام سے رہیں اس لئے بعد جہاں آپ
 کہیں گے پہنچا دیا جائے گا۔“
 ”آپ سب بے حد مہمان لوگ ہیں۔“
 ”مجھے یوں لگتا ہے جیسے آپ کو ہماری زبان بولنے میں
 وقت ہوتی ہے۔“

”زیادہ نہیں۔“
 ”آپ کی اپنی زبان کیا ہے؟“
 ”وہ آپ نہیں سمجھ سکیں گے۔“
 ”کیوں؟“

”بس میرا خیال ہے۔“
 ”آپ بے حد خوبصورت ہیں انیلا۔“
 ”ہاں۔ میں۔“ شرارت ایک دم خاموش ہو گئی۔
 ”آپ کو ایک نگاہ دیکھتے ہی میری عجیب کیفیت ہو گئی
 تھی۔ لیکن جب آپ نے میری طرف توجہ نہیں دی تو
 مجھے رنج ہوا۔“

”اچھا۔“ شرارت نے سنجیدگی سے گردن ہلائی۔
 ”کیا آپ کو میرے ساتھ گھومتے ہوئے کو فٹ ہوئی
 ہے انیلا؟“

”نہیں۔“
 ”تو پھر باتیں کریں۔“

لگتا۔ تاہم یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔ رات کو میں اس سے ملاقات کروں گا۔“ ڈاکٹر سلمان نے پر خیال انداز میں کہا۔

❖ ❖ ❖ ❖ ❖

برفاری اب کسی قدر کم ہو گئی تھی۔ ہواؤں کی شدت میں بھی کمی آگئی تھی۔ مکانات کے اوپری حصے کے ایک سنسان گوشے میں شارت، راشد کے ساتھ موجود تھی۔ ”جذبات“ شناسائی کی مدت کے تابع نہیں ہوتے۔

ایک لمحہ ساری حیات کا سراغ بن جاتا ہے لمحات، انسان کو بہت کچھ دیتے ہیں اور بہت کچھ چھین لیتے ہیں بس نگاہ کی ضرورت ہے۔ محبت اور صرف محبت زندگی کا سب سے اہم جذبہ ہے میں نہیں جانتا تمہاری سوچ، تمہاری معلومات کہاں تک ہیں لیکن میں... میں تمہیں چاہتا ہوں۔ ایلا... میری خواہش ہے کہ تم یہاں سے بھی نہ جاؤ۔“

شارت احمقانہ انداز میں اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔ ”میرے ان الفاظ سے تمہارے دل میں کوئی جذبہ ابھرا ایلا؟“ راشد نے پوچھا۔

”نہیں...“ اس نے جواب دیا اور راشد اسے عجیب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ تب اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ”تم اپنی عمر سے کہیں پھوٹی ہو۔ نہ جانے کیوں۔ نہ جانے کیوں، مجھے معاف کرنا نہیں جذبات سے آشنا کرنے کے لئے میں جرات کر رہا ہوں۔“ اس نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ شارت کی تکیاں کی کمرے گرد حائل کر دیئے۔ شارت نے تعرض نہیں کیا تھا۔ تب راشد نے اسے سینے سے پیچ لیا اور اپنے ہونٹ شارت کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ لیکن اتفاق طور پر شارت کی کمر پر لگا ہوا کوئی بٹن دب گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے راشد کو اتنا شدید جھکا لگا کہ وہ اچھل کر کئی فٹ دور جاگرا۔ چند لمحات کے لئے اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ وہ زمین پر پڑا پٹی پٹی نگاہوں سے شارت کو دیکھ رہا تھا۔ تب وہ آگے بڑھ آئی اس نے جھک کر راشد کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن جو بھئی اس نے راشد کو چھوا، راشد کے حلق سے ایک کربہ جھنجھل گئی اس کے بدن کو دوبارہ جھکا لگا تھا۔ اور شاید اس کی اس دوسری جھنجھ نے ہی ایلا کو اس طرف متوجہ کیا تھا جو دو دربین سنبھالے اپنے محبوب مشغلے میں مصروف تھی۔ وہ دوڑی

تیار ہے چند روز بلکہ ممکن ہے چند گھنٹوں کے بعد اسے خلاء میں بھیجا جائے والا ہو۔ جو نئی موسم درست ہو راکٹ چھوڑ دیا جائے گا۔ بہت سے ذہنوں میں ہمارے غلامی پروگرام سے تشویش ہے وہ ان لوگوں میں سے نہ ہوں۔“

”نہیں ڈیڈی۔ سیدھے سادے لوگ ہیں۔ اس کے باوجود مناسب اندازہ آپ ان سے ملاقات کے بعد ہی لگا سکیں گے۔“

”تم لوگ یقین کرو میں صرف اسی وجہ سے آیا ہوں ورنہ اس وقت موقع نہیں تھا۔ اب ان سے ملاقات کا بندوبست کرو۔“

”کیا میں ان لوگوں کو بلا کر لاؤں؟“

”چلو میں ہی چلتا ہوں۔“ ڈاکٹر سلمان نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ سب مہمانوں کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ڈاکٹر سلمان نے برتیاک انداز میں سالوس سے مصافحہ کیا۔ ”آپ لوگوں کے بارے میں تفصیلات تو معلوم ہو ہی گئی ہیں مجھے اس حادثے کا افسوس ہے لیکن میرے بچوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ آپ نے اس دوران کچھ کھایا پیا نہیں ہے۔“

”ہاں“ سالوس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”لیکن یہ ڈاکٹری کا کونسا اصول ہے؟“

”اس کے بارے میں، میں آپ کو تنہائی میں بتانا چاہتا ہوں۔“ سالوس نے کہا۔

”موجودہ بہر حال آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ ہم سب آپ کی مدد کے خواہش مند ہیں۔ جب تک چاہیں قیام کریں۔ موسم بہتر ہو جائے گا تو آپ کو آپ کی پسند کی جگہ پہنچا دیا جائے گا۔“ ڈاکٹر سلمان نے کہا۔

”ہم سب آپ کے ہمدردانہ رویے کو ہمیشہ یاد کریں گے۔“ سالوس نے جواب دیا۔ مختصری گفتگو کے بعد ڈاکٹر سلمان انہیں آرام کرنے کا مشورہ دیکر باہر نکل آیا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی الجھن کے آثار تھے۔ ”کوئی خاص بات ہے۔ آپ مجھے کچھ اچھے اچھے سے نظر آ رہے ہیں۔“ مسز سلمان نے پوچھا۔

”نہیں! کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ یہ لوگ مجھے اذکے لگے ہیں۔ ان کے افعال نامانوس سے ہیں۔ آواز کا تاثر کچھ نہیں ہوتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ آوازیں مشینوں سے نکل رہی ہیں۔ الفاظ اور چہروں کا تاثر بھی ہم آہنگ نہیں

ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ راشد اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی ہمت بھی نہیں تھی۔

”کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟“ وہ حیرت سے ان دونوں کو دیکھتی ہوئی بولی۔

”کچھ نہیں۔۔۔ یہ مجھے محبت کرنا سکھا رہے ہیں۔“ ثنارت نے معصومیت سے جواب دیا۔

”اوہ آپ کو آپ کو ایسی کوئی حرکت نہیں کرنی چاہیے تھی راشد یہ لوگ بہر حال ہمارے مہمان ہیں۔ لیکن۔۔۔

لیکن۔۔۔“ وہ حیرت زدہ انداز میں خاموش ہو گئی۔ اسے تعجب ہوا تھا۔ اس کی ہم نام لڑکی اتنی طاقتور تو نہیں تھی۔

راشد نے کئی بار انھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ تب اٹھانے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ اور راشد لرزتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی خوف و حیرت نمایاں تھی۔ وہ بار بار اس معصوم لڑکی کو دیکھنے لگتا تھا۔

”ہو کیا تھا؟“ اٹھانے پوچھا۔

”کچھ نہیں مجھے۔۔۔ مجھے جکڑ آگیا تھا۔“ راشد اصل بات تو نہیں بتا سکتا تھا۔

”محبت سکھانا اتنا مشکل کام تو نہیں ہے۔“ اٹھانے پڑی۔

”مجھے میرے کمرے تک پہنچا دو اٹھان۔ پلیز اس وقت میرا مذاق مت اڑاؤ۔“ راشد نے کمزور آواز میں کہا۔ اور اٹھانہ سجدہ ہو گئی راشد جیسے کھنڈرے نوجوان کو اس نے اتنا نڈھال کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر اس نے لاکھ راشد سے پوچھنے کی کوشش کی لیکن اس نے زبان بند کر لی تھی خود اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ اٹھان کو کیا بتاتا۔

❖ ❖ ❖ ❖

ڈاکٹر سلمان بے حد ذہن انسان تھا۔ جس وقت سے وہ این لوگوں سے ملا تھا اس کے ذہن میں ایک عجیب سی کیرید تھی۔ بس ایک بے نام سا احساس۔ ان سب کا انداز غیر انسانی تھا۔ بظاہر وہ مکمل انسان محسوس ہوتے تھے۔ لیکن کوئی ایسی بات، کوئی ایسی بات جو ذہن میں چبھتی تھی وہ کیا بات تھی۔

یہ پروگرام کے مطابق رات کو وہ اجنبی مہمان کے پاس پہنچ گیا۔ معمر مہمان کے ہونٹوں پر پر خلوص مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”مجھے آپ کے بارے میں تفصیل جاننے کا اشتیاق ہے۔ اور خاص طور سے اس بھوک ہڑنال کی وجہ

جاننا چاہتا ہوں۔“

”اے یہ ہوا تھا کہ ہم لوگ تہائی میں گفتگو کریں گے۔“ سالوس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور ڈاکٹر سلمان نے گردن ملا دی۔

”مجھے اعتراض نہیں۔ بہتر ہے کہ آپ میرے کمرے میں چلیں۔ میں سب سے کہہ دوں کہ ہمارے درمیان مداخلت نہ کریں۔“ ڈاکٹر سلمان نے پیشکش کی اور سالوس نے آمادگی ظاہر کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر سلمان اسے لے لے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہو گیا اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

”تمہارے انداز میں ہمارے لئے غیر معمولی دلچسپی پائی جاتی ہے ڈاکٹر۔“ سالوس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں! میں اس سے انکار نہیں کروں گا۔“

”اس کی کوئی خاص وجہ ضرور ہوگی؟“

”ہاں۔۔۔ میں نے تمہارے اندر کچھ خاص باتیں نوٹ کی ہیں۔ اول تو تم ہماری زبان ہمارے انداز میں نہیں بولتے۔ اس کے علاوہ بھی چند چیزیں مثلاً ”یہ فائدہ کشی۔“

”تم ذہین انسان ہو ڈاکٹر، تمہارے اس سیارے پر میں نے سب سے پہلے تمہارے خاندان کو دیکھا ہے اور میں تم سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ اس اجنبی زمین پر پہنچ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی لیکن میں اپنی الجھن تمہارے سامنے پیش کیے دیتا ہوں۔ صرف اس احساس کے سارے کے تم نیک انسان ہو اور میری مدد ضرور کرو گے۔“

ڈاکٹر سلمان تعجب سے اسے دیکھ رہا تھا ”سیارہ“ اجنبی زمین؟۔“ وہ معجبانہ انداز میں بولا۔

”ہاں ڈاکٹر۔۔۔ میرا تعلق اس سیارے سے نہیں ہے۔ خلاء میں میرا چھوٹا سا سیارہ ہے جسے ہم لوگ ”گون“ کے نام سے پکارتے ہیں۔ میں گون کا حکمران ہوں۔ تمہارے سیارے کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات مجھے اس نوجوان سے معلوم ہوئی ہیں۔ ہمارے ہاں کا طرز حکومت بھی تمہارے سیارے کے مطابق ہے۔ ہمارے ہاں بھی حکمرانوں کے خلاف سازشیں ہوتی ہیں اور اس بار میرے دشمن میرے خلاف سازش میں کامیاب بھی ہو گئے تھے میں اپنے خلائی جہاز میں کشاکش کی۔ سیر کو نکلا تھا لیکن ہمیں دھوکہ دیا گیا اور خلائی جہاز میں ایندھن کی بہت معمولی مقدار رہی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ ہم خلاء ہی میں رہ جائیں، جب مجھے احساس ہوا تو میں نے مدبیر کی اور خلائی

کوئی بھی حادثہ پیش آسکتا تھا۔ لیکن اس شخص کے بیان کی تصدیق ضروری تھی۔ راستے میں وہ سالوس کے بارے میں بہت کچھ معلوم کرچکا تھا اور یہ معلومات اس کی زندگی کی قیمتی ترین معلومات تھیں۔ بے لانا تک پہنچنا آسان کام نہیں تھا تاہم وہ اس انوکھے خلائی جہاز میں پہنچ گئے اور سالوس، ڈاکٹر سلمان کو اس کی تفصیل بتانے لگا۔ اب ڈاکٹر سلمان کو اجنبی سیارے کے حکمران کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے آدھی رات تک بے لانا کا معائنہ کیا اور پھر واپس چل پڑے۔ ڈاکٹر سلمان کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ واپس آکر وہ سالوس کو پھر اپنے کمرے میں لے گیا۔ ”میں تمہاری پوری پوری مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔ کل ہی میں اپنے پروجیکٹ کو ذہن ترین سائنسدانوں کو تمہارے خلائی جہاز کا معائنہ کرنے کی دعوت دوں گا۔ میں حکومت سے بھی تمہارے لئے امداد طلب کروں گا۔ اور یہ میرا وعدہ ہے کہ تمہیں کسی الجھن کا شکار نہیں ہونے دوں گا۔ ورنہ اگر تمہارے بارے میں تشویش ہو جائے تو شاید ساری دنیا تمہارے طرف دوڑ پڑے۔“

”پروجیکٹ؟“ سالوس نے سوالیہ انداز میں ڈاکٹر سلمان کو دیکھا۔

”ہاں میں بھی خلائی تحقیقاتی ادارے کا ایک رکن ہوں۔ یہاں ادارے کی ایک برانچ ہے اور ہم خلاء میں راکٹ بھیجنے کے لئے تیار ہیں اور کل موسم درست ہو جائے تو ہم راکٹ چھوڑ سکتے ہیں۔“ ڈاکٹر سلمان نے کہا اور پھر ایک دم خاموش ہو گیا۔

”کیا تم مجھے اس راکٹ کے بارے میں مزید تفصیلات نہیں بتاؤ گے؟“ سالوس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

”افسوس یہ میرے لئے ممکن نہیں ہے میں سرکاری ملازم ہوں۔“ ڈاکٹر سلمان نے معذرت آمیز انداز میں اسے دیکھا۔ لیکن سالوس کی آنکھوں میں انوکھے رنگ گردش کر رہے تھے۔ ڈاکٹر سلمان کی آنکھیں ان رنگوں پر جم کر رہ گئیں۔

”راکٹ کا محور کیا ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

”کوئی مخصوص زاویہ طے نہیں کیا جاسکا۔“ ڈاکٹر کی آواز ابھری۔

”اس کی قوت؟“

”فضاء میں طویل عرصے رہ سکتا ہے۔“

جہاز میں دھماکہ کر کے اسے کمکتاں کے مدار سے ہٹایا نتیجے میں وہ اس سیارے میں اگرا۔ اتفاق سے تم لوگ ہمارے مائنز تھے چنانچہ ہم مقامی سیارے کے لوگوں کی حیثیت سے تمہارے درمیان آگئے۔ یہ ہے ہماری کمائی ڈاکٹر سلمان۔“

ڈاکٹر سلمان کی آنکھوں میں حیرت و اشتیاق کی چمک تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ زندگی میں کسی ایسے واقعے سے دوچار ہو سکتا ہے۔

”تم اپنے سیارے کے حکمران ہو؟“ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

”ہاں ڈاکٹر، اور جان بوجھ کر یہاں نہیں آئے۔“

”لیکن اب تم کیا کرو گے؟“

”اس زمین سے میں ناواقف ہوں۔ ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکا ہوں۔ لیکن ظاہر ہے میں یہاں نہیں رہ سکتا مجھے کسی نہ کسی طور اپنے سیارے پر واپس جانا ہو گا۔ ہمدرد لوگوں کے درمیان میں خود کو غیر محفوظ نہیں سمجھتا مجھے تمہارا مشورہ درکار ہو گا۔“

”تمہارا خلائی جہاز کہاں ہے؟“

”یہاں سے تھوڑی دور برف میں دفن ہے۔“

”کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟“ ڈاکٹر سلمان نے پوچھا۔ اس کے ذہن میں لاتعداد خدشات جاگ رہے تھے۔

”ضرور۔ میں تمہیں اس تک لے جانے کے لئے تیار ہوں۔“

”کب؟“

”جب تم پسند کرو۔“

”میری چٹھی مختصر ہے۔ اگر ہم یہ کام ابھی کر لیں تو کیا حرج ہے؟“

”کوئی حرج نہیں ہے میں تیار ہوں۔“

”تب پھر اٹھو بانی بائیں راستے میں کریں گے۔“ ڈاکٹر سلمان تیار ہو گئے۔ برف سے بچنے کیلئے انہوں نے پوسٹین پن لپی اور سالوس کو بھی گرم لباس پیش کیا۔

”تمہارے سیارے کا موسم ہمارے لئے بے ضرر ہے اس لئے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ سالوس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور ڈاکٹر نے گردن ہلا دی۔

جب کپ کی لائیں برف کی دھند کو چیرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں ڈاکٹر نے اس کی رفتار بہت سست رکھی تھی۔

”ساز؟“

”کافی وسیع ہے۔ اس کے اندر خلائی تحقیقات کے لئے بے شمار آلات نصب ہیں۔“

”کیا اس میں کوئی انسان سفر کرے گا؟“

”نہیں۔“ ڈاکٹر سلمان نے جواب دیا۔ اور سالوس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ چند ساعت وہ خاموش رہا پھر بولا۔ ”یہ چند لمحات تمہاری یادداشت میں نہیں رہنے چاہئیں۔ تم اس گفتگو کو فراموش کر دو گے۔“

ڈاکٹر سلمان نے کوئی جواب نہیں دیا اور سالوس کی آنکھوں کے رنگ بجھ گئے۔ ڈاکٹر نے چونک کر آنکھیں پھاڑ دیں۔ پھر اٹھتا ہوا بولا۔

”بہر حال میرے دوست تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں میں تمہاری پوری مدد کروں گا۔ اب آرام کرو پوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کل کا دن چمکدار ہو گا۔ اور ہم راکٹ فضا میں چھوڑ دیں گے۔“ ڈاکٹر سلمان کمرے سے نکل گیا۔

◆ ◆ ◆ ◆ ◆

دوسرے دن سورج نے منہ چمکایا تھا۔ برقرار رات کے کسی حصے میں ختم ہو گئی تھی۔ صبح سات بجے پہلی کاپڑ ڈاکٹر سلمان کو لینے پہنچ گیا۔ پروجیکٹ میں بڑی گہما گہمی تھی۔ راکٹ کی آخری جانچ پڑتال ہو رہی تھی۔

دس بجے کا وقت راکٹ چھوڑنے کے لئے طے کیا گیا اور ساری ضروری تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ ٹھیک دس بجے راکٹ نے زمین چھوڑ دی۔ تمام سالسداں ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہے تھے کنٹرول کیشن میں راکٹ کے بارے میں ساری تفصیلات موصول ہو رہی تھیں۔ تب ایک آپریٹر نے اپنا کچھ الجھن محسوس کی اور وہ کنٹرول بورڈ کو چیک کرنے لگا پھر اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں پروجیکٹ انچارج کو اطلاع دی۔ ”راکٹ کا وزن پہلے سے تقریباً چار سو پونڈ بھڑ گیا ہے۔“

”چار سو پونڈ؟“ انچارج بوکھلا کر بولا۔

”لیکن راکٹ کی پرواز مناسب ہے۔ اس کی مشینری پر کوئی اثر نہیں ہے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔“ انچارج نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ سب کنٹرول روم میں جمع تھے۔ سب کے سب پریشان تھے تب انچارج نے راکٹ کے اندرونی حصے سے رابطہ قائم کیا اور اس کی آوازیں سننے لگا۔

دوسرے لمحے وہ سب الجھ پڑے راکٹ میں کچھ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ انچارج کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ”ہیلو ہیلو راکٹ میں کون ہے؟ ہیلو۔ بات کر۔“

اور چند ساعت کے بعد ایک آواز ابھری۔ ”ڈاکٹر سلمان کیا تم بھی ان لوگوں کے درمیان موجود ہو۔“ جواب دو؟“

زرد چہرے ڈاکٹر سلمان کی طرف اٹھ گئے۔ وہ آگے بڑھا پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ ”ہاں! میں موجود ہوں۔ لیکن تم کون ہو؟“

”سالوس، میرے عظیم محسن، میرے ہمدرد میزبان مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے لئے ذرا سی الجھن کا سبب بن گیا ہوں۔ لیکن اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں تھا میں اپنے اہل خاندان کے ساتھ راکٹ میں موجود ہوں اور اس بات پر شرمندہ ہوں کہ تمہارے خلائی پروگرام میں تھوڑی سی مداخلت کی ہے میں اس راکٹ کو اپنے سیارے پر لے جاؤں گا اور پھر پوری دیانتداری کے ساتھ اسے فضا میں چھوڑ دوں گا۔ نہ صرف یہ بلکہ میں اس راکٹ کے ذریعے تم سے رابطہ قائم کروں گا اور خلائی معلومات میں جہاں میری مدد درکار ہوگی میں تعاون کروں گا۔ اس تھوڑی سی ردوبدل کے لئے مجھے معاف کر دینا۔“

”لیکن تم راکٹ میں کس طرح پہنچے؟“

”میرا نظام تم سے بہت مختلف ہے۔ ہم اپنے ذرات کو منتشر کر کے چھوٹی چھوٹی جگہ میں سمو سکتے ہیں۔ میں نے اور میرے اہل خاندان نے یہی کیا ہے ہم منتشر ہو کر راکٹ کی پرواز کے وقت اس میں داخل ہو گئے تھے۔ اور اب ہم سکون کے ساتھ اپنے سیارے کی جانب جا رہے ہیں۔ راکٹ میرے کنٹرول میں ہے اور یہ آسانی مجھے میری دنیا میں پہنچا دے گا میں تمہ دل سے تم لوگوں کا شکر گزار ہوں۔“

ڈاکٹر سلمان نے سر پکڑ لیا اور دوسرے لوگ احمقانہ انداز میں اسے دیکھ رہے تھے۔



وہشت زارہ

ایم اے راحت

وہ بہت ٹھنڈے دل و دماغ کا بہت مستقل مزاج آدمی تھا۔ اس نے ہنگل پر کوئی ہنگامہ نہیں کیا اور یونس سے کہا کہ وہ دوسرے دن یعنی بدھ کی شام کو اس کے گھر آکر اس مسئلے پر بات کرے گا۔ یونس نے آمادگی کا اظہار کیا اور رخصت ہو گیا۔ بدھ کی شام ساڑھے آٹھ بجے سیٹھ شمشاد بیگ اس کے فلیٹ پہنچا جو کہ نوری نگر کی ایک نو تعمیر ہانچ منزلہ ہلالہ کی آخری منزل پر واقع تھا۔ فلیٹ میں بجلی جل رہی تھی۔ اس سے سیٹھ شمشاد بیگ نے اندازہ لگایا کہ یونس اندر موجود ہے۔

ایک معاشرتی کہانی 'عمران ڈائجسٹ' کے آخری صفحات کے لیے



اس موت کی خبر فوری طور پر پولیس کو کی جائے۔
میجر شاہ کسی زمانے میں ملٹری ایٹلی جنس کے
ایک اہم رکن تصور کیے جاتے تھے۔ رہنما رہنے
کے بعد انہوں نے اپنا ایک ارادہ قائم کر لیا۔
مقامی طور پر پرائیویٹ جاسوسی کے لائسنس تو
جاری نہیں کیے جاتے لیکن میجر شاہ خصوصی
مرامات کے ساتھ اپنا یہ کاروبار چلا رہے تھے۔ دو
اسٹنٹ شارق اور صوفیہ انہوں نے اپنے ساتھ
رکھے تھے۔ اکثر پولیس بھی ان سے مدد لے لیا
کرتی تھی اور وہ پولیس کے پسندیدہ افراد میں سے
تھے۔

بہر حال اس دن بھی وہ اپنے دونوں ماتحتوں
کے ساتھ بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے کہ ایک
خاتون اندر داخل ہوئیں میجر شاہ نے انہیں پہچان
لیا۔ یہ میڈم رخسانہ تھیں۔ کافی عرصہ پہلے میجر شاہ
کے تعلقات طاہر علی صاحب سے تھے اور اس
وقت مسز رخسانہ ان کی بیگم تھیں لیکن ان کی موت
کے بعد مسز رخسانہ ان کے کاروبار کی مالک بن
گئیں۔ اور پھر انہوں نے اپنے بیجر الیا س بیک
سے شادی کر لی ان کی بیٹی نوشابہ اپنے سوتیلے
باپ سے بالکل منفرست تھی۔ اس کے اپنے باپ
نے اس کے لیے اچھی خاصی دولت چھوڑی تھی اور
اس نے علیحدہ رہائش اختیار کر لی تھی۔

اس وقت میڈم رخسانہ کو دیکھ کر میجر شاہ کو
سب کچھ یاد آ گیا۔

”آئیے میڈم کیسی ہیں آپ۔“

”آپ نے مجھے پہچان لیا۔“

”آپ کو نہ پہچاننے کا کیا سوال پیدا ہوتا

ہے۔“

”میں آپ کے پاس ایک بہت ضروری کام

ہے آئی ہوں۔ مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔“

”جی جی..... فرمائیے۔“

”میری بیٹی نوشابہ کو مل کر دیا گیا ہے۔ آپ

نے اخبارات میں خبر پڑھی ہوگی۔“

کونسی ایسی بات نہیں ہے۔ اس قسم کے
قبوہ خانے نجانے کہاں کہاں کھلے ہوئے ہیں۔
تعلقات والی عورتوں نے صاحب اقتدار لوگوں کی
مدد سے یہ جگہیں قائم کر رکھی ہیں۔ وہ دونوں بھی
سسر ڈیولیانہ کے اس قبوہ خانے میں داخل
ہوئے۔ یہاں اس طرح کے مہمانوں کے لیے ہر
طرح کی آسائشیں موجود تھیں۔ نوشابہ اور اس کے
ساتھی جس نے اپنا صرف پاشا بتایا تھا نے سسر
ڈیولیانہ سے بات کی اور انہیں ایک کمرہ حاصل
ہو گیا۔ نوشابہ ایک عجیب سی کیفیت کا شکار تھی۔
حالانکہ پاشا کے ساتھ اس نے صرف کافی بی تھی
لیکن کافی پینے کے بعد ہی اسے ہلکے ہلکے نشے کا سا
احساس ہوا تھا۔ یا تو پاشا نے کوئی کاروائی کی تھی۔
یا پھر خود اسی کی طبیعت خراب تھی۔

بہر طور وہ دونوں فرضی نام اور پتے کے
ساتھ اس کمرے میں مقیم ہو گئے پھر صبح نو بجے تک
جب اس کمرے کے مہمان بیدار نہ ہوئے تو سسر
ڈیولیانہ کو یواغصہ آیا مہمانوں کے لیے ہدایت
نامہ موجود تھا۔ انہیں آٹھ بجے تک کرا چھوڑ دینا
ہوتا تھا۔ وہ غصے سے تیز قدم رکھتی ہوئی کمرے
پر پہنچی کمرے میں وہ لڑکی بے خبر سو رہی تھی۔ جو
رات کو اپنے ساتھی کے ساتھ اس کمرے پر پہنچی
کمرے میں وہ لڑکی بے خبر سو رہی تھی۔ جو رات کو
اپنے ساتھی کے ساتھ اس کمرے میں مقیم ہوئی
تھی۔ اس کا جسم کسی تراشے ہوئے مجسمے کی طرح
خوب صورت اور سڈول تھا۔ اس کے سینے پر ایک
سرخ گلاب رکھا ہوا تھا۔ جس کی پتیاں بکھر گئی
تھیں۔ سسر ڈیولیانہ نے دروازہ آہستہ سے بند کیا
اور لڑکی کو بیدار کرنے کے لیے جھکی اور پھر دم بخود
رہ گئیں۔ ان کے اندر ایک ہلکی سی کپکپاہٹ بیدار
ہوئی تھی۔ کیونکہ لڑکی مر چکی تھی۔ اس کے دل کے
اوپر خنجر کا ایک گہرا گھاؤ تھا۔ جس سے نکلنے والا
خون جم گیا تھا اور اس خون کو گلاب کی پتیوں نے
چھپا لیا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ

گہرے تعلقات تھے کہ اگر میں آپ کے لیے کوئی کام کروں تو اس کا کوئی معاوضہ طلب نہیں کروں گا۔“

”تو آپ براہ کرم پولیس سے رابطہ قائم کیجیے۔ پولیس نے اس سلسلے میں کافی کام کیا ہے۔ میرا خیال میں وہ آپ کی مدد ضرور کر سکتی ہے۔“

تھوڑی دیر تک خاموشی طاری رہی پھر میجر شاہ نے ٹیلی فون اٹھایا اور پولیس آفس کے نمبر ڈائل کرنے لگے۔ انہوں نے انسپٹر نواز کو طلب کر لیا تھا۔

”میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ میرے آفس آ جاؤ۔“

”کوئی بہت ضروری کام ہے۔“

”ہاں..... وہ لڑکی نوشاہہ جو سسٹر ڈیولیانہ کے کمرے کے بیڈ پر ختم ہوئی ہے۔ اس کے بارے میں تمام تفصیلات لے کر آ جاؤ۔“ انسپٹر نواز ہینک میجر شاہ کا ملازم نہیں تھا۔ نہ میجر شاہ کوئی بڑا پولیس آفیسر تھا لیکن بہت سے معاملات میں میجر نے خود انسپٹر شاہ کی بڑی مدد کی تھی اور میجر شاہ کی مدد سے انسپٹر نواز ایس آئی سے انسپٹر بنا تھا۔ وہ ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک فائل اٹھائے ہوئے میجر شاہ کے آفس میں داخل ہو گیا۔ وردی میں ملبوس تھا اور بہت شاندار نظر آ رہا تھا لیکن میجر شاہ جانتے تھے کہ اس کا ابرچسبیر بالکل خالی ہے اور وہ بھی کوئی ڈھنگ کا کام نہیں کر سکا۔ اس نے تمام کاغذات کچھ ٹرانسپیرنسی وغیرہ میجر شاہ کے سامنے رکھ دیں۔

”کہاں تک پہنچے۔“

”بس سر! ابھی تو ابتدائی منزل میں ہوں۔“

”اچھا..... ذرا دیکھو!“ میجر شاہ نے شارٹ سے کہا اور شارٹ وہ میجر ڈراؤن اٹھالایا جس میں اسے ٹرانسپیرنسی دیکھنا تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میجر ڈراؤن ٹرانسپیرنسی لگا کر اس نے اس کا سوچج آن کر دیا اور میجر شاہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”اوہو..... کیا سسٹر ڈیولیانہ کے گھر پر جولاش ملی ہے وہ آپ کی بیٹی نوشاہہ کی تھی۔“

”ہاں..... لیکن جو کچھ اختیارات میں لکھا گیا ہے۔ وہ قطعی غلط ہے۔ خدا کی قسم میری بیٹی ایسی نہیں تھی اسے دھوکہ دے کر وہاں لے جایا گیا۔ طریقہ کار کچھ بھی رہا ہو پولیس نے بالکل غلط فیصلہ کیا ہے اور اسے پھر اس آوارگی کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو خود کچھ عرصے کے بعد شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس کے باپ کا چھوڑا ہوا کافی کچھ اس کے پاس موجود ہے۔“

”ٹھیک ہے کیا آپ مجھے یہ بتانا پسند کریں گی کہ کوئی اس کا مرکز نگاہ تھا۔ یعنی کوئی ایسا شخص جس سے وہ شادی کرنا چاہتی ہو۔“

”بالکل نہیں یا اگر وہ بھی تو اس نے آج تک مجھ سے اس کا تذکرہ نہیں کیا یہ تو میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ دوسری شادی کرنے کے بعد وہ مجھ سے کشیدہ رہنے لگی تھی۔“

”کیا آپ یہ بتا سکتی ہیں کہ الگ رہتے ہوئے اس کے مشاغل کیا رہتے تھے۔“

”بالکل نارمل۔ اگر آپ اس کے کردار کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں تو میں آپ سے پورے دعوے کے ساتھ یہ بات کہہ سکتی ہوں کہ وہ ایک باکردار لڑکی تھی اور جس انداز میں اس کا نقل ہوا ہے۔ وہ تو قصور سے بھی باہر ہے۔“

”ہوں۔“ میجر شاہ نے پر خیال انداز میں نچلا ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے کہا۔ اور پھر دیر تک خاموش رہا اور پھر بولا۔ ”ایک بات تو بتائیے۔ میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔“

”کمال ہے۔ آپ جو کچھ کر رہے ہیں۔ مجھے اس کا علم ہے۔ اگر آپ اپنے کسی معاوضے کی بات کرتے ہیں تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔“ میجر شاہ ہنسنے لگے۔ پھر انہوں نے کہا۔ ”نہیں میرے آپ کے شوہر کے ساتھ اتنے

”ہوں تو آلہ قتل بھی نہیں ملا۔“ میجر شاہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”قاتل کوئی انارڈی معلوم نہیں ہوتا، ایک ہی دار میں اس نے لڑکی کو ٹھکانے لگا دیا اور خنجر بھی ساتھ لے گیا۔“

”آپ نے وہ شعر سنا ہے میجر۔ کی میرے قتل کے بعد اس نے جہاں سے توبہ..... قاتل خودکشی کے لیے خنجر ساتھ لے گیا ہوگا۔“

”تم باز نہیں آؤ گے۔“

”کیسے باز رہوں۔ اتنی رومانی داستان دو چاہنے والے ظالم سماج کے ڈر سے چھپ کر ہوتے جاتے ہیں اور پھر مہر جانے کا عہد کرتے ہیں۔ محبوب آنکھیں بند کر کے اپنی انارڈی کو خنجر کی نوک سے ہمکنار کرتا ہے۔ اس کی لاش پر محبت کا گلاب رکھ کر دیوانہ دار باہر نکل جاتا ہے اور پھر کسی دیرانے میں پہنچ کر وہی خنجر اپنے دل میں پیوست کر لیتا ہے۔ بس اس کی لاش تلاش کر لو۔ کیس ملے ہو جائے گا۔“

”شارق یہ نہ بھولو کہ نوشاہہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی تھی۔“ میجر شاہ نے اسے غصے سے گھورا۔

”لیکن میجر۔“ نواز نے ہچکاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”وہ شریف لڑکی نہیں تھی۔ سرسری محادثے کے مطابق وہ کنواری نہیں تھی۔“

”مگر ابی پر چلنے کے لیے کسی کو مجبور کرنے کے دو موثر طریقے ہیں، بلیک میل اور منشیات کا استعمال۔“ میجر شاہ نے کہا۔ ”پوسٹ مارٹم سے یہ تو نہیں ظاہر ہوا کہ وہ منشیات کی عادی تھی۔“ نواز نے اپنی گھڑی دیکھی اور گھڑا ہو گیا۔ ”میں فون کر کے معلوم کرتا ہوں۔ ٹرانسپیر نیوٹن کے معمر کے علاوہ پوسٹ مارٹم کے بارے میں بھی معلوم کرتا ہوں۔ کیونکہ ابھی تک وہ مل نہیں ہوا تھا۔“

وہ فون پر کسی سے بات کرتا رہا۔ ٹرانسپیر نیوٹن کے بارے میں وہ بار بار جھنجھلاہٹ اور غصے میں دیر تک الجھتا رہا۔ اس کے بعد پوسٹ

☆☆

ایک بار پھر وہ ڈرائیونگ روم میں بیٹھے تھے۔ ٹرانسپیر نیوٹن سے تصویر غائب ہو جانے سے انسپکٹر نواز پریشان تھا اور حیران بھی میجر شاہ نے اس سے لاش کی کیفیت زبانی بتلانے کے لیے کہا۔

”لاش بستر پر چت پڑی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے نوشاہہ سو رہی ہے اس کے لیوں پر مسکراہٹ تھی۔ سینے پر عین زخم کے اوپر ایک گلاب کا پھول رکھا ہوا تھا۔ جس کی پتیاں ٹوٹ کر زخم پر بکھر گئی تھیں۔ اس لیے پہلی نظر میں نظر نہیں آتا تھا۔ وار عین دل پر کسی تیز دھار لیکن باریک خنجر سے کیا گیا تھا۔ اس لیے خون برائے نام نکلا تھا اور لاش بالکل عریاں تھی۔“

”یہ شپ کا بند ہے۔“ شارق نے آہستہ سے کہا۔ میجر شاہ نے اسے غصے سے گھورا۔

”یہ گلاب کا پھول کیا ہوٹل کے باغیچے سے لیا گیا تھا۔“ میجر شاہ نے پوچھا۔

”نہیں، اس گھٹیا ہوٹل میں باغیچہ تو کیا گلاب کا پودا تک نہیں ہے۔“ پھر اچانک اسے اس سوال کی اہمیت کا احساس ہوا۔ ”اوہ سر! آپ نے تو بہت بڑا کتہ پکڑ لیا، اتنی رات گئے قاتل وہ پھول لایا کہاں ہے۔“

”کل کسی جنات نے نہیں کیا ہے۔ وہ گلاب کا پھول کل بکاؤلی کے باغ سے لایا ہوگا۔“ شارق نے فوراً کہا۔

”تم خاموش نہیں رہ سکتے۔“ میجر شاہ نے ڈانٹا۔

”رہ سکتا ہوں۔ بشرطیکہ یہ احمق بھی ہمیں الف لیلا کی کہانی نہ سنائے۔“ اس نے انسپکٹر نواز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

اس سے پہلے کہ نواز جواب دیتا میجر بول پڑا۔ ”اچھا ختم کر دیو، نوک جھونک ہاں نواز وہ خنجر ملا جس سے قتل کیا گیا تھا۔“

”جی نہیں، خنجر وغیرہ کچھ نہیں ملا۔“

صدمہ ہے۔ الیاس جب تک اس کا قاتل گرفتار نہیں ہو جاتا۔ مجھے چین نہ آئے گا۔ مجھے اچانک یہ خیال آیا کہ پولیس نوشاہہ پر کچرا اچھالنے کے سوا کچھ نہ کر سکے گی۔ اس لیے میں ایک جگہ گئی تھی۔ ایک ایسے شخص کے پاس جو قاتل کو گرفتار بھی کر سکتا ہے اور نوشاہہ کی بے گناہی بھی ثابت کر سکتا ہے۔

”لیکن پولیس سے بہتر یہ کام اور کون کر سکتا ہے رخسانہ۔“

”میجر شاہ“ لیکن شاید تم اسے نہیں جانتے ہو گے۔“ رخسانہ نے کہا۔ ”جو کام پولیس نہیں کر سکتی وہ کر سکتے ہیں۔“

الیاس بیک کے چہرے پر ایک لمحہ پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے پھر وہ فوراً ہی اس پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ ”مجھے تمہارے دکھ کا احساس ہے۔ ڈارلنگ اس طرح تو نوشاہہ کی اور بدنامی ہوگی۔“

”نہیں الیاس تم میجر شاہ کو نہیں جانتے وہ قاتل کو گرفتار کرانے کے لیے سب حقیقت معلوم کر لیں گے کہ نوشاہہ کو اس ظالم بدرا الدین نے مجبور کیا۔ وہ اپنی مرضی سے ایسی حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ جب تک بدنامی کا یہ داغ اس کے دامن سے دور نہیں ہو جاتا مجھے چین نہیں آئے گا۔“

”تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ اخراجات کہاں سے آئیں گے۔ بزنس کا حال تم جانتی ہو اور میجر شاہ جیسے لوگ لوگوں کو کونٹے ہیں۔ آخر پولیس کس لیے ہے۔“

رخسانہ غور سے اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ ”میں نے ابھی کہا تھا ناں کہ تم شاہ کو نہیں جانتے وہ پشتہ در سر اغرساں نہیں ہیں۔ وہ کوئی معاوضہ نہیں لیتے وہ نوشاہہ کے پیادے کے دوست بھی ہیں اور اگر خرچے کی بات ہوئی بھی تو میں تمہاری کمائی سے خرچہ ادا نہ کرتی۔ بیشک نوشاہہ کی موت کے بعد وصیت کے مطابق اس کی کروڑوں کی دولت میں

مارٹم رپورٹ کے بارے میں پوچھا۔ چند لمحے بعد جب میجر کی طرف مڑا تو چہرہ فق تھا۔

”وہ ٹرانسپیرینس کے لیے تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ کہیں غلطی سے ڈیو بدل نہیں گیا۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن پروفیسر..... پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بارے میں میں کچھ نہیں بتلا سکوں گا۔“

”کیوں ابھی تک پوسٹ مارٹم مکمل نہیں ہوا۔“

”نہیں..... نہ مکمل ہوا اور نہ ہو سکے گا۔“

”کیوں میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکا۔“

میجر نے حیران ہو کر پوچھا۔

”اس لیے کہ..... نوشاہہ کی لاش اچانک پانی کی طرح بہہ گئی۔ اس کی ہڈیاں بھی باقی نہ رہیں۔“

”کیا۔“ شارق حیرت سے اچھل پڑا۔

”جس طرح ٹرانسپیرینس سے تصویروں غائب ہو گئیں اسی طرح اس کا جسم بھی باقی نہیں رہا۔ میجر آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔“ نواز نے بے بسی کے عالم میں پوچھا۔

میجر شاہ خاموش تھا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

☆ ☆ ☆

رخسانہ جیسے ہی ڈرائینگ روم میں داخل ہوئی۔ الیاس بیک اٹھ کھڑا ہوا۔ ”رخسانہ تم کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ میں نے سب جگہ فون کر لیا بس پولیس اسٹیشن باقی رہ گیا تھا۔“ اس نے غصے میں کہا۔

”مجھے افسوس ہے الیاس صاحب۔“ رخسانہ نے آہستہ سے کہا۔ ”لیکن اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔“

الیاس بیک نے آہستہ سے کہا۔ ”لیکن تم کہاں چلی گئیں تھیں۔ ڈارلنگ۔“

رخسانہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”تم جانتے ہو کہ نوشاہہ کی موت کا مجھے کتنا

تھیں۔

”تم رقم لے آئے ہو۔“ بدر نے الیاس بیک سے پوچھا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔

”رہم..... تم نے سارا بیڑہ غرق کر دیا۔ پھر بھی رقم کی بات کر رہے ہو۔“ الیاس نے غصے سے کہا۔

”اس میں میرا کیا قصور ہے۔“ بدر کا چہرہ اچانک خطرناک ہو گیا تھا۔ ”میں نے تم کو ابھی بتا دیا ہے کہ نوشاہہ کے قتل سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اسے زندہ چھوڑ کر آیا تھا، اسے شراب میں خواب آور دوا بھی پلا دی تھی۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس کے کپڑے بھی ساتھ لے آیا تھا تا کہ صبح کو جب پولیس ہوئل پہنچے تو اسے شرمناک حالت میں پائے۔ تمام اخبارات میں اس کا چرچا ہو۔ وہ منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ تم یہ ہی تو چاہتے تھے۔“

”لیکن قتل کا الزام تم پر لگ چکا تھا۔ پولیس تم کو قاتل قرار دے رہی ہے۔“

”یہ جھوٹ ہے تم جانتے ہو یہ جھوٹ ہے۔“ بدر نے جلدی سے کہا۔ ”میں اسے کیوں ہلاک کرتا۔“

”لیکن یہ تم کہہ رہے ہو..... کون اس پر یقین کرے گا۔ قتل کی وجہ سے سب کام بڑ گیا اس کی ماں نے عہد کر لیا ہے کہ نوشاہہ کی ساری دولت یتیم خانے کو دے دی گئی۔ مجھے کیا ملا جو تم کو معاوضہ دوں۔“ الیاس بیک غصے میں سب کچھ بول گیا۔ پھر گھبرا کر بولا۔ ”میرا مطلب ہے۔“

”میں تمہارا مطلب پہلے ہی سمجھ رہا تھا۔ الیاس بیک کوئی سویتلا باپ ایسی حرکت بلا لاچ کے نہیں کرتا۔“

”تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو۔ میں پولیس کو۔“

”رہنے دو الیاس صاحب! میں گرفتار ہوا تو تم بھی نہیں بچو گے۔ رقم میرے حوالے کر دو اور جا

دارت ہوں لیکن الیاس میں نوشاہہ کے نام سے بدنامی کا داغ دھونے کے لیے یہ ساری دولت خرچ کر دوں گی۔ ویسے بھی اس دولت کی ایک پائی بھی مجھ پر حرام ہے۔ میں یہ ساری دولت کسی ٹرسٹ یا یتیم خانے کو دے دوں گی۔ تاکہ میری بچی کا نام ہمیشہ عزت سے لیا جائے۔ سمجھے۔“

رخسانہ اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ الیاس کا چہرہ غصے سے سیاہ پڑ گیا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ رخسانہ ٹھیک ہے۔ تم ذہنی طور پر ابھی بہت پریشان ہو۔ جاؤ آرام کرو۔“

رخسانہ کو بیدار دم تک پہنچا کر وہ ایک کام کے بہانے باہر نکل گیا۔

ٹھیک ساڑھے نو بجے الیاس بیک وعدے کے مطابق ایک ویران ہوئل میں بیٹھا تھا اور اس کے سامنے جو شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا حلیہ نوشاہہ کے قاتل بدر سے بہت ملتا جلتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کے سیاہ بال اب نیم سفید نظر آ رہے تھے۔ لباس بھی معمولی اور ملگجھا تھا اور چہرے پر جھریاں نمایاں تھیں اور وہ بہت خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ درحقیقت یہ وہی شخص تھا۔ جو نوشاہہ کو ہوئل میں لے کر گیا تھا۔ جس نے اپنا فرضی نام پاشا بتایا تھا۔ اور جس کی پولیس کو تلاش تھی اور جس کا اصلی نام بدر الدین تھا۔ پولیس نے لوگوں کی انفارمیشن کے مطابق اس کی جو شناختی تصویر بنا کر اخبارات کو جاری کی تھی۔ وہ اس سے بہت ملتی جلتی تھی۔

بدر خوب صورت لباس اور امیرانہ ٹھٹھاٹ باٹ کے ذریعے خوب صورت لڑکیوں کو پھنسا کر گناہ کی راہ بر لگانے کا بڑا ماہر تھا۔ اسے اپنے فن پر اتنا عبور حاصل تھا کہ ان گنت لڑکیوں کو پھنسا کر گناہ کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھیں۔ ان کو بلیک میل کر کے وہ آرام دہ زندگی بسر کرتا رہا تھا اور اس لیے الیاس بیک نے اس کی خدمات حاصل کی

رجسٹر رکھا ہوا تھا۔ شاید وہ بوتیک کی منیجر تھی۔ شارق کو دیکھ کر وہ مسکرائی تو شارق اس کی سمت بڑھ گیا۔ ”جی فرمائیے۔“ لڑکی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”شاید آپ کو اپنی مزے کے لیے کوئی تحفہ چاہیے۔“

شارق نے اسے غور سے دیکھا۔ لباس سے وہ کچھ معلوم ہوتی تھی۔ خدو خال بنگالیوں جیسے تھے۔ بڑی جاذب نظر اور اسٹارٹ لگ رہی تھی۔ ”کیا میں شکل سے شادی شدہ لگتا ہوں۔“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

لڑکی نے چونک کر اسے دیکھا پھر شوخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”دو بچوں کے باپ بھی۔“

”آپ شاید اپنے شوہر سے میرا موازنہ کر رہی ہیں۔“

”جی..... جی نہیں۔ ابھی میں نے یہ مصیبت نہیں پالی۔“ لڑکی نے فوراً کہا۔ ”آپ فرمائیے کیا چاہیے۔“

”جی..... فی الحال تو صرف آپ کی ضرورت ہے۔“

لڑکی کے ماتھے پر ہل آگیا۔ ”مسٹر آپ غلط جگہ آ گئے ہیں۔“ اس نے غصے سے کہا۔

”کیا یہ بوتیک نوشاہہ کا نہیں ہے۔“ شارق نے کہا۔

لڑکی چونک پڑی۔ اس نے شارق کو غور سے دیکھا۔ ”شکل سے پولیس والے تو آپ لگتے نہیں۔ شاید پولیس سے تعلق ہوگا۔“

”دونوں اندازے غلط ہیں۔“

”پھر آپ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔“ لڑکی کی آنکھوں سے ہلکا سا خوف جھلکنے لگا۔ ”میں نوشاہہ کے بارے میں باتیں کرنا چاہتا ہوں لیکن تنہائی میں۔“ شارق نے کہا۔ ”آپ گھبراہٹ نہیں آدی شریف ہوں۔“

لڑکی بے ساختہ مسکرا دی۔ ”یہ بھی اندازہ ہو

کر خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔ ورنہ.....“

الیاس جانتا تھا کہ بدرالدین کی دھمکی وزن رکھتی ہے۔ اس نے خاموشی سے رقم اس کے حوالے کر دی اور خوشخوار نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ”تم بہت کینے ہو بدرالدین اب مجھے بھی اپنی شکل نہ دکھانا۔ ورنہ خواہ انجام کچھ بھی ہو۔ میں پولیس کو مطلع کر دوں گا۔“ وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

بدر نے رقم جیب میں رکھی وہ جلد از جلد اس شہر سے بہت دور نکل جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اگر پکڑا گیا تو قتل کے الزام سے بچنا مشکل تھا۔ یہ اور بات تھی کہ قتل واقعی اس نے نہیں کیا تھا۔ ہوٹل سے نکل کر وہ ایک تنگ و تاریک گلی میں تیز تیز قدم رکھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ہوٹل سے نکل کر وہ ایک تنگ و تاریک گلی میں تیز تیز قدم رکھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ سر پر کوئی پہاڑ آگرا ہو۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ اس شخص کے بازوؤں میں جھول گیا۔ جس نے عقب سے اس کے سر پر وار کیا تھا۔ اس شخص نے اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی کار کی قطعی سیٹ پر ڈال دیا۔

کار رات کی تاریکی میں گلی سے نکل کر غائب ہو گئی۔

☆☆

شارق نے ایک بوتیک سنٹر کے سامنے رک کر جائزہ لیا خاصی بڑی اور دیدہ زیب دوکان تھی۔ شیشے کی بڑی بڑی شو ونڈوز میں لیڈیز کے جدید فیشن کےلبوسات اور میک اپ کا سامان سجا ہوا تھا۔ چند لمحے انتظار کر کے وہ اندر داخل ہوا۔ کاؤنٹر پر تین عورتیں خریداری میں مصروف تھیں۔ ایک دہلی پتلی سی سیلر گرل نے انہیں سامان دکھانے میں مصروف تھی۔ کونے میں ایک گداڑ بدن کی خوب صورت سی لڑکی کھڑی اسے عجیب سی نظروں سے گھور رہی تھی۔ اس کے سامنے کاؤنٹر پر ایک

”اس کے دوسرے دوستوں کے بارے میں تو جانتی ہوگی۔“

”ہاں وہ بہت آزاد خیال اور خوش مزاج تھی لیکن ایسی نہیں جیسا کہ پولیس کا خیال ہے۔“

”دیکھو کیتھرین میرا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔ تم مجھے ایک دوست سمجھ کر بات کرو۔ جو نوشاہہ کے متعلق کوئی ایسی بات جو اس کی ذات اس کی مصروفیات حلقہ احباب پر روشنی ڈال سکے۔ اس کے قتل کا معمہ حل کرنے میں بڑی مدد دے سکتی ہے۔ تم میں اور نوشاہہ کی ماں سب یہی چاہتے ہیں کہ اس کا قاتل پکڑا جائے۔“

کیتھرین اسے چند لمحے گھورتی رہی پھر مسکرا کر بولی۔ ”وہ زندہ ہوئی تو تم کو بہت پسند کرنی۔“

”چلو یہ سبھی سمجھ کر تم اعتماد کر لو۔ ویسے عموماً لڑکیاں مجھے پسند کرتی ہیں۔“

کیتھرین چند لمحے غور کرتی رہی پھر سوچتے ہوئے بولی۔ ”نوشاہہ نے مجھ سے بھی کوئی بات راز نہیں رکھی لیکن کل جب میں اس کی دراز صاف کر رہی تھی تو وہ تصویر اچانک مل گئی اس نے مجھے نہیں بتلایا تھا کہ وہ کب اور کہاں اتروانی اور بڑی احتیاط سے چھپا کر رکھا گیا تھا۔ اسی لیے میں نے پولیس کو اس کے بارے میں نہیں بتایا۔“

”کون سی تصویر؟“ شارق نے چونک کر بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

کیتھرین اس کے چہرے کو گھورتی رہی۔

”میرا خیال ہے تم براہ اعتماد نہ رہی لوں۔“ اس نے دراز کھول کر ایک ڈشٹری نکالی۔ اس کے اندر سے ایک چھوٹی سی تصویر نکالی ایک لمحہ سوچتی رہی پھر تصویر شارق کو دے دی۔ ”لو یہ رہی وہ تصویر۔“

شارق نے تصویر کیتھرین کے ہاتھ سے لی لیکن اس پر نظر ڈالتے ہی اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”مائی گاڈ خدا بچائے تم لڑکیوں سے۔“

جائے گا آپ انڈر آفس میں آ جائیے۔“

دفتر کا گرہ چھوٹا سا لیکن بڑا دیدہ زیب اور سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ کونے میں میز تھی جس پر لمبوسات کے بہت سے ڈیزائن رکھے ہوئے تھے۔ لڑکی نے اسے ہنسنے کا اشارہ کیا اور میز کے گردن رکھی ہوئی ریڈیو لنگ چیئر پر سمٹتے ہوئے بولی۔

”مجھے کیتھرین کہتے ہیں نوشاہہ کی سہیلی بھی ہوں اور پارٹنر بھی۔“

شارق نے اپنی جب سے کارڈ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ”میں نوشاہہ کی موت کے سلسلے میں حقائق جاننا چاہتا ہوں۔ آپ یقیناً کچھ روشنی ڈال سکتی ہیں۔“

کیتھرین کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”اس کی اچانک موت سے ہم حیران رہ گئے ہیں وہ میری دوست بھی تھی اور پارٹنر بھی ہم دونوں بہنوں کی طرح ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے لیکن لیکن پہلی مرتبہ مجھے اعتماد میں لیے بغیر میرا مطلب ہے۔ اس نے مجھے اس شخص کے بارے میں نہیں بتایا جو اسے رات کو ساتھ لے کر گیا تھا اور جس نے اسے بے دردی سے قتل کر دیا۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔

شارق نے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

”مجھے افسوس ہے کیتھرین لیکن میں بھی نوشاہہ کے قاتل کو بے نقاب کرنا چاہتا ہوں امید ہے۔ تم میری مدد کرو گی۔“

”میں کیا مدد کر سکتی ہوں جو کچھ معلوم تھا سب کچھ پولیس کو بتا چکی ہوں۔“

”بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو پولیس کو بھی نہیں بتلائی جاسکتیں۔ وہ باتیں جو راز کی باتیں ہوتی ہیں جو صرف سہیلیوں کے درمیان راز ہوتی ہیں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اس شخص کے بارے میں بالکل نہیں جانتی جس کی پولیس کو تلاش ہے۔“

کے سینے سے یہ نقش مٹا دیا تھا۔ قاتل نہیں چاہتا تھا کہ کوئی یہ نقش دیکھ سکے لیکن کیوں۔“

”کیا میں یہ تصویر رکھ سکتا ہوں۔“ شارق نے اچانک پوچھا۔

”ہاں بشرطیکہ تم اسے راز رکھو۔“ کیتھرین نے جواب دیا۔

کیتھرین سے تصویر لے کر وہ سیدھا گھر پہنچا اور میجر شاہ کو تمام تفصیلات بتلائیں۔ وہ اسے ساتھ لیتے ہوئے سیدھے اپنی لیبارٹری میں پہنچے اور اسے اپنی ڈیسکوپ میں لگا کر جو ہر چیز کو کٹی گنا بڑا کر کے دکھانے کا آلہ تیار کر دیا۔ سوچ آن کر دیا۔ اسکرین پر نوشاہہ کی قد آدم سے بھی دو گنا بڑی تصویر نمایاں ہو گئی فوکس درست کرنے کے بعد شاہ نے غور سے تصویر کو دیکھنا شروع کیا۔

”بڑا ظالم شخص تھا۔ جس نے نوشاہہ کو قتل کر دیا۔“ شارق نے غصہ سی سانس لے کر کہا۔

”مگر اتنے ہوئے بولا۔“ میجر شاہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”بلاشبہ یہ تصویر جسم پر گودی گئی تھی۔ تصویر کے ساتھ یہ نم انجان زبان کے حروف دیکھ رہے ہو۔ یہ قدیم مصری زبان کے ہیں اور تصویر کے نقوش پہچان رہے ہو۔ تم نے بہت ہی اہم سراغ حاصل کر لیا ہے۔ شارق لیکن اس سے مسئلہ اور بھی پراسرار ہو گیا ہے۔“

”مسئلے سے زیادہ آپ کی باتیں پراسرار ہو گئی ہیں۔“ شارق نے کہا۔

”یہ تمہاری جہالت کا ثبوت ہے۔ بر خوردار پندرہویں صدی کے مصر اور اٹھارہویں صدی کے فرانس میں شاعی غلوں میں یہ لباس عام تھے۔ قدیم مصر میں تو یہ رواج بہت پہلے سے عام تھا۔ یہ جو تصویر کے گرد بیضوی دائرہ نظر آ رہا ہے۔ اسے کارٹوش کہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی ہیر و غلائی کہلاتی ہے۔ جس میں حکمران کے نام اور عہد تحریر ہوتا ہے۔ اس مخصوص کارٹوش کی زبان دائیں سے

تصویر۔“ اس نے کیتھرین کی سمت دیکھا۔ ”کیا تم نے اتاری تھی۔“

کیتھرین کا چہرہ شرم سے گلزار ہو گیا۔ ”نہیں مجھے تو اس کا علم بھی نہیں تھا اور نوشاہہ نے بھی اسے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔“

”لیکن اگر کسی نے یہ تصویر اتار دی تھی تو نوشاہہ نے اسے دی کیوں نہیں۔“

”میں بھی یہ ہی سوچتی رہی ہوں۔ میرا خیال ہے ایسے اور پرنٹ بھی رہے ہوں گے جو اس نے

چھپنے والے کو دے دیے ہوں گے۔ یہ پرنٹ ذرا خراب ہو گیا تھا۔ اس لیے نہیں دیا ہوگا۔“

”کیا خرابی ہے اس میں۔“ شارق نے سوال کیا۔

”ذرا غور کرو سینے پر ایک دھبہ نہیں آ گیا ہے۔“

شارق نے میز پر رکھا ہوا محب شیشہ اٹھا کر تصویر کو غور سے دیکھنا شروع کیا تصویر پر نظر آنے والا دھبہ کچھ واضح ہو گیا۔ شارق نے غور کیا تو وہ

دھبہ نہیں تھا۔ لکیروں سے بنائی گئی ایک تصویر تھی۔

سیاہی یا پھر گودنے سے ایک تصویر بنی نظر آ رہی تھی۔ نقوش واضح نہیں تھے لیکن تھی وہ بہر حال

ایک تصویر جسے شاید جسم پر گدوایا گیا تھا لیکن وہ اتنی مبہم تھی کہ کچھ کہنا دشوار تھا۔ اس نے کیتھرین کی

سمت دیکھا۔ ”کیتھرین تم نوشاہہ کی راز دان دوست تھیں۔ کیا اس کو اس قسم کے مشاغل کا شوق

تھا۔“

”نہیں۔“ کیتھرین نے فوراً کہا۔ ”اسی لیے تو مجھے اس تصویر کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔“

شارق چند لمحوں سوچتا رہا اب نوشاہہ کی لاش بھی باقی نہیں تھی جو دیکھا جاسکے۔ اسے حیرت تھی

کہ انسپکٹر نواز نے اس نشان کا ذکر کیوں نہیں کیا پھر اچانک اسے نواز کا ایک جملہ یاد آ گیا۔ ایسا لگتا تھا

جیسے اس کے سینے پر کسی نے کھر دینے لگائے ہوں گوشت جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا۔ کسی نے نوشاہہ

قاتل کا نہیں نوشاہہ کے سوتیلے باپ کا تعلق اسٹاک ایجنٹ سے ہے۔ میں الیاس بیک کے بارے میں معلومات حاصل کرنے گیا تھا۔“

”لیکن کیوں۔“

”اس لیے کہ نوشاہہ کی موت سے جس کسی کو بھی مالی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ آیا تمہاری کھوپڑی میں۔“

میجر شاہ نے جھنجھلا کر کہا۔

”تھوڑا تھوڑا..... لیکن جناب مسز بیک نے رات صاف صاف کہہ دیا تھا کہ نوشاہہ کے ورثے کی ایک پائی بھی وہ خرچ نہیں کرے گی۔ سب فلاحی کاموں کے لیے وقف کر دے گی۔ پھر الیاس بیک اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔“

”تمہیں یہ کیسے معلوم کہ مسز بیک نے یہ بات اپنے شوہر کو بھی بتلا دی تھی۔ ممکن ہے وہ یہی سمجھ رہا ہو کہ یہ ساری دولت مسز بیک کے ذریعے اس کی دسترس میں آ جائے گی۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ پھر آپ کو کیا معلوم ہوا۔“

”الیاس بیک کو فوری طور پر بھاری رقم کی ضرورت ہے۔“ میجر شاہ نے بتلایا۔ ”وہ بری طرح مفرود ہے اور دیوالیہ ہونے کی حد کو پہنچ چکا ہے اور تباہی سے بچنے کے لیے اسے فوری طور پر رقم درکار ہے۔“

”اور اس لیے اپنی سوتیلی بیٹی کو قتل کر کے اس کی دولت تھپکانا چاہتا تھا۔ گڈ ویری گڈ معاوضہ حاصل ہو گیا۔“

”ابھی نہیں ابھی تو محض ایک مفرودہ ہے۔“ میجر شاہ نے کہا۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ انسپکٹر نواز کو بتا دیجئے وہ بار بار کر الیاس بیک سے اقرار جبر کرالے گا۔ قتل خواہ کسی نے کیا ہو۔“

”ہمیں اس سے عرض نہیں کہ پولیس کیا کر رہی ہے۔“ میجر شاہ نے کہا۔ ”قاتل کی تلاش کے ہمیں

بائیں جانب بڑھی جائے گی اور اس دائرے میں بنی ہوئی ملکہ کی تصویر کے نقوش بھی اگر تم نہیں پہچان سکتے تو یقیناً تمہاری کھوپڑی بھیجے سے خالی ہے۔“

”قلو پٹرو۔“ شارق نے اچھل کر کہا۔

”شاہباش تم تو واقعی تھوڑی سی عقل بھی رکھتے ہو۔“ میجر شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور پرو جیکٹر کا سوئچ آف کر دیا۔ ”اب سوال یہ ہے کہ یہ نشان نوشاہہ کے سینے پر کیوں گودا گیا اور قاتل نے اس کو مٹانے کی کوشش کیوں کی۔“

”آپ جانتے ہیں کہ میں سوالات کے جواب کے معاملے میں بچپن ہی سے کمزور ہوں۔“

شارق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”چند باتیں قابل غور ہیں۔“ میجر شاہ نے شارق کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ بات اب تصدیق ہو چکی ہے کہ نواز جو ٹرانسپورٹ لایا تھا وہ اصلی تھیں اور ان پر سے نوشاہہ کی لاش کی تصویر پر اسرار طور پر مٹ گئی تھی۔ اس کے بعد نوشاہہ کی لاش پوسٹ مارٹم کی میز پر اس طرح پھیل گئی جیسے وہ گوشت پوست کی نہیں برف کی رہی ہو۔ قاتل نے اس کے سینے سے یہ نشان اپنی دانست میں بٹھا دیا تھا۔ یہ ساری باتیں عقل سے بالاتر ہیں اور اب تک ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے ہیں۔“

”خوب تو آپ لوگ میری کم عقلی کا ڈھنڈورا بلا سبب پہنچتے ہیں۔“ شارق نے کہا۔

”اسی دوران آپ نے کچھ بھی معلوم نہیں کیا۔“

”نواز سے فون پر بات کرنے کے بعد میں اسٹاک ایکس چھینچ چلا گیا تھا۔ وہاں میرا ایک دوست فیروز ہے۔ اس سے چند باتیں ضرور معلوم ہوئی ہیں۔“

”لیکن آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ قاتل کا تعلق اسٹاک ایجنٹ سے تھا۔“

”احق ہونم..... میں نے یہ کب کہا ہے۔“

یہاں کیسے پہنچا اور اسے کیوں یہاں قید کیا گیا تھا اور وہ کون لوگ تھے۔ جو اسے پکڑ کر یہاں لے آئے تھے۔ وہ جس کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ اس کا فرش اور دیواریں اتنی چٹنی اور صاف ستھری تھیں کہ تاریکی میں بھی چمک رہی تھیں۔ بناوٹ میں بھی عجیب تھی۔ کم از کم جدید دور میں شہر کے اندر ایسی بناوٹ اسی نے بھی نہ دیکھی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ قدیم دور کے کسی مندر میں آ گیا ہے۔

دیواروں پر رسمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ جن پر عجیب و غریب نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ اس کے بالکل سامنے والے پردے پر ایک خوفناک درندے کی تصویر تھی۔ جس کا سر انسانوں جیسا تھا۔ ایک جانب بلند اسٹینڈ پر ایک بڑی بلی کا مجسمہ رکھا ہوا جس کے نیچے انگریزی کے رومن حرف میں "ٹائیگر" لکھا ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ اس بلی کا نام ہوگا لیکن اس سے بمشکل دو گزر دور بیٹھی ہوئی بلی کو مجسمہ نہ تھی۔ وہ ٹھٹھکی گدے پر کسی مجسمے کی طرح بیٹھی ہوئی اسے گھور رہی تھی لیکن اس کی آنکھیں حرکت کر رہی تھیں۔ کمرے میں اسی بلی کے علاوہ کوئی جاندار چیز نہیں تھی۔

بدر کا خیال بار بار الیاس بیک کی طرف جاتا لیکن پھر خیال آتا کہ اگر اس نے رقم واپس لینے کے لیے یہ حرکت کی ہوئی تو یہاں قید کیوں کرتا۔ اسے بار بار احساس ہو رہا تھا کہ اسے اس مکار آدمی کا آلہ کار نہیں بننا چاہیے تھا۔ اس نے دولت کی خاطر اپنی سوتیلی بیٹی کو بدنام کرنے کی سازش کی ممکن ہے کہ اس کے آنے کے بعد نوشاہی کو الیاس بیک نے ہی قتل کر دیا ہو۔ کچھ بھی ہو لیکن پولیس کی نظروں میں تو قاتل وہ تھا اور وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ اسی لمحے ہلکی سی آواز ہوئی اور وہ چونک پڑا کسی نے ہلکے سے پردہ کھینچا تھا۔ اس نے نظریں اٹھائیں تو حیرت زدہ رہ گیا۔

اندر سے آنے والی روشنی میں اسے وہ

نوشاہی کے دامن سے بدنامی کا داغ بھی دھونا ہے۔

”اب یہ کیسے ممکن ہے۔ یہ تصویر اور پوسٹ کارڈ دونوں سے ظاہر ہے کہ نوشاہی پاکباز تو نہیں تھی۔“

”لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اسے مرضی کے خلاف اس راہ پر چلنے کے لیے مجبور کیا گیا تھا۔ تو اس کی بیگناہی ثابت ہو سکتی ہے۔“

”میجر..... یہ ثابت کرنے کے لیے ہمیں پہلے پاشا کو تلاش کرنا پڑے گا اور یہ کام آسان نہ ہوگا۔“

”آسان ہوتا تو تمہارے سپرد کیوں کیا جاتا۔“ میجر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”حلیہ اور شناختی تصویر تمہارے پاس موجود ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایسی جگہوں پر ضرور آتا جاتا رہا ہوگا جہاں نوشاہی جیسی آزاد خیال اور خوب صورت لڑکیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ تمہارے لیے ہم دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ پاشا اور الیاس بیک میں کوئی رابطہ تھا تو معاملہ آسان ہو جائے گا۔“

☆☆

تقریباً چوبیس گھنٹوں کے درمیان بدر الدین کی آنکھ تیسری مرتبہ کھلی تھی۔ ہر مرتبہ اس نے خود کو اسی چمکنے والے فرش پر پڑا ہوا پایا۔ جس عجیب طرز کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور ہر مرتبہ اس نے ایک بلی کو گھورتے ہوئے پایا۔ جو اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ نیم تاریک میں بلی کی انگارے کی طرح چمکتی آنکھیں اسے مسلسل گھورتی رہتی تھیں۔ خوف سے اس کے جسم پر پھریری سی آگئی۔

اس کے ہاتھ پیر اسی میں بندھے ہونے کی وجہ سے اڑ گئے تھے۔ گردن دکھ رہی تھی اور جسم بے حس محسوس ہو رہا تھا۔ سر پر لگنے والی ضرب سے ٹیسس سی اٹھ رہی تھیں۔ اسے کچھ یاد نہ تھا کہ وہ

بالکل آنکھ کی طرح تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی سرخ دہکتی ہوئی آنکھ اسے گھور رہی ہو اور اس کے دماغ میں پیوست ہوتی جا رہی ہو۔ ”یہ..... یہ تم کیا کر رہے ہو۔“ بدر نے گھبرا کر کہا۔ ”آخر تم کیا چاہتے ہو۔“

”خاموش رہو..... بدر الدین۔“ ایک نرم اور ملائم آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ ”تمہاری ساری مصیبتیں دور ہونے والی ہیں لیکن پہلے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم کتنا جان چکے ہو۔ اس نادان لڑکی نے جواب دینا میں نہیں ہے تم کس حد تک بتلایا ہے۔ اور میرے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت بالکل نہیں ہے۔ اس لیے جھوٹ اور سچ کی تمیز کرنے میں اپنی صلاحیت برباد نہیں کرنا چاہتا۔“

”سچ اور جھوٹ۔“ بدر نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ”میں کچھ نہیں جانتا مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس نے یقین دلایا۔ نوحشاہ نے مجھے کچھ نہیں بتلایا کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔“

”انگوٹھی کو غور سے دیکھو بدر الدین، غور سے دیکھو، ذہن پر زور دو جسم کو ڈھیلا چھوڑ دو۔“ میٹھی اور نرم آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں انگوٹھی کے ٹکینے سے چپک کر رہ گئیں تھیں۔ وہ گہرائیوں میں ڈوبا چلا جا رہا تھا۔ ”اب اپنی آنکھیں بند کرلو۔ بدر تم سو رہے ہو۔ تم سو رہے ہو تم کو نیند آرہی ہے۔ گہری۔“ میٹھی اور آرام دہ نیند۔ ”بدر کا جسم ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ وہ سو رہا تھا۔“

”اب یہ قابو میں ہے۔ اسے پوچا کے کمرے میں لے آؤ۔“ دراز قد والے عبا پوں نے کہا۔

وہ ایک بلند چھت والا کشادہ کمرہ تھا۔ چھت میں پوشیدہ جگہوں سے رنگ برنگی روشنیاں اس طرح نیچے آرہی تھیں جیسے دھوپ چھاؤں ہو رہی ہو۔ دیواروں میں پوشیدہ میٹروں نے کمرے کے

دونوں خوفناک افراد نظر آئے۔ ایک تو دیوتا مت شخص تھا۔ جس کے جسم پر صرف ایک سفید لنگوٹی بندھی ہوئی تھی۔ جسم پر کسی چکنے تیل کی مالش کی ہوئی تھی جس سے وہ چمک رہا تھا۔ پیر چٹکے تھے۔ وہ اتنا جہیم اور توانا تھا کہ بازوؤں کے پٹھوں کی مچھلیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس کے برابر کھڑے ہوئے شخص کے جسم پر سلک کی سفید رنگ کی عبا تھی۔ جس کی لائی آستنیوں سے اس کے ہاتھ باہر نکلے ہوئے تھے۔ عبا پر دل کے مقام پر سنہری رنگ سے ایک تصویر گزری ہوئی تھی اس کا چہرہ لاٹا اور سفید ہو رہا تھا۔ آنکھیں ملی کی طرح چمک رہی تھیں اور ماتھے پر ایک سیاہ چمکا باندا ہوا تھا۔ خوف کی ایک سرد لہر بدر الدین کے جسم میں دوڑ گئی۔

اس شخص نے بدر کے بجائے ملی کو مخاطب کیا اور اس کے قریب جا کر آہستہ سے بولا۔ ”شکریہ ٹائیگر۔“ ملی نے آخری بار بدر کی طرف دیکھا اور پھر شاہانہ انداز میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کے بعد وہ شخص بدر الدین کی طرف مڑا، قدیم مصر میں بلیوں کو دیوتاؤں کا اوتار تصور کیا جاتا تھا۔ خصوصاً بوباستی کی دیوی باست کا جب وہ مر جاتی تھی تو اس کی لاش کو حوط کر کے بوباستی کے شہر مقبرے کے اندر محفوظ کر دیا جاتا تھا۔ ”تم اس کے مستحق تو نہ تھے کہ اتنی متبرک محافظ تمہاری نگرانی کے لیے مقرر کی جانی بدر الدین لیکن اتفاق سے تم ہمارے لیے بڑے اہم بن گئے ہو۔“ اس کے اشارے پر قوی الجسد شخص نے کرسی

بدر کے سامنے رکھ دی۔ وہ شخص کرسی پر بیٹھ گیا۔ اپنی تھوڑی کلائی کے سہارے رکھ کر بدر الدین کی جانب جھکا اور غور سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا بدر کا حلق خوف سے خشک ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ عبا پہنے ہوئے شخص کی دائیں ہاتھ کی ایک انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی۔ جس میں سرخ رنگ کا بڑا سایا قوت لگا ہوا تھا۔ اس یا قوت کی شکل

دار کھڑکی سے اچانک تیز روشنی نے چہوتے کی ہر چیز کو نمایاں کر دیا۔ اور پھر اچانک عبا پوش بچاری نے اچانک اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور انجانی زبان میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کے گلے میں ایک ننھا سامانیکر و فون پوشیدہ تھا۔ جس کے ذریعے دیواروں میں گئے ہوئے خفیہ لاؤڈ اسپیکر سے اس کی آواز گونج رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے آہستہ آہستہ مدھم آواز میں کہنا شروع کر دیا۔

”بدی کے دیوتا کے بچاریو! تم جانتے ہو ہماری ایک بچارن جسے ہم نے قلوپٹرہ کے نام سے موسوم کیا تھا۔ گمراہی کی راہ پر چل نکلی تھی۔ اس نے دیوتا سے کیا جو عہد توڑ دیا تھا اور میں نے سب کے سامنے یہ اعلان کیا تھا کہ اس پر دیوتا کا قہر نازل ہو گا تم جانتے ہو اسے سزا مل گئی اور اب وہ دنیا میں نہیں ہے۔ اس کی لاش کا بھی نام و نشان نہیں ہے۔ اس کی سسکتی ہوئی روح تمام عہد عذاب کا شکار رہے گی۔“

بچاریوں کو خوف سے پھریری آ گئی۔ عبا پوش بچاری نے پھر کہنا شروع کر دیا۔

”تمہارے سامنے قربان گاہ میں بے حس پڑا ہوا شخص قلوپٹرہ کا شریک جرم ہے۔ اب میں تم سب کے سامنے اس شخص کی زبان سے قلوپٹرہ کی گمراہی کا ثبوت فراہم کروں گا۔ بدرالدین تم میری آواز سن رہے ہو۔“ بدرالدین کے لبوں کو حرکت ہوئی۔ ”ہاں۔“

”تب پھر تم میری ہر بات کا سچا سچ جواب دو گے۔ تم جس لڑکی کو نو شاہ کے نام سے جانتے ہو اس نے بچاریوں کے بارے میں تمہیں کچھ بتلایا تھا۔“

چند لمبے کے وقفے کے بعد بدرالدین نے کہا۔ ”بچاری نہیں کچھ نہیں کہا۔“

”کیا اس نے کسی خوف اور اندیشے کا ذکر کیا تھا۔“

”نہیں، لیکن کبھی کبھی وہ مجھے انجانے خوف

درجہ حرارت کو مہر کے ریگزاروں کے برابر کر دیا تھا۔ کمرے میں بچاریوں کا مجمع اس حرارت میں لذت محسوس کر رہا تھا۔ سامنے بنے ہوئے بلند چہوتے پر جو کمرے کے ایک کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک نہایت خوب صورت اور نقشیں تخت رکھا ہوا تھا۔ جس کے نقش رنگار پر سرخ اور سیاہ ملمع پڑھا ہوا تھا۔ بیٹوں کا رنگ سنہرا تھا۔ تخت کے بالکل سامنے قربان گاہ تھی جو ایک لائبریری کی سل رکھ کر بنائی گئی تھی اور اس کے ایک کونے میں دائرہ نما گڑھا سا بنا ہوا تھا۔ جس میں انسانی سر پر آسانی آ سکتا تھا۔ اس کے دونوں جانب نالی نما سوراخ بنے ہوئے تھے کمرے کے مخالف سمت کا پورا حصہ ایک دبیز پردے نے چھپا رکھا تھا۔ وہاں موجود بچاریوں میں سے کوئی بھی ادھر نہیں دیکھ رہا تھا۔

کمرے میں موجود افراد جن کی تعداد بیس کے قریب تھی اضطراب کے عالم میں پہلو بدل رہے تھے۔ ان میں چند کھڑے تھے اور باقی قدیم مصری طرز کی پیچی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ سب کی بے چین نگاہیں اس دروازے پر مرکوز تھیں۔ جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ تخت کے پیچھے پھر کا ایک بڑا پردہ پڑا ہوا تھا۔ جس پر ایک بھیا نک شکل والا پردہ بنا ہوا تھا۔ اسکا سر انسان نما تھا۔ اس پر دو سینگ بھی نکلے ہوئے تھے۔ چہرہ اتنا بھیا نک تھا کہ دیکھ کر دھنکے کھڑے ہو جائیں۔ مصری علوم کا ماہر فوراً پہچان لیتا کہ یہ بدی کے قدیم دیوتا کی شکل تھی۔ قربان گاہ کے آخر میں ایک شمع دان تھا۔ جس میں مصری عود سلگ رہی تھی۔ اس کی بھینی خوشبو دھوئیں کے ساتھ تمام کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

اور پھر اچانک پردہ ہٹا اور دراز قد اپنے بازوؤں پر ایک بے ہوش کو اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوا۔ یہ بدرالدین تھا۔ جو تنویری نیند کے زیر اثر تھا۔ دراز قد نے اسے قربان گاہ پر لٹا دیا اور پھر ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ بلندی پر بنی ہوئی ایک محرم

تھا۔ سڑھیاں اتر کر وہ نیچے گیا۔ چند لمبے بعد فضا بدرالدین کی دلخراش چٹخوں سے گونج اٹھی اور یہ دردناک چٹخیں آہستہ آہستہ ختم ہو گئیں۔ سب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

”دیوتا سے غداری کا انجام سب نے دیکھ لیا تھا۔“ عباپوش کی آواز پھر گونجی۔ ”اب پوجا کا آغاز ہوتا ہے۔“

اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ کمرے میں دھیمی بے جان موسیقی گونج اٹھی، عباپوش کا ہاتھ بلند ہوا اور تخت کے قریب رکھے ہوئے تابوت کا ڈھکن خود بخود ہٹ گیا اندر لیٹی ہوئی می آہستہ آہستہ بلند ہونے لگی یہاں تک کہ سیدی کھڑی ہو گئی۔ نشے میں جھومتے ہوئے پجاریوں کے جوڑے پوجا میں داخل ہونے لگے۔

☆☆

شارق کی جدوجہد رائیگاں نہیں گئی تھی۔ الیاس بیک کے بارے میں اسے حیرت انگیز انکشافات ہوئے تھے۔ اس نے میجر شاہ کے مشورے پر کلبوں اور ہوٹلوں کے رنگین ماحول میں صرف دو دن گزارے تھے کہ نتاشا جونیر سے ملاقات ہو گئی۔ نتاشا ایک معمولی گھرانے کی لڑکی تھی لیکن نشے اور آداری کی بنا پر گھر والوں کی توجہ سے محروم ہو چکی تھی۔ وہ مالدار لوگوں کو متوجہ کرنے کی ماہر تھی اور قیمتی لباس میں شارق کی دلکش شخصیت نے اسے چونکا دیا تھا جیسے ہی رقص شروع ہوا اس نے شارق کو دعوت دی اور رقص کے دوران تکلفات کی منزل سے آگے نکل گئی۔ رقص کے بعد شارق اسے لاؤنج میں لے کر بیٹھا ہی تھا کہ نتاشا نے شراب کا آرڈر دے دیا۔

”صرف ایک بار۔“ شارق نے کہا۔ ”میں شراب نہیں پیتا۔“

”بائیں..... یہ کیسے ممکن ہے۔ تم جیسا خوب صورت نوجوان اور شراب سے پرہیز۔“

”بات یہ ہے۔ نتاشا کہ ڈیڈی کا منتر دیکھ کر

میں مبتلا نظر آتی تھی۔ اسی لیے میں نے اسے آسانی سے شراب پلا دی تھی۔“

”جب پھر تم اس کے بارے میں کوئی۔ پوشیدہ بات نہیں جانتے۔“

”نہیں..... سوائے اس کے کہ میں اس کی زندگی میں پہلا مرد نہیں تھا۔“ بدر نے جواب دیا۔ ”لیکن الیاس بیک کو اس کا علم نہیں تھا لیکن میں نے اسے یہ بات نہیں بتلائی۔“

عباپوش چونک پڑا۔ ”اس نے تم سے کالے جادو۔ یا کسی پوجا وغیرہ کا ذکر کیا تھا۔ کوئی ایسی بات بتلائی تھی جو تمہیں پراسرار لگی ہو۔“

”کالے جادو یا پوجا کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ میں نے اس کے سننے پر گودی ہوئی تصویر کے بارے میں پوچھا بھی لیکن۔“

”اوہ..... تم نے وہ نقش دیکھا تھا۔“

”ہاں..... میرے پوچھنے پر اس نے بتلایا کہ یہ قلو پٹھر کا نشان ہے۔ ایک احمق نے اس کے سینے پر نقش کر دیا تھا۔“

”اوہ..... احمق نے۔“ عباپوش کے لہجے میں سختی آ گئی تھی۔ ”تم نے اس نقش کے بارے میں کسی کو بتلایا تھا۔“

”ہاں..... اس کے سوتیلے باپ الیاس بیک کو۔“

”اور کسی کو نہیں۔“

”نہیں میری اور کسی سے بات ہی نہیں ہوئی۔“

عباپوش نے دراز قد کی طرف دیکھا۔ ”لے جاؤ اسے ختم کر دو..... دو منٹ بعد یہ ہوش میں آ جائے گا۔“ اس نے کہا۔ ”بدر تم اب سے ٹھیک دو منٹ بعد بیدار ہو جاؤ گے۔“

پجاری اس خوفناک حکم کا مطلب سمجھتے تھے۔ دراز قد خوفناک آدمی جب بدر کو اٹھا کر چلا تو وہ خوف سے کانپ اٹھے۔ دروازے سے نکل کر وہ غلام گردش میں آ گیا۔ جس کے آخر میں ایک زینہ

تو بہ کر لی ہے۔“
”کیا ہوا تمہارے ڈیڈی کو.....“
شارق نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”شراب

اور..... عورت کے چکر میں لاکھوں روپے برباد کر دیے۔“ اس نے کہا۔ ”مئی نے بڑس نہ سنبھال لیا ہوتا تو اب تک ہم ریوٹوں کو محتاج ہو جاتے ان کے دوست میں ایسے تھے۔ ابھی کچھ دنوں قبل ایک شخص ان سے بھاری رقم لے کر چلتا بنا دیکھو شاید تم اسے پہچانتی ہو۔“ اس نے جیب سے تصویر نکال کر دکھائی۔

نتاشا چونک پڑی۔ ”بدرالدین یہ تو بڑا مکار بلیک میلر ہے تمہارے ڈیڈی کا نام کیا ہے۔“
”جائے دو میں نہیں چاہتا کہ وہ بدنام ہوں۔ ان کو اس راستے پر ڈالنے والا ایک شخص الیاس بیگ ہے۔“

”تم الیاس بیگ کو بھی جانتے ہو۔“ نتاشا نے حیرت سے کہا۔ ”بڑا کمینہ شخص ہے۔ مجھے بدرالدین نے ہی اس سے ملوایا تھا۔“

شارق کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ بدر اور الیاس ایک دوسرے سے واقف تھے۔ میجر شاہ کا شک حقیقت بن گیا تھا۔ ”تم بتلا سکتی ہو کہ بدر کہاں ملے گا۔“ اس نے پوچھا۔

”اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ دو تین دن پہلے وہ الیاس بیگ کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ تب سے میں نے اسے نہیں دیکھا۔“ نتاشا نے جام خالی کرتے ہوئے کہا۔ ”تم الیاس بیگ سے کیوں نہیں پوچھ لیتے۔“

شارق نے اس سے مزید پوچھ گچھ نہیں کی وہ جلد از جلد یہ خبر میجر شاہ کو دینا چاہتا تھا۔

☆ ☆
الیاس بیگ گھر سے نکلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ نوشاہی کی موت نے اس کے منصوبے پر پانی پھیر دیا تھا اور وہ بے حد پریشان رہنے لگا تھا۔ اب تک

جو قرض اس امید پر لیے تھے کہ نوشاہی کی دولت رخسانہ کو ملنے کے بعد ادا کر دیے گا۔ ان کی ادائیگی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

شراب اور عیاشی نے اسے بتائی کے دہانے پر لاکھڑا کیا تھا۔ اچانک فون کی کھنٹی بجی اور اس نے لپک کر ریسیور اٹھالیا۔

”ہیلو میں الیاس بیگ بول رہا ہوں۔“ اس نے کن انکھیوں سے رخسانہ کی سمت دیکھتے ہو کہا۔ جو اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

”ہیلو الیاس!“ ایک سریلی نسوانی آواز سنائی دی۔ ”تم کتنی جلدی میرے پاس پہنچ سکتے ہو۔“

الیاس چونک پڑا۔ آواز نئی تھی لیکن بہت سریلی۔ ”کون بول رہا ہے۔“ اس نے رخسانہ کو سانے کے لیے پوچھا۔

”نام پوچھ کر کیا کرو گے ڈارلنگ، بس آ جاؤ۔“ بولنے والی نے اس انداز میں کہا کہ الیاس بیگ کے خون میں حدت آ گئی۔

”لیکن کیوں کیا کام ہے۔“ اس نے آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”قلو پٹھرہ کے بارے میں بات کریں گے۔“

الیاس بیگ کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ اسے یاد آیا کہ بدر نے اس نقشے کا ذکر کیا تھا جو نوشاہی کے سینے پر رہتا ہوا تھا۔ قلو پٹھرہ کی تصویر۔ تو بدر نے ایک بلیک میل کرنے کے لیے کسی عورت کا استعمال کیا تھا۔ کمینہ نہیں کا الیاس بیگ نے پھر بھی اپنے شے کی تقدیر ضروری سمجھی۔ ”کون قلو پٹھرہ۔ میں نہیں سمجھا۔“ ایک ہلکا سا ہتھکڑی سنائی دیا۔

”تم اتنے بھولے نہیں الیاس بیگ۔ بدر کی زبانی اتنی آسانی سے بند نہیں ہوگی۔“ خوف کی ایک سرد دلہ اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ بدر نے بلیک میلنگ کا نیا طریقہ اختیار کیا تھا لیکن وہ انکار نہ کر سکتا تھا۔ پتہ نہیں اس

کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ گارڈن پارک سے ہو کر مختلف سڑکوں سے گزرتی ہوئی پارک اسٹریٹ سے ہو کر مختلف سڑکوں سے گزرتی ہوئی ایک جنگل کے سامنے رک گئی۔ ہر سمت سناٹا طاری تھا۔ عورت دروازہ کھول کر اتری اور پھر مرسیڈز سائیڈ پر کھڑی کرے مگر الیاس کو دیکھا اور کہا۔ ”کیا اندر آنے کا ارادہ نہیں ہے۔ ڈارلنگ۔“

الیاس کا دل اس دعوت سے اچھلنے لگا۔ اس کا دماغ اس کا فردا کے جسم سے آنے والی بھینی بھینی خوشبو سے محو ہو رہا تھا۔ عورت نے محو کر گرد و پیش دیکھا اور پھر مطمئن ہو کر جنگل کے گیٹ میں داخل ہوئی۔ لان کے زینے سے چڑھتے ہوئے۔ وہ بالائی منزل پر پہنچنے پر اس نے دروازہ کھول کر لائٹ جلائی اور الیاس کی سمت دیکھ کر مسکرائی۔

”کیا۔ بدریہاں موجود ہے۔“ الیاس نے

پوچھا۔

”نہیں..... ڈارلنگ یہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی اور موجود نہیں۔“ عورت نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”کیا پیو گے۔“

”جو چاہو پلا دو۔“ الیاس بیک مسکرا کر بولا۔ ”مجھے تو بن بنے نشہ ہو رہا ہے۔“ وہ دلوں ادا سے مسکرائی۔ ”تم آرام سے بیٹھو میں لباس تبدیل کر کے ابھی آئی۔“ اس نے شراب کی بوتل اور گلاس اس کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”انتا نہ پی لیتا کہ جب واپس آؤں تو بیہوش ملو۔“

وہ دروازہ کھول کر برابر والے کمرے میں چلی گئی۔ الیاس نے قیمتی شراب کا جام بھرا اور آہستہ آہستہ پینے لگا۔ کمرے کے ایک کونے میں بڑا سا اسٹینڈ رکھا تھا۔ جس پر ایک عجیب طرز کی شیشے کی بانڈی رکھی تھی۔ اس میں بھورے رنگ کی ریت رکھی ہوئی تھی۔ دیواروں پر جگہ ریشمی کپڑے کے لائے لائے پردے لٹکے ہوئے تھے۔ جن پر

کینے نے اس عورت کو کیا کیا بتا دیا تھا۔ ”کہاں آنا ہے مجھے۔“ الیاس بیک نے تھکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”اور کب۔“

”ٹھیک گیارہ بجے نوزادہ اسٹیشن کے پاس ہوٹل نیو گارڈن ہے۔ بس ہوٹل کے گیٹ کے سامنے آ جاؤ میں تمہیں پہچان لوں گی۔“

وہ کار سے اتر کر ہوٹل گارڈن کی سمت بڑھا ہی تھا کہ کسی نے بڑے پیارے سے اسے پکارا۔ الیاس بیک اس نے چونک کر دیکھا۔

تاریکی سے نکل کر وہ اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ الیاس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ سنہرے بالوں والی یہ حسینہ اسے کسی دوسری دنیا کی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ اتنی حسین و جمیل اور بھرپور عورت اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ چند لمحے وہ مہموت بنا اسے محو رہا اور پھر آہستہ سے بولا۔

”ہاں..... میں الیاس ہوں اور تم۔“ وہی کھٹکھٹاتا ہوا سر ہلاتے ہوئے پھر سنائی دیا۔ ”نام میں کیا رکھا ہے۔ تم کام سے عرض رکھو۔ اس نے کہا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“ الیاس بیک کسی سحر زدہ انسان کی طرح اس کے ساتھ چلنے لگا۔ ”اس کینے بدرالدین نے اگر تمہیں اس لیے بھیجا ہے کہ تم مجھے بلیک میل کرو تو.....“ وہ کھٹکھٹا کر ہنسی۔

”اوہ..... الیاس ڈارلنگ کیا میں تم کو بلیک میل نظر آتی ہوں۔“ اس نے الیاس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ”میں تو صرف قسمت کا حال بتلاتی ہوں۔ ممکن ہے تمہاری قسمت کھٹنے والی ہو۔“

”خوب تو یہ کافرا قسمت کا حال بتلا کر لوگوں کو پھانسی ہے۔“ الیاس نے سوچا۔ ”اگر آج رات ییل جائے تو واقعی قسمت کھل جائے۔“ یہی لالچ اسے آگے لے جا رہی تھی۔

سڑک کے موڑ پر ایک مرسیڈز کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس ہوٹل کو کار چلاتے دیکھ کر الیاس کو

نے ایک ہاتھ ہانڈی میں بھری ہوئی ریت پر رکھا اور دوسرے سے الیاس بیک کا ہاتھ تھام لیا اور پھر ریت کو گھورنے لگی۔

لیکن اس کے جسم کے لمس نے الیاس بیک کو دیوانہ کر دیا تھا۔ اس نے مخمور آواز میں کہا۔ ”میری قسمت میں اس وقت جو کچھ ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے۔“

عورت اس طرح اچھل کر کھڑی ہو گئی جیسے بچھوئے ڈنگ مار دیا ہو۔ اب وہ مسکرا نہیں رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سفاکی اور خوف جھلکنے لگا تھا۔ ”ٹھیک ہے اب تم اسے سنھال لو۔“ اس نے سامنے کھڑے دروازہ آدمی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

الیاس بیک پھرتی سے مڑا۔ دروازے میں کھڑے ہوئے دیو قامت کو دیکھ کر اس کی روح فنا ہو گئی۔ دروازہ آہستہ آہستہ اس کی سمت بڑھ رہا تھا۔ الیاس بیک گھبرا کر کھڑا ہو گیا لیکن خوف نے اس کے پیر منجمد کر دیے تھے۔ کیونکہ دروازہ قد نے اچانک خنجر نکال لیا تھا۔

”شلوکا یہاں کوئی خوریزی نہیں ہوگی۔“ عورت نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ”ناٹک بھوکا ہوگا۔ اسی کے لیے اسے محفوظ کر لو۔“

الیاس بیک نے خوفزدہ ہو کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن شلوکا کے آہنی ہاتھوں نے اس کی گردن دیوچ لی۔ الیاس بیک اس کی گرفت میں تڑپنے لگا۔ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ اگر عورت مداخلت نہ کرتی تو شاید الیاس بیک وہیں دم توڑ دیتا۔ شلوکا نے حقارت آمیز انداز میں اسے صوفے پر ڈال دیا۔

☆☆

شارق ایک تاریک دروازے میں کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں بنگلے کے اس دروازے پر مرکوز تھیں۔ جس میں الیاس بیک ایک انجانی عورت کے ساتھ داخل ہوا تھا۔

میسر شاہ گھر پر موجود نہیں تھا۔ اس لیے شارق

ہنے ہوئے نقش اس کی سمجھ سے باہر تھے۔ یہ عورت واقعی قسمت کا حال بتلانے کا کاروبار کرتی تھی۔ اپنے اصلی پیشے کی پردہ پوشی کا اچھا طریقہ تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ کمرے میں داخل ہوئی۔

الیاس بیک نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”ہاں اب بتلاؤ بدر نے تم سے کہا کیا ہے۔“

”یہی بات پوچھنے کے لیے تو میں نے تم کو یہاں بلایا ہے۔“ عورت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں جاننا چاہتی ہوں کہ نوشاہ کے بارے میں بدر نے تم کو کیا باتیں بتلائی ہیں۔“

”نوشاہ کے بارے میں۔“ الیاس نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”کوئی خاص بات تو نہیں۔“

”کوئی خاص بات نہیں جو کچھ اس نے کہا تھا۔ وہ اب سب کو معلوم ہو چکا ہے۔“

عورت کے لبوں سے مسکراہٹ اچانک غائب ہو گئی۔ وہ چند لمحہ الیاس بیک کو گھورتی رہی پھر آہستہ سے بولی۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ جو کچھ بدر الدین نے بتلایا تھا۔ وہ تم نے سب کو بتلا دیا۔“

”نہیں میرا مطلب ہے کہ نوشاہ کے بارے میں سب کچھ اخبار میں آچکا ہے۔ اور بدر الدین نے سوائے ایک چیز کے اور کوئی بات نہیں بتلائی۔“

”اور وہ ایک چیز کیا ہے۔“

”تم پہلے ہی جانتی ہو ورنہ فون پر اسی کا حوالہ کیوں دیا تھا۔“ الیاس بیک نے جواب دیا۔

”نوشاہ کے سینے پر قلو پٹھرہ کی شکل گودی ہوئی تھی۔“

وہ بے ساختہ مسکرا دی اور الیاس بیک سے اور قریب ہو گئی۔ ”تم نے یقیناً یہ بات اپنی بیوی کو بتلائی ہوگی۔“

”نہیں۔“ اس نے فوراً کہا۔ ”کسی کو نہیں۔ تم جانتی ہو کہ میں اس کا ذکر کسی سے نہیں کر سکتا تھا۔“

”اب میں تمہاری قسمت پڑھ دوں۔“ اس

شارق چو کنا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ وہ تاریکی میں دروازے سے چپک گیا تھا۔ تاکہ کسی کے نظر میں نہ آ سکے لیکن اگلے ہی لمحے وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ دراز قد اس مرتبہ تنہا نہیں آ رہا تھا۔ وہ کسی کو پشت پر اٹھا کر لا رہا تھا۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر جب وہ روشنی میں آیا تو شارق چوٹ اٹھا۔ اس نے الیاس بیک کو پہچان لیا تھا۔ جو بے ہوش نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ جب دراز قد آدمی نے اسے اندر ڈالنے کی کوشش کی تو اس کے لیوں سے ایک کراہ نکل گئی تھی۔ دراز قد نے واپس جا کر دروازہ مقفل کر دیا اور واپس آ گیا۔

کار فوراً روانہ ہو گئی تھی۔

شارق بھاگتا ہوا۔ اپنی کار تک پہنچا جو کچھ فاصلے پر کھڑی تھی بارش اچانک شدید ہو گئی تھی اور وہ کسی قیمت پر بھی مرسدیز کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ بارش کی وجہ سے کار کا تعاقب دشوار ہو گیا تھا۔ کیونکہ موسلا دھار بارش کی بناء پر تھوڑے فاصلے کی چیز بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ شارق نے دانستہ فاصلہ زیادہ نہیں رکھا۔ ویسے احتیاط اس نے مرسدیز کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔

وہ مین سڑک سے گزرے اور پھر مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے کئی بار مرسدیز کی لائٹ نے اس کی راہنمائی کی۔ یہاں تک کہ برج پارک کے وہ سڑک پر اس سمت بڑھنے لگے جہاں آبادی کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ جہاں رات کو لوگ کم آتے تھے۔ جیسے ہی مرسدیز مڑی شارق نے تیزی سے اپنی کار آگے بڑھائی اور اس لیے وہ سائیڈ سے آنے والے ٹرک کو نہ دیکھ سکا۔ ٹکراتے زور سے ہوئی تھی کہ دھماکے سے قضا کوٹ اٹھی۔

ٹرک کی رفتار خاصی تیز تھی۔ کار کے پرچے اڑ گئے اور ٹرک اپنے ساتھ اسے دور تک گھسیٹا لے گیا۔ ٹرک ڈرائیور جب نیچے اترا تو بڑی مشکل سے کار کے کچلے ہوئے ڈھانچے سے شارق کو باہر نکال سکا۔ شارق خون میں لت پت تھا۔ ہسپتال

نے اس کے نام پیغام چھوڑ کر فون سے صورت حال کی تفصیل تار کو بتادی تھی اور خود الیاس بیک کی نگرانی کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ الیاس بنگلے سے نکلا تو شارق کی کار اس کے تعاقب میں تھی۔ ہوش نیو گارڈن سے یہاں تک وہ بلا کسی دشواری کے تعاقب کرتا آیا تھا۔ اب اچانک پھوار پڑنا شروع ہو گئی تھی۔ شارق کے لیے یہ اندازہ کرنا دشوار تھا کہ بدرالدین یہاں موجود ہے یا نہیں لیکن وہ الیاس بیک کا تعاقب اس لیے کر رہا تھا کہ شاید اس کے ذریعے بدر تک پہنچ جائے۔

وہ بنگلے کے بالکل قریب ایک بند دروازے سے چپکا ہوا کھڑا تھا۔ دروازے کے اوپر چوڑا سا چھجا تھا۔ جس کا سایہ اسے تاریکی اور بارش سے تحفظ فراہم کر رہا تھا۔ اس نے دوبارہ فون کیا تھا لیکن میجر شاہ واپس نہیں آیا تھا۔ اس نے صوفیہ کو پھر صورتحال سے آگاہ کیا کھڑے کھڑے جب پیر رکھنے لگے تو اچانک اس نے دروازے کے کھلنے کی آواز سنی اور وہ چونک کر اس طرف دیکھنے لگا۔

دروازے سے وہی خوب صورت عورت باہر نکلے۔ جس کے ساتھ الیاس بیک آیا تھا۔ شارق سوچ رہا تھا کہ شاید الیاس بیک کے ساتھ بدرالدین بھی نظر آ جائے لیکن وہ ایک سیاہ دیو قامت کو دیکھ کر حیران رہ گیا جو اپنی پشت پر ایک بڑا لانا بکس لے کر نیچے اتر رہا تھا۔ تن و توش اور چلیے سے وہ بہت خوشخوار معلوم ہو رہا تھا۔ عورت نے گیٹ کے باہر کھڑی ہوئی کار کا پھیلا دروازہ کھول لیا لیکن دراز قد کی تمام تر کوششیں کرنے باوجود کار کے اندر نہ جاسکا۔

”بکس اندر نہیں جاسکتا۔ مجھے اوپر واپس جانا پڑے گا۔“ دراز قد آدمی نے مایوس ہو کر کہا۔

عورت نے ادھر ادھر دیکھا اور جھنجھلا کر کہا۔ ”تو پھر جلدی کرو۔ ویسے کوئی خطرہ نہیں ہر سمت سنا ہے۔“

پہنچتے پہنچتے اس کی حالت خطرناک ہو چکی تھی۔ اسے فوراً امیر جیسی آپریشن کے لیے تھیر میں لے جایا گیا۔

میجر شاہ نے اپنا کام نوشاہہ کی پارٹنر کرن سے شروع کیا لیکن وہ نوشاہہ کی نجی زندگی کے بارے میں کوئی بات نہ بتا سکی۔ میجر شاہ نے یونیک کی عورتوں اور کرن سے نوشاہہ کی دوستوں اور وقف کاروں کی ایک فہرست تیار کی اور ہر ایک سے فرداً فرداً معلومات حاصل کرنا شروع کر دی۔ یہ بور ذمہ داری دانستہ شارق کو نہ دی گئی تھی۔ وہ ہر ایک کو پاشا کی شناختی تصویر دکھا کر اس کے بارے میں پوچھتا لیکن کوئی کارآمد معلومات نہ حاصل ہو سکی۔ کرن نے اسے فیشن آرکیڈ کا پتہ بھی دیا تھا۔ یہ وہی آرٹ اسکول تھا۔ جہاں جدید فیشن کے ڈیزائنوں کی ترتیب دی جاتی تھی۔ نوشاہہ اور کرن دونوں نے یہیں تربیت حاصل کی تھی۔ اور یہیں سے ان کی دوستی ہوئی تھی۔

میجر شاہ جب فیشن آرکیڈ کے ڈائریکٹر کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اپنے آرٹ ڈائریکٹر مسٹر مائیکل سے کسی نئے ڈیزائن کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ شاہ کو دیکھ کر مسکرائے اور انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”فرمائیے میجر شاہ ہم کیا خدمت کر سکتے ہیں۔“ ڈائریکٹر صاحب نے کہا۔

”میں نوشاہہ کے سلسلے میں کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“ میجر شاہ نے کہا۔ ”وہ آپ کی طالبہ رہ چکی ہے۔“

مسٹر مائیکل نے غور سے میجر شاہ کو دیکھا لیکن خاموش رہے۔ ”نوشاہہ جی بے شک پوچھیے لیکن ہم زیادہ نہیں بتا سکیں گے، پروفیسر آپ جانتے ہیں یہاں اتنی لڑکیاں تربیت کے لیے آتی ہیں کہ۔“

”آپ دونوں نے کبھی اس شخص کو نوشاہہ کے ساتھ دیکھا ہے۔“ میجر نے پاشا کی تصویر نکال

کر میز پر رکھی۔

”جی نہیں۔“ ڈائریکٹر صاحب نے کہا۔ ”شاید مسٹر مائیکل کچھ بتا سکیں۔ ڈیزائن کلاس یہی لیتے ہیں۔“

”میں نے اس شخص کو کبھی نہیں دیکھا۔“ مائیکل نے ناگواری کے ساتھ جواب دیا۔ ”میں ڈیزائن آرٹسٹ ہوں مسٹر میجر شاہ..... مجھے اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ چروں پر نظر رکھوں۔“

”ممکن ہے یہ شخص بھی آرٹ اسٹوڈنٹ رہا ہو۔“ میجر شاہ نے کہا۔

”مجھے یاد نہیں کہ اسے کبھی کلاس میں دیکھا ہے۔“ مائیکل نے جواب دیا۔ ”آپ کا تعلق پولیس سے ہے۔“

میجر شاہ نے غور سے مائیکل کو دیکھا۔ ”جی نہیں..... لیکن آپ کو یہ خیال کیوں آیا۔“

”دیکھیے۔ مسٹر نوشاہہ جیسی لڑکیاں ہمارے پیشے کی بدنامی کا باعث بن سکتی ہیں۔“ مائیکل نے خشک لہجے میں کہا۔ ”لوگ سمجھیں گے کہ یہاں آنے والی سب لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں۔ مجھے افسوس ہے لیکن ہم کوئی مدد نہیں کر سکتے۔“

”میرا خیال ہے میجر شاہ۔“ ڈائریکٹر نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ ”شاید اس کی کوئی کلاس میٹ آپ کی مدد کر سکے۔ آپ ہمارے سیکشن میں معلوم کر لیں۔“

مائیکل نے قہر آلود نگاہوں سے ڈائریکٹر صاحب کو گھورا۔ میجر شاہ مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ آرٹ سیکشن میں ایک لڑکی نوشاہہ کے ساتھ پڑھ چکی تھی۔ دہلی پتلی سانولے رنگ کی سویتا نے تصویر دیکھتے ہی کہا۔ ”یہ تو کاشف معلوم دیتے ہیں۔“

میجر شاہ چونک پڑا۔ ”کاشف..... تم یقین سے کہہ سکتی ہو۔“

”یہ اصلی تصویر تو نہیں ہے۔ آپ ان کو خود جا کر دیکھ لیجیے۔ بڑے مشہور آرٹسٹ ہیں۔“

پڑھی ہوگی۔“

”ہاں..... یاد آیا۔ قاتل کی یہ شناختی تصویر

بھی اخبار میں چھپی تھی۔ اب یاد آ گیا۔“

”پھر بھی آپ نے خود کو پولیس کے حوالے

نہیں کیا۔“ میجر شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کاشف ایک لمحے تک اسے گھورتا رہا۔ پھر

زور کا ہتھیر لگا کر بولا۔ ”سمجھا، لیکن میں نے کسی

لڑکی کو قتل نہیں کیا۔“

”اس بات پر اور کوئی یقین کر سکتا ہے۔“

”کیوں نہیں لڑکی کا قاتل تو ضروری کرے

گا۔“ کاشف نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ویسے شکل

سے آپ پولیس والے تو نہیں لگتے۔“

”شکرا ادا کیجئے کہ پولیس والا نہیں ہوں ورنہ

آپ کو گرفتار پہلے کرتا۔ یہ باتیں بعد میں

پوچھتا۔“ میجر شاہ نے کہا۔ ”قتل والی رات آپ

کہاں تھے۔“

”اپنے فلیٹ پر جہاں تین آرٹسٹ اور رہتے

ہیں۔ وہ سب گواہی دیں گے کیونکہ ہم تینوں ایک

بی ماڈل کے ساتھ تھے کہ آپ بھی ہوتے تو رات

وہیں گزار دیتے۔“ کاشف نے جواب دیا۔

”اب جان چھوڑ دیجئے۔“

میجر شاہ کو یوں بھی اس شخص کے قاتل ہونے

پر یقین نہیں تھا۔ وہ وہاں سے سیدھا انسپکٹر نواز کے

پاس پہنچا اور اسے اب تک کی تک و دو کے نتیجے

سے آگاہ کیا۔ اگر اس نے کاشف کی مشابہت کے

باوجود اس کی گئے گناہی کا یقین نہ دلایا ہوتا تو نواز

یقیناً اسے قاتل قرار دے کر گرفتار کر لیتا لیکن میجر

شاہ کے مشورے پر اس نے یہ مان لیا کہ فی الحال

اس کی نگرانی پر اکتفا کرے۔ بارش زور و شور سے

شروع ہو گئی تھی۔ اس لیے میجر شاہ نے گھر فون

کیا۔

”اوہ..... خدایا..... آپ کہاں غائب

ہو گئے تھے۔“ نفیسہ بوانے بدخواہی کے عالم میں

کہا۔ ”آپ فوراً ہسپتال جائیے شارق کی حالت

”ڈنشین اسٹریٹ چوراہے کے قریب ان کا

اسٹوڈیو ہے۔“ اس نے پتہ بتلاتے ہوئے کہا۔

میجر شاہ کا شکر یہ ادا کر کے ڈنشین اسٹریٹ

پہنچا۔ کاشف کا اسٹوڈیو ایک بوسیدہ عمارت کی

دوسری منزل پر تھا۔ لکڑی کی سیڑھیاں چڑھ کر وہ

جیسے ہی اسٹوڈیو کے سامنے پہنچا ایک مولی سی خوب

صورت لڑکی بڑبڑاتی ہوئی باہر نکلی۔ میجر شاہ کو دیکھ

کر اس نے منہ بنا لیا اور سیڑھیاں اترتی نیچے چلی

گئی۔ میجر شاہ جب اسٹوڈیو میں پہنچا تو ایک شخص

کیونوس پہ جھکا کسی تصویر میں رنگ بھر رہا تھا۔ وہ مٹا

تو میجر شاہ چونک اٹھا۔ تصویر سے اس شخص کے

چہرے میں بلا کی مشابہت تھی۔

”جی۔“ کاشف نے سر دلچے میں پوچھا۔

”آپ کس سلسلے میں آئے ہیں۔“ وہ لہجہ دوستانہ

نہ تھا۔

”میرا خیال ہے۔ اس فری لڑکی نے آپ کو

ماریوس کر دیا ہے۔“ میجر شاہ نے مسکراتے ہوئے

کہا۔

کاشف نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”دیکھیے بھائی میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ وہ مولی

ماڈل بننا چاہتی تھی۔ میرے پاس اتنا بڑا کیونوس

نہیں جس میں وہ سا سکے۔ آپ ماڈل تو نہیں

ہیں۔“

”جی نہیں“ میں تو صرف چند باتیں معلوم کرنا

چاہتا ہوں۔ آپ اس شخص کو جانتے ہیں۔“

کاشف نے امپرن پر ہاتھ صاف کرتے

ہوئے تصویر لے لی۔ چند لمحہ غور سے دیکھتا رہا۔ پھر

مسکرایا۔ ”بڑی بھونڈی تصویر ہے۔ مگر مجھ سے ملتی

جلتی ہے۔ آپ نے بتائی ہے۔“

”آپ اس شکل کے کسی اور شخص کو نہیں

جانتے۔“

”آپ کیا چاہتے ہیں۔ میں نے پہلے ہی کہہ

دیا ہے کہ میرے پاس وقت نہیں ہے۔“

”آپ نے ایک لڑکی کو شاہ کے قتل کی خبر

شارق کی حالت اب بہتر ہے۔“ میجر شاہ نے کہا۔
”کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں میجر صاحب۔“

”ابھی نہیں ہوا۔ وہ بے ہوش ہے۔ صبح آپ کو ضرور لے چلیں گے۔ میں صرف آپ کو اطمینان دلانے آیا تھا ابھی پھر ہسپتال جاؤں گا۔“
ابھی وہ ڈرائیونگ روم میں بیٹھے ہی تھے کہ نفیسہ بوا حسب معمول کافی تیار کر کے لائیں میجر شاہ نے پوچھا۔ ”حادثے سے پہلے شارق نے کوئی پیغام تو نہیں دیا تھا۔ ہوا۔“

”ہاں میاں دو مرتبہ فون کیا تھا۔ وہ الیاس بیگ کا تعاقب کر رہے تھے۔ جو اپنے بنگلے سے گیارہ بجے روانہ ہو کر ہوٹل نیوگارڈن پہنچے تھے۔ وہاں ایک بے حد خوب صورت عورت جس کے بال سنہری تھے اس کی منتظر تھی۔ اپنی کار وہیں چھوڑ کر الیاس بیگ عورت کی کار میں بیٹھ گیا۔ وہ ایک ماڈرن کالونی کے ایک بنگلے پر پہنچے بنگلے پر نام کی کوئی سختی نہیں تھی لیکن نمبر پی ۸۷ ہے۔ شارق کو یقین ہے کہ بدرالدین عرف پاشا وہاں موجود ہے۔ شارق اب تک وہیں مگرانی کر رہا ہے۔“

”شارق نے کسی بدرالدین کا پتا چلایا ہے۔ جس کا حلیہ پاشا سے مشابہہ ہے۔“ میجر شاہ نے پرچہ انسپکٹر نواز کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔
”ایسا لگتا ہے کہ وہ عورت وہاں سے کہیں اور روانہ ہوگئی تھی اور اس کا تعاقب کرتے ہوئے شارق کو حادثہ پیش آیا۔“ نواز نے کہا۔

”ہاں لیکن اب قاتل سے مشابہہ ایک نہیں دو افراد ہو گئے۔ کاشف کی بے گناہی یقینی ہوتی جا رہی ہے۔“

”کیا صوفیہ بی بی کو اطلاع نہیں دیں گے۔“
نفیسہ بوا نے برتن اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں اتنی رات گئے اسے پریشان کرنا لا حاصل ہوگا۔ صبح اطلاع دے دیں گے۔“ میجر شاہ نے کہا۔ ”آپ آرام سے سوئیں ہم ہسپتال جا

بہت خراب ہے۔ حادثہ ہو گیا۔“ اس کی آواز سسکیوں میں دب گئی۔

☆☆

انسپکٹر نواز اور میجر شاہ ایک ساتھ ہسپتال پہنچے شارق کے سر کا آپریشن ہو چکا تھا اور وہ کمرے میں بے ہوش پڑا تھا۔ مدہم روشنی میں اس کا سر پیٹوں میں بندھا نظر آ رہا تھا۔ میجر شاہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اسے آج اندازہ ہوا کہ شارق اس کو کتنا عزیز تھا۔ کمرے سے باہر نکل کر بھی وہ چند لمحہ تک خود پر قابو نہ پاسکا پھر مٹھی ہوئی آواز میں ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”حالت کیسی ہے۔“

”مجھے افسوس ہے۔ میجر صاحب..... لیکن حالت خطرناک ہے۔ دماغ کو شدید صدمہ پہنچا ہے لیکن آپریشن کے بعد خون بند ہو گیا ہے۔ پھر بھی ابھی کچھ کہا نہیں جاسکتا۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”ہم ان کو ہر لمحہ آہر و دہش میں رکھے ہوئے ہیں۔ آپ اطمینان رہیں۔“
”آپ کو حادثے کی کچھ تفصیل معلوم ہے۔“

”کسی ٹرک سے کار کی ٹکر ہوگئی تھی۔ حادثہ ایک سڑک پر ہوا تھا۔“

”آپریشن کس نے کیا ہے۔“
”سرجن..... ہارون نے اور نیو دوسرجن عمر گل نے ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ شارق آپ کے اسسٹنٹ ہیں۔“

ڈیوٹی نرس کو تاکید کر کے کہ اگر خدا نخواستہ شارق کی حالت خراب ہو تو فوراً فون کر دے۔
میجر شاہ اپنے بنگلے پہنچے کیونکہ نفیسہ بوا کو اطمینان دلانا ضروری تھا۔ انسپکٹر نواز ان کے ساتھ تھا۔ نفیسہ بوا جائے نماز پر مصروف دعا میں وہ بدحواسی کے عالم میں بھاگتی ہوئی آئیں۔ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ انہوں نے کچھ پوچھا نہیں۔ صرف سوا لیدنگا ہوں سے میجر شاہ کو دیکھا۔
”خدا کا شکر ہے ہوا۔ آپریشن ہو گیا ہے۔“

یہ کہ تم اس کے سینے پر بنے ہوئے نقش کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔“

عباپوش نے کہا۔ ”لیکن افسوس کے اب صورت حال مختلف ہو گئی ہے۔ اب تم یقیناً اس راز کو جاننے کی کوشش کرو گے۔“

الیاس بیک صرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے گھورتا رہا۔ جیسے توہی اثر کے تحت ہو۔ ”نہیں..... نہیں۔“ الیاس بیک کے لبوں سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

”تم نے ابھی خود بتلایا کہ تمہاری مسزنے نوشاہ کے قتل کی تفتیش کے لیے میجر شاہ کو مامور کیا ہے۔“ عباپوش نے سرد لہجے میں کہا۔

”وہ پولیس سے زیادہ خطرناک ہے۔ میں خطرے کی بو بہت قریب سے سونگھ رہا ہوں۔ اب تمہارا وجود بھی ایک مستقل خطرہ بن چکا ہے۔ اس لیے الوداع الیاس بیک..... شلوکا اس خطرے کو ہمیشہ کے لیے ناک کے جڑوں میں دفن کر دو۔“

اس نے ہوا میں ہاتھ بلند کر کے چٹکی بجائی۔ کمرے میں دھیمی لیکن پہچان نیز موسیقی گونجنے لگی۔ شلوکا نے الیاس بیک کو اس طرح شانوں پر اٹھا لیا۔ جیسے وہ اناج کا بورا ہو۔

الیاس بیک ہاتھ پاؤں مارتا رہا لیکن شلوکا کی آہنی گرفت سے نہ نکل سکا۔ پجاریوں نے اسے راستہ دے دیا۔ شلوکا پردے کے پیچھے جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ عباپوش نے ایک بار پھر ہاتھ اٹھا کر چٹکی بجائی۔ روشنی کا اتنا جھماکا ہوا کہ سب کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ عباپوش چبوترے سے غائب ہو چکا تھا اور پھر فضا میں الیاس بیک کی آخری دلخراش چیخ ابھر کر ڈوب گئی۔

☆☆

کچھ دیر بعد عباپوش نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ”یہ میجر شاہ بہت چالاک شخص ہے۔ یہ بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“ اس نے نقاب اتار دی تھی اور صوفے پر

رہے ہیں۔“

نفیسہ بوا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”میں سو کیسے سکتی ہوں۔ اسے ہوش آ جائے تو اطلاع کر دیتا۔“

راستے میں میجر شاہ نے نواز کو بتلایا کہ شارق نے کس طرح ایک لڑکی کیتھیرین کے ذریعے نوشاہ کی وہ تصویر حاصل کر لی تھی۔ جس میں اس کے سینے پر نقش گودا گیا تھا اب ایک اور پراسرار عورت درمیان میں آ گئی تھی۔ ”میں حیران ہوں کہ یہ سنہرے بالوں والی حسینہ کون ہے۔ افسوس کے ہم فی الحال شارق سے کچھ معلوم نہیں کر سکتے۔“

”اس نے کار نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ اس سے ممکن ہے کچھ پتہ چل جائے۔“ نواز نے کہا۔ ”افسوس کے ہمارے آدمی بھی اب تک قاتل کو تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔“ شارق کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اب تک بیہوش تھا۔

☆☆

ہری رام کے مندر میں ایک بار پھر وہی ڈرامہ دہرایا جا رہا تھا۔ دیو قاتم شلوکا نے الیاس بیک کو مضبوطی کے ساتھ اپنی گرفت میں جکڑ رکھا تھا۔ پوجا کے بلند چبوترے پر عباپوش پجاری کے علاوہ عورت بھی موجود تھی۔ جس کے سینے پر کسی دیوی کا نشان تھا لیکن الیاس بیک اتنا دھشت زدہ تھا کہ اسے حسن و شباب کے اس شاہکار کو دیکھنے کا خیال بھی نہ آیا۔ حالانکہ چند گھنٹے قبل وہ اس کے حسن سے مسحور ہو کر اس کے جال میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس کی خوف سے پھٹی نگاہیں سامنے رکھے ہوئے تخت پر تھیں۔ جہاں عباپوش پجاری کسی بت کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ ایک بھیاں تک نقاب میں پوشیدہ تھا۔ جس کے سوراخوں سے صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔

”مجھے یقین ہے الیاس بیک کہ اپنی سوتیلی بیٹی کے متعلق تم نے اب تک کسی کو کچھ نہیں بتلایا اور

ہسپتال فون کیا ڈیوٹی نرس نے بتلایا کہ شارق کی حالت قدرے بہتر تھی لیکن وہ ہوش میں نہیں آیا تھا۔ میجر شاہ نے صوفے کی سمت دیکھا۔ نواز بے خبر پڑا خرائے لے رہا تھا۔ اس نے شارق کی کیفیت ایک پرچے پر لکھ کر میز پر رکھ دی تاکہ انسپکٹر نواز جب بیدار ہو تو پڑھ لے لیاں تبدیل کر کے اس نے کار باہر نکالی اور روانہ ہو گیا۔ وہ سیدھا اس بنگلے پر پہنچا جس کا نمبر شارق نے اپنے پیغام میں لکھا تھا۔ دروازے پر نام کی تختی نہیں تھی میجر شاہ نے گھنٹی بجائی لیکن کئی بار کوشش کے باوجود جواب نہیں ملا۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی۔

لیکن ہر سمت سناٹا تھا۔ جیب سے پرس نکال کر اس نے اندر سے ایک باریک سا اوزار نکالا چند بار کی کوشش سے دروازہ کھل گیا۔ میجر شاہ نے دبے پاؤں اندر داخل ہو کر دروازہ بند کیا اور آگے بڑھ گیا۔ اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہاں کوئی نہ تھا۔

میجر شام نے ڈرائنگ روم میں رکھی ہوئی اس ہانڈی کو دیکھا جس میں ریت بھری ہوئی تھی۔ یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ عورت جو بھی کبھی قسمت کا حال پڑھنے کا مصری فن جانتی تھی۔ دیواروں پر آویزاں پردوں پر بے ہوئے نقش بھی سب مصری قدیم تہذیب سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ برابر والے کمرے میں داخل ہوا۔ جو بالکل تاریک تھا۔ پردہ کھینچ کر اس نے جیب سے ٹارچ نکالی اور سوچ تلاش کر کے لائٹ آن کی۔ روشنی ہوتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

یہ کمرہ نہیں قدیم مصری دیوی کا مندر معلوم ہوتا تھا۔ اس کا بڑا سا مجسمہ رکھا تھا۔ پورا جسم ایک عورت کا اور سر شارق کا تھا۔ دیواروں پر جگہ جگہ مختلف عمل اور جادو کے نقش لٹک رہے تھے۔ کتابوں کے حلیف میں قدیم مصری علوم اور پراسرار عملیات کی کتابیں رکھی تھیں۔ وہ میز کے پاس پہنچا اور دروازہ کھولی۔ تو اس میں مختلف شکلوں کے کارڈ رکھے

دراز تھا۔ اس کے برابر ہی سنہرے بالوں والی حسین بیٹی تھی۔ صوفے کے بازو پر وہ سیاہ ملی بیٹی ہوئی تھی۔ جسے وہ ٹائیگر کہتے تھے۔ کونے میں رکھے ہوئے ریڈیو سے موسیقی کی ہلکی دھن بج رہی تھی۔

”پھر کیا سوچا ہے۔“ عورت نے مترنم آواز میں پوچھا۔

اسی وقت ریڈیو سے مقامی خبریں شروع ہو گئیں۔ نیوز ریڈر شارق کے حادثے کی خبر سن رہا تھا۔ ”ٹریفک کے حادثے میں زخمی ہونے والا یہ نوجوان ایک امیگرا ہوا سائنس دان ہے۔ اور مشہور شخص میجر شاہ کا اسٹنٹ ہے۔ سر کے ایمرجنسی آپریشن کے بعد سے اب تک وہ بے ہوش ہے۔ ڈاکٹروں نے حالت خطرناک قرار دی ہے۔“

”ریڈیو بند کرو۔“ عبا پوس نے قدرے جھنجھلا کر کہا۔

عورت نے ریڈیو بند کر کے اس کی طرف قدرے حیرت سے دیکھا۔ ”خیر تو ہے۔“

”یہ شارق..... پتہ نہیں اس کی بیماری میجر شاہ کو کتنی دیر معروف رکھ سکتی ہے اگر ایسا نہ ہوا تو کوئی دوسرا بند بست کرنا ہو گا۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھتی۔“

”تم جانتی ہو کہ میں اپنے روحانی عمل کے ذریعے دور دراز فاصلے کے مریضوں کا علاج کر سکتا ہوں۔ میں اس عمل کو الٹا بھی کر سکتا ہوں۔ شارق بے ہوش ہے اور وہ مزاحمت بھی نہیں کر سکا اور ابدی نیند سو جائے گا۔“

”نہیں۔“ عورت نے سہم کر کہا۔

”اس عمل کے لیے مجھے اپنی تمام تر قوت کو بروئے کار لانا ہو گا اور تم کو بھی مدد کرنا ہو گی۔“ اس نے عورت کی سمت دیکھا۔

☆☆

صبح چھ بجے کا وقت تھا۔ جب میجر شاہ نے

شاہ کے قریب آ کر آہستہ سے کہا۔ ”نہ برین ہیرج کے کوئی آٹھ ہیں اور نہ سر کے زخم میں اور کسی خرابی کی یہ جوخ اور دورے کی علامات نظر آ رہی ہیں۔ عقل سے بالاتر ہیں۔ اس کے ساتھ ہی دل کی حالت دم بدم کمزور ہوئی جا رہی ہے۔“

”دماغ کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچ گیا۔“ میجر شاہ نے پوچھا۔

جس میں دیوی کی شکل کا وہ نقش بھی تھا۔ جو نوشاہ کے سینے پر بنا ہوا تھا۔ نیچے کی دراز میں گودنے کی شین بھی مل گئی۔ اب ہر چیز واضح ہوئی جا رہی تھی۔ دروازہ بند کرنے کے بعد میجر شاہ کی نظر میز پر رکھی ہوئی نام کی تختی پر پڑی جس پر ہلنڈہ سامری لکھا ہوا تھا۔ اب میجر شاہ کو اس بات میں کوئی شک نہیں رہا تھا۔ ہلنڈہ سامری کا ایلاس بیک سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور تھا اور نوشاہ بھی اس عورت کے زیر اثر تھی کیونکہ کوئی بھی لڑکی بلا کسی گھرے تعلق کے اپنے سینے پر ایسا نقش بنوانے کے لیے رضا مند نہ ہو سکتی تھی۔

میجر شاہ کو وہاں نوشاہ کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہ مل سکا نہ ہی کوئی ایسا کاغذ یا دستاویز ملی جس سے ظاہر ہوتا کہ نوشاہ جیسی لڑکیاں اور مکار عورت کے دام فریب میں گرفتار ہو چکی تھیں۔ ہر چیز کو اسی طرح رکھ کر وہ خاموشی سے باہر نکلا اور جب گھر پہنچا تو نواز بیدار ہو چکا تھا وہ کافی پی کر فارغ ہوئے تھے کہ فون کی کھنٹی بجی میجر شاہ نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ ”ہیلو میں میجر شاہ بول رہا ہوں۔“

”اوہ..... میجر صاحب۔“ نرس گہرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”آپ فوراً اسپتال آ جائیے مسٹر شارق کی حالت اچانک بہت خراب ہو گئی ہے۔“

میجر شاہ اور اسپیکٹر نواز تقریباً بھاگتے ہوئے ہسپتال کی پہلی منزل پر پہنچے جہاں ایک پرائیویٹ روم میں شارق کو رکھا گیا تھا، لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی میجر شاہ کا رنگ فق ہو گیا۔ شارق کو اسٹریٹس سے باندھ دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود اس کا جسم تڑپ رہا تھا۔ جیسے بندھنوں کو توڑ ڈالے گا۔ اس کا چہرہ کسی شدید ذہنی کرب و اذیت سے سیاہ ہو رہا تھا۔ سر کو پٹیوں سے کس کر اس طرح باندھ دیا گیا تھا کہ اس میں مزید جوش نہ آ سکے۔ نیوروسرجن اور کئی ڈاکٹر بستر کے گرد کھڑے تھے۔

”میں بہت حیران ہوں۔“ سرجن نے میجر

”آپریشن کے دوران تو کوئی ایسی علامت نظر نہیں آئی تھی۔“ نیوروسرجن نے کہا۔ ”لیکن خور اور ہجیان کی یہ کیفیت ختم نہیں ہوئی تو مجھے ڈر ہے۔“ اس نے جملہ نامک چھوڑ دیا۔

میجر شاہ دیر تک شارق کے چہرے کو دیکھتا رہا تھا۔ جس پہ ہر لمحہ موت کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ شارق کی موت اس کے لیے گہرے صدمہ کا باعث ہوئی ایسا لگتا تھا کہ بے ہوشی کے عالم میں وہ بھیانک ڈراؤنے خواب دیکھ رہا تھا۔ میجر شاہ گہری سوچ میں تھا۔

”آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ نواز نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

”آکر آپ لوگ اجازت دیں تو ہم ایک اور آپریشن کر کے سر کو کھولنا چاہتے ہیں تاکہ حقیقت معلوم کر سکیں۔“

نواز نے میجر شاہ کی سمت دیکھا۔ ”بے شک آپ ہر ممکن کوشش کریں۔“ میجر شاہ نے آہستہ سے کہا۔

وہ کمرے سے باہر آ گیا۔ نواز اس کے ساتھ تھا لیکن میجر شاہ کو جیسے اس کی موجودگی کا احساس نہ ہو۔ چند لمحوں بعد وہ تیزی سے ریپشن کی سمت بڑھا اس کے لبوں سے صرف ایک لفظ نکلا تھا۔ ”کا ہونہ۔“ لیکن نواز کی سمجھ میں اس کا مطلب نہیں آ سکا۔ ڈیوٹی پر موجود نرس سے اجازت لے کر میجر شاہ نے ایک نمبر ملایا۔ ”بابا صاحب ہیں۔“

”نہیں جناب وہ اس وقت گھر پر تشریف

لجے میں کہا۔

”آپ نے یاد کیا تھا۔ میں حاضر ہو گیا۔“
بابا صاحب نے کہا۔

”لیکن بابا صاحب کیا آپ گھر سے آ رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے۔ آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں ہوں۔“

”اس کے لیے فون کی ضرورت نہیں میجر۔ ذہن بھی رابطہ قائم کر سکتا ہے۔ آپ نے اتنی شدت سے یاد کیا کہ مجھے خبر ہو گئی۔“

”بابا صاحب شارق کی حالت بڑی خراب ہے۔ اس کا حادثہ ہو گیا تھا۔“ میجر شاہ نے تفصیل بتلانے کے بعد کہا۔ ”لیکن اس وقت جو کیفیت ہے اس نے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ کاہونہ.....“

”چلیے“ پہلے اس کی کیفیت دیکھ لیں۔“ بابا صاحب نے بات کاٹ کر کہا۔

وہ ایک بار پھر شارق کے کمرے میں آئے، ڈاکٹر سے آپریشن ٹھہر لے جانے کے لیے تیاری کر رہے تھے۔ بابا صاحب اس کے سر ہانے کھڑے ہو گئے۔ شارق کی پیشانی پر یا تو رکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور چند منٹ اسی حالت میں کھڑے رہے۔ سب لوگ حیرت زدہ تھے۔ شارق کا کج اچانک ختم ہو گیا تھا۔ وہ بالکل پرسکون لیٹا ہوا تھا۔ چند لمحے بعد بابا صاحب نے آنکھیں کھولیں اور میجر شاہ کی طرف دیکھا وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔

”میجر آپ کا شعبہ صحیح تھا لیکن مسئلہ نازک ہے کوئی شیطانی قوت اس کی جان لینے کے درپے ہے۔“

”میں ابھی آپ کو بتلاتا ہوں۔“ میجر نے کہا اور سرجن کی سمت دیکھا۔ ”آپ مریض کو آپریشن ٹھہر لے جاسکتے ہیں ڈاکٹر۔“

”نہیں۔“ بابا صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”شارق کا علاج ان کے پاس نہیں

نہیں رکھتے۔“ کسی خاتون نے جواب دیا۔

”کچھ اندازہ ہے کہ کب تک تشریف لے آئیں گے۔“ میجر شاہ نے سوال کیا۔

”یا ان سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے۔“

”جی نہیں وہ کچھ بتلا کر نہیں گئے۔“ خاتون نے جواب دیا۔ ”آپ اپنا نام اور نمبر بتا دیجیے وہ آئیں گے تو ہم انہیں بتا دیں گے۔“

میجر شاہ کی آنکھوں میں نظر آنے والی امید کی جھلک ختم ہو گئی۔ ”اس وقت تک تو بہت دیر ہو چائے گی۔“ اس نے مایوس لہجے میں کہا۔ ”دوبارہ فون کر لوں گا میں۔“

وہ نواز کی سبست دیکھ کر کھڑا رہا۔ نواز نے پہلے کبھی بابا صاحب کا نام نہیں سنا تھا بابا صاحب کوئی نام نہاد عامل فقیر نہیں تھے۔ وہ ایک بلند پایہ سائنسدان تھے اور پراسرار علوم پر انہوں نے کئی ممالک میں تحقیق کی تھی۔ میجر شاہ جانتا تھا کہ پراسرار علوم پر وہ اتھارٹی تھے۔ پٹانزم، ٹیلی پتھی اور سحر کے موضوع پر ان کی معلومات بے پناہ تھیں یہ اور بات تھی کہ اپنی علمی قابلیت کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے نواز بڑے غور سے میجر شاہ کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک میجر شاہ کچھ کہے بغیر شارق کے کمرے کی سمت واپس چل دیا۔ وہ آخری لمحات میں شارق کے پاس رہتا چاہتا تھا۔

”السلام علیکم میجر۔“ ایک بھاری آواز سنائی دی۔

میجر شاہ نے چونک کر سامنے دیکھا اور حیرت زدہ ہو گیا۔ نواز نے اس ادھیڑ عمر گورے چٹے شخص کو پہلے بھی نہیں دیکھا تھا۔ جو سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ سفید شیر وانی اور ٹوپی میں وہ بہت خوب صورت اور باوقار لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں میجر شاہ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”آ..... پ۔“ بابا صاحب میں نے تو ابھی آپ کو فون کیا تھا۔“ میجر شاہ نے مسرت بھرے

”میجر۔“

”مجھے خود آج صبح یہ اندازہ ہوا ہے اور پھر تم ان باتوں پر کب یقین کر لیتے۔“

”اس عمل کے لیے وہ خاص مقدر ہونا ضروری ہے جس میں یہ عمل کیا جاتا ہے۔“ بابا صاحب نے کہا۔ ”تصور کا غائب ہو جانا۔ لاش کا پھل جانا اور اب شارق کی یہ حالت بے شک تمہارا شبہ درست ہے۔ میجر اور ایسی صورت میں تم کو فوری طور پر مندر کے پجاری کو اس عمل سے روکنا ہوگا اور اس کے لیے سب سے پہلے مندر کا پتہ لگانا ضروری ہے۔ میں شارق پر اس کا اثر روک تو نہیں سکتا ہوں لیکن زیادہ دیر تک نہیں۔ مجھے اس کا توڑ نہیں معلوم، شارق کو بچانے کے لیے تمہیں مندر کا پتہ چلا کر عمل روکنا ہوگا۔“

”آئے میجر صاحب، ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔“ انسپٹر نواز نے کہا۔

”نہیں، نواز تم اس میں مداخلت نہیں کرو یہ کام۔“

”میجر، یہ اب ممکن نہیں۔“ نواز نے کہا۔ ”پولیس افسر کی حیثیت سے میرا بھی کچھ فرض ہے۔“

”تم ضرور یہ فرض پورا کرو انسپٹر۔“ بابا صاحب نے کہا۔ ”لیکن میجر شاہ کو اپنی مہم پر تہا جانے دو۔ اس دوران میں یہاں بیٹھ کر تحفظ فراہم کرونگا لیکن تم کو اپنا کام جلد از جلد کرنا ہوگا۔“

”میجر جلد از جلد اس سے پہلے کہ میں بھی بے بس ہو جاؤں۔“

میجر اور نواز جیسے ہی باہر نکلے انہوں نے صوفیہ کو اپنی سمت بڑھتے ہوئے دیکھا اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔ میجر کو دیکھتے ہی وہ بھاگتی ہوئی آئی۔ اور اس سے لپٹ کر سسکیاں لینے لگی۔ ”اوه..... سر آپ نے مجھے پہلے اطلاع کیوں نہیں دی۔“ صوفیہ نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔

”رات کو تمہیں بیدار کر کے پریشان کرنا

ہے۔ اسے کوئی جسمانی تکلیف نہیں ہے۔“

ڈاکٹر نے حیرت اور تذبذب کے عالم میں میجر شاہ کو دیکھا۔ ”میں نہیں جانتا کہ سبب کیا ہے لیکن مریش اب پرسکون ہے۔ کیوں نہ کچھ دیر انتظار کر لیں۔“

”ٹھیک ہے ڈاکٹر جیسی آپ کی مرضی۔“

ڈاکٹر اور نرسیں چلی گئیں تو بابا صاحب نے میجر شاہ کی سمت دیکھا۔ ”تم کچھ بتلانا چاہ رہے تھے۔“

”جی ہاں بابا صاحب آپ نے شاید اخبار میں ایک لڑکی نوشاہہ کے قتل کی خبر پڑھی ہوگی۔“

میجر شاہ نے کہا۔ ”یہ انسپٹر نواز ہیں۔ ہم دونوں لڑکی کے قتل کی افینش کر رہے ہیں۔“

”تم نے کیا پولیس میں ملازمت کر لی ہے میجر۔“

”نہیں بابا صاحب..... لڑکی کا باپ میرا دوست تھا۔ اس کی بیوی نے ذاتی طور پر مجھ سے خواہش ظاہر کی تھی کہ میں نوشاہہ کے قاتل کا پتہ چلاؤں۔ اسی سلسلے میں لڑکی کے سوتیلے باپ کا تعاقب کرتے ہوئے شارق کو حادثہ پیش آیا۔“

اس نے تمام واقعات دہرائے اور پھر کہا۔ ”آج صبح ہی میں نے ہلنگلہ سامری کے بنگلے کی تلاشی لی تو پتہ چلا کہ وہ کسی دیوی کی پجاری ہے۔ بنگلے میں ریت کے ذریعے قسمت پڑھنے پوچھا کرنے اور ساحرانہ عمل کا تمام سامان موجود تھا۔ آج جانتے ہیں اور مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ آج بھی ایسے شیطان کے چیلے موجود ہیں جو ایسے ساحرانہ عمل کرتے ہیں۔ اس عورت کا حلق مصر سے ہے اور مصر میں تو طرح طرح کے ساحرانہ عمل کے عامل موجود ہیں۔ وہ فاصلے پر رہ کر بھی لوگوں کو اذیت کی موت مار سکتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ شارق پر یہی عمل کیا جا رہا ہے۔“

انسپٹر نواز کا منہ حیرت سے پھیل گیا۔ ”لیکن..... لیکن آپ نے مجھے تو یہ سب بتلایا ہی نہیں تھا۔“

دوسرے بچے نے جلدی سے پوچھا۔
 میجر کا دل زور زور سے اچھلنے لگا۔ ”ہاں ہاں
 تم نے اسے دیکھا ہے۔“
 ”ہاں وہ کالی گھاٹ والے آشرم میں روز
 آتی ہے۔“ بچے نے کہا۔ ”میرا گھر وہیں ہے۔“
 ”تم مجھے وہاں تک لے چلو گے۔“
 ”ہاں چلیے۔“ بچہ خوش ہو گیا۔

لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ چھ سات بچے تھے
 اور سب جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ میجر شاہ ان کو
 خانا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے سب کو بٹھالیا۔
 تنگ سڑکوں سے گزرتے ہوئے وہ کبھی علاقوں
 میں ایک ایسی جگہ پہنچ گئے۔ جہاں سے آگے گاڑی
 لے جانا ممکن نہ تھا۔ میجر نے گاڑی روک دی۔
 بچے نے اشارے سے بتلایا آشرم داہنے جانب
 والی گلی میں ہے۔ میجر شاہ نے جیب سے دس کا
 نوٹ نکال کر بچے کو دیا اور ان کی ٹولی سے جان
 چھڑائی۔ بچے شور مچاتے بھاگ گئے تو وہ گلی کی سمت
 بڑھا۔

اینبوں کی بنی ہوئی یہ تنگ گلی کافی دور تک
 چلی گئی تھی اس کے ختم ہوتے ہی اچانک اسے دریا
 کا پانی نظر آیا لیکن آشرم کی عمارت یا کارا سے نظر
 نہ آئی۔ میجر شاہ سوچنے لگا۔ وہ یقیناً کسی غلط موڑ پر
 آ گیا تھا لیکن اسی وقت میجر کی نگاہ گھاٹ پر پڑی۔
 جہاں اسٹیرر رکنے کی جیٹی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اس
 سمت بڑھنے لگا۔ چند فرلانگ جاتے ہی اسے دریا
 کے کنارے بنی ہوئی ایک پرانے عمارت نظر
 آ گئی۔ ایک تنگ سی سڑک عمارت کے قریب آ کر
 ختم ہو جاتی تھی اور عمارت کا اگلا حصہ بلند پتھر پر
 دریا کے عین کنارے پر بنا ہوا تھا۔ میجر شاہ جیسے ہی
 قریب پہنچا اسے کنارے پر کھڑی مرسیڈز نظر
 آ گئی۔

اس کا دل خوشی سے اچھلنے لگا اور اب اسے
 اندازہ ہوا کہ وہ اگر درمیان والی گلی کا راستہ اختیار
 کرتا تو سیدھا سی عمارت تک پہنچ جاتا۔

مناسب نہ تھا صوفیہ۔“ میجر شاہ نے اسے تسلی دیتے
 ہوئے کہا۔ ”گھبراؤ نہیں دعا کرو۔“
 ”میں اسے دیکھ سکتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے جا کر دیکھ لو۔“ میجر شاہ نے پس
 و پیش کے بعد کہا۔ ”لیکن پھر واپس بنگلے پر پہنچ کر
 انتظار کرنا۔ ممکن ہے تمہاری ضرورت ہو۔“

انسپکٹر نواز کو اس کے دفتر چھوڑ کر میجر شاہ نے
 اس جگہ کا رخ کیا جہاں شارق کی کار کو حادثہ پیش
 آیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ مندر اسی علاقے میں
 کہیں ہوگا۔ دریا نے شنی کے کنارے اس علاقے
 میں یوں تو کئی مندر تھے لیکن میجر شاہ کو جس مندر کی
 تلاش تھی وہ یقیناً کسی ایسی جگہ ہوگا۔ جہاں کسی کو
 پتہ نہ چل سکے۔ ایک چوراہے سے آگے بڑھ کر
 اس نے کار روک دی۔ ٹریفک کا فٹپل سے اس
 نے دریافت کیا تو اس نے فوراً جائے حادثے کی
 نشاندہی کر دی۔ میجر وہاں پہنچا تو اسے شارق کی
 چکی ہوئی کار سڑک کے کنارے رکھی نظر آ گئی۔
 اس وقت بہت سے بچے وہاں جمع تھے۔ میجر شاہ کو
 دیکھ کر وہ خاموش ہو گئے۔

میجر شاہ حیران تھا کہ شارق بچے کیسے گیا
 کیونکہ کار اس طرح چکی گئی تھی کہ کوئی حصہ سلامت
 نہیں رہا تھا۔

”آپ پولیس والے ہیں جی۔“ ایک خوب
 صورت بچے نے آگے بڑھ کر اچانک سوال کیا۔
 میجر شاہ نے چونک کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔
 ”کیوں بیٹے کیا بات ہے۔“

”کیا وہ آدمی مر گیا ہے۔ جو اس کار میں
 تھا۔“ بچے نے پوچھا۔

میجر کا دل دھک سے ہو گیا۔ ”نہیں بیٹے وہ
 زندہ ہے۔ دعا کرو بچے جائے۔“ اس نے جلدی
 سے کہا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا اس نے بڑے
 پیار سے پوچھا۔ ”بیٹے تم نے اس علاقے میں ایک
 نئی سیاحہ کار کو آتے جاتے دیکھا ہے۔“
 ”جیسے ایک عورت چلائی ہے جی۔“

”جی ہاں میڈم شکلتہ سامری۔“ میجر شاہ نے جواب دیا۔

عورت خاموشی سے اسے گھورتی رہی۔ وہ سناٹے میں آگئی تھی لیکن اس نے میجر سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ اس جگہ تک کیسے پہنچا۔

”فرمائیے.....“ شکلتہ نے آہستہ سے کہا۔

”میں کسی کی قسمت کا حال جاننا چاہتا تھا۔“ میجر شاہ نے جواب دیا۔

عورت کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے اطمینان کی جھلک نمودار ہوئی۔ وہ شدید ذہنی نش و پنج میں معلوم ہوتی تھی۔ ”لیکن یہاں یہاں میں ہاتھ نہیں پڑھتی..... میں تو۔“

”میں ہاتھ پڑھوانے نہیں آیا میڈم یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ الیاس بیک کہاں ہے۔“

وہ اس طرح اچھلی جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ پھر شدید غصے سے قابو پاتے ہوئے بولی۔

”کون الیاس بیک کون ہو تم۔“

”میں کون ہوں۔ میرا خیال تھا کہ تمہارے دیوتاؤں نے اتنا علم ضرور دیا ہوگا کہ مجھے پہچان لو اور الیاس بیک وہی جسے تم ہوٹل گارڈن سے اپنی کار میں بٹھا کر لائی تھیں۔“

”اوہ..... وہ شخص..... وہ شخص تو رات ہی ہاتھ دکھا کر چلا گیا تھا۔ اپنے گھر ہوگا۔“

”نہیں میڈم وہ اپنے گھر نہیں گیا۔ کیونکہ اسے آپ دوبارہ بیہوشی کی حالت میں اپنے ساتھ کار میں لے کر آئی تھیں۔ شاید اسی جگہ۔“

شکلتہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خونخوار نگاہوں سے میجر کو گھورتی رہی۔ میجر نے پھر کہا۔

”شاید اس لیے کہ نوشاہہ کی طرح وہ بھی تمہارے راز سے واقف ہو چکا تھا۔“

”پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ کون نوشاہہ کون سارا۔“

”میڈم شکلتہ تم خوب جانتی ہو میں کیا کہہ

اس نے ابھی عمارت کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ وہ بھاگتا ہوا عمارت کے گیٹ تک پہنچا گیٹ بند تھا۔ اس نے اوپر بے ہوئے چوڑے چھجے کے نیچے کھڑے ہو کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ ہر سمت سناٹا طرہ تھا۔ گرج چمک کے ساتھ گھر کر آنے والے بادلوں نے تاریکی پھیلا دی تھی۔ میجر شاہ نے گیٹ کے برابر لگی ہوئی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ دو تین منٹ گزر گئے لیکن کوئی باہر نہیں نکلا اس نے دوبارہ بٹن دبایا اور کچھ دیر تک اسے دبائے رہا۔ پھر بھی کوئی جواب نہ ملا۔ گیٹ اندر سے بند تھا۔ بارش شدید نہ ہوتی تو وہ عقبی دروازے کو تلاش کرتا۔ تیسری بار اس کا ہاتھ ابھی اٹھا ہی تھا کہ دروازہ کھلا میجر شاہ ایک لمحے کے لیے بہوت رہ گیا۔

عورت کے حسن و جمال نے اسے یقین کرنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ شکلتہ سامری کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔

”میں اندر آ سکتا ہوں۔“ اس نے بڑی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

عورت نے ایک لمحہ پس و پیش کیا پھر سامنے سے ہٹ گئی۔ میجر شاہ کے اندر آنے کے بعد اس نے دروازہ بند کیا۔ ایک نیم تاریک راہداری سے گزر کر وہ کشادہ سے گمرے میں نیچے جہاں ایک صوفے کے علاوہ کوئی فرنیچر نہ تھا۔ فرش پر جیتی قالین بچھے ہوئے تھے اور سامنے کی دیوار کے ساتھ کرشن جی کی ایک بڑی سی مورتی رکھی ہوئی تھی۔

”آپ شاید بارش میں پھنس گئے تھے۔“ عورت نے ایک دنواز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”تشریف لائیے۔ میں چائے منگواتی ہوں۔“ میجر شاہ نے مسکرا کر کہا۔ ”شکر یہ چائے کی

زحمت نہ کیجیے میں صرف آپ سے ملنے آیا تھا۔“

”مجھے ملنے یہاں۔“ عورت نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”آپ مجھے جانتے ہیں۔“

میجر نے گردن کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی پوری قوت سے پلٹ کر لات ماری۔ ہلکی سی غراہٹ سنائی دی لیکن میجر شاہ اس کی گرفت سے نکل چکا تھا۔ وہ پھرتی سے ایک سمت ہٹا۔ تاریکی میں کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اس لمحہ ہلکی سی آہٹ ہوئی میڈم خلخلہ سامری تیزی سے ایک دروازے میں غائب ہو گئی لیکن اتنی دیر میں میجر شاہ نے دروازے کی سمت جست لگا دی تھی۔ اس نے دروازہ بند ہونے سے پہلے اس پر لات ماری دروازہ کھلا تو اس نے راہ داری میں خلخلہ کا بھاگتا ہوا سایہ دیکھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ تعاقب کرتا۔ شلوکا کا تاریک وجود سر پر پہنچ چکا تھا۔ میجر شاہ نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس دیوقامت وجود میں بلا کی طاقت ہے اور اگر وہ دوبارہ گرفت میں آ گیا تو نکلنا مشکل ہوگا۔ اس لیے وہ واپس مڑنے کے بجائے برق رفتاری سے اس راہداری میں داخل ہو کر اسی سمت بھاگا۔ جدر خلخلہ لگی تھی۔ راہداری کے اختتام پر ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔ میجر شاہ اندر گھستا چلا گیا اور پھر اگلے ہی لمحے وہ دم بخود رہ گیا۔ ایک وسیع کمرے کے اندر جہاں بہت مدہم روشنی ہو رہی تھی۔ بیس چیمیں افراد فرش پر خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے ایک بلند چوڑے پر ایک تخت کے اوپر نقاب پوش کسی بت کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔ کمرے میں ایک عجیب بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی لیکن موت کی سی خاموش طاری تھی۔ خلخلہ بھاگتی ہوئی اس چوڑے پر پہنچ گئی تھی اس کی نظر میجر شاہ پر پڑی خلخلہ سامری کے لبوں سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

اور اسی لمحے میجر شاہ کے سر پر اتنی زور کی ضرب پڑی کہ وہ چکر اکر وہیں ڈیر ہو گیا۔ وہ بے ہوش نہ ہوا تھا لیکن ہاتھ پیروں میں دم نہ رہا تھا۔ حواس بجا ہوئے تو نقاب پوش کی آواز کانوں سے سکرائی۔

رہا ہوں۔ نوشتابہ کے سینے پر جو نقش کیا گیا تھا۔ تم ہی نے بنایا تھا ناں۔ اس کے قتل کے بعد گودنے کا نشان اسی لیے مٹا دیا گیا تھا کہ تم سے قتل کا کوئی تعلق باقی نہ رہے۔ انکار نہ کرو میں بھی ایک جادو جانتا ہوں۔ جس کا نام ہے پولیس اور اگر تمہارے گھر کی تلاشی سے ثبوت برآمد ہو جائے تو جانتی ہو کیا انجام ہوگا۔ بھائی۔“

خلخلہ کا چہرہ سفید پڑ گیا لیکن وہ بڑی جی دار عورت تھی۔ فوراً ہی سنبھل گئی۔ اس کے لبوں سے ایک نفرتی قہقہہ نکلا اور وہ میجر کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی۔

”تم بڑے دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہو۔ میرا جادو تمہارے سامنے ہے میجر شاہ میری آنکھوں میں دیکھو کیا ان میں تم کو جادو نظر نہیں آتا۔“

میجر شاہ کی نگاہیں جیسے ہی اوپر اٹھیں اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اتھاہ گھرائیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ ایک لمحے کو وہ بے بسی کے عالم میں ساکت رہا۔ پھر اس نے زور سے گردن کو جھٹکا دیا اور اٹھ کر کھڑا ہوگا۔

”نہیں میڈم تم مجھے پتا نا نہیں کرسوگی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میڈم خلخلہ حیرت زدہ رہ گئی تھی۔ پھر اس کی نگاہوں سے خوف جھلکنے لگا لیکن اس لمحے کمرے میں اچانک تاریکی چھا گئی۔ میجر شاہ بڑی پھرتی سے پلٹا لیکن ایسا لگا جیسے اسے کسی نے فولاد کے ٹکچے میں جکڑ لیا ہو۔ اس نے بہت ہاتھ پیر مارے بڑی جدوجہد کی لیکن گرفت سے نہ نکل سکا۔ تاریکی میں اچانک دو مضبوط ہاتھوں نے اس کی گردن دیوچ لی۔ اسے اپنا دم گھٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا لیکن جسم آزاد ہو گیا تھا۔ میجر نے صورت حال کو سمجھتے ہی اپنا جسم بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا اور پھر پوری قوت سے جھٹکا چلا گیا۔ حملہ آور بہت وزنی تھا۔ اس لیے میجر کے ساتھ ہی نیچے گرا۔

نے بندھن کھولتے ہی اس کو گردن سے دو بوج کر اس طرح اٹھا لیا تھا۔ جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہو۔ ریوالور کا کس اسے اپنی پشت پر محسوس ہو رہا تھا۔ چپوترے سے نیچے اتر کر شلوکا نے اسے آگے دھکا دیا۔ اس کا رخ اسے چھوٹے دروازے کی سمت تھا۔ جس پر ایک سیاہ پردہ پڑا ہوا تھا اور میجر کو نیچے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

☆☆

شارق کے سرسکون جسم میں اچانک حرکت پیدا ہوئی۔ ہلکا سا جھٹکا۔ سر ہانے بیٹھے ہوئے بابا صاحب نے حیرت سے اسے دیکھا۔ صوفیہ برابر کھڑی ہوئی تھی۔ شارق نے آنکھیں کھول دیں لیکن ایسا لگتا تھا کہ وہ غلاء میں دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں اتنی دہشت تھی کہ صوفیہ کانپ اٹھی۔ ایسا لگتا تھا۔ جیسے شارق کوئی بھیانک اور ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہو۔

اچانک اس کے لبوں میں حرکت ہوئی۔ وہ دہشت زدہ آواز میں بڑبڑایا۔
”وہ..... وہ میجر، وہ میجر کو قتل کر رہے ہیں۔ وہ اسے مار ڈالیں گے۔“

صوفیہ نے خوفزدہ نگاہوں سے بابا صاحب کو دیکھا۔ انہوں نے سرگوشی میں کہا۔
”جلدی کرو۔ فون کر کے انسپکٹر نواز کو میرے پاس بلا لو۔ جاؤ لڑکی میرا منہ نہ دیکھو۔“

☆☆

شلوکا نے اب تک میجر شاہ کی گردن نہ چھوڑی تھی۔ ریوالور کی نال اس کی پشت سے لگائے ہوئے وہ میجر شاہ کو چکر دار زینے سے نیچے لے جا رہا تھا۔ سیڑھیاں ختم ہوئیں تو وہ ایک بند کمرے میں پہنچ گئے۔ زینے کے علاوہ یہاں سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ کمرے کے عین درمیان میں ایک گول سا دہانہ تھا۔ جس کے گرد چھوٹی سی منڈیر بنی ہوئی تھی۔ اس کنویں نما حوض کے کنارے پہنچ کر وہ رک گئے۔ میجر شاہ نے دیکھا

”تم نے سب کچھ غارت کر دیا۔ عین اس وقت میرے ٹرائس کو توڑ دیا۔ جب میں اسے موت کے شکنجے میں لینے والا تھا۔“

”لیکن یہ..... یہ یہاں پہنچ گیا تھا۔“ شکستہ لہجے میں کاہنتی ہوئی آواز میں میجر شاہ کی سمت اشارہ کیا۔ ”یہ میجر شاہ ہے۔“

اور تب میجر شاہ کو احساس ہوا کہ وہ قربان گاہ کے چپوترے پر بے حس پڑا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو اندازہ ہوا کہ اسے قربان گاہ سے باندھ کر جکڑ دیا گیا تھا۔

”مجھے معلوم ہے..... اور یہ بھی اچھا ہوا کہ یہ خود ہی ہمارے پاس پہنچ گیا۔ ورنہ اس کے ساتھی کو ٹھکانے لگانے کے بعد ہمیں اس کو یہاں تک لانے کے لیے جدوجہد کرنا پڑتی۔“

”لیکن یہ پولیس کی دھمکی دے رہا تھا۔“
نقاب پوش نے ہتھیار لگایا۔ ”جلد ہی یہ کسی قسم کی دھمکی دینے کے قابل نہ رہا جائے گا۔ شلوکا۔“
اس نے جشی کی سمت دیکھا اور کہا۔ ”نائیک بھوکا ہے۔“

شلوکا کے سیاہ موئے لبوں پر ایک بھیانک مسکراہٹ نمودار ہوئی ہلکی روشنی میں اس کے سفید دانت چمک رہے تھے۔ وہ میجر شاہ کے بندھن کھولنے کے لیے جھکا۔

”تم یہ بھول رہے ہو کہ پولیس جلد یہاں پہنچ جائے گی۔“

میجر نے اچانک کہا۔ نقاب پوش نے ایک زوردار ہتھیار لگایا۔ ”پولیس..... تمہارے شلوکا۔ یہ شخص خطرناک ہے۔“ اس نے اپنی عبا سے ایک ریوالور نکال کر شلوکا کی سمت بڑھایا۔

”اگر یہ بھاگنے کی کوشش کرے تو بے دریغ گولی مار دیتا۔“

میجر شاہ کا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ نائیک ایک دیوتا کا نام ہے اور یہ جشی اسے مگرچھ کی غذا بنانے لے جا رہا تھا۔ شلوکا

پار ہوگی۔ وہ میجر کو دھکا دینے کے لیے ایک قدم پیچھے ہٹا ہاتھ بڑھایا اور پھر پوری قوت سے دھکا دیا۔

میجر نے اندازہ کر لیا تھا۔ وہ اسی لمحے کا منتظر تھا۔ جیسے ہی شلوکا نے دھکا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا، میجر شاہ نے پوری قوت سے جست لگائی اس نے کنویں کے درمیانی فاصلے کا اندازہ کر لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اندازے کی ذرا سی غلطی بھی موت کا ذریعہ ہوگی۔ فاصلہ کافی تھا لیکن بچنے کا صرف یہ ہی ایک آسرا باقی تھا۔ ایک لمحے کو یوں لگا جسے وہ تاریک دہانے میں جا رہا ہے لیکن اگلے ہی لمحے اس کے پیر کنویں کی منڈیر سے دوسری جانب ٹکرائے اس نے موت کے کنویں کو پار کر لیا تھا۔ اور دوسرے ہی لمحے شلوکا کی دھڑلش چیخ سے فضاء گونج اٹھی تھی۔

چند لمحے تک میجر زمین پر پڑا رہا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا لیکن جلد ہی اس نے خود پر قابو پا لیا۔ کنویں میں گرنے سے بچنے کی کوشش میں شلوکا نے ریوالور پھینک دیا تھا۔ میجر شاہ نے ریوالور اٹھایا، بیڑھیاں ملے کر کے اوپر پہنچا، وہ جس دروازے سے راہ داری میں داخل ہوا تھا۔ اس کی مخالف سمت بھی ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ جو بند تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے پڑے ہوئے پردے کو ذرا ہٹایا، نقاب پوش بچاری کی پشت اس کے سامنے تھی۔

میجر شاہ کی آواز نے ایک لمحہ کے لیے بچاری کو اپنی جگہ ساکت کر دیا تھا۔ اس کی یہ بات سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میجر کے بجائے شلوکا نائیک کی غذا بن گیا۔ وہ اپنے عمل کو بھول کر نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ترکیب سوچ رہا تھا کہ میجر نے سفاک لہجے میں کہا۔

”ذرا سی حرکت کی تو تم بھی اس جیسی غلے پاس پہنچ جاؤ گے خبردار ہلنا نہیں۔“

بچاری انہیں چاہتا تھا۔ اس کا آخری

کہ کنویں کی گہرائی اتنی تھی کہ کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ شاید یہ ہی اس آدم خور مگر مجھ کی پناہ گاہ تھی۔ جسے نائیک کہتے تھے۔

بھیا نک موت کا تصور کر کے میجر شاہ کانپ گیا۔ شلوکا کی گرفت سے بچ نکلنے کی کوئی امید نہ تھی۔ جدوجہد کے نتیجے میں گلی جسم میں پیوست ہو جاتی۔ نجات کا راستہ مسدود تھا۔ کسی بھی لمحے وہ موت کے دہانے میں جانے والا تھا اور شارق ہسپتال میں بے بس پڑا ہوا تھا۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ وہ کہاں گیا ہے۔ اس نے نواز کو بھی کچھ نہیں بتلایا تھا۔

باہر تمام بچاری ساکت بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ میجر شاہ کی آخری بھیا نک چیخ سننے کے منتظر تھے۔ اور پھر آچانک فضاء میں اتنی دھڑلش چیخ ابھری کہ سب کانپ اٹھے، عبا پوش کے لیوں پر فاتحانہ مسکراہٹ قفس کر رہی تھی۔

”تم قربان گاہ کے چوہرے پر لیٹ جاؤ۔“

عبا پوش نے شگفتا سے کہا۔

شگفتا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ”میں..... میں۔“

”ہاں ڈرو نہیں، میں تمہارے ذریعے اب اپنا آخری عمل کروں گا۔“ وہ مسکرایا۔ ”کوئی قوت میری راہ میں مزاحمت کر رہی ہے۔ کوئی اس بد نصیب میجر کے ساتھی کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اب اس قربانی کے بعد میری قوت بے پناہ ہو جائے گی۔ میں ایک خاص عمل کرنے جا رہا ہوں۔ اس کی قوت کے آگے کوئی مزاحمت نہ کر سکے گا۔“

”اس کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ تم خود اب وہیں پہنچ جاؤ گے۔“ پشت سے ایک آواز سنائی دی۔

☆☆

شلوکا نے میجر شاہ کی گردن چھوڑ دی۔ وہ مطمئن تھا۔ میجر شاہ اس کے ریوالور کی زد میں تھا۔ فرار کی ذرا بھی کوشش کی تو گولی اس کے جسم سے

سہارا بادی کا دیوتا تھا۔ اس کے لب آہستہ آہستہ
ہلنے لگے۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔

میجر شاہ کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔
اس نے ریوالور کی لمبی پرائنگی رکھی ہوئی تھی۔
”ہاتھ بلند کر کے کھڑے ہو جاؤ۔“ اس نے گرج
کر کہا۔

بجاری کھڑا نہیں ہوا لیکن اچانک اس کا ہاتھ
بلند ہوا۔ فضا میں ایک تیز روشنی کا جھماکا ہوا سب
کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ میجر شاہ نے فائر کیا
لیکن گولی ضائع ہوئی کیونکہ بجاری اپنی جگہ موجود نہ
تھا اور پھر میجر شاہ نے بڑا ہولناک منظر دیکھا۔
اچانک دروازے پر سے شعلے نکلنے شروع ہو گئے۔ ہر
چیز جل رہی تھی۔ دروازے پر دے چوترا ہر
طرف آگ ہی آگ تھی۔ بجاریوں کی چیخوں
میں میڈم شکستہ کی دلخراش جج بھی شامل تھی۔ ہر
فحص حزار کی راہ ڈھونڈ رہا تھا لیکن برق رفتاری
کے ساتھ شعلوں نے سب کو گھیر لیا تھا۔ آگ کی
تپش سے میجر شاہ بھی پسینے میں تر ہو چکا تھا۔

اور تب اس کو چوتراے کے نیچے وہ دروازہ
نظر آیا جسے بجاری گھبراہٹ میں بند کرنا بھول گئے
تھے۔ میجر شاہ نے اس میں چھلانگ لگا دی۔

☆☆

بارش کے باوجود میجر شاہ کار کو بہت تیز
رفتاری سے چلا رہا تھا۔ وہ ایک ایسے علاقے میں
پہنچ گیا تھا۔ جہاں شہر کے متمول لوگوں کے بنگلے
تھے۔ اسے خوشی تھی بلکہ محض شبہ کی بناء پر اس نے یہ
پتہ نوٹ کر لیا تھا۔ جلد ہی اس نے ایک چھوٹے
خوب صورت بنگلے کے سامنے پہنچ کر کار روک لی۔
بنگلہ بظاہر تاریک تھا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ میجر شاہ
نے دروازے پر پہنچ کر کھٹکی کا ہٹن دبا یا اور دبائے
رہا۔ ذرا دیر بعد اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔
پھر لائٹ جلی اور گاؤں پہنچے ہوئے ایک شخص نے
دروازہ کھولا۔ ریوالور کی نال دیکھ کر وہ جلدی سے
پچھے ہٹا۔ میجر شاہ نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند

کر لیا۔

”یہ..... یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ میجر۔“
گاؤں پہنچے ہوئے شخص نے غصے میں کہا۔ ”اتنی
رات گئے آپ ریوالور لے کر یہاں کیوں آئے
ہیں۔“

”شکر ہے تم نے مجھے پہچان لیا۔“ میجر شاہ
نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”ریوالور بھی پہچان لیا ہوگا
تمہارا ہی ہے۔“

”میرا ریوالور۔ آپ ہوش میں تو ہیں مجھے
ریوالور کی کیا ضرورت۔“

”بکواس مت کرو، اندر چلو۔“ میجر شاہ نے
کھلے ہوئے دروازے کی سمت اشارہ کیا لیکن میجر
شاہ کو اپنے فیصلے پر اعتماد تھا۔ ”یہ فرض بھی میں خود
ہی ادا کروں گا اندر چلو۔“

وہ جس کمرے میں پہنچے وہ بیڈروم تھا۔ میجر
شاہ نے ہر سمت کا جائزہ لیا۔ ایک لمبے کے لیے
اسے شبہ ہونے لگا کہ اس سے واقعی غلطی ہوئی
ہے۔ پھر اس نے دیوار میں لگی ہوئی سیف کی سمت
دیکھا۔ ”سیف کی چابی نکالو۔“

”مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ جیسا شریف
آدی ڈاکر زنی کر سکتا ہے۔“ اس شخص نے کہا۔

اچانک میجر شاہ آگے بڑھا۔ اس نے ہاتھ
بڑھا کر اس کے بال پکڑے اور ایک جھٹکا دیا۔ سیاہ
بالوں کی وگ میجر شاہ کے ہاتھوں میں آ گئی۔
”اب بھی یقین نہیں آتا۔“ اس نے گاؤں والے
کے بھورے بال دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب وگ پہننا کوئی جرم ہے۔“
”اتنے اچھے بالوں پر وگ کی کیا ضرورت
تھی لیکن وقت ضائع نہ کرو۔ سیف کی چابی دو۔“

وگ والے نے بڑی پھرتی سے جست لگائی
تھی لیکن میجر شاہ اس کے لیے تیار تھا۔ برقی
رفتاری سے ایک سمت ہٹ کر اس نے اپنی ایڈی کو
جنبش دی، ایک پیروگ والے کے گھٹنے پر بڑا۔ وہ
قالین پر منہ کے بل گر ا اور میجر شاہ نے موج نہیں

”شارق سے۔“

”ہاں..... وہ بیہوشی کے عالم میں بھی بول رہا تھا۔ اسی نے بتایا کہ وہ تمہیں ہلاک کر رہے ہیں۔ یہ بابا صاحب تو بہت پہنچے ہوئے آدمی ہیں۔“

”پھر..... پھر کیا ہوا۔“

”وہ عمارت جل کر راکھ ہو چکی ہے۔ کوئی بھی بچ نہیں سکا۔ ہم فائر بریگیڈ والوں کی مدد سے لاشیں نکال رہے تھے۔ میں ان میں تمہاری لاش تلاش کر رہا تھا کہ وائرلیس پر تمہارے فون کا پیغام ملا اور ہم آندمی طوفان کی طرح یہاں پہنچ گئے۔“

”یہ شخص کون ہے۔“

”نوشابہ اور اس کے قاتل کا قاتل۔“ میجر نے کہا۔ ”اور ایسا ایک کے علاوہ ان تمام لوگوں کا قاتل جن کی لاشیں تمہیں ملی ہیں۔“

☆☆

وہ ہسپتال پہنچے تو شارق ہوش میں آچکا تھا اور صوفیہ سے ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ ان کو دیکھتے ہی وہ مسکرایا۔ ”شکر ہے آپ خیریت سے آ گئے۔ میجر شاہ۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”میں بیہوشی کے عالم میں جو کچھ دیکھ رہا تھا۔“

”بے ہوشی نہیں ہوش کے عالم میں۔“ بابا صاحب نے اسے ٹوکا۔ ”تم اس وقت خوفناک سحر کے زیر اثر تھے۔“

”بابا صاحب۔“ انسپکٹر نواز نے کہا۔ ”میری کھوپڑی میں تو یہ کوہر دھند آیا نہیں۔ اب آپ کی کچھ بتا دیجیے کہ کیا چکر تھا۔ یہ سب کچھ کیا تھا۔“

”قصور تمہاری کھوپڑی کا ہے۔ جو اندر سے خالی ہے۔“ شارق نے آہستہ سے کہا۔

انسپکٹر نواز نے اسے بتا دی غصے سے گھورا۔ ”میری کھوپڑے کے اندر کا حال تو پتہ نہیں لیکن تمہاری کھوپڑی تو سر جن کھول کر دیکھ چکے ہیں۔ اندر جانتے ہو کیا بھرا ہوا ہے۔“

دیا۔ ریو اور کا دستہ پلاز کردہ جھکا اور اٹھنے سے پہلے دگ والے کے سر پر ضرب لگائی وہ کراہ کر گر پڑا اور پھر نہیں اٹھا۔ سیف کی بجلی سونے کی زنجیر کے ساتھ اس کے گلے میں پڑی تھی۔ کا پتے ہاتھوں سے میجر شاہ نے سیف کھولی اور مسرت سے اس کی نگاہیں اٹھیں۔

سیف میں رکھے ہوئے رجسٹر میں ان تمام افراد کے نام اور پتے درج تھے جنہیں اب تک پجاری بنایا جا چکا تھا۔ اس میں نوشابہ کا نام بھی درج تھا اور اسی کے ساتھ وہ عبا اور نقاب بھی موجود تھی۔ جو ذرا دیر پہلے وہ مندر میں دیکھ چکا تھا۔ میجر نے بیڈ کے پاس رکھی ہوئی میز پر سے پانی کا جگ اٹھا اور بے ہوش شخص پر الٹا دیا۔ اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔

”اب اٹھ بھی جاؤ مسٹر مائیکل۔ تمہاری خواہش پر میں پولیس کو فون کر چکا ہوں۔“ مائیکل نے خوفزدہ نگاہوں سے ریو اور کی نال اور سامنے رکھی ہوئی عبا اور رجسٹر کو دیکھا۔ اس میں اٹھنے کی سکت نہ رہی تھی۔

”تم حیران تو ہو گے کہ میں نے تمہیں کیسے پہچانا۔“ میجر شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم کو فیشن آرکیڈ کی ملاقات یاد ہے۔ یہ بھی یاد ہو گا کہ میں نے ڈائریکٹر صاحب سے نوشابہ کے بارے میں پوچھا تو تمہیں ناگوار گزرا تھا۔ تم فرم کے مالک نہیں بلکہ ڈیزائن آرٹسٹ تھے۔ تمہارے روپے نے مجھے مشکوک کر دیا اور پھر میں تمہاری آنکھوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ان میں ایسی سونے جیسی چٹیاں میں نے پہلے شلوکا کو میری موت کا حکم دے رہے تھے۔“

اسی لمحے دروازہ کھلا انسپکٹر نواز پولیس والوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

”ہم پہلے کالی گھاٹ پہنچے تھے۔“ انسپکٹر نواز نے کہا۔ ”بابا صاحب نے شارق سے اس جگہ کا پتہ معلوم کر لیا تھا۔“

تھا۔

وہاں سنانی کے مندر میں مصری ساجروں کا فن سیکھا، جس کے ذریعے لوگوں کو اپنے تابع بنا کر جرائم کا ارتکاب کر لیا۔ وہاں جب خطرہ محسوس ہوا تو فرار ہو کر یہاں آ گیا۔ بلا کا چالاک شخص تھا۔ پڑھا لکھا اور فنکار تھا۔ فیشن آرکیڈ میں اس نے ملازمت کر لی آرٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے بڑے گھرانوں کی لڑکیوں سے اس کا رابطہ رہتا تھا۔ جنہیں وہ اپنے مندر کے پجاریوں میں شامل کر کے سحر کے ذریعے مجبور کرتا اور پھر بعد میں بلیک میل کر کے استعمال کرتا تھا۔ نوشاہہ بھی اسی کا شکار بنی لیکن وہ ضدی اور خود سر لڑکی تھی۔ اس نے پوجا کی شرمناک رسموں سے انکار کر دیا۔ اس لیے اسے قتل کر دیا گیا۔ بدرالدین اور الیاس بیک کو اس لیے ہلاک کر دیا گیا کہ وہ نوشاہہ کے جسم پر بنے ہوئے خفیہ نقش کو دیکھ چکے تھے اور تم کو اور مجھے اس لیے ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی کہ ہم ان کی سرگرمیوں کو معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔“ میجر شاہ نے انسپکٹر نواز کی سمت دیکھا۔ ”یہ صرف اتفاق ہی ہے کہ ہم نے بروقت اس گروہ کا قلع قمع کر دیا۔ ورنہ پولیس کا پراسرار جرائم کی بنا پر ناطقہ بند ہو جاتا۔“

”میجر..... آپ نے یہ سب باتیں پولیس سے پوشیدہ رکھی تھیں۔“ انسپکٹر نے شکوہ کیا۔

”اگر میں پہلے سے سب کو بتا دیتا تو یقیناً کون کرتا اور پولیس اگر کوشش بھی کرتی تو ہز بیڈ کا پتہ نہ لگا سکتی۔“

”کیا آپ ہمیں اتنا احق سمجھتے ہیں میجر شاہ۔“

”میجر مروت سے کام نہ لیجیے۔ صاف بتلا دیجیے کہ کتنا سمجھتے ہیں۔“ شارق نے کہا اور کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔



”میرا خیال ہے۔ دونوں کی کھوپڑیوں میں بھس بھرا ہوا ہے۔“ میجر شاہ نے مسکرا کر کہا۔ ”تم کو اندازہ نہیں کہ تم نے کتنے خطرناک گروہ کو ختم کیا ہے۔“

”پلیز میجر ہم یہ جاننے کے لیے چہن ہیں کہ شارق کی کھوپڑی کا یہ حشر ہوا کیسے۔“ صوفیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

میجر ایک لمحے سوچتا رہا۔ ”یہ ماسٹر کیل مصری سحر کا ماہر تھا۔ یہ عمل جو اس نے کیا ایکسپرمینٹ کا کالا جادو ہے جو وہاں کے قبائلی جزیروں میں عام ہے۔ اس کے ذریعے خواہ دشمن کتنے عسکری فاصلے پر کیوں نہ ہو۔ اسے ہلاک کیا جاسکتا ہے۔ آج کے سائنسی دور میں یہ تمام باتیں ناقابل یقین سمجھی جاتی ہیں لیکن بابا جان اس موضوع کے ماہر ہیں اور وہ گواہی دیں گے کہ سحر کا وجود ایک حقیقت ہے۔ کچھ عرصہ قبل آسٹریلیا کے میڈیکل سرجن نے اس عمل پر جو یہ پجاری کر رہے تھے۔ ایک تفصیلی مضمون شائع کیا ہے۔ جس میں کہا گیا تھا کہ اس عمل کے ذریعے ہونے والی اموات کے بارے میں تحقیق کی ضرورت ہے۔“

”لیکن یہ ہے کیا بلا۔“ انسپکٹر نواز نے پوچھا۔

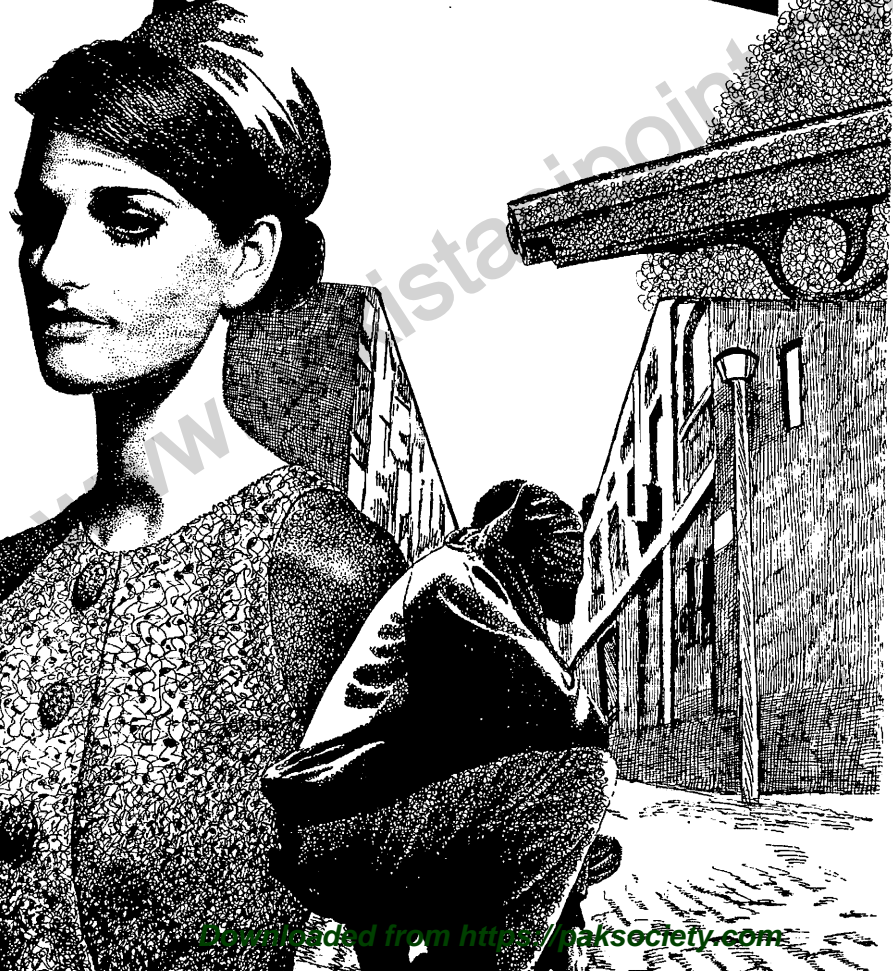
”تم نے ٹیلی پیٹھی یا ای، ایس پی کا نام تو سنا ہوگا۔ ذہن کی اس قوت کے ذریعے فاصلے پر بیٹھے ہوئے انسان سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ اسے کسی کام کی ہدایت کی جاسکتی ہے۔ بالکل اسی طرح کا عمل یہ پجاری اپنے عمل کے ذریعے کرتے ہیں۔ عامل اپنی ذہنی قوت کے سحر کے ذریعے سب کچھ کر سکتا ہے۔ تم سب نے دیکھا کہ پولیس کی ٹرانسپیرنسی سے تصویریں غائب ہو گئیں۔ نوشاہہ کی لاش پھیل گئی۔ شارق مرتے مرتے بچا، یہ ہماری یقین دہانی کے لیے کافی ہے۔ ماسٹر کیل کا اصل نام ہز بیڈ تھا۔ وہ مصری جزیروں کا مشہور ساحر تھا اور کئی اہم افراد کا قتل کر کے وہاں سے بھاگ گیا

روپ بھروپ

ایم اے راحت

جاگیردارانہ معاشرے کے پس منظر میں لکھی جانے والی ایک خوب صورت تحریر جسے پڑھتے ہوئے آپ وقت کا احساس کھو بیٹھیں گے۔ ایک مضبوط جذبوں کی مالک باحوصلہ مگر نازک اندام حسینہ کی روداد اسے اپنی شناخت کی تلاش تھی مگنے اسے اپنا خون قرار دینے پر تیار نہ تھے۔ محبت اور انتقام میں اندھے ہو جانے والوں کا قصہ، ان کے نزدیک انسان کا قتل ہی تمام مسائل کا حل ہے۔

نئے افق کے تارین کے لیے ایم اے راحت کا تحفہ خاص، ایک دلچسپ ناول



کو جانے کا مریض تھا اک اس نے دیکھی سی اور دروازے کے پاس اک کھڑا ہوا تھا۔ یہ دودھ والا ان کے ہاں بھی دودھ دیتا تھا۔ ان دونوں کو کچھ کر تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے کہا۔

”آگ لگ گئی۔“

”ہاں بھائی ہم زندہ بچ گئے۔“ ماں کی روتی ہوئی آواز ابھری۔

”ب..... بچی کہاں ہے تمہاری بہن جی۔“

”یہ ہے میرے پاس۔“ ماں نے کہا۔

”آجاؤ اندر آجاؤ۔ اندر آجاؤ جلدی سے۔“ وہ بولا اور دونوں ماں بیٹیاں اندر داخل ہو گئیں۔ غریب لوگ عام طور سے ایتھے ہوتے ہیں وہی آثار بھی کرتے ہیں۔ وہی مدد بھی کرتے ہیں۔ رمضان نے انہیں بھرپور مدد دی۔ اس نے انہیں ایک بالکل ہی اندرونی کونہ میں چھپا دیا اور پھر بولا۔

”میں کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ تم دونوں یہاں ہو۔ تم بھی جانتی ہو اور میں بھی جانتا ہوں کہ یہ آگ کیسے لگی یا کس نے لگائی۔ خاموشی سے یہاں چھپی رہو۔ اللہ تمہاری مدد کرے۔“ کئی دن تک وہ دونوں ماں بیٹیاں یہاں چھپی رہیں۔ باہر کیا ہو رہا تھا کسی کو علم نہیں تھا۔ کسی نے کیا کیا تھا اللہ جانے اور وہ جانے اور پھر ماں کو تو اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا وہ بھلا کیا

کرئی اور کئے کیا بتائی۔ چوتھے دن رمضان نے کہا۔

”اب تم بتاؤ کہاں جاؤ گی کیا کرو گی؟“

”بھائی رمضان جس طرح بھی بن پڑے مجھے ریل میں

بٹھا دو۔ میں سید پور جانا چاہتی ہوں سید پور میں میرے ایک

جاننے والے ہیں۔ بس ان تک پہنچ جاؤں۔ اللہ نے چاہا تو

سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”بڑی اچھی بات ہے میں انتظام کروں گا تم فکر مت

کرو۔“ رات کی تاریکی میں رمضان نے ان دونوں کو تیل

گازی میں بٹھا کر لے کر سفر طے کیا اور ریلوے اسٹیشن پہنچا دیا۔

اس نے ان دونوں کی مالی مدد بھی کی۔

کافی ترے حصے طے کیا بات کی ایک بھائی سید پور

میں رہتا تھا اور ایک ڈاکٹر کے کھانک میں کام کرتا تھا۔ ڈاکٹر

جمال شاہ بڑا ہی مہربان اور شفیق انسان تھا۔ اپنے ایک بار اپنے

بھائی سے ملنے گئی تھی۔ تو جمال شاہ نے بڑی عزت سے اپنا

مہمان رکھا تھا اور کہا تھا کہ وہ صرف اپنے بھائی کی مہمان نہیں

ہے بلکہ اس کی اپنی بھی مہمان ہے۔ بڑا ہی نیک طبع انسان

تھا۔ بھائی تو مر گیا تھا۔ لیکن امینہ کو جمال شاہ کی شرافت یاد تھی۔

وہی اس کے ذہن میں آیا تھا۔ بہر حال روپ نہ کرے سید پور

تک کے فاصلے طے ہو گئے۔ مسجد دار عورت بھی ٹیکنک کا پتا

شیشوں کے باہر ایک پراسرار پرسکوت روکی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ روشنی چاند کی تھی اور بھلا جانہ رنگوں پابندی لگا سکتا ہے۔ ورنہ رات کو جنرل وارڈ کے اس عجیبے میں روشنی جلانے کی اجازت نہیں تھی کہ وارڈ کے مریضوں کی نیند خراب نہ ہو۔ وہ بہت دیر سے باہر پھیلی ہوئی اس روشنی کو دیکھ رہی تھی۔ دوسری طرف پھولوں کے سج تھے اور مدہم مدہم ہوا چل رہی تھی۔ گھنٹیوں پر کھلے ہوئے پھول جھوم رہے تھے۔ کیا خوب صورت زندگی ہے ان کی۔ بے شک چھوٹی سی لیکن مکمل طور پر اپنی۔ کوئیں آئیں پھول مکھلے اور بس مر جھان گئے۔ جھگڑا ختم نہ چچین ہے نہ جوانی نہ بڑھاپا۔ انسان اپنی تقدیر کے بھنور میں پھنسا ہوا ہے۔ پھولوں کی کوئی تقدیر کیوں نہیں ہوتی۔ کتنا بے بس ہوتا ہے یہ انسان تقدیر کے ہاتھوں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اس کی نگاہیں ماں کے بستر کی طرف اٹھ گئیں۔ سوکھا ہوا خشک چہرہ تجھے ہوئے ہونٹ آنکھوں کے گرد جلتے زندگی بھر کا خلاصان نفوس میں خیر اور اس کے بعد یہ بند آنکھیں اور بھاری بھاری چلتے ہوئے سانس میرے اس مصرعے کے مطابق کہ

”ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے۔“

ماں بھی کچھ اسی انداز میں کمری کمری لہری لہری رہی تھی جیسے وہ سونا چاہتی ہو جیسے جاتے جاتے ٹھک گئی ہو۔ کیا زندگی کواری سے میری ماں نے بھی ایسا نہیں ہوئے سے پہلے کا ماضی کیا تھا۔ ہوش تو ڈاکٹر جمال شاہ کے ہنگامے ہی آیا تھا۔ ڈاکٹر جمال جیسے فرشتہ صفت انسان کو۔ اللہ اس کو عطا دے۔ بڑی عزت دی تھی اس نے ان دونوں ماں بیٹیوں کو بے شک اس عالیشان ہنگامے کے سرورٹ کواریز میں ہی انہیں جگہ ملی ہوئی تھی لیکن اس کے علاوہ اور کوئی تکلیف نہیں تھی۔ ماضی کے سنے مئے نقوش بھی بھی آنکھوں میں آجاتے اور پلے پلے رنگ کے شعلے فضا میں ابھرتے دکھائی دیتے۔ بتائیں کیا عمر تھی اس کی آگ لگی تھی گھر میں اور وہ سوری تھی۔ بس ذرا سی دیر باقی تھی کہ آگ انہیں اپنی لیڈ میں لے لے کر جاگ گئی تھی اس لیے سے اپنے نزدیک میں آجوتا تھا۔ وہ اسے اٹھا تو نہیں سکی تھی کیونکہ خود زندگی بھر اس کی ہڈی باہر لے گئی تھی اور پھیلے دروازے کی طرف بھاگ گئی تھی۔ سانس کی سمت آگ ہی آگ تھی اور اس آگ سے زندہ بچ لگنا بڑا مشکل تھا لیکن پھیلے دروازے تک رسائی ہو گئی اور وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔ جان بچ گئی تھی دونوں کی تن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہیں تھا ان کے پاس پھر سب سے پہلے رمضان دودھ والا ملا تھا۔ جس کا گھر زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور جو راتوں

”وہ مر گئے بیٹی اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔“ مگر یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے ماں کا لہجہ بڑا عجیب ہوتا تھا۔ پہلے تو خیر یہ بات سمجھ میں ہی نہیں آئی تھی لیکن ماں کے الفاظ پر اسے نہ جانے کیوں یقین نہیں آتا تھا۔ بہر حال اب کچھ بھی نہیں رہا تھا اور وہ سوچوں میں گھری رہتی تھی۔ چنانچہ کیا کیا خیالات اس کے ذہن میں آتے رہتے تھے۔ ماں کی موت کے بعد ماں کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجتے۔ تو وہ ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہو جاتی۔ ابھی تم نہیں سمجھ سکتیں ماریہ۔ بڑی ہو جاؤ گی تو سب کچھ بتا دوں گی۔ جب بھی اپنے باپ کے بارے میں وہ بات کرنی ماں کچھ اسی طرح کے جوابات دیا کرتی تھی لیکن اس وقت اس کی آنکھوں میں کرب جاکٹ اٹھتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے سارے وجود میں درد سہا رہا ہو۔ بہر حال یہ سارے معاملے اسی طرح چلتے رہے وہ نرس کی ڈیوٹی سرانجام دیتی رہی۔ یہ بھی ڈاکٹر جمال شاہ نے اس پر احسان کیا تھا کہ وہ ایک کوالیفائیڈ نرس تھی۔ ورنہ اس جیسی بے سہارا لڑکی کو کون پوچھتا۔

اس شام بھی وہ ایسے ہی بیٹھی ماں کی یادوں کو رید رہی تھی کہ اسے ردی کاغذوں میں ایک تہہ کیا ہوا کاغذ ملا۔ اس پر اردو زبان میں ایک ٹوٹی پھوٹی تحریر لکھی ہوئی تھی۔ ایک ایسی تحریر جس سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ کسی بہت ہی کم تعلیم یافتہ انسان نے یہ سب کچھ لکھا ہے۔ وہ اس تحریر کو پڑھنے لگی اور اس کی آنکھوں میں عجب سے تصورات جاگ اٹھے۔ آہ کاش بہت پہلے ماں کی زندگی میں وہ یہ کاغذ دیکھ لیتی اس میں کچھ ایسی تحریر تھی جس سے کچھ شاہد ملتے تھے لیکن اس کاغذ کا تذکرہ اس نے کسی سے بھی نہیں کیا۔ جمال شاہ سے بھی نہیں۔ البتہ اس دن اس نے جمال شاہ سے جو بات کہی اس نے جمال شاہ کو کبھی حیران کر دیا۔

”انکل آپ کی اجازت سے میں کچھ دن کے لیے روپ نگر جانا چاہتی ہوں۔“ جمال شاہ نے چونک کر اسے دیکھا پھر آہستہ سے بولا۔

”لیکن کیوں؟“

”بس انکل! میرا دل چاہتا ہے کہ وہاں جا کر میں اپنے باپ کے بارے میں معلومات حاصل کروں۔ جمال شاہ سوچ میں ڈوب گیا پھر اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

”بھئی! تمہاری مرضی ہے میں تمہیں روکوں گا تو بالکل نہیں۔ لیکن ایک بات کہوں وہ جگہ تمہارے لیے محفوظ نہیں ہے۔“

”کچھ بھی ہو انکل آپ نے میری پرورش کی ہے آپ کی

معلوم کر کے وہاں جا رہی تھی۔ چھوٹا سا کلینک تھا۔ جمال شاہ نے پرائیویٹ طور پر اسے گھر کے سامنے کھول رکھا تھا لیکن اصل میں وہ سرکاری اسپتال میں ملازمت کرتا تھا۔ اتفاق کی بات یہ کہ امینہ کو اپنے کلینک میں ہی بل گیا۔ امینہ نے اسے اپنی بیٹا سناٹی اور جمال شاہ نے کہا۔

”نہیں بہن ٹھیک ہے تمہارا بھائی اب اس دنیا میں نہیں ہے لیکن میں بھی تمہارا بزرگ ہوں۔ فکر مت کرو۔ آؤ یہاں آرام سے رہو۔“

انتسابہ رامل جانا۔ زندگی کی معراج تھی ایسے بے سہارا لوگوں کے لیے۔

سروٹ کوارٹر میں امینہ کو پچھادیا گیا اور اس کے بعد ایک نئی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد امینہ نے منت خوشامد کر کے اپنے لیے اس گھر میں کام تلاش کر لیا۔ حالانکہ ڈاکٹر جمال شاہ نے کہا تھا کہ کام دام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ آرام سے یہاں رہے ایک انسان کا خرچ اٹھانا کوئی مشکل نہیں ہے اس کے لیے لیکن امینہ نے جب تک اس کے اعصاب کام دے سکے۔ ڈاکٹر جمال شاہ کے گھر کے بہت سے مسئلے سمیٹ لیے صفائی ستھرائی دوسرے امور جہاں جو کام دیکھا وہاں مصروف ہو گئی۔ ماریہ بڑی ہوئی گئی۔ جمال شاہ نے خود ہی اس کے لیے ٹیوشن وغیرہ کا بندوبست کیا اور دنیا کے رموز سے آشنا کیا اور اس کے بعد اس نے اسے نرس کی تربیت دینا شروع کر دی۔ وقت پر لگا کر اڑ جاتا ہے۔ ماریہ جوان ہو گئی۔ جمال شاہ نے اسے اپنے کلینک میں نہیں رکھا تھا بلکہ اسے سرکاری اسپتال میں نرس کی ملازمت دلوا دی اور جب امینہ بیمار ہوئی تو جمال شاہ اسے سرکاری اسپتال میں لے آیا جہاں ہر طرح کی مراعات موجود تھیں۔ ماریہ ڈیوٹی کے علاوہ بھی اپنی ماں کی دیکھ بھال کرتی تھی لیکن ماں کی حالت زیادہ سے زیادہ خراب ہوئی جا رہی تھی اور اب وہ ایک سو کھے ہوئے درخت کی مانند تھی۔ ہوا کے دوش پر رکھا ہوا چراغ تھی۔ آخر کار چراغ بجھ گیا اور ماریہ کی دلدرد چیخیں بہت سے دلوں کو ہمدردی پر آمادہ کرنے لگیں۔ لیکن بہر حال صبر ایک مجبوری کا نام ہوتا ہے۔ انسان صبر نہ کرے تو کیا کرے۔ لوگ تاقین بھی اسی کی کرتے ہیں۔ خود جمال شاہ بھی یہی کہتا تھا کہ بیٹی صبر کرو اپنے آپ کو یہاں تنہا نہ سمجھو۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ وقت تمہارا فیصلہ خود کرے گا ماریہ کے ذہن میں سوچوں کے بھنور پڑتے رہتے تھے۔ کئی بار اس نے ماں سے باپ کے بارے میں پوچھا تھا۔

”امی ابوکہاں ہیں؟ میرے ابوکہاں چلے گئے؟“

حق نہیں رکھتا۔

”میں اکل حق تو آپ رکھتے ہیں۔ آپ نے ہم نے سہارا ماں بنی کو جس طرح اپنے قدموں میں جگہ دی اور انی محبت سے نواز ا کوئی بہت ہی پاس انسان ہوگا جوان باتوں کو بھول جائے اور میں نا پاں نہیں ہوں۔

”اچھا اچھا یہی تم ہی انی ہی ہو۔ جاؤ میں پوری خوشی کے ساتھ تمہیں اجازت دیتا ہوں۔“

روپ نگر کے بارے میں انہوں نے بہت سی باتیں کہیں اور انہوں نے اپنے ذہن میں روپ نگر کے کچھ مٹے مٹے نقشے تھے۔ اس نے ذریعے روپ نگر تک جایا جاسکتا تھا لیکن لوہی بس براہ راست روپ نگر میں جاتی تھی۔ بلکہ مرید پور اور اس کے بعد سیگانامی قصبوں سے گزر کر روپ نگر تک پہنچا جاسکتا تھا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے اندر اعتماد پیدا کیا۔ حالات کچھ بھی ہوں وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی ماں کا گھر کس نے جلایا۔ اس کا باپ اس انداز میں کہاں غائب ہو گیا۔ کچھ نہیں معلوم تھا اسے۔ بہر حال وہ گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ بس کے ذریعے مرید پور پہنچی۔ گنجان آبادی والا یہ مختصر سا شہر اس کے لیے اچھی تھا۔ ایک جگہ اس نے فحشوں کیا کہ کچھ شہریر نگاہیں اس کے سر پرے کا جائزہ لے رہی ہیں۔ دو تین لنگے قسم کے آدمی اس کے فریضے بھی پہنچ گئے۔ کسی نے آواز کس دی۔ خالص گھیر ملوڑی نہیں تھی۔ اسپتال میں مریضوں کے ساتھ ذیل کرتی تھی۔ اس کی بھلی نگاہوں نے ان غنڈوں کو خوفزدہ کر دیا اور وہ پیچھے ہٹ گئے۔

ساڑھے بارہ بجے کے قریب اسے دوسری بس مل گئی جو سبک قصبہ تک جاتی تھی اور تقریباً پونے دو گھنٹے کے بعد اس بس نے اسے روپ نگر کے موڑ پر اتار دیا اور وہ اپنا سوٹ کیس اٹھا کر روپ نگر چل پڑی۔ معلومات کے مطابق اسے روپ نگر تک جانے کے لیے کوئی چار کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنا تھا اور وہ بھی پیدل۔ وہ کچھ دیر تک سوچی رہی اور پھر اس نے آگے قدم بڑھائے۔ اس سنسان سڑک پر وہ اکیلی تھی۔ وحشت زدہ نگاہوں سے وہ چاروں طرف دیکھ رہی تھی کہ کہیں سے کوئی نمودار ہو جائے۔ تا حد نگاہ کسی انسان کا نشان نہیں تھا۔ اس سنسان دوپہر میں آبادی سے میلوں دور اپنے آپ کو تنہا پا کر اس پر وحشت سی سوار ہونے لگی تھی۔ راستہ بہت زیادہ ہموار نہیں تھا اور آگے چل کر یہ پتلی سی سڑک چٹانوں میں بل کھاتی کہیں بلند یوں اور کہیں پتھروں کو سینے ہوئے روپ نگر تک جاتی تھی۔ اس نے اپنا سوٹ کیس سنبھالا اور اپنی دانست میں تیز قدم اٹھانے لگی۔ شدت کی گرمی میں یہ بین چار کلو میٹر کا

ترتیب نے مجھے بہت بہادر بنادیا ہے۔ اکل میں دنیا کی کسی چیز سے نہیں ڈرتی آپ یقین کریں میں بہت باہمت ہوں۔“

”تمہاری مرضی ہے مگر کیا میں تمہیں ڈرائیور کے ساتھ وہاں بھیجوں۔“

”نہیں اکل۔“

”پھر یوں کرو گاڑی تم خود لے جاؤ۔ روپ نگر کے راستوں کے بارے میں تمہاری معلومات۔۔۔۔۔“

”میں اکل، اکل نہیں۔ میں جس حیثیت کی مالک ہوں اس حیثیت سے روپ نگر جاؤں گی۔ آپ نے بے شک مجھے کار چلانا سکھادیا ہے لیکن اکل ماں بھی ہمیشہ یہی کہا کرتی تھی کہ کسی کی محبت سے ناجائز فائدہ ہاں اکل نہیں اٹھانا چاہیے اور ویسے بھی اکل اگر میں اس سچ دج کے ساتھ اپنے آپ کی کاؤں لگی تو میری شخصیت مشکوک ہو جائے گی۔“

”وہ کسے؟“ جمال شاہ نے سوال کیا لیکن ماریہ نے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ تو بس اپنے طور پر اپنی پسند کے مطابق روپ نگر جانا چاہتی تھی۔ جہاں سے اسے اس کے خیال کے مطابق اپنے باپ کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ ڈالر جمال نے کہا۔

”مجھے روپ نگر کے بارے میں زیادہ معلومات تو حاصل نہیں ہیں لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ ایک غیر معروف سی جگہ ہے اور وہاں تک جانے کے راستے بھی مشکل۔ تم پہلے بھی وہاں نہیں گئی ہو۔ میرا مطلب ہے جب تمہاری والدہ وہاں سے تمہیں لے کر آئی تھیں اس کے بعد سے آج تک ان راستوں کا تعین تمہارے لیے مشکل کام ہوگا۔ ماریہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

”اگل میری شخصیت کی تشکیل آپ نے اور میری امی نے کی ہے لیکن آپ نے جس شعبے سے مجھے منسلک کر دیا۔ یعنی نرسنگ کے شعبے سے اس میں تھوڑا سا ایڈوٹر بھی ہے۔ اکل سائنڈ نہ سمجھے گا۔ ہمارا واسطہ طرح طرح کے مریضوں سے بڑتا ہے۔ وہ ہمیں اپنے تجربات سے بھی آشنا کرتے ہیں اور اکل زندگی میں جتنی بھی مختصر ترین یہی معلومات حاصل ہو سکی ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ انسان کو ہر حالت میں اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے اور اپنے آپ کو آزمائشوں میں ڈالتے رہنا چاہیے۔ اس طرح زندگی میں بہت سی آسانیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ جو شخص آزمائشوں میں ہی نہ بڑا ہو اسے کیا معلوم کہ آزمائش کیا چیز ہوتی ہے۔“ جمال شاہ ہنسنے لگا پھر بولا۔ ”اور جو کچھ ہے یا نہیں ہے لیکن تم باتیں بہت اچھی کر رہی ہو تمہاری مرضی ہے میں تمہیں کسی بھی سلسلے میں جتنی کے ساتھ منع کرنے کا کوئی

فاصلہ ایک قیامت تھا اور اس کی نگاہیں امید بھرے انداز میں دو دروازے تک اٹھ جاتی تھیں۔ اسے پتا چلتا تھا کہ روپ نگر سے اس میں روڈ تک گھوڑا گاڑیاں اور بیل گاڑیاں وغیرہ جاتی ہیں۔ اس جگہ تو اسے کوئی بیل گاڑی نہیں ملی تھی جہاں بس نے اسے اتارا تھا لیکن گھوڑوں کی لید اور بیلوں کو گوبرا سے یہ احساس دلا رہا تھا کہ بات تھوڑا بہت فاصلہ طے کرنے کے بعد کہیں نہ کہیں یہ بن ہی جائے گی لیکن اب اسے چلتے ہوئے بہت دیر گزر چکی تھی اور ابھی تک راستے میں کسی قسم کی کوئی سواری نظر نہیں آئی تھی۔

گرمی کی شدت سے اسے اپنا دماغ پگھلتا محسوس ہو رہا تھا۔ اٹھنے والا ہر قدم ایک نئی کیفیت کا حامل تھا۔ پیاس سے اس کی زبان سوکھ کر کاشے کی طرح حلق میں چبھنے لگی۔ ان پہاڑوں میں کہیں نہ کہیں کوئی ایسا چشمہ یا نالہ وغیرہ ضرور ہوگا جس میں پانی مل سکے مگر وہ سڑک نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ جب وہ ایک چٹانی موڑ سے دوسری طرف گھومی تو اچانک ہی اس کے دل میں خوشی کا ایک احساس جاگ اٹھا تھوڑے فاصلے پر چل کر یہ چٹانوں کا سلسلہ اچانک ہی ختم ہو جاتا تھا اور سامنے نشیب میں وہ سبزہ زار نظر آرہے تھے۔ جن کے بارے میں اسے معلوم ہوا تھا کہ بس انہی کے درمیان روپ نگر آباد ہے۔ تھوڑے فاصلے پر درختوں کے جھنڈ پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے جہاں تک روپ نگر کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں ان کے تحت جب درختوں کے یہ سلسلے نظر آجائیں تو اس کے بعد روپ نگر زیادہ دور نہیں رہ جاتا اور اسے یقین تھا کہ وہ اپنی منزل سے زیادہ دور نہیں ہے۔ جوں جوں قدم آگے بڑھ رہے تھے اسے سبزہ زار پھیلے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اب اس کے دائیں بائیں لہلہاتے ہوئے کھیت نظر آنے لگے تھے جن کے اس بار درختوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ وہ تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی کافی آگے نکل آئی۔ سامنے ایک چھوٹی سی ندی نظر آرہی تھی جس کا شفاف پانی اسے دعوت دے رہا تھا کہ وہ شدت کی پیاس بجھائے۔ تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی آخر کار وہ ندی کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے سوٹ پیس ایک جگہ رکھا اور ڈھلان میں اتر کر ندی کے کنارے بیٹھ کر چلو بھر بھر کر پانی پینے لگی۔ شفاف اور شیریں پانی کے پہلے گھونٹ نے ہی اسے یہ احساس دلایا کہ زندگی کیسی کیسی نعمتوں سے آشنا ہو جاتی ہے اس نے پانی پینا۔ چلو بھر کر چہرہ اور گردن بھگوئی ہاتھ جہاں تک کھلے ہوئے تھے وہاں تک دھو لیے۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ خاصی تازہ دم ہو گئی تھی۔ اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹکتی لگیں اور پھر دفعتاً ہی اس کے دل کو

دھکا سا لگا۔ روپ نگر جہاں وہ پیدا ہوئی جہاں اس کی ماں نے زندگی کے نشیب و فراز گزارے یہاں کی ہوا میں اسے اپنے وجود میں ماں کی آغوش جیسی محسوس ہونے لگیں اور اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ دل نے عجب سے انداز میں دھڑک کر اسے احساس دلایا کہ بہت کچھ بچھن چکا ہے۔ اس نے آنسو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ماں کا تو وجود ہی ختم ہو گیا تھا۔ کوئی نہیں تھا اس کا۔ باب کی اس نے صورت تک نہیں دیکھی تھی پہلے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کا باپ کون تھا۔ ماں سے حال انا کہ وہ بڑی بے تکلف ہو گئی تھی لیکن نہ جانے کیوں جب بھی کبھی باپ کا تذکرہ آتا۔ ماں کچھ نہیں بتاتی تھی۔ بس اتنا بتایا تھا اس نے کہ وہ روپ نگر میں ہی پیدا ہوئی ہے۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ روتی رہی کاش روپ نگر میں اسے اپنے بارے میں کچھ معلوم ہو جائے۔ وہ جان لے کہ ماں کون تھی؟ اور باپ کون تھا؟ بہت دیر تک وہ اسی طرح روتی رہی۔ پھر اچانک چونک بڑی۔ اس خاموش اور سسٹان ویرانے میں کوئی بھی حادثہ پیش آسکتا تھا۔ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی بھی بعض اوقات عذاب بن جاتی ہے۔ اچانک اس کی نگاہ آسمان کی جانب اٹھ گئی۔ مغرب کی طرف سے اچانک ہی گہرے کالے بادل اٹھنے لگے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آبادی اب بھی فاصلے پر تھی اور اس کا بارش سے قبل آبادی تک پہنچنا ضروری تھا۔ چنانچہ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ جیسے ہی وہ ڈھلوان سے اوپر ابھری اچانک ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک لمبے چوڑے بدن کا جوان آدمی کھڑا ہوا تھا۔ قد اچھا خاصا بدن کی حد تک دیرلا پتلا بڑے بڑے لمبے بال جڑوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی۔ آنکھوں میں بھی ایک عجیب سی چمک تھی۔ ایک نگاہ دیکھنے سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ کوئی شریف آدمی نہیں ہے اور پھر اس طرح اس کا یہاں پہنچنا بھی بڑا ہی سنسنی خیز تھا۔

ماریہ کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے خوف کے آثار پھیل گئے۔ اس نے دیکھا کہ وہ بھی گہری نگاہوں سے ماریہ کا جائزہ لے رہا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک سنگین جرائم پیشہ شخص کے نقوش نمایاں تھے اور یہی طور پر وہ اس وقت اسے اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر جمال شاہ نے اس خطرے سے آگاہ کیا تھا لیکن وہی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی اچانک اس کی آواز ابھری۔

”تو کون ہے لڑکی! یہاں کیا کر رہی ہے۔“ اس کی آواز میں غراہٹ تھی۔ ماریہ جواب دینے کے بجائے ندی کے کنارے کنارے ایک طرف ہٹنے لگی۔ اس شخص نے اسے غور

”میں پاگل نہیں ہوں مگر تو مجھے ضرور پاگل بنا دیے گی۔ میں نے تجھ سے صرف ایک سوال کیا تھا اس میں تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گا۔ بس تجھے اپنے بارے میں بتا دے کون ہے تو؟“ اس نے عجیب سی وحشیانہ نگاہوں سے ماریہ کو دیکھتے ہوئے کہا اس کی انگلیاں ماریہ کے بازوؤں میں گڑھ جاری تھیں۔ وہ اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

”ہاں وہی لگ رہی ہے بالکل وہی ہے لیکن بھلا تو وہ کیسے ہو سکتی ہے۔“

اب ماریہ کو احساس ہوا کہ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی وحشت اس کی دیوانگی کا اظہار کرتی ہے۔ اس نے اس کے لباس پر بھی غور کیا۔ یہ تو واقعی پاگل ہے۔ ایک بار پھر ماریہ کی آنکھوں میں وحشت تیرنے لگی۔ اس سے بجائے کیسے ممکن ہے ایک ہوش منید آدمی سے تو مناجا جاسکتا ہے لیکن ایک پاگل آدمی..... کہیں واقعی اسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ ایک بار پھر اس نے موقع تاکا اور اچانک ہی اس شخص کی ناک پر ایک زور دار گرر رسید کر دی۔ اس کی ناک سے خون بہہ نکلا اور اس نے ماریہ کا بازو چھوڑ دیا۔ ماریہ نے ایک بار پھر بھاگنے کی کوشش کی لیکن وہ پھسل کر اس کے سامنے آ گیا۔ اب بھی اس کے چہرے پر کسی خوف یا تکلیف کے آثار نہیں تھے۔ بلکہ خون آلود چہرہ پہلے سے زیادہ ہسیانہ لگنے لگا تھا۔ اس نے خلاف توقع کسی قدر نرم لہجے میں کہا۔

”بہادر لڑکی! تو بتا تو دے کہ آخر تو کون ہے؟ میری بات کا جواب دے بغیر تو آگے نہیں بڑھ سکتی۔“

”سنو اگر تم اس سے زیادہ مار کھانا چاہتے ہو تو میں اس کے لیے تیار ہوں۔ تم میرے ساتھ کوئی بد تمیزی نہیں کر سکو گے۔ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ تمہارا جاننا ضروری نہیں ہے۔ البتہ اگر مناسب سمجھو تو اپنے بارے میں بتا دو تاکہ میں تمہارے ساتھ زیادہ قریبی نہ کروں۔“

”دیکھو مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں! میں کیا بتاؤں تمہیں! میرا نام بلاول ہے۔ یوں سمجھ لو وہ پنگر کی آدمی نہیں میری ملکیت ہیں۔ میں زمیندار ہوں یہاں کا۔ میرے لباس پر مت جاؤ۔ میں بے پروا آدمی ہوں۔ میں تمہیں دیکھ کر پریشان ہو گیا ہوں۔ بھئی میں تمہارا راستہ نہ روکتا اگر تم میرے لیے باعث پریشانی نہ بن جاتیں۔ سنو اگر تم سوچنا نہیں ہو تو..... تو میں جانا چاہتا ہوں کہ آخر تم کون ہو؟“

”سوچنا۔“ ماریہ نے کہا۔
”ہاں کم کی واقعی سوچنا نہیں ہو۔“

سے دیکھا اور تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ ماریہ کے حلق سے ایک وحشت ناک چیخ نکل گئی تھی وہ ماریہ کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ ماریہ مسلسل پیچھے ہٹ رہی تھی۔ اچانک اس نے ہاتھ بڑھا کر ماریہ کا بازو پکڑ لیا۔

”رک جا کہاں مر رہی ہے۔“ لہجہ انتہائی کرخت اور انداز بد تمیزی کا تھا۔ ماریہ دوسری بار کوشش کے باوجود نہیں پیچھے ہٹ سکی تو وہ بولا۔

”جواب نہیں دیا تو نے۔ کیا کر رہی ہے یہاں اکیلی اور کون ہے تیرے ساتھ۔“ اس نے ماریہ کے بازو کو زور سے جھکادیتے ہوئے کہا۔

ماریہ کے بدن کو شدید جھٹکے لگ رہے تھے۔ وہ اپنے آپ کو خوف سے دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس شخص کی بات کا جواب دینے کے بجائے وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اب اسے اپنی مدافعت کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ پھر دفعتاً ہی اس کے اندر ایک وحشیانہ جنون جاگ اٹھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا کہ جس اعتماد کے ساتھ اس نے جمال شاہ سے کہا تھا کہ میں ہر طرح کے حالات سے نمٹنا جانتی ہوں اسی اعتماد کا ثبوت دینا چاہیے اور پھر وہ کوئی گھر بلاؤ کی نہیں تھی۔ بھانت بھانت کے مریضوں سے اس کا واسطہ پڑتا تھا۔ تھوڑی سی انسان شناسی بھی لگی تھی اور تھوڑے سے نفسیاتی ڈباؤ سے بھی واقف ہو گئی تھی۔ ابھی ایسے مریض بھی آ جاتے تھے جو صرف تفریح باز ہوتے تھے اور اسپتال میں نرسوں کے ساتھ شرارتیں کرنے کے لیے داخل ہو جایا کرتے تھے۔ کئی بار ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا لیکن نرسوں کو اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ ایسے افراد کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے۔ اچانک ہی اس نے اچھل کر اس شخص کے پیٹ پر جوتے کی ٹھوک ماری اور اس کے حلق سے ایک کراہ نکل گئی۔ وہ پیٹ پکڑ کر پیچھے ہٹا اور کسی پتھر سے ٹکرا کر سیدھا سیدھا لپٹ گیا۔ ماریہ نے سب کچھ بھول کر پلایا کی طرف چھلانگ لگادی۔ لیکن گرنے والا ایک دم اٹھ گیا تھا اور اس بار اس نے خاصے خطرناک انداز میں ماریہ کا پیچھا شروع کر دیا تھا۔ پھر ایک لمبی چھلانگ لگا کر اس نے ماریہ کو دوبارہ گرفت میں لے لیا اور پوری قوت سے دبوچ کر اسے اپنے سامنے کر لیا۔

”حرام زادی! بہت زیادہ جالا کہنے کی کوشش کر رہی ہے۔ شکل بگاڑ کر رکھ دوں گا اگر کوئی حرکت کی۔“

ماریہ نے اب اپنے آپ پر قابو پایا تھا۔ وہ خونی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی پوئی۔ ”پاگل کے بچے پیچھے ہٹ جا۔ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تو پاگل ہے۔“

نے اس بات کا اظہار کیا تھا اور پھر بچی..... بچی پھر وہ اس کی ماں کے بارے میں بھی جانتا تھا۔ کیا عجیب باتیں ہیں۔ کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی۔ پھر جب بارش کا پہلا قطرہ اس کے ہاتھوں پر پڑا تو اسے سوچوں کی دنیا سے باہر آنا پڑا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی دھولان سڑک پر چلنے لگی۔ آبادی زیادہ دور نہیں تھی اور اگر تیز رفتاری سے سفر کیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ بارش کے ساتھ ساتھ ہی وہ آبادی تک پہنچ سکے شکر تھا کہ بوندا باندی ہو رہی تھی اور ابھی تیز بارش کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ البتہ جب وہ روپ گھر کے سرے پہنچی تو اچانک ہی بارش ہوا کے ساتھ تیز ہو گئی۔ وہ اگر جاتی تو پناہ لینے کے لیے کسی بھی گھر میں سہی سکتی تھی۔ دیہاتی لوگ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں لیکن اس نے ابھی اس سے گریز کیا وہ کسی طرح سے ابھی ان لوگوں میں نہیں گھلنا چاہتی تھی۔ اس کی نگاہیں چاروں طرف بھٹکتی لیکن اور اسے خوش بختی ہی کہا جاسکتا ہے یا اس سرے کے مالکان کی زبانت کہ انہوں نے آبادی کے سرے پر ہی یہ سرے بنائی تھی اور ایک جگہ دیوار پر سرے لکھا ہوا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس سرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ کوئی معمولی سی ٹھکانا جگہ ہوگی لیکن دیوار پر لکھی ہوئی سرے کے نام کی تختی اسے اس جانب لے گئی۔ دروازہ بند تھا اس نے دروازے کو زور سے بجایا تو فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ اسے اپنے سامنے ایک خوب صورت نقوش والی الہڑی لڑکی نظر آئی جس کی عمر بائیس تینیس سال سے زیادہ نہیں ہوئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا اور اس کے پیچھے بھاگنے لگی۔ پھر بولی۔
”اور کون ہے تمہارے ساتھ۔“
”کوئی نہیں۔“

”اندر آ جاؤ۔“ بارش میں اس طرح سے آرام سے بیٹھ کر بیٹھ کر ہوا پر بڑھاؤ کی۔ لڑکی کے لہجے میں ایک عجیب سی بے تکلفی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اندر داخل ہوئی۔ اس نے کہا۔
”میں یہاں ٹھہرنا چاہتی ہوں۔“

”میں نے کہا نا بھٹکنے کی بہت زیادہ شوقین معلوم ہوتی ہو۔ برا آدمے میں آ جاؤ ٹھہر جاؤ گی۔“ لڑکی شوق لہجے میں بولی اور ہاتھ بڑھا کر اس کا اپنی پیس اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لڑکی کے الفاظ اور اس کے انداز نے ماریہ کے اندر ایک خوشگوار کیفیت پیدا کی اور اس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ آ گئی اور وہ اس کے پیچھے چلتی ہوئی ایک کمرے کے دروازے تک پہنچ گئی۔ کمرہ خاصا کشادہ اور بہترین تھا۔ ماریہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میرا نام ماریہ ہے۔ سو نیا کون ہے یہ میں نہیں جانتی اور لیکن تم یہ سب کچھ کیوں جانتا چاہتے ہو؟“
”اس لیے کہ تم میری بہن ہو۔“ سمجھ گیس تم زندہ نہیں ہو۔ تم بہت عرصے پہلے مر گئی تھیں۔“ اس نے ماریہ کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”تمہاری قبر بھی مسجد والے قبرستان میں موجود ہے مجھیں۔ نام ایسہ تھا ناں کیوں میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔“ ماریہ بری طرح چونک پڑی۔ اس نے غور سے اس شخص کی طرف دیکھا۔

”تمہیں میری ماں کا نام کیسے معلوم؟ بتاؤ تم کیسے جانتے ہو میری ماں کو؟“ ماریہ نے اس شخص کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دیکھے۔ جیسے وہ انتہائی غمزدہ ہو اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ ایک بار پھر اس نے ماریہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جیسے اسے چھو کر اس کے وجود کا یقین کرنا چاہتا ہو۔ پھر اس نے آہستہ سے ہاتھ پیچھے ہٹ لیا۔

”مگر وہ ایک بچی کی پھوپھی سی لڑکی نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے تم وہ کہاں سے ہو سکتی ہو نہیں نہیں۔ غلطی ہے میری غلط سوچ رہا ہوں۔ معافی چاہتا ہوں تم سے۔ معاف کر دینا مجھے معاف کر دینا۔“ وہ دفعتاً پلٹا اور پاؤں کی طرح دوڑتا چلا گیا۔ ماریہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ درنیک وہ اس طرف دیکھتی رہی پھر اس نے گردن پھینکی۔ دھینا وہ کوئی ناگلی ہی تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ ایسے کا نام جانتا تھا یعنی اگر کوشش کی جائے تو ایسے کے نام کے ساتھ لوگوں کی یادوں کو کرید جاسکتا ہے اور وہ اسے بتا سکتے ہیں کہ اس کے ماں باپ کون تھے؟ اور کہاں تھے؟ یہی طور پر روپ گھر سے اسے اپنے ماں باپ کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم ہو سکتا تھا گویا اس کی کوششیں کارگر ہوں گی۔ دفعتاً وہ بے چوٹی اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ مغرب سے اٹھنے والی گھٹاؤ رفتہ رفتہ پورے آسمان پر چھانی جا رہی تھی اور فضا پر گہرا سکوت طاری ہو چکا تھا۔ یہ علامت تھی بہت بڑے طوفان کی۔ ہوا بندھی اور کوئی پتا نہ تھا کہ اس کا کیا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر چیز نے سانس روک رکھا ہو۔ اسی لمحے بادل زور سے گرجے اور وہ تیزی سے اپنے اپنی کیس کی جانب دوڑی۔ خوف بے شک دل میں تھا لیکن اس پائل کے الفاظ نے ہلا کر رکھ دیا تھا کیا نام بتایا تھا اس نے اپنا ماریہ نے سوچا لیکن اسے یاد نہیں آ سکا کہ اس شخص نے کوئی نام بتایا بھی تھا یا نہیں۔ پھر اسے ایک دم یاد آ گیا کہ اس نے اپنا نام بلاول بتایا تھا۔ بلاول لیکن سو نیا کون تھی اس نے اس کا نام کیوں لیا تھا اور بلاول کا سو نیا سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اس نے یہ کیوں کہا تھا کہ سو نیا جیسی ہے وہ کیوں اس نے اس بات کا اظہار کیا کیوں اس

سوار تھا۔ آخر وہ کون تھا؟ اور اس نے وہ عجیب و غریب باتیں کیوں کہی تھیں۔ اس نے اسے مردہ کہا تھا مگر کیوں؟ وہ جیسے جیسے سوچتی رہی اس کا ذہن الجھتا گیا۔ پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ ایک بھر پور نیند لینے کے بعد جب وہ ابھی تو اندھیرا پھیل چکا تھا اور شدت سے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ پورا دن ہی نکل گیا تھا اور پھر بیدل بھی خوب چلی تھی چنانچہ اس نے پہلے منہ ہاتھ دھو یا۔ ششے میں اپنا چہرہ دیکھا اور پھر کمرے سے نکل کر ہال میں آئی۔ جہاں کرن کور نے دلکش مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا تھا۔

”کیسی رہی نیند میرا خیال ہے اب تم اپنی تھکن اتار چکی ہو گی۔“ ماریہ نے چاروں طرف نگاہیں ڈالیں اس وقت یہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ کہنے لگی۔
 ”جی ہاں“ ماریہ نے کہا۔
 ”لیکن کھانا بھی تیار ہے کہو تو کھانا لے آؤں یا پھر ان چیزوں سے کام چلاؤ تا کہ بھوک خراب نہ ہو۔“
 ”چائے کی دو پیالیاں۔“ ماریہ نے چائے کی ٹرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیوں مجھے اپنے ساتھ چائے نہیں پلاؤ گی؟“
 ”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ وہ دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ ماریہ ٹرے میں رہی چیزیں کھانے لگی اور کرن کور نے دونوں پیالیوں میں چائے سا بنڈیل لی۔

”یہاں صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو سرائے میں قیام کرتے ہیں یا باہر کے لوگ بھی آجاتے ہیں۔“
 ”نہیں ہے ہمارا چھوٹا سا ریہ ٹورٹ بھی ہے روپ نگر میں لوگ فارغ اوقات میں یہاں بیٹھ کر گپ شپ لڑاتے رہتے ہیں۔ یہ صرف اتفاق ہے کہ یہاں اس وقت کوئی نہیں ہے۔“ اسی وقت قدموں کی آہٹ سنائی دی اور ماریہ کی گردن گھوم گئی آنے والے کو اس نے ایک لمحے کے اندر پہچان لیا تھا کہ وہ کرن کور کا لپ ہے یعنی سری ناتھ سنگھ۔ داڑھی اور سر پر نظر آنے والی چٹنی ہوئی پٹری سے یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ کبھی ہے۔ بوڑھا ماریہ کے سامنے آیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”سست سری اکال۔“ لیکن اس کے ساتھ ہی ماریہ کا چہرہ دیکھ کر وہ بری طرح چونک گیا اور پھر عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھتا ہوا بولا۔

”تم..... تم کیا تم روپ نگر ہی کی رہنے والی ہو۔ مجھے لگ رہا ہے میں نے تمہیں پہلے بھی نہیں دیکھا ہے پتر۔ لیکن کب اور کہاں یہ سچہ میں نہیں آ رہا۔“
 ”تھوڑا سا صبر تو کرو باجی۔ یہاں آنے والے ہر مہمان

”تم مجھے لے تو آئی ہو یہاں۔ تمہیں کیا معلوم میرے پاس تمہارے اس کمرے کا کرایہ ادا کرنے کے لیے رقم موجود تھی ہے یا نہیں۔“ لڑکی نے نگاہیں گھما کر اسے دیکھا پھر بولی۔

”پہلے اپنے بھیکے کپڑے تبدیل کر لو بعد میں کرائے کی بات کریں گے۔“

ماریہ نے دل میں سوچا کہ روپ نگر میں ملنے والی پہلی اچھی لڑکی کا ش یہ میرے کام آسکے۔ ابھی تک اس نے نہ تو لڑکی سے اس کا نام پوچھا نہ لڑکی نے اس سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس نے احتیاطاً دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ پھر اپنے پیچ پیس سے ایک سادہ سا لباس نکال کر پہن لیا اور پھر بال سنواری ہوئی لڑکی سے ملنے چل دی۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا اسے لڑکی نظر آئی جو ہاتھ میں چائے کا کپ لیے کھڑی تھی۔ ماریہ اس کی مستعدی سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ لڑکی مسکرائی ہوئی اندر داخل ہو گئی اور کہنے لگی۔

”ابھی میرے اور تمہارے درمیان یہاں ٹھہرنے کے معاوضے کا فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ اس لیے اس چائے کو مہمان نوازی سمجھو۔“

”اندراؤ تم بہت شرمیلو معلوم ہوتی ہو کیا نام ہے تمہارا؟“
 ”کرن کور سب لوگ مجھے کرن کہتے ہیں۔“
 ”کرن کور کیا تم سکھ ہو؟“

”ہاں میرے پتا جی کا نام سری ناتھ سنگھ ہے۔ میں یہیں پیدا ہوئی تھی۔ اب چلو چائے پوٹھ پٹنگ چائے نہیں۔“
 کرن کور بہت ہی اچھی لڑکی تھی۔ وہی پتلی دراز قامت دیکھنے میں ہی بیماری لگتی تھی۔ پھر کچھ ہی دیر میں وہ اس سے بے تکلف ہو گئی۔ اس کا خاندان ایک طویل عرصے سے یہیں آباد تھا۔ ماں کا دیہانت ہو چکا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے باپ کے ہمراہ یہ سرائے چلا رہی تھی۔
 ”اچھا مجھے معاوضہ بتادو۔ میں بھی ایک درمیانی حیثیت کی لڑکی ہوں۔“

”جودل چاہے دے دینا۔ میں سودے بازی کی قائل نہیں۔ تم جو کچھ بھی دو گی ہم قبول کریں گے۔ فی الحال تم آرام کرو پتا نہیں کہاں سے آ رہی ہو۔ تھک گئی ہو گی بعد میں باتیں کریں گے۔ کرائے کی بروا مت کرو۔ ہو تو دے دینا ورنہ دوستی کے حساب میں۔“ وہ مسکرائی اور بلبل نکل گئی۔

ماریہ درپتک دروازے کو دیکھتی رہی تھی پھر وہ دروازہ بند کر کے بستر پر سونے لگی۔ اس وقت اس کے ذہن پر شدت سے بلاول

اندازہ ہو گیا تھا کہ بلاول کے تپور کچھ ایچھے نہیں ہیں۔ پتا نہیں اب کیا بات ہوئی۔ وہ اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ سری ناتھ نے کہا۔

”بیٹھو بیٹا تم بیٹھو۔“ اور وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ بلاول اس کے قریب پہنچا اور غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”مہمیں میرے ساتھ چلنا ہے۔“ سری ناتھ نے بلاول کو دیکھا اور کہا۔

”کہاں؟ یہ ہماری مہمان ہے۔“

”مجھے اس سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“ بلاول نے بدستور غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ماریہ کی نگاہیں کیرن کو رکی طرف اٹھ گئیں کیرن کو بھی کچھ خوفزدہ سی نظر آرہی تھی۔ سری ناتھ نے کہا۔

”میں اس طرح اپنی مہمان کو نہیں جانے دوں گا۔“

”کچھ نہیں بولو گے تم کچھ نہیں بولو گے۔“ اچانک بلاول نے خوشخوار لہجے میں کہا۔

”تم کیا بکواس کر رہے ہو؟ کون ہو تم میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی میں نہیں جانتی تم کون ہو اور کیا بکواس کرنا چاہتے ہو مجھ سے۔“ مہمیں اس بات کا کہیں سے حق دیا کہ اپنے گاؤں میں کسی اجنبی سے اس طرح بد مزیزی کا سلوک کرو۔

ماریہ کا چہرہ بالکل سخت رہا۔ اس نے سخت لہجے میں کہا۔

”مجھے کتنا حق حاصل ہے یہ بات میں جانتا ہوں۔ تم کیا چاہتی ہو؟ اور کیا نہیں مجھے اس سے بھی کوئی غرض نہیں ہے۔ میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں اور مہمیں میرے ساتھ چلنا ہے اور ایک بات کان کھول کر سن لو۔ میں انکار سننے کا عادی نہیں ہوں۔“ مہمیں گھٹکت کر بھی یہاں سے لے جاسکتا ہوں۔“

”یہ آسان نہیں ہوگا سمجھے۔ تم جو بکواس کرنا چاہتے ہو یہیں کرو۔ ورنہ نتیجے کے ذمے دار خود ہو گے۔“

”بے خوف لڑکی مجھے جو کہہ رہا ہے میں کسی اور کی موجودگی میں نہیں کہہ سکتا وہ بدستور جارحانہ لہجے میں بولا اور ایک بات اور سنو۔ یہاں کوئی تمہاری مدد نہیں کرے گا یہ بوڑھا سٹکھ بھی نہیں اور اس کی بیٹی بھی نہیں چونکہ یہ اچھی طرح جانتی ہے کہ میں کس طرح کا انسان ہوں۔ اٹھو ورنہ اس کے بعد میں جو کچھ کروں گا اس کی ذمے دار تم خود ہو گی۔“

ماریہ آخری حد تک کوشش کر رہی تھی کہ اپنے حواس بحال رکھے اور صورت حال سے نمٹنے کے لیے اپنے آپ کو مضبوط رکھے۔ اس شخص کا جارحانہ عمل یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ کر دکھائے گا۔ اس نے کیرن اور اس کے باپ کی طرف

سے تم بھی کہتے ہو۔ چائے پیو گے؟“

”تو بکواس نہ کرو۔“ سری ناتھ سٹکھ نے عجیب سے انداز میں کہا پھر بولا۔ ”میں بوڑھا بے شک ہو گیا ہوں اس کا یہ مطلب نہیں کہ پاگل بھی ہوں۔ میرے اندر ایک بہت بڑی خوبی ہے کہ ایک بار کسی کو دیکھ لوں تو اسے کبھی نہیں بھولتا۔ اس بچی کو بھی میں نے پہلے ہی دیکھا لیکن کہاں مجھے یہ یاد نہیں آ رہا کہاں دیکھا ہے میں نے نہیں؟ میں یہاں بیٹھ جاؤں مہمیں اعتراض تو نہیں ہے بیٹا۔“ سری ناتھ سٹکھ نے کہا۔ ماریہ ایک بار پھر اٹھ گئی تھی۔ یہ ایک عجیب و غریب بات تھی کہ یہاں کے لوگ اسے اپنا شناسا سمجھ رہے تھے۔ پھر اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس نے کہا۔

”سری ناتھ جی! جب میں یہاں آ رہی تھی تو راستے میں مجھے ایک شخص ملا اس نے مجھے سونیا کہہ کر پکارا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تم سونیا نہیں ہو سکتیں ایک بات بتائیے کیا آپ سونیا نامی کسی لڑکی کو جانتے ہیں۔ جوشاید مر چکی ہے۔“ ماریہ کی نگاہیں بوڑھے سری ناتھ کے چہرے پر جم گئیں۔ سری ناتھ نے پر خیال انداز میں گردن ہلاتی اور بولا۔

”نہیں میں تو یہاں بہت عرصے سے رہتا ہوں۔ بہت ہی عرصے سے مگر سونیا نامی کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔“

اچانک ہی ان تینوں کو چونکا پڑا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا تھا اور اس دھماکے کے ساتھ ہی ایک شخص اندر داخل ہوا تھا۔ پوری قوت سے اس نے دروازہ کھولا تھا جس کی وجہ سے دھماکا ہوا تھا۔ آنے والا اندر داخل ہوا تینوں نے اسے دیکھا اور ایک بار پھر ماریہ بری طرح چونک پڑی۔ دبلا پتلا جسم بھرے ہوئے بال اور پانی میں بیگا ہوا لباس اس کا کرخت چہرہ کسی کو بھی خوفزدہ کر دینے کے لیے کافی تھا۔ ماریہ ایک دم اپنی جگہ سمٹ سی گئی۔ وہ بلاول تھا۔ جس کی آنکھوں میں بڑی وحشتناکی چمک تھی۔

”کیسے ہو تم بلاول اتنی زور سے دروازہ کھولتے ہیں کہیں۔“ یہ کہہ کر کیرن کو اپنی جگہ سے اٹھی اور آگے بڑھ کر بلاول کے پاس پہنچ گئی لیکن پھر اسے ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ بلاول کے چہرے پر عجیب سی وحشت تھی اور اس کی نگاہیں ماریہ پر جمی ہوئی تھیں۔ کیرن کو کچھ پریشان سی ہو گئی۔ اس نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور اسے احساس ہونے لگا کہ کوئی کڑ بڑ ہے۔ دوسری طرف ماریہ کے چہرے پر بھی خوف کی زردی سی پھیل رہی تھی۔ نہ جانے کیوں ایک انجانا خوف اسے اپنے دل میں محسوس ہو رہا تھا اور اسی خوف کے ہاتھوں وہ اضطرابی طور پر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اسے ایک لمحے کے لیے

اس کا دل خزاں رسیدہ تپے کی طرح کانپ رہا تھا۔

گاڑی تیز رفتاری سے علاقے کی گلیوں میں دوڑتی ہوئی نکل آئی۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ تیز بارش اور سانپ کی طرح بل کھاتی سڑک پر تیز رفتاری کا مظاہرہ ایک طرح سے خود کی سے مترادف تھا لیکن وہ دہلوانہ وار گاڑی دوڑا رہا تھا۔

باریہ کو یہ احساس ہونے لگا کہ یہ غلطی اس کی زندگی کی آخری غلطی ہے۔ اسپتال میں بہت سے ڈاکٹروں وارڈ بوائے اور نرسوں کی موجودگی میں مریضوں سے نمٹنا ایک الگ بات ہے۔ باہر کی دنیا اس سے مختلف ہے لیکن اس کی خود اعتمادی نے اسے مرادیا تھا وہ نہیں جانتی تھی کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ اس نے دانت بچھنچ کر آگے والی سیٹ پکڑ لی تھی اسے یہ

احساس ہو رہا تھا کہ بس کچھ لمحے چلنے والے ہیں جب گاڑی کسی خوف ناک حادثے کا شکار ہو جائے گی لیکن ابھی تک ایسا نہیں ہوا تھا اور بس گاڑی پیچ ختم سے نکل کر تیز رفتاری سے سیدھی سڑک پر جا رہی تھی۔ بار بار باریہ سامنے سڑک پر دیکھنے کی کوشش کرتی لیکن موسلا دھار بارش میں چند کر آگے کی کوئی چیز

نظر نہیں آ رہی تھی اور بلاول خاموشی سے سامنے نگاہیں جٹائے۔ تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ مینی طور پر وہ کوئی بچہ دماغ کا آدمی نہیں تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کی دیوانگی اسے کسی بھی احتیاط کی ضرورت نہیں محسوس ہونے دیتی یا پھر وہ اس قدر امیپسٹ ڈرائیور ہے کہ اسے کسی حادثے کا خطرہ

نہیں ہے اور جن راستوں پر وہ سفر کر رہا ہے ان کے بچے سے واقف ہے۔ ایک بار اس نے آنکھیں بچھنچ کر کھولیں اور بلاول کو دیکھا۔ کار میں چلنے والے سے بلب کی روشنی میں بلاول کا چہرہ بے حد بھیاں تک منظر پیش کر رہا تھا پھر اچانک ہی کار داییں ہاتھ کی ایک ڈبلی سڑک کی طرف مڑ گئی۔ باریہ اس اچانک جھٹکے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ لڑھک کر کائی زور سے دروازے سے نکل کر بائیں اور اس کے بازو میں ہتھیلیں اٹھنے

لگیں۔ پھر کار کی رفتار سست ہوئی اور کچھ لمحے کے بعد وہ رک گئی باریہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ قرب و جوار میں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا دل خوف سے دھڑکنے لگا۔ بلاول گہرا۔ کار کا اچانک بند ہوا اور جھٹ سے بلب روشن ہو گیا۔ بلاول اس کی جانب مڑا اور اس کا چہرہ دکھتا ہوا بولا۔

”ہوں ڈر رہی ہو مجھ سے۔“ باریہ نے فوراً ہی جواب دینا ضروری سمجھا اور اپنے لہجے کو کسی قدر پختہ بنا کر بولی۔

”نہیں میں سوچے مجھے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلی اور ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو اور یہ کیوں کی جگہ ہے تم میرے لیے مجھے کیوں لائے

بھی دیکھا تھا لیکن دونوں کے انداز سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کی کوئی مدد نہیں کریں گے۔ ایک لمحے کے لیے ماریہ نے سوچا کہ موقع کی نزاکت کا خیال کرنا چاہیے۔ درحقیقت یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ روپ گمر کے لوگ کیسے ہیں اور کسی اچھی لڑکی کے لیے وہ اپنے ذہن میں کیا تصور رکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے واقعی یہاں کوئی اس کی مدد کرنے والا نہ ہو۔ بہر حال وہ ایک عورت تھی۔ نقصان اٹھا سکتی تھی اس نے فیصلہ کیا اور بولی۔

”ٹھیک ہے چلو میں تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر لیکن اس کی ٹانگیں ہولے ہولے کیپکیرا رہی تھیں۔ تب بلاول نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور آٹھے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ماریہ نے ایک بار پھر بے بس

نگاہوں سے کرن کو اور اس کے باپ کو دیکھا ساری ناٹھ اب کسی قدر بے تعلق سا نظر آ رہا تھا لیکن کرن کوڑے کے چہرے کی سرخی بتاتی تھی کہ وہ بہ مشکل تمام ان حالات کو برداشت کر رہی ہے اس کے چہرے پر عجب سے تاثرات تھے۔ تب اس نے کہا۔

”تمہاری واپسی کب تک ہوگی۔“

”ایک یا دو بڑھ گھنٹے میں صبح سلامت واپس نہ آئے تو تم پولیس کو اطلاع دے سکتی ہو کہ اسے میں نے انکوار کیا ہے۔“ ماریہ کی بجائے بلاول جارحانہ انداز میں بولا اور اس کے بعد اس نے ماریہ کا بازو دو بونچ لیا اور اسے پکڑے ہوئے باہر نکل گیا۔ یہ ظاہر وہ ایک عام سا آدمی تھا لیکن اس نے یہ بات بھی

کہی تھی کہ یہاں ہی آدھی زمینی اس کی ہیں باہر نکل کر جو کچھ ماریہ کی نگاہوں کے سامنے آیا اس نے اس کے ذہن کو ایک اور جگہ لگا دیا تھا کیونکہ سرائے کے سامنے ہی ایک کانظر آ رہی تھی۔

جوشاندار اور نئی تھی۔ ظاہر ہے یہ کار کسی عام آدمی کے پاس نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ وہ ماریہ کو دھکیلتا ہوا کار تک لایا اور اسے بھٹنے کا اشارہ کیا اور دروازہ باہر سے بند کر کے خود اسٹیئرنگ کے پر بیٹھ گیا۔ اس نے بڑے اطمینان سے انجن اشارت کیا اور گاڑی کو ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھایا ماریہ کا سر سیٹ سے ٹکراتے

ٹکراتے بجا گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھی۔

ماریہ کا دل خون ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر جمال شاہ نے اسے بہت سمجھا یا تھا اور کہا تھا ایک اکیلے لڑکی کو اس طرح ایسی جگہ نہیں جانا چاہیے جہاں اس کے اور اس کے ماں باپ کے ساتھ عجیب و غریب سنگین حالات پیش آئے تھے اور جہاں کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ ماریہ نے فوری طور پر اس شخص کے ساتھ چلنے کا فیصلہ کیا تھا اور دل میں سوچا تھا کہ اب جو بھی صورت حال ہو اس سے نمٹنے کی کوشش کی جائے گی لیکن

زده ہو گئی لیکن اس نے جیب سے ایک سگریٹ کیس نکالا اور ایک سگریٹ ہوٹوں میں دبا کر اسے سلگائے لگا۔ پھر اس نے سگریٹ کے کٹی کش لگائے اور اس کے بعد بھاری آواز میں بولا۔

”اور وہ وجہ بڑی اہم ہے تم کون ہو؟ شاید تم نہیں جانتیں لیکن میں جانتا ہوں۔ ایک بات ذہن نشین کر لو اگر تم بھی اپنی ماں کے نقش قدم پر چلنے کا ارادہ لے کر یہاں آئی ہو تو میں مشورہ دیتا ہوں کہ تم نہ جی رہی ہو تو یہاں سے چلی جاؤ یہاں تمہیں ذہنی سکون نہیں بلکہ اذیت ناک موت مل سکتی ہے۔ تمہاری زندگی ایسی ہو جائے گی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم مجھے یہ دھمکیاں کیوں دے رہے ہو؟ تمہارا مجھ سے تعلق کیا ہے؟ کیوں بار بار میری ماں کی باتیں کرتے ہو؟ کیا جانتے ہو؟ میری ماں کے بارے میں؟“

”دیکھو میں تمہیں دھمکی نہیں بلکہ ایک پر خلوص مشورہ دے رہا ہوں۔ تمہاری موت پر مجھے واقعی افسوس ہوگا۔ بہت پیاری لڑکی ہو تم تمہیں دیکھ کر دل کو ایک عجیب سا احساس ہوتا ہے لیکن جب تم زندگی سے محروم ہو جاؤ گی تو تمہارا خوب صورت چہرہ کتنا بھانک ہو جائے گا۔ میں اس چہرے کو بھانک نہیں دیکھنا چاہتا ماریہ کی آنکھیں خوف سے پٹکتی جا رہی ہیں۔ اس کے الفاظ اس قدر سخت تھے۔ جن سے احساس ہوتا تھا کہ جو کچھ کہہ رہا ہے کم بخت کر کے ہی دکھا دے گا۔ ماریہ اپنی جیسی کوششوں میں مصروف تھی لیکن پھر بھی خوف اس کی زبان کو جکڑے ہوئے تھا۔ بلاول کی آواز پھر سنائی دی۔

”میری بات تمہاری سمجھ میں آرہی ہے لڑکی! مجھ سے بہتر مشورہ تمہیں اور کوئی نہیں دے سکتا۔ تم کل صبح سورج طلوع ہوئے ہی یہاں سے نکل جاؤ۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔“

”اور کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں تم سے خوف زدہ ہوئی ہوں دیکھو ایک بات میں نہیں بتا دوں۔ میری زندگی کچھ اس انداز سے گزری ہے کہ زندگی یا موت میرے لیے اب بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اگر تم مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہتے ہو تو میں اس کی مداخلت کر دوں گی اور جب تک میرا دل چاہے گا یہاں رہوں گی کیا تم یہاں آنے والے ہر شخص کو اپنی مرضی سے یہاں رہنے دیتے ہو اور اپنی مرضی سے نکال دیتے ہو۔“

”ہر شخص سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں تمہاری بات کر رہا ہوں اور سنو میں تم سے کسی قسم کا مذاق نہیں کر رہا۔ اس وقت بچی تم کی قدم ادھر ادھر نہیں کر سکتیں۔ جب تک میں نہ چاہوں تمہیں مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا کہ کل رات سویرے تم یہاں سے چلی جاؤ گی۔ ورنہ پھر تم اس جگہ سے نہیں جاسکو گی۔“

ہو۔ کیا چاہتے ہو مجھ سے ایک بات میں تم سے کہوں مجھے صرف ایک لڑکی نہ سمجھنا؟“

”فصل بکواس۔“ بلاول نے داہنا ہاتھ اور اٹھاتے ہوئے کہا۔ یہ بتاؤ تم روپ ٹیکریوں آئی ہو۔“ اس کی نگاہیں ماریہ کے چہرے پر گر گئی تھیں۔

”کیوں کیا یہ صرف تمہاری ملکیت ہے؟ کیا یہاں آنے کے لیے تم سے لائسنس لینا ضروری ہوتا ہے۔ کوئی یہاں کیوں آ سکتا ہے میرے خیال میں تمہیں اس سے دلچسپی نہیں ہونی چاہیے۔“

”صرف تم سے صرف تم سے باقی کوئی بھی یہاں آئے مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ کیا تمہاری ماں نے تمہیں یہاں بھیجا ہے۔ بلاول کی نگاہیں بدستور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔“ ماریہ نے ایک سی سانس لی اور بچنے ہوئے انداز میں بولی۔

”میری ماں میری ماں مر چکی ہے۔ اس کا انتقال ہو چکا ہے سمجھو۔“

”ہوں اس نے مرنے سے پہلے تمہیں بہت کچھ بتایا ہو گا۔ تم مجھے بتاؤ کیا بتایا اس نے میں یہاں تمہاری آمد کا مقصد جانتا چاہتا ہوں۔ صرف یہ بتاؤ تم یہاں کیوں آئی ہو۔“

”کیا تم مجھے جانتے ہو؟ کیا تم واقعی کوئی پاگل شخصیت نہیں ہو۔ میں بالکل نہیں سمجھ رہی کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں صرف ذہنی سکون حاصل کرنے کی خاطر کسی دیہی علاقے میں جانا چاہتی تھی۔ چنانچہ میں نے روپ ٹیکر آنے کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ روز کے لیے یہاں ٹھہری ہوں اور سرائے میں ٹھہری ہوں۔ سمجھ رہے ہو نا؟ کوئی انسان اگر ذہنی سکون حاصل کرنے کے لیے کسی جگہ بے مقصد چلا جاتا ہے تو کوئی جرم نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ یہاں آنے کا میرا کوئی مقصد نہیں ہے۔“ ماریہ محسوس کر رہی تھی کہ بلاول اس کے ایک ایک لفظ کو ٹول رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں جھانک کر اس کے دماغ میں اترنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر اس نے کہا۔

”کیا یہاں تمہارا کوئی رشتہ دار بھی ہے؟“

”نہیں کوئی نہیں میرا یہاں اگر ایسا ہوتا تو میں کسی سرائے میں ٹھہرنے کی کوشش نہ کرتی لیکن تم اس طرح مجھے یہاں کیوں لائے ہو اور کیوں اتنی دلچسپی لے رہے ہو مجھ میں کیا صرف ایک تنہا اور کیلی لڑکی سمجھ کر لیکن یاد رکھنا۔“

”ایک منٹ ایک منٹ اس کی وجہ بھی میں تمہیں بتا دوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب ٹٹولی اور ماریہ ایک بار پھر خوف

مسٹر بلاول تم میری رہنمائی کرو گے اگر تم براہ راست ایسے کسی معاملے میں موٹ ہو تو یقینی طور پر ہمیں ماضی کی وہ داستان بھی معلوم ہوگی۔ جس کا تعلق میری ذات سے ہے سنو میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میری ماں مرچلی سے اور میں کراچ تک ایک گمشدہ کہانی بن کر رہی ہوں۔ میں اس کہانی کی تفصیل جاننا چاہتی ہوں کیا تم میری مدد کرو گے بلاول اگر تم ایسا کرو گے تو میری ساری شکایتیں دور ہو جائیں گی وہ اب نرم نظر آنے لگا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

”کیا تم یہ جانتی ہو کہ تمہارے گھر کو آگ لگی تھی۔“

”ہاں مجھے کچھ کچھ یاد ہے اگر اتفاقاً طور پر میری ماں کی آنکھ نہ کھل جاتی تو ہم دونوں اپنے گھر میں جل کر خاکستر ہو جاتے۔“

”اور تم یہ بھی جانتی ہو گی کہ آگ خود بہ خود نہیں لگی تھی۔ وہ آگ لگانی لگی تھی اور آگ لگنے کا مقصد یہ تھا کہ تم اور تمہاری ماں اس دنیا میں نہ رہیں۔“

”ہاں مجھے یاد ہے اور میں یہ بھی جانتا چاہتی ہوں کہ وہ حادثہ نہیں تھا اور یقینی طور پر ہمارے گھر کو کنڈرا آگ لگا گیا تھا۔“

”ہاں۔ بلاول نے پر خیال انداز میں گردن ہلا کر کہا۔ پھر بولا۔

”میں تم سے جھوٹ نہیں بولنا چاہتا اور میں تمہیں بتاؤں کہ تمہارا باپ اب لب مرگ ہے۔ وہ دل کا مریض ہے اور اس بات کا یقین کر لو کہ تمہاری واپسی کی خبر اس کی زندگی کا چراغ بجھا دے گی۔ لوگوں کو جب یہ بات معلوم ہو گی کہ تم زندہ ہوا اور واپس آ گئی ہو تو نہ جانے کیسی کیسی افواہیں جنم لیں گی اور تمہارا باپ ختم ہو جائے گا۔“ ماریہ نے اسے ٹھوڑتے ہوئے کہا۔

”مگر تمہیں میرے باپ سے کیا واپسی ہو سکتی ہے۔ تم اس کے لیے اتنے مضطرب کیوں ہو جواب دو۔“

”بکواس میت کرو میں تمہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتا۔ ہاں اگر تمہیں کسی مدد کی ضرورت ہو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں لو کہ تمہارا ہر قیمت پر یہاں سے نکل جانا بہتر ہے اور تمہیں سب سوچنا ہے یہی یہاں سے چلے جانا ہوگا۔“

”بکواس کر رہے ہو تم۔“ اچانک ہی ماریہ کا سہارا خوف دور ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں سلگنے لگیں۔ وہ یہ اندازہ لگنے کی کوشش کر رہی تھی کہ آخر اس شخص کا اس کے باپ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے لیکن اس کا دماغ بری طرح سلگ رہا تھا اور وہ اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

”بولو تمہیں رقم سے لے کر سواری تک ہر طرح کی مدد فراہم کی جاسکتی ہے۔“

”تم شاید بھول گئے ہو کہ کرن کو اور اس کا باپ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ کاش میں سمجھ سکتی کہ تم مجھے یہاں سے کیوں بھگانا چاہتے ہو۔“ ماریہ کے ان الفاظ نے اس کے چہرے میں ایک تبدیلی رونما کی۔ ایسا لگتا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہو۔ پھر اس نے پر خیال انداز میں کہا۔

”کیا تم نے ابھی اپنے باپ کے بارے میں نہیں سوچا۔“

ماریہ کے سارے وجود میں ایک بار پھر گرگڑا ہٹ پیدا ہوئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آخر بلاول اس کی جانب اس طرح کیوں متوجہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی مہی ہوئی باتیں بھی ماریہ کے لیے پر اسرار تھیں لیکن اس وقت اس نے جو کچھ کہا اس سے ماریہ کو کم از کم یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ شخص یقینی طور پر اس کی ذات کی گہرائیوں میں کچھ تلاش کر رہا ہے۔ وہ پھر بولا۔

”اور کیا تم یہ سوچ کر یہاں نہیں آئی ہو کہ تمہارا باپ روپ نگر کا ہی کوئی شخص ہو سکتا ہے۔ تم نہیں جانتیں اسے خوف لگتی کہ تمہارے یہاں آنے سے اتنی ہنگامہ آرائی ہو گی کہ لوگ پریشان ہو جائیں گے۔ ایسی ایسی کہانیاں جنم لیں گی یہاں جنہیں لوگ بہت عرصے پہلے بھول چکے ہیں۔ تم یہاں مرچلی ہو سبھیں۔ بہتر ہو گا کہ کسی ہنگامے کے جنم لینے سے پہلے ہی تم یہاں سے چلی جاؤ۔ یہ تمہارے مفاد میں ہے۔ تمہارا یہاں سے چلے جانا بہتر ہے۔ ماریہ نے ایک بار پھر خود کو سنبھالا دیا اور بھارتی لہجے میں بولی۔

”میں نہیں جانتی کہ تم کیا کر رہے ہو۔ اگر تم مجھ سے یہاں تک بات کر سکتے ہو تو پھر بہت سے سوالات کے جوابات تم ہی مجھ کو دے سکتے ہو۔ بولو کیا تم میرے سوالات کے جوابات دینا پسند کرو گے۔ بلاول کے چہرے پر سوچ کے آثار ابھر آئے کچھ دیر وہ خاموش رہ کر سوچتا رہا پھر بولا۔

”بولو کیا جانا چاہتی ہو۔“

”میرا باپ کون ہے؟ کیا تم اسے جانتے ہو؟“ وہ پر خیال انداز میں اپنا دایاں رخسار کھچانے لگا۔ اس کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ پھر اس نے کہا۔

”تم مجھے ایک بات کا جواب دو۔ تمہاری ماں یہاں سے کیوں چلی گئی تھی۔ جواب دو، کیوں فرار ہوئی تھی وہ یہاں سے۔ میں تمہیں بتاؤں وہ عقل مند تھی۔ اس نے اپنی اور تمہاری بھلائی کے لیے یہ جگہ چھوڑ دی تمہیں لیکن تم..... تم بے وقوف ہو۔“

”بہت خوب۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ جس کہانی کی تلاش میں مجھے یہاں تک آنا پڑا وہ خود ہی اپنے قدموں سے چل کر مجھ تک پہنچ گئی اور اب مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے

کر ٹرن لیا اور تیز رفتاری سے سامنے کی سمت چل پڑی۔ بلاول دووں ہاتھ اٹھائے سرک کے وسط میں کھڑا تھا۔ بارش میں اس کا چہرہ کچھ زیادہ ہی بھیاںک نظر آرہا تھا۔ ماریہ نے اسٹیرنگ پر ہاتھوں کی گرفت مضبوط کی اور ایک سیلیڈر پر پیر کا دباؤ بڑھا دیا۔ بلاول اس کی زد میں تھا۔ ماریہ پر اس طرح جنون سوار ہو گیا تھا کہ اگر بلاول عین وقت پر اچھل کر ایک طرف نہ ہٹ جاتا تو یقیناً کچلا جاتا۔ خاصی آگے نکلنے کے بعد ماریہ نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بلاول نظر نہیں آ رہا تھا۔ بڑی سرک پر پہنچ کر اس نے گاڑی کا رخ اس طرف موڑ دیا جس طرف سے وہ آئے تھے۔

طوفانی بارش میں قصبے تک پہنچنے میں ایسے بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ کوئی ماہر ڈرائیور نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح احتیاط کے ساتھ گاڑی چلائی ہوئی آبادی کے پہلے موڑ پر پہنچ گئی۔ اس گاڑی کو لیے ہوئے سرائے تک پہنچنا کسی بھی طرح مناسب نہیں تھا۔ چنانچہ وہ کار وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی اس کے بعد پیدل سرائے تک پہنچنے میں بھی اسے کافی وقت لگ گیا۔ سرائے میں داخل ہوئی تو چکی نگاہ سری اتھتھکھ بر پڑی۔ جس نے سرسری نظر سے اسے دیکھا اور اس طرح لاغفل ہو گیا جیسے اس سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہو۔ ویسے یہ بات ماریہ پہلے بھی محسوس کر چکی تھی کہ بیٹی کی نسبت باپ بے حس قسم کا آدمی ہے اور معاملات پر زیادہ توجہ نہیں دیتا۔ وہ بھی اس کی طرف توجہ دے بغیر سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ دروازہ بند کر کے اس نے سب سے پہلے غسل خانے کا رخ کیا ہی تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور نہ جانے کیوں اس کا دل کانپ کر رہ گیا۔ کون آگیا؟ اس نے دل ہی دل میں سوچا لیکن کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ہی آنے والا کمرے میں داخل ہو گیا اور ماریہ نے کرن گورکھ دیکھا جو حیران حیران سی اندر داخل ہوئی تھی اس نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

”ماریہ تم ٹھیک تو ہونا؟“

”ہاں کرن! جس ذرا پیر پھسلنے سے کچھڑ میں گر گئی تھی۔“

ماریہ نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

”مگر تم..... میرا مطلب ہے تم..... وہ تمہیں اپنے ساتھ لے گیا تھا بلاول..... کوئی..... کوئی.....“

”میں کہنا نہیں بالکل ٹھیک ہوں۔“ ماریہ نے کرن کو رک کے لہجے کا مطلب سمجھ کر کہا۔

”میں جانتی ہوں کہ مجھے اس قسم کے سوالات نہیں کرنے چاہئیں میرے باپ نے بھی مجھ سے یہی کہا ہے کہ میں اس

”کچھ نہیں چاہیے مجھے..... کچھ نہیں چاہیے سمجھے اور سنو اگر مجھے یہاں تک لا کر تم یہ سمجھتے ہو کہ کسی طرح سے خوف زدہ کر دو گے تو میں تمہارا خیال غلط ثابت کر دوں گی۔“

”تب پھر تم۔“ بلاول کے انداز میں ایک دم جنون سا طاری ہو گیا لیکن ماریہ اپنے الفاظ کی سچائی ثابت کرنے کی تیاریاں کر چکی تھی۔ وہ اچانک ہی بھگی اور اس نے زمین پر پڑی ہوئی کچھڑھی میں بھری اور پوری قوت سے بلاول کے چہرے پر اچھال دی یہ کچھڑ بلاول کی آنکھوں میں بھی گری تھی اور وہ ایک کریمہ جیج کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا تھا۔ جیسے ہی اس کی آنکھیں بند ہوئیں ماریہ نے تیزی سے ایک طرف جھلاٹک لگا دی اور اس کا پاؤں کچھڑ میں پڑا۔ وہ پھسل کر گر پڑی لیکن پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ وقت تھا اور بلاول اسے اس کا فاصلہ بھی ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ بلاول اپنی آنکھوں میں بھر جانے والی کچھڑ صاف کر رہا تھا چنانچہ وہ برق رفتاری سے آگے بڑھتی رہی گہری تاریکی اور موسلا دھار بارش میں وہ سرک پر دوڑ رہی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ بٹھائی نہیں دے رہا تھا۔ چاروں طرف کچھڑ پھیلی ہوئی تھی اور اس کچھڑ میں بار بار اس کا پیر پھسل جاتا تھا۔ دوسری بار پھر وہ بری طرح پھسل کر گری یہاں کافی کچھڑ بھی اور ایک لمحے کے لیے اس سے اٹھا نہیں گیا تھا۔ اسے سنبھالنے معلوم تھا کہ بلاول اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ یہ صرف خوش قسمتی تھی کہ بلاول چھٹا دھاڑتا ہوا اس کے قریب سے گزرا اور آگے بڑھ گیا۔ اول تو گہری تاریکی اور پھر اس کی آنکھوں میں بھری ہوئی نمی اسے صحیح طور سے دیکھنے نہیں دے رہی تھی۔ وہ صرف چند فٹ کے فاصلے سے اس کے قریب سے گزرا تھا لیکن بارش کی گہری چادر اور گہری تاریکی کے باعث وہ اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔ جیسے ہی آگے نکلا ماریہ کے ذہن میں ایک خیال ابھر۔ وہ چند سیکنڈ اپنی جگہ پر پڑی رہی پھر سنبھل کر اس کا کی جانب چل پڑی۔ جو موڑ سے ہی فاصلے پر موجود تھی۔ اب وہ بلاول پر اپنی بہادری ثابت کرنا چاہتی تھی۔ وہ یہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ اپنی ماں کی طرح بے بس اور بزدل نہیں ہے۔ بکار کے نزدیک پہنچ کر اس نے نہایت احتیاط سے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور کچھڑ میں لت پت جسم کو ہٹاتی ہوئی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے ٹنڈل کر دیکھا چابی سوچ میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے جانی گھما دی۔ لیکن اشارت ہوتے ہی اس نے بیڈ پیپس بھی آن کر دیے اور اسی وقت بلاول پہنچ پڑا۔

”رکو..... رکو بے وقوف! لڑکی رک جاؤ۔“ لیکن وہ اسے سبق سکھانے کا تہیہ کر چکی تھی۔ اس نے گاڑی کو گیر میں ڈال

معاملے میں زیادہ ٹانگ نہ اڑاؤں۔“ کرن کور بولی۔
 ”کیوں سری ناتھ تمہارا باپ اس معاملے سے اتنا تعلق
 کیوں رہنا چاہتا ہے۔ یہ ویسے تو انسانی اصولوں کے خلاف
 ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ کسی کے معاملے میں اس حد تک ٹانگ
 اڑانی جائے کہ خود پریشانی کا سامنا کرنا پڑے لیکن کم از کم یہ
 سوال کرنے کا حق میں ضرور رکھتی ہوں کہ تمہارا باپ اس
 معاملے سے اتنا تعلق کیوں رہنا چاہتا ہے۔“ کرن کور کچھ
 لمحے سوچتی رہی پھر بھاری لہجے میں بولی۔

”تم کہیں جانتیں ماریہ تمہیں اس علاقے کے بارے میں
 کچھ معلوم نہیں ہے۔ یہاں رہنے والے لوگ اس خاندان کو اپنا
 مالک سمجھتے ہیں۔ بلاول کا باپ روپ نگر کی آڈی سے زیادہ
 زمینوں کا مالک ہے۔ یہ مالک بات ہے کہ وہ طویل عرصے سے
 ایانج ہو چکا ہے۔ بلاول بڑا صاحب اختیار ہے۔ شاید اس نے
 تمہیں اپنے بارے میں کچھ نہ بتایا ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ
 روپ نگر پر اس کی حکمرانی قائم ہے۔ وہ ایک آوارہ سائنڈ ہے
 جس کی طرف چاہے ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔ کسی کی عزت محفوظ
 نہیں ہے۔ لوگ اس کے خلاف کوئی شکایت بھی نہیں کر سکتے
 اور اگر وہ شکایت کریں بھی تو کس سے پولیس اس کی مٹھی میں

سے اور اس کا باپ خود ایک ایانج آدمی ہے وہ اسے روکنے کے
 لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ آہ کاش اس نے تمہارے ساتھ کوئی
 زبانی نہ کی ہو اور اگر ایسا ہوا ہے تو۔۔۔۔۔۔“ کرن کور کی آواز خود
 بہ خود بجھنے لگی لیکن ماریہ کی آنکھوں میں خون ابھر آیا۔
 ”میں کرن میں اتنی کمزور نہیں ہوں کیا سمجھیں۔“
 ”آہ کاش! ایسا ہی ہو کوئی تو ایسا ملے اسے جو اس پر حاوی
 ہو جائے۔“ کرن کور کا لہجہ اس قدر پر خلوص تھا کہ ماریہ کے
 ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اس کا دل چاہا کہ وہ کرن کور کو اپنے
 اعتماد میں لے لے پنا چاہے۔

”ہاں وہ مجھے اپنے ساتھ ایک دیرانے میں لے گیا تھا
 میں نہیں جانتی کہ اس کے دل میں کیا تھا لیکن اس کا رویہ
 میرے ساتھ سخت تھا اور میں نے اسے بہترین سزا دی ہے۔
 میں نے اس کو تھوڑی دیر کے لیے اندھا کر دیا اور اس کی گاڑی
 لے کر بھاگ آئی۔ اب وہ زخمی سانپ کی طرح تل کھار ہا ہوگا
 آؤ لیکن وہ مجھ سے کہتا تھا کہ میں کل صبح کا سورج روپ نگر میں
 نہ دیکھوں ورنہ وہ میری بری حالت کرے گا اور اسے اس وقت
 کتنی خوش ہوگی۔ جب کل میں یہیں نظر آؤں گی کیونکہ میں
 یہاں سے کہیں نہیں جا رہی لیکن ایک بات میری سمجھ میں اب
 بھی نہیں آ رہی ہے کرن کور آخر وہ مجھے یہاں سے کیوں بھگانا
 چاہتا ہے۔ آخر کیوں؟“ کرن کور کے چہرے کے رنگ

بدلنے لگے کچھ لمحے وہ سوچتی رہی پھر اس نے کہا۔
 ”وہ انتہائی کمینہ انسان ہے۔ اپنی بات منوانے کا عادی
 ہے۔ وہ اس کا اندازہ تم نے بھی لگا لیا ہوگا
 مم۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔ میں۔“ وہ رک گئی اور دیر تک سوچتی
 رہی اس کے چہرے کے نقوش تیار ہے تھے کہ وہ شدید کشمکش کا
 شکار ہے اور کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن کہہ نہیں پاری ماریہ نے
 کہا۔

”دیکھو کرن یا تو انسان کسی کے لیے خطرہ مول لے لے یا
 پھر نہ لے۔ تم مجھے انتہائی مخلص لڑکی نظر آتی ہو۔ میں نہیں
 چاہتی کہ تم کوئی ایسی بات مجھے بتاؤ جو تمہارے لیے مشکل
 بن جائے۔“
 ”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اصل میں وہ عدیلہ سے
 شادی کرنا چاہتا ہے۔ عدیلہ کا باپ گل زبان اس علاقے کا
 دوسرا بڑا زمیندار ہے۔“

اجانک بی ماریہ کو کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا۔ یہ دو نئے
 نام اس کے علم میں آئے تھے اور وہ ان سے ناواقف تھی جب
 کہ یہ نام اس کے لیے کارآمد ہو سکتے تھے۔ ادھر کرن کہہ رہی
 تھی۔ بلاول عدیلہ سے شادی اس لیے نہیں کرنا چاہتا کہ اسے
 عدیلہ پسند ہے۔ بلکہ اس طرح وہ گل زبان کے تمام باغات
 کھیت اور دوسری زمینوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔
 ”کیا عدیلہ بھی اس سے شادی کی خواہش مند ہے اور یہ
 بات جانتی ہے کہ وہ محض دولت کی خاطر اس سے شادی کرنا
 چاہتا ہے۔“ ماریہ نے سوال کیا۔
 ”یقینی طور پر بھلا کون ہے جب کہ میں یہ بات جانتی
 ہوں کہ عدیلہ اس کی منظور نظر نہیں ہے بلکہ صرف ایک ضرورت
 ہے۔“
 ”تو پھر عدیلہ کا اپنا رویہ کیا ہے۔“ ماریہ کو اس کہانی میں
 خاصی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔
 ”سب کچھ جانتے ہوئے بھی عدیلہ اس سے شادی کے
 لیے تیار ہے وہ یہ بھی جانتی ہے کہ اس علاقے کی بہت سی
 لڑکیاں بلاول سے اپنی بربادی کا انتقام لینے کے لیے موقع کی
 تلاش میں ہیں اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ گل زبان کو
 بھی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن گل زبان کا بیٹا
 بلاول کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور یہ بات
 بھی تمام لوگ جانتے ہیں۔ میں سوچتی رہی بات جانتی ہوں کہ
 ایک روز زعم گل بھی اسی طرح بلاول کے راستے سے ہٹ
 جائے گا۔ جس طرح زرق خان وہ بھی زرق خان کی طرح اس
 طرح غائب ہو جائے گا کہ اس کا سراغ تک نہیں ملے گا۔“

کروں گی۔ ہاں تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا میں تمہاری اس سرائے میں رہ سکتی ہوں۔“
 ”ایسی باتیں مت کرو جو مجھے گالی محسوس ہوں۔ میں تو بس تمہارے لیے پریشان ہوں۔“

”تمہاری ہمدردی کا بے حد شکریہ دیتے ہیں تمہارے مشورے کا خیال رکھوں گی اور جیسے ہی میں نے اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس کیا۔ یہاں سے نکلنے میں دیر نہیں لگاؤں گی کرن تشویش زدہ نہ لگا ہوں سے اسے دسمتھی رہی پھر مسکرا کر بولی۔
 ”بچپڑ میں تھڑی ہوئی تم مٹی کی ایک گڑیا معلوم ہو رہی ہو جاؤ واش روم میں جا کر تم اپنے آپ کو صاف تھرا کرو۔ یہ بتاؤ میں تمہارے لیے چائے یا کافی لے کر آؤں۔“

”میں کوئی ضرورت نہیں محسوس ہو رہی۔ میں بالکل پرسکون ہوں اور نہانے کے بعد آرام کی نیند سو جاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ کرن کور نے کہا اور باہر نکل گئی۔ تب ماریہ واپس پہنچی اس نے دروازہ بند کر کے پلٹ چڑھایا اور کپڑے اٹھا کر باتھ روم میں داخل ہو گئی۔ غسل خانے میں وہ دیر تک اپنے بدن سے مٹی چھڑاتے ہوئے اور اپنے بالوں کو صاف کرتے ہوئے سوچی رہی تھی یہ سوچ بچار کچھ عجیب سا تھا۔ اس کے ذہن میں بہت سی باتیں آ رہی تھیں۔ پھر نہ جانے کیوں اسے رمضان دودھ والے کا خیال آیا۔ ماں اسے سینے سے لٹک کر بھانگی تھی اور رمضان نے اسے نہ صرف پناہ دی تھی بلکہ تین دن کے بعد اسے وہاں سے نکالنے میں بھی مدد کی تھی۔ وقت بہت آگے بڑھ چکا تھا کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ رمضان زندہ ہے یا مر گیا۔ اس کے اہل خاندان میں کون کون تھا۔ یہ بات بھی نہیں معلوم تھی اس وقت وہ اتنی عقل و ہوش میں نہیں تھی کہ ان ساری باتوں کو سمجھ سکتی۔ بہر حال یہ ایک نیا خیال تھا جو اس کے ذہن میں آیا تھا اور رات کو سوتے جاگتے اس نے کئی نئے منصوبے بنائے تھے۔ عارضی طور پر صبح بلاول سے تصادم سے بچنے کے لیے اگر وہ یہ سرائے چھوڑ دے تو کیا زیادہ مناسب نہیں رہے گا۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا جلدی جلدی تیار ہوئی اور چپ چاپ سرائے سے باہر نکل گئی۔ بتائیں بلاول رات کو کیوں اس پر نہیں چڑھ دوڑا تھا۔ بہر حال وہ آگے بڑھتی رہی۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ ہو سکتا ہے بلاول نے اس سے بدلہ لینے کے لیے کوئی اور منصوبہ بنایا ہو۔ کرن کو اس کے بارے میں خاصی تفصیلات بتا چکی تھی۔ خبر یہ تو حقیقت تھی کہ اس چھوٹے سے گاؤں میں بلاول کی نگاہوں سے بچنا ممکن نہیں تھا اور خاص طور سے اس وقت جب اسے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ قصبے والے بلاول

”آہ تم نے تو بہت سے نام میرے سامنے دہرا دیے عدیلہ گل زباق زبیم گل اور زرق خان۔“ ماریہ پرسوج لہجے میں بولی اور پھر ایک لمحہ خاموش ہو کر دوبارہ بولی۔ ”یہ زرق خان کون ہے؟“

”بہت کچھ بتا چکی ہوں تمہیں مجھے اس واقعے کا کوئی علم نہیں یہ سب سنائی باتیں ہیں۔ ویسے زرق خان جو ہے وہ گل زباق کا بڑا بھائی تھا اور پندرہ سال پہلے اچانک ہی غائب ہو گیا تھا۔ آج تک اس کا سراغ نہیں ملا۔ ان زمینوں کا اصل مالک زرق خان ہی تھا اس کی پراسرار گمشدگی کے بعد بلاول خان کا باپ امین خان ان زمینوں کا مالک بن بیٹھا جب کہ ان دنوں وہ اپنا بچے اور عملی طور پر بلاول ہی یہاں کا مالک ہے۔ بلاول کے بارے میں میں نہیں بتا چکی ہوں کہ وہ بہت ہی خبیث آدمی ہے بلکہ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ باپ کے معذور ہونے میں بھی اسی کا ہاتھ ہے۔ وہ شیطاں کا شیطان ہے ماریہ میری ایک بات مانو گی۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں تمہارے لیے بہت اچھے تاثرات پیدا ہونے لگے ہیں اور مجھے تم اپنی اپنی سی لگنے لگی ہو۔ یقین کرو جب بلاول تمہیں یہاں سے لے کر جا رہا تھا تو میرا دل چاہ رہا تھا کہ کاش میرے پاس راضل ہوتی تو میں بہت سی گولیاں اس کے بدن میں اتار کر تمہیں اس سے آزاد کر دیتی لیکن ہم غریب لوگ ہم تو ویسے ہی غیر مذہب کے لوگ ہیں۔ یہاں ان لوگوں کے رحم و کرم پر اس لیے زندگی گزار رہے ہیں کہ ہمیں اس کی اجازت دے دی گئی تھی۔ بہت عرصے پہلے ہم حالات کا ذکر ہو کر یہاں آئے تھے اور ہمیں یہاں رہنے کی اجازت مل گئی تھی۔ میرا باپ سن پسند آدمی ہے۔ ہمیشہ علاقے کے لوگوں کے ساتھ مل کے ساتھ رہتا ہے۔ اسی لیے وہ مجھے منع کر رہا تھا کہ میں ان معاملات میں نہ پڑوں۔ میری دوست تم صبح کو یہاں سے چلی جاؤ۔ بلاوجہ زندگی کو مشکلات کا شکار کرنا عقل کی بات نہیں ہے۔“

”کرن کور! میں تمہارے امن پسند باپ کو پریشان نہیں کروں گی۔ میں یہاں سے جاسکتی ہوں۔ میرا مطلب ہے تمہاری اس سرائے سے لیکن روپ نمگر سے ابھی جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے میرا۔ اس وقت تک میں یہاں سے نہیں جاؤں گی جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ بلاول مجھے یہاں سے کیوں ہٹانا چاہتا ہے۔“

”آہ تم خطرات کو دعوت دے رہی ہو۔“ کرن کور کے لہجے میں تشویش تھی۔

”تمہاری ہمدردی کا بے حد شکریہ۔ میں اپنی حفاظت

تمہیں نہیں دیکھا۔“

”اگر غور سے دیکھیں تو شاید مجھے پہچان جائیں گی آپ۔“ عورت نے آنکھیں پٹیٹاٹیں اور تھوڑی سی آکر گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لینے لگی۔ پھر یوں لگا جیسے اسے ایک جھک سا لگا ہو۔ وہ چند لمحے خاموش رہی اور اس کے ہونٹ کھلے رہے۔ پھر اس کے چہرے پر اچھٹن کے تاثرات پھیل گئے اور اس کے منہ سے لرزی ہوئی آواز اُڑی۔

”کیا تم..... کیا تم ایمنی کی بیٹی ہو؟ میں اگر ایک باریک دیکھ لیتی ہوں تو اسے آسانی سے پہچان لیا کرتی ہوں لیکن تم..... تم اودہ میں سے نہیں بنیں میں دیکھتا تھا۔ مجھے جواب دو میری نظریں اور یادداشت دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ تم یہاں کیسے آئیں گی؟ تم دوبارہ کیسے آگئیں۔ پہلے میری بات کی تصدیق کرو۔“

”ایمنی کی بیٹی ہی ہونا کیا نام تھا تمہارا مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہا۔“

”ماریہ۔“ ماریہ نے جواب دیا۔

”مگر تم..... تم اودہ یہاں کیسے آگئیں۔ تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ روپ نگر والوں کے لیے تو تم مر چکی ہو۔“ جو خوش گواری کیفیت ماریہ کے چہرے پر نمودار ہوئی تھی ان الفاظ نے اسے چھین لیا۔ ایک لمحے کو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ واقعی کوئی بھوت یا بدروح ہو۔ یہ بات یہاں کا ہر شخص کہہ رہا تھا اور کوئی بھی اسے زندہ تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ ان کے خیال میں وہ برسوں پہلے مر چکی تھی۔ اس نے بزرگ عورت کی صورت دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں میں مری نہیں زندہ ہوں۔ آپ کے سامنے کوئی بدروح نہیں کھڑی ہوئی۔ ایک زندہ اور جیتا جاگتا وجود ہے جو برسوں کے بعد اس زمین پر آیا ہے۔ جہاں اس نے زندگی کی پہلی سانس لی تھی۔“

”اودہ تمہیں کچھ بھی نہیں معلوم۔ تمہاری ماں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا۔“

”افسوس تو یہی ہے! کش! میری ماں مرنے سے پہلے مجھے سب کچھ بتا دیتی۔ مجھے صرف وہ رات یاد ہے۔ چچی جب ہمارے گھر میں آگ لگی تھی اور رمضان پچانے میں اپنے گھر میں پناہ دی گئی اور پھر خاموشی سے ہمیں ریلوے اسٹیشن تک پہنچا دیا تھا۔“

”آؤ اندر آؤ اندر آ جاؤ..... آؤ۔“ اس بار عورت کے لہجے میں محبت کی جھلک پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اسے ساتھ لے ہوئے اندر پہنچ گئی۔ یہاں کمرے میں بان کی چار پائی ایک گرسی اور ضرورت کی کچھ اور چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک طرف

سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ بہر حال ایک جگہ پہنچ کر اس نے رمضان دودھ والے کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو اسے پتا چلا کہ رمضان مر چکا ہے۔ اس کی بیوی اور بچے موجود ہیں۔ بہر حال وہ اس طرف چل پڑی۔ ماضی کے بہت سے نقش اس کے ذہن میں واضح تھے۔ اسے ایک ایک بات کو یاد کرنا پڑ رہا تھا اور اس بات کی اسے امید تھی کہ مہربان خاندان کی کوئی بھی شخصیت اسے پہچان لے گی۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد وہ رمضان دودھ والے کے مکان پر پہنچ گئی۔ اس نے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر دوبارہ اور تین بار دستک دے کر اس نے دروازے کے پٹ پر باؤ ڈالا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ وہ ایک لمحے تک سوچتی رہی نہ جانے کسی نے اندر سے دروازہ کیوں نہیں کھولا۔ کیا قصہ ہے لیکن کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی۔ کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل ہو جانا کوئی اچھی بات تو نہیں تھی لیکن وہ اندر داخل ہوئی۔

اس کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا اور وہ بھیاں تک رات اسے یاد آ رہی تھی۔ جب ان کا مکان آگ کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا۔ واقعی رمضان دودھ والے کے گھر ایک عورت تھی۔ ہمدرد اور مہربان حسین نقوش و نگار کی مالک اس نے آگے بڑھ کر جلدی سے اسے گود میں اٹھالیا تھا اور اس کی ماں کو سہارا دیا تھا۔ وہ نقش اس وقت ماریہ کے ذہن میں محفوظ تھے اور وہ اپنی نقوش کی تلاش میں آگے بڑھ رہی تھی۔ مختصر سے آگن کی دوسری طرف برآمدہ تھا جس میں ساتھ ساتھ صرف دو کمرے تھے۔ جیسے ہی وہ کھن عبور کر کے برآمدے میں پہنچی ایک بوڑھی عورت ایک کمرے سے برآمد ہوئی۔ ہر چند کہ وہ بوڑھی عورت تھی لیکن اس کی صحت بہت اچھی تھی سر کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے۔ سادہ سے شلوار قمیص میں ملبوس وہ اچھی لگ رہی تھی اور خوب گہری نگاہوں سے وہ ماریہ کو دیکھ رہی تھی۔ لیکن ماریہ کے ذہن میں وہ نقوش زندہ ہو گئے تھے جو رمضان دودھ والے کی بیوی کے تھے اور جس جوان عورت نے اسے اپنی چھائی سے لگا تھا وہ اب عمر گزر جانے کے باوجود اس کے کمرے کو محسوس کر سکتی تھی لیکن ماریہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کی اچھٹن صاف محسوس ہو رہی تھی اور پھر اس کی آواز ابھری۔

”کون ہو تم؟ اور بغیر اجازت کیسے اندر چل آ رہی ہو۔“ اس کے سوال پر ماریہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اس نے کہا۔

”اس لیے کہ پہلے بھی میں بغیر اجازت اس گھر میں داخل ہو چکی ہوں چچی۔“

”کیا مطلب؟ کب کی بات کر رہی ہو؟ میں نے تو پہلے

جلی ہوئی لائیں اس گھر سے براؤ نہیں ہوئیں تھیں۔ اتنے باخبر لوگ تھے وہ کہ انہیں اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ تم ذریعہ ٹرین یہاں سے کہیں جاری ہو۔ میرا دعویٰ ہے کہ نہ تو تمہیں اور نہ تمہاری ماں کو اس بارے میں کچھ معلوم ہوگا کہ ان کے یہاں سے جانے کے بعد ان کے لیے کتنا خوف ناک حادثہ کیا گیا تھا۔“

”خوف ناک حادثہ؟“

”ہاں ایک بے پناہ خوف ناک حادثہ اس خیال کے تحت کے تم بذرِ بے ثمرین یہاں سے نہیں بھاگ رہی ہو۔ انہوں نے ریلوے لائن اکھاڑ دی تھی اور کیا سپر ٹرین پٹری سے اتر گئی تھی۔ اس خوف ناک حادثے میں پچاس افراد ہلاک ہوئے تھے اور تمہیں یقیناً اس بات پر حیرت ہوئی کہ رمضان اس وقت اسی علاقے میں موجود تھے۔ جہاں ٹرین کا یہ حادثہ پیش آیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے کئی ہمدست مسافروں کی لائیں جلی ہوئی بوگیوں سے نکالی تھیں۔ جب وہ واپس آیا تھا تو انتہائی خوفزدہ تھا اور یہ بات جانتا تھا کہ یہ حادثہ تمہارے لیے ہی کیا گیا ہے کیونکہ کسی کو یہ خیال تھا کہ تم اسی ٹرین سے سفر کر رہی ہو اور اس کے بعد۔ اس کے بعد یہ رمضان ہی کی تجویز تھی کہ تمہیں اور ایندوہ مراد سے فرار دے دیا جائے۔“

”کیا مطلب؟“

”ہاں میں نے کہا نا بہت ہی خوف ناک لوگ تمہارے دشمن تھے۔ حادثے میں ٹرین کی دو بوگیوں کو آگ لگ جانے کی وجہ سے بہت سی لائیں خراب ہو گئیں اور پھر جب ان لاشوں کو گاؤں لایا گیا تو رمضان کے کہنے پر میں نے دلاشوں کی شناخت کی یعنی تم اور تمہاری ماں جہیں روپ نگر لے آیا گیا تھا۔ گاؤں کے تمام مسلمانوں نے جنازے میں شرکت کی تھی اور میں ہر جمعرات کو ان قبروں پر پھول چڑھانی اور دیئے جلاتی رہی۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ بھی کیا سکتی تھی۔ ان لوگوں کو یقین دلا نا تھا کہ اب تم اس دنیا میں نہیں ہو۔ حالانکہ میں جانتی تھی کہ وہ لائیں تمہاری نہیں تھیں۔“ ماریہ نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا ہر نیا لمحہ اس کے لیے نئے انکشاف کا باعث بن جاتا تھا۔ کچھ دیر تک وہ خاموشی سے سر پکڑے بیٹھی رہی۔ پھر اس نے کہا۔

”اور کیا چچا رمضان کو یہ بات معلوم تھی۔“

”ہاں بالکل انہی کے مقصود پر میں نے تم ماں بیٹیوں کی لائیں شناخت کی تھیں۔ حالانکہ رمضان نے خود تمہیں وہاں تک روانہ کرنے کا انتظام کیا تھا تم اس وقت بہت چھوٹی تھیں۔ میرا خیال ہے تمہیں کچھ بھی یاد نہیں ہوگا۔“

انہی ٹھہری ہوئی تھی۔ جس پر چائے کی کیتلی رکھی ہوئی تھی۔ ”جیہو اتفاق کی بات یہ ہے کہ میں چائے ہی بنا رہی تھی۔ اپنے کام کو اندر ہی کر لیا کرتی ہوں بچے کچھ باہر ہی رہا کرتے ہیں۔ ایک بوڑھی عورت کے ساتھ کون وقت گزارنا پسند کرتا ہے، جیہو۔“ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور ماریہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ عورت چائے کی کیتلی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی پھر اس نے چائے کی پیالی کے ساتھ بسکٹوں کی پلیٹ بھی ماریہ کے سامنے چھوٹی سی میز پر رکھ دی۔

”سب سے پہلے میں اپنی موت کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہر شخص مجھے مردہ سمجھنے لگے لیے کیوں تیار رہتا ہے۔“ عورت نے اپنے لیے چائے کی پیالی بھری وہ شاید گرم چائے پینے کی عادی تھی کیونکہ چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگی تو اسے ذرہ برابر بھی احساس نہ ہوا۔ جب کہ ماریہ نے اپنی پیالی ہونٹوں سے چھو کر دیکھی تو اس کے ہونٹ سلگ کر گرہ گئے عورت نے لے لے دو تین گھونٹ لیے اور پر خیال انداز میں بولی۔

”تم بہت چھوٹی تھیں تمہاری ماں نے بتائیں کیوں تمہیں بڑے ہونے کے بعد اس بارے میں نہیں بتایا۔ ویسے بتایا نہیں تم نے کسی سے وہ زندہ ہے نا۔“

”میں ان کا انتقال ہو چکا ہے اور اب میں دنیا میں تنہا ہوں۔“ ماریہ نے افسردگی سے کہا۔

”اوہ مجھے اس کا افسوس ہوا بہت اچھی خاتون تھی وہ ہم تو کچھ بھی نہیں تھے تم لوگوں کے سامنے معمولی سے لوگ میرے شوہر تمہارے گھر میں دودھ دیا کرتے تھے۔ بے جاری ایندوہ اس کی ساری زندگی دکھ چھیلنے ہوئے گزر گئی۔ لیکن بچی تم ابھی جوان ہو۔ تمہیں ابھی پوری زندگی گزارنی ہے یہ جگہ تمہارے لیے اچھی نہیں ہے۔ تم یہاں سے چلی جاؤ تو تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہوگا۔“

”مجھے بہت عرصے کے بعد اس کا موقع ملا ہے چچی جان کہ میں اپنے ماں باپ اور اپنے بارے میں معلومات حاصل کروں۔ سب سے پہلے تو میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ یہاں مجھے مردہ کیوں سمجھا جا رہا ہے۔“

”دیکھو بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہر انسان کے علم میں نہیں ہوتیں لیکن اتنا میں جانتی ہوں کہ کسی نے تم دونوں ماں بیٹیوں کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ تمہارے مکان کو جان بوجھ کر آگ لگائی گئی تھی۔ بہت خطرناک لوگوں نے یہ کام کیا تھا۔ میرے مرحوم شوہر کو بہت بعد میں اس کا پتا چلا تھا کہ ان لوگوں کو تمہاری موت کا یقین نہیں ہے۔ کیونکہ تمہاری

بیٹھنے کی ہدایت کی اور پھر بولی۔
 ”تمہارے ذہن میں یہ خیال کیسے آیا؟“
 ”بلادل مسلسل مجھے یہاں سے جانے کے لیے کہتا رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں جلد از جلد یہاں سے چلی جاؤں۔ اس نے مجھے دھمکیاں بھی دی ہیں۔“
 ”آہ اس کا مطلب ہے کہ بلادل کو بھی تمہاری یہاں آمد کا پتا چل چکا ہے، مٹی خدا سے دعا مانگو کہ وہ تمہیں اس بد معاش اور کمینے شخص سے محفوظ رکھے۔ اس سے زیادہ ذلیل اور کمینہ انسان آج تک میری نگاہوں سے نہیں گزرا بلکہ اسے انسان کہنا بے وقوفی ہے وہ تو شیطان ہے۔ اس کے سائے سے بھی دور رہو اسی میں تمہاری بہتری ہے اگر اس نے تمہیں کوئی دھمکی دی ہے تو۔“

”دیکھیے چچی جان! میں سچ جانا چاہتی ہوں چاہے اس کے لیے مجھے سو بار زندگی قربان کرنی پڑے۔ آپ کو یقیناً اس بات کا علم ہے کہ میرا باپ کون تھا۔ ضرور آپ اس کے بارے میں جانتی ہیں۔ آپ لوگ یہاں کے قدیمی رہنے والے ہیں۔ کیا آپ کو اس بات کا دکھ نہیں ہوتا کہ ایک ایسی لڑکی جس کی ماں بھی مریجی ہے۔ اپنے باپ کے وجود سے نا آشنا ہے۔ چچی جان خدا کے واسطے مجھے بتا دیجیے کہ میرا باپ کون ہے؟“
 ”کیسی باتیں کرتی ہو مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ تمہاری ماں مجھ سے بے حد بے تکلف تھی۔ بے شک میرا شوہر تمہارے ہاں دودھ دیتا تھا لیکن تمہاری ماں کے ہم لوگوں سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ مجھ سے بے تکلف ہونے کے باوجود اس نے بھی اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں بتایا۔“

”ٹھیک ہے! اچھا ایک بات تو بتا دیجیے۔ آپ کو اس بات کا علم تو ہوگا کہ سونیا کون ہے؟“ ایک بار پھر نرم بیٹھا تھا۔ رمضان کی بیوہ متوش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ لیکن اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا اور باپ اس کا چہرہ بے تاثر اور سہا ہوتا جا رہا تھا اس پر ہلکی سی کڑکھلی پیدا ہوئی تھی اور وہ اس سے نگاہیں چراتی رہی تھی۔ ماریہ جانتی ہی کہ اب ایک لمحے کے بعد وہ اس سے معذرت کرتے ہوئے کہے گی کہ اسے پریشان نہ کیا جائے اور وہ وہاں سے چلی جائے ایسے حالات میں وہ کی کو مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے آپ مطمئن رہیں میں اسی سرزمین پر پیدا ہوئی ہوں۔ گو مجھے یہاں پر پروان چڑھنے کا موقع نہیں ملا لیکن اس کے باوجود میں اسے اپنے ماں باپ کا گھر سمجھتی ہوں۔ آپ لوگ کب تک میری مدد نہیں کریں گے میں ان مدد

”ہاں مجھے کچھ یاد نہیں ہے سوائے آگ کے ان شعلوں کے جو ہمیں اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے لپک رہے تھے۔ ان کے علاوہ مجھے اور کچھ یاد نہیں۔“

”تو پھر باقی سب کچھ بھولی ہی رہو تو اچھا ہے تمہیں کچھ یاد نہیں کرنا چاہیے تم وہ نہیں ہو جو ہمیں اسی میں تمہاری زندگی کی بقاء اور میرے اپنے خیال میں تم نے بے حد بھینٹ قدم اٹھایا ہے۔ روپ گرا کر کیا تمہیں۔ گڑے مردے اٹھاؤنے سے کوئی فائدہ نہیں میری رائے ہے کہ تم واپس چلی جاؤ۔“
 ”میں بالکل نہیں آنے والا ہر لمحہ میرے ارادے کو پختہ کرتا ہے۔ میں اپنے نامعلوم دشمنوں سے بالکل خوفزدہ نہیں ہوں۔ سمجھیں آپ چچی جان میں کوئی ڈر ہو کہ لڑکی نہیں ہوں۔ میں حالات سے دنیا سے مقابلہ کرنا جانتی ہوں۔“
 ”دیکھو ضد اچھی نہیں ہوتی تمہاری اصلیت سے آگاہ ہو کر وہ تمہیں دوبارہ ہلاک کرنے کی کوشش کریں گے اور ضروری نہیں ہے اس مرتبہ بھی تم بچ جاؤ۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آپ بہت کچھ جانتی ہیں چچی جان۔ یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ آپ اس سلسلے میں ضرور بہت کچھ جانتی ہیں۔ خدا کے لیے آپ مجھے کچھ اور بتائیے۔“
 ”تمہیں ممکن نہیں ہے۔ پہلے تو میں تمہیں یہ بتاؤں کہ تمہاری ماں کو صرف تمہاری فکر تھی اگر تم نہ ہوتیں تو وہ شاید زندہ بھی رہتی اور روپ نگریں ہی رہتی۔ اسے یہاں سے جانے کی ضرورت نہ پیش آتی۔“

”کیا میری ماں نے میرے باپ کے بارے میں آپ کو کچھ نہیں بتایا چچی جان؟“
 ”میں سن رہی ہوں تمہارا باپ گواہ میں کہیں رہتا تھا۔“
 ”گواہ۔“
 ”ہاں۔“

”تمہیں میں نہیں جانتی۔ آپ اب ایک بے مقصد جھوٹ بولنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ایک بات بتائیے مجھے ایک بات بتائیے کیا میرے باپ کا تعلق جوہلی سے نہیں تھا۔ اس جوہلی سے جو امین خان کی جوہلی کہلاتی ہے۔ ماریہ کے یہ الفاظ گویا ہم کا دھماکا تھے۔ اس وقت رمضان کی بیوہ اپنی چائے کی پیالی کا آخری کھونٹ لے رہی تھی۔ پیالی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے پیڑوں پر گر پڑی۔ اس کا چہرہ سخت و سخت کا شکار نظر آ رہا تھا۔ اس نے پیالی اٹھا کر اس کی جگہ رکھی۔ گری ہوئی جائے کو صاف کرنے لگی۔ ماریہ نے اٹھ کر اس کا لباس صاف کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے ہاتھ کا اشارہ کر کے اسے

عزت نہیں دے سکیں گے۔ کیا تم ان لوگوں کو بلیک میل کرنا چاہتی ہو۔“

”میں ذہنی سکون حاصل کرنے آئی تھی اور خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ یہاں مجھے اپنی تفریح کی زیارت کرنی پڑے گی۔ واقعی بڑی عجیب داستان ہے میری۔ ویسے کیا آپ جانتی ہیں کہ میری زندگی اب بھی خطرے میں ہے۔ یہ تو بڑی پرانی بات ہے۔ بہت ہی پرانی بات۔ جب ان لوگوں نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ کیا اب بھی انہیں میری زندگی ناپسند ہے۔ اتنے طویل عرصے کے بعد بھی۔“

”ہاں بالیقہ ناشاید تمہاری طرح اور کوئی بھی ذہنی سکون چاہتا ہو۔ بس اب تم جاؤ تمہیں خدا کا واسطہ۔ میں اتنی بد اخلاق نہیں ہوں کہ کسی کو اپنے گھر کے دروازے سے باہر جانے کے لیے کہوں لیکن مجبور بنی ہے جاؤ۔“

اس نے ماریہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ دونوں دروازے تک پہنچ گئیں۔ اس نے ہاتھ کے دباؤ سے ماریہ کو دروازے سے باہر کیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ ماریہ خاموش کھڑی اس بند دروازے کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ ابتدائے میں رمضان کی بیوی بڑے اخلاق اور مروت سے پیش آتی تھی لیکن آخر میں اس نے اپنے روئے کو بے حد سرد اور سخت کر لیا تھا۔ ماریہ کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ رمضان کی بیوی سو فیصدی اس کے باپ کو جاتی ہے مگر کوئی انجانا خوف اسے زبان بند کرنے پر مجبور کر رہا ہے اور ہر حال ماریہ اپنے طور پر پختہ کار ہوئی جارہی تھی۔ کچھ بھی ہو زندگی کا ایک مقصد ہی تو ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اگر زندگی چلی جاتی ہے تو سودا نقصان کا نہیں ہے۔ ٹھیک ہے روپ نگر والو تم بھی ایک انوکھی لڑکی کو دیکھو گے جو ضد کی پکی ہے اور جو اپنا مقصد پورا کیے بغیر یہاں سے نہیں جائے گی۔ وہ ٹھنلے والے انداز میں آگے بڑھتی رہی۔ گاؤں کی مختلف گلیاں اور سڑکیں اس کے قدموں تلے آگئیں ویسے اب وہ بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ وہ اسے آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہاں اس کا کوئی دشمن نہیں ہے اور اسے کسی سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ طویل عرصے پہلے گھر کو آگ لگنے کا واقعہ محض اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔ امینہ نے ملاوہ خوفزدہ ہو کر روپ نگر چھوڑ دیا تھا اگر ان کا کوئی بیچ بچ دُکھ ہوتا تو اب تک وہ زندہ کیسے رہ سکتے تھے۔ بقول رمضان کی بیوی کے ٹرین کا حادثہ کیا گیا صرف ان لوگوں کو ختم کرنے کے لیے مکان کو آگ لگائی گئی۔ جو لوگ اس حد تک عمل کر سکتے ہیں وہ صرف رحم کے سہارے کیسے مطمئن ہو گئے نہیں اگر کوئی انہیں ہلاک کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا بہت عرصہ ملا ہے اسے امینہ کے

گاروں کو تلاش کرتی رہوں گی جو مجھے میرے ماں باپ کے بارے میں بتا دیں میں بھی بہت ضدی ہوں۔ جو فیصلہ کر کے میں یہ لیا اور برخطر راستہ طے کر کے یہاں آئی ہوں وہ فیصلہ میری زندگی کا آخری فیصلہ ہے۔ دیکھ لیجئے میں یہاں پر اپنے بارے میں معلومات حاصل کر کے ہی جاؤں گی۔“

”خدا کے لیے تم چلی جاؤ۔ خدا کے لیے تم چلی جاؤ ورنہ..... ورنہ..... میں اور میرے بچے مصیبت میں پڑ جائیں گے۔“

”کیا مطلب؟ آپ مصیبت میں کیوں پڑ جائیں گی؟“

”اس لیے کہ میں تمہاری اور تمہاری ماں کی لاشوں کو شناخت کیا تھا اور اب راز اُھل جانے کے بعد لازمی بات ہے کہ وہ مجھے پریشان کر دیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ میرے ہی دشمن بن جائیں باقی دوسری بات یہی ہے کہ وہ تمہیں کسی بھی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑیں گے وہ تمہارے بدترین دشمن ہیں۔ جاؤ خدا کے لیے یہاں سے چلی جاؤ۔“

”یہاں سے تو میں جاری ہوں اور ہو سکتا ہے وہ بارہ آپ کو پریشان نہ کروں پچی جان! لیکن مجھے اس بات کا افسوس رہے گا کہ آپ لوگوں نے میری کوئی مدد نہیں کی ویسے میں آپ کو بتا دوں کہ میرا واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”بہت بڑی غلطی کر رہی ہو تم بہت بڑی غلطی کر رہی ہو۔ میری ایک بات یاد رکھنا یہ زندگی بڑی قیمتی چیز ہوتی ہے اسے کسی دوسرے کے اختیار میں دے دینا بڑی بات ہے۔ ایک بات اور بتا دوں تمہیں اگر تم کچھ معلوم کرنے میں کامیاب بھی ہو جاؤ تو زبان بند رکھنا اور..... اور بہت زیادہ کوششیں مت کرنا۔ کبھی بھی خون کے رشتے بھی اس قدر بدنام لگتے ہیں کہ انسان کو ان سے گھن آنے لگے۔ ماریہ واپسی کے لیے مڑتے مڑتے پھر کر گئی۔ اس نے کبھی نگاہوں سے رمضان کی بیوی کو دیکھتے ہوئے نہ کیا۔

”اور میں مختلف لوگوں کی باتوں سے یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گئی ہوں کہ میرا باپ اس علاقے کا ایسا کوئی معزز شخص ہے جو یہاں میری موجودگی سے خوفزدہ ہے۔ وہ زندہ ہے اور میری ماں سے بھی اپنا تعلق ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا اور مجھ سے بھی۔ شاید وہ سوچ رہا ہو کہ میں اسے بلیک میل کرنے کی کوشش نہ کروں بوزھ می عورت نے سرد نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولی۔

”فرض کرواگر تمہیں بہت ساری باتیں معلوم بھی ہو جاتی ہیں تو تم کیا کرو گی۔ کیا حاصل کرنا چاہو گی تم یہاں سے۔ دولت عزت کا تو خیر کوئی تصویر ہی نہیں ہے۔ وہ لوگ بھی نہیں

بری طرح اچھل پڑی۔ اس کی وحشیت زدہ نگاہیں چاروں طرف دیکھنے لگیں۔ مکی عورت کی چیخ بھی جس کی بازخوابت اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ ماریہ کی نظر تقریباً آدھے فرلانگ کے فاصلے پر درختوں کے جھنڈ میں نظر آنے والی ایک مختصر عمارت کی طرف اٹھ گئی۔ اسے ایک سایہ سا لہراتا ہوا نظر آیا جو درختوں میں غائب ہو گیا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ اس کی شکل نہیں دیکھ سکی تھی لیکن لباس سے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی کہ وہ کوئی لڑکی تھی جو غالباً اس عمارت سے نکلی تھی۔ جو درختوں میں نظر آرہی تھی۔ ابھی اس کی نگاہیں صحیح طور پر اس لڑکی کو تلاش بھی نہیں کر پائی تھیں کہ ایک اور سایہ درختوں کے درمیان نظر آیا اور دوڑتا ہوا درختوں ہی میں غائب ہو گیا اگرچہ شکل اس کی بھی نظر نہیں آئی تھی لیکن اس مرتبہ ماریہ بری طرح چونک پڑی تھی۔ رات بھر کی باتش کے بعد بادی جگہ جگہ جمع ہو چکا تھا وہ کچھ میں دھنستی ہوتی قبروں تک چلی تو آئی تھی لیکن اب قبرستان سے باہر نکلتا دشاور ہو رہا تھا۔ آخر کار وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بیچڑ میں چھپ چھپ کر نئی قبرستان سے باہر نکل آئی۔ اس کا رخ درختوں کے اسی جھنڈ کی جانب تھا جہاں سے اس نے بچوں کی آواز سنی تھی اور ان سبوں کو دیکھا تھا۔ درختوں کا یہ جھنڈ کسی قدر اونچی جگہ پر تھا لیکن دور دور تک اسے کسی کا نشان نظر نہیں آیا۔ وہ اس چھوٹی سی عمارت کی طرف چل پڑی۔ جواب کھنڈر بن چکی تھی۔ اس عمارت کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اسے تباہ ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ عمارت میں چند کمرے تھے جو ٹوٹے پھوٹے تھے کمرے کی دیواریں بے شک موجود تھیں لیکن چھت غائب تھی۔ البتہ ایک کمرے کی چھت قائم تھی۔ مگر اس کی دیواریں میں بھی دراڑیں صاف نظر آرہی تھیں۔ وہ آگے بڑھ کر کھنڈر میں داخل ہو گئی۔ کمرے کے نیم تاریک ماحول میں وہ بحسب بھری نگاہوں سے ادھر ادھر کا جائزہ لیتے گئی۔ دفعتاً ہی اس کی نگاہیں فرش پر پڑی ہوئی ایک چاندی کی انگوٹھی پر جم گئیں۔ چاندی کی یہ انگوٹھی جس میں ایک کالے رنگ کا پتھر بڑا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے شامہ شناسی محسوس ہوئی۔ وہ جھکی اور اس نے چاندی کی اس انگوٹھی کو اٹھا لیا۔ اسے یادیں آ رہا تھا کہ چاندی کی یہ انگوٹھی اس نے کہاں دیکھی ہے۔ بہر حال اسے اپنی محسوس میں دبا کر وہ کھنڈر کے لقیہ حصوں کا جائزہ لینے لگی اور پھر پیچھے سے ہوتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اس نے بحسب نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ اسے حیرت تھی کہ وہ لڑکی کون تھی اور کون اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ نیز یہ کہ اچانک وہ کہاں غائب ہو گئے۔ بہت دیر تک وہ قرب و جوار کا جائزہ دیتی رہی اور اس کے

انتقال کو تو بہت مختصر وقت گزرا ہے۔ اپنے آپ کو یہ محسوس نہیں سمجھاتی ہوتی وہ اس جگہ سے باہر نکل آئی جہاں آبادی کا آخری مکان تھا۔ ہاں کچھ فاصلے پر ایک مختصر مکان کے گرد مٹی کی دیواریں اٹھادی گئی تھیں۔ ایک احاطہ سا بنایا گیا تھا اور اس احاطے پر کوئی گیٹ نہیں تھا۔ دیوار پر چونے سے عید کا لکھا ہوا تھا اور عید گاہ کی اس چار دیواری کے قریب ہی کچھ فاصلے پر قبرستان تھا۔ یہ ٹوٹا پھوٹا قبرستان بھی زیادہ بڑا نہیں تھا۔ کچھ قبریں بچی تھیں۔ کچھ بیٹھ گئی تھیں۔ بعض قبروں پر سنگ مرمر کے کتبے لگے ہوئے تھے اور بعض پر پتھر کے ٹکڑے کچھ چٹھروں پر مرمر کے والوں کے نام بھی لکھے ہوئے تھے وہ یہ کتبے دیکھتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ بے شمار قبروں کو اس نے قریب سے دیکھا اور پھر ایک قبر کے قریب رک گئی۔ یہ قبر بھی خاصی شکستہ تھی اس کے سر پائے لگے ہوئے کتبے کی تحریر اگرچہ مدھم بڑ چکی تھی مگر پڑھی جاسکتی تھی۔ وہ جھپک کر اسے دیکھنے لگی اور دوسرے لمحے اس کی بدوح تک لڑ گئی کتبے پر اس کا نام اور مرنے کی تاریخ درج تھی۔ دوسری قبر کے کتبے پر اس کی ماں کا نام درج تھا۔ دونوں کے مرنے کی تاریخ ایک ہی تھی۔ وہ اپنی قبر پر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی کہ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو جس نے خود اپنی قبر پر فاتحہ پڑھی ہو۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ یونہی صم صم بیٹھی اپنی قبر پر ہاتھ رکھے اپنے آپ کو تلاش کرتی رہی۔ اس کا ذہن ان لاشوں کی جانب چلا گیا تھا جو ان قبروں میں دفن تھیں۔ نہ جانے کون ہو گی بے چاری لیکن ان کی تصدیق کر دی گئی تھی اور اب رمضان کی بیوی اس بات پر خوفزدہ تھی کہ تصدیق کرنے والوں میں اس کا نام صرف ہرست تھا اور وہ نام نہاد دشمن اس سے یہ سوال کر سکتے ہیں کہ اس نے یہ جھوٹی تصدیق کیوں کی وہ پہلے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ یہ خیال اور یہ احساس ایسی سنسنی خیز کیفیتوں کا حامل بن جائے گا اب تو کتنی بات یہ ہے کہ ان حالات میں لطف آنے لگا تھا۔ پہلے تو کتنی ہی کہ شاید اپنے باب کے بارے میں اسے کچھ معلومات حاصل ہو جائیں دشمنوں کا کوئی تصور اس کے ذہن میں نہیں تھا اور وہ نہیں جانتی تھی کہ روپ نگر میں اس کے دشمن اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں لیکن اب وہ عجیب امید و بیم کی کیفیت کا شکار ہو گئی تھی۔ دل اندر سے کہتا تھا کہ کوئی کہانی سے ضرور لیکن اس کہانی کو اہمیت دینے کا مقصد یہ تھا کہ اپنے دشمن سے بھٹک جائے۔ کیا کرنا چاہیے اس کا دل چاہا کہ قبروں میں سونے والوں سے یہ سوال کرے کہ زندہ لوگ تو اس کی مدد کر نہیں سکتے کیا وہ اسے کوئی راستہ دکھا سکتے ہیں۔ تھوڑی دیر اسی طرح گزرتی اور پھر اچانک ہی ایک چیخ سنائی دی اور وہ

ماریہ کے بدن میں مستی دوڑ رہی تھی۔ اس نے گھوم کر بلاول کا جائزہ لیا۔ بلاول اسے تیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

”گویا تم نے یہاں اپنے کام کا آغاز کر دیا ہے لیکن کیا معلوم کر سکتی ہیں اس سے، کیا معلوم کر سکتی ہو گی مجھے یہ بات معلوم نہیں کہ تم کیا کرتی پھر رہی ہو۔ رمضان دودھ والا مہینہ ہے۔ مگر اس کی بوجہ وہ..... اس سے پہلے بھی اس کے بارے میں غور نہیں کیا تھا لیکن اب شاید نہیں اس بات کا علم نہیں کہ اسی نے تمہاری اور تمہاری ماں کی لاش شناسخت کی تھی۔ اس کے علاوہ وہ لڑکی جو یہاں ہم لوگوں کے رحم و کرم پر رہ رہی ہے اور اس کا باپ میری مراد سہی ناتھ ہے۔ وہ لڑکی بھی بہت زیادہ تمہاری دوست بننے کی کوشش کر رہی ہے خیر اس لکڑیا کو یہ بات معلوم ہے کہ ہم اسے یہاں نہیں رکھنا چاہتے لیکن اس نے تمہیں اپنی سرائے میں جگہ دی ہوئی ہے۔ اسے اس کا نتیجہ بھگتنا ہوگا۔ بہر حال میں گزری رات کے واقعے کو نہیں بھولا ہوں۔ اصل میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ شاید تم اب تک مجھے بھی نہیں ہو۔“

”جیسی طرح سمجھ چکی ہوں، مگر بلاول۔“

”نہیں سمجھ سکتی اگر مجھے سمجھ چکی ہو تو اب تک یہاں سے بھاگ گئی ہوگی۔“

”اور تمہیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ میں بھاگنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ ویسے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم میرے لیے اتنے پریشان کیوں ہو اور میرے ساتھ تعاون کیوں نہیں کرتے اگر میں تم سے یہ سوال کروں کہ سونیا کون ہے؟ تو کیا تم اس سوال کا جواب دینا پسند کرو گے؟“

”گویا تم یہاں سے جانا نہیں چاہتیں۔ چلو ٹھیک سے سونیا کے بارے میں تم خود ہی معلوم کر لو لیکن اس سے پہلے جو کچھ ہو جائے گا ذرا اس پر نگاہ رکھنا۔“ بلاول نے کہا۔

”تمہیں دے رہے ہو مجھے اب مجھے یہ دیکھنا ہے کہ اس دھمکی پر عمل کب کرتے ہو۔“ سوچ کر رہی ہوں تمہیں بات سمجھ میں آئی ہوگی۔“ ماریہ نے کہا اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ وہ اس بات کی منتظر تھی کہ بلاول اس کا تعاقب کرے گا اور ہو سکتا ہے وہ پیچھے سے اس کے بال پکڑ کر اسے روکنے کی کوشش کرے لیکن اس مرتبہ بلاول نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ غالباً روپ ٹگر میں بارشیں زیادہ ہوتی تھیں۔ کیونکہ ماریہ جب سے یہاں آئی تھیں اسے بادل اور بارشوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس وقت بھی آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ وہ مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی سرائے میں

بعد درختوں کے چھنڈ سے نکل کر دوبارہ قبرستان کی طرف آگئی۔ کچھ جگہ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا قصہ ہے۔

اچانک ہی اسے اپنے کندھے پر دباؤ محسوس ہوا اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ تیزی سے پیچھے گھومی پھر اس نے جیسے دیکھا اسے دیکھ کر اس وقت وہ اپنے اعصاب قابو نہیں پاسکی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں جیسے رکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ حلق میں آواز پھنس گئی۔ دیر تک وہ اسی طرح خاموش کھڑی رہی تب بلاول کی آواز ابھری۔

”ہوئی گئی تمہیں اپنی یہ قبر؟“ بلاول کے لہجے میں ایک عجیب سا طنز تھا۔ ماریہ کوئی جواب نہیں دے سکی تو بلاول نے پھر کہا۔

”ویسے یہ قبر تلاش کرنے میں تمہیں کافی دشواری پیش آئی ہوگی۔ یہاں بہت سی ایسی قبریں ہیں جن کی اموات نہایت راسخہ حالات میں واقع ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ کبھی کے لوگ بھی ان کی موت کے معنی کو حل نہیں کر سکے۔“ اس کی زہریلی آواز ماریہ کو اپنے کانوں میں تیر کی طرح جھپتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ قہقہہ لگا کر رہ گئی۔ بلاول کا طنز اس کی سمجھ میں آ رہا تھا اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

”اور یقیناً تم خود کو ان کا قاتل ظاہر کرنا چاہتے ہو لیکن میں تمہیں بتاؤں مجھے ایسی احقانہ باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں کسی کے لیے اس قدر زور تو نہیں ثابت ہو سکتی۔“

”ہوں۔“ بلاول نے کہا اور اسی وقت ماریہ نے قدم آگے بڑھا دیے۔ اب وہ اپنے آپ کو بلاول کی یہاں موجودگی سے بے پروا ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ بلاول اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

”تم واپس کیوں نہیں گئیں؟“

”بلاول! میں نہیں کہہ سکتی کہ تم کیسے طرح کے انسان ہو۔ رات کو جو کچھ ہوا کیا اس کے بعد بھی تمہیں میرے بارے میں اندازہ نہیں ہو سکا کہ میں کیا چیز ہوں۔ سنبو تمہیں تم نے غیر فطری طور پر ان قبروں میں سلا یا ہے ان میں سے ایک بھی میرے باپ کا انسان نہیں ہوگا۔ ورنہ تمہیں پچھٹی کا دودھ یاد آ جاتا۔ سمجھ رہے ہو نا۔ یہ تمہاری بے وفائی ہے کہ میرے بارے میں بھی تم اسی انداز میں سوچ رہے ہو۔ اتنا میں جانتی ہوں کہ تم میرے بارے میں جان چکے ہو اور مرحوم رمضان کی بیوہ۔“ اچانک ہی ماریہ نے دانٹوں تلے زبان دہائی وہ اپنے آپ سے شرمندہ ہو گئی بے خیالی میں اس کی زبان سے جو نام نکل گیا تھا وہ اسے نہیں لینا چاہیے تھا۔ بلاول کی غراہٹ ابھری۔

سے آنے کے کچھ ہی دنوں کے بعد امین خان کو ایک اور حادثہ پیش آیا۔ اس مرتبہ وہ گھر کی سیڑھیوں سے گرا تھا۔ جس سے اس کی ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی۔ بس اس کے اپنا بچ ہونے کے لیے یہی دونوں چیزیں کافی تھیں اور اس کے بعد سے بے چارہ پہیوں والی کرسی پر زندگی کے دن گزار رہا ہے بس اتنی ہی معلومات مجھے حاصل ہو سکی ہیں ویسے اگر تم جاہلوں گل زبان سے رابطہ قائم کر کے اس سلسلے میں معلومات حاصل کر سکتی ہو۔ وہ تمہیں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔“

”گل زبان“ ایک دم سے ماریہ کے دماغ میں ایک روشنی سی چمکی پہلے بھی اس کا نام سامنے آچکا تھا۔

”ہاں گل زبان۔ اس علاقے کا دوسرا بڑا زمیندار۔“ کرن کور نے جواب دیا پھر بولی۔

”اس کی حویلی آبادی کے شل میں ہے۔ ویسے ماضی میں امین خان سے اس کی بڑی گہری دوستی تھی لیکن ان کی دوستی میں امین خان کا بیٹا ملاول ہی رخصت انداز ہوا اور اس کی وجہ سے ان کے تعلقات بگڑ گئے۔“

”ہاں شاید تم نے پہلے بھی بتایا تھا کہ بلاول گل زبان کی بیٹی عدلیہ سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن تم نے کچھ اور بھی کہا تھا۔“

”کیا؟“

”یہی کہ تعلقات میں کشیدگی کے باوجود گل زبان اس رشتے پر آمادہ ہے۔“

”اس کی وجہ سے سمجھتی کیوں نہیں ہو تم بلاول اس علاقے کی آدمی سے زیادہ زمینوں کا مالک ہے اور دولت کا لالچ بہت بڑی چیز ہوتی ہے۔ گل زبان کا خیال ہے کہ اس کی بیٹی ملاول سے شادی کر کے ان بقیہ زمینوں کی مالک بھی بن جائے گی۔ دونوں ایک ہی انداز میں سوچ رہے ہیں۔ بلاول خود گل زبان کی زمینوں پر دانت کاڑے بیٹھا ہے کیا دلچسپ بات ہے۔“ ماریہ نے لگی۔ اس نے گردن ہلا کر کہا۔

”واقعی دولت عجیب چیز ہوتی ہے۔ انسان کو جانور بنادیتی ہے۔“ اچانک ہی نیچے سے چھٹا وازیں سنائی دیں اور کرن کور اٹھی ہوئی بولی۔

”شاید نیچے کوئی آبا سے میں چلتی ہوں۔“

”تمہارے ہاتھ مجھے نظر نہیں آئے۔“

”ہاں وہ شہر گئے ہوئے ہیں اور ان کی واپسی کل شام تک ہوگی۔“ کرن کور نے جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

ماریہ دو چہر کا کھانا کھانے کے بعد سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ پھر رات کو اٹھ بچے کے گک بھگ اس کی آنکھ کھلی باہر

آگئی۔ پیرونی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی اس نے کرن کور کو دیکھا اور ایک دم سے چونک پڑی اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ کرن کور اس وقت چست لباس میں لباس تھی۔ اس نے پٹی سی شرٹ پہنی ہوئی تھی اس لباس میں کچھ عجیب سی نظر آرہی تھی کرن کور نے اسے دیکھ کر کہا۔

”میں اپنے آپ کو ٹر کھنے کے لیے بہت سخت ورزش کرتی ہوں اور میرے باپ نے مجھے تھوڑے سے تھیل بھی سکھائے ہیں۔ یعنی سیلف ڈیفنس کیا تمہیں۔“

”یہ بڑی اچھی چیز ہے۔ کم از کم انسان کے اپنے اندر اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ ویسے کیا تمہیں بھی کسی دشمن نے نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ یہ بات سیخہ راز میں رہنے دو۔ دشمن نقصان ہی پہنچاتے ہیں۔“ کرن کور نے گول مول جواب دیا اور ماریہ مسکرائے لگی۔ کرن کور نے کہا۔

”کہاں گئی تھیں تم۔“

”اپنی قبر دیکھنے۔“

”اپنی قبر؟“

”ہاں مجھ سے میری قبر کے بارے میں کچھ جاننا چاہو تو اندر آ جاؤ۔ مگر جائے کے ساتھ۔“ ماریہ نے کہا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ غالباً کرن کور سخت تجسس تھی۔ کیوں کہ تھوڑی دیر کے بعد وہ کمرے میں جائے لے کر بیٹھ گئی۔ بس اتنا وقفہ ہوا تھا کہ ماریہ نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔

”ہاں اب بتاؤ۔“

”مجھے نہیں قبرستان گئی تھی۔“ ماریہ نے کہا اور تھوڑی سی تفصیل اسے بتائی۔ کرن کور کہنے لگی۔

”وہ شخص اس قدر ذلیل ہے کہ تمہیں تعجب ہوگا۔“

”تم نے اس کے باپ کے بارے میں بھی ایک بار کچھ بتایا تھا۔“

”امین خان۔“

”ہاں۔“

”امین خان کب سے مفلوج ہے۔“

”سنائے دس گیارہ سال پہلے وہ ایک چٹان سے بھسل کر گرا تھا۔ جس سے اس کی ٹانگ کی ایک ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ کافی علاج کیا گیا اس کا تقریباً ایک سال تک اسپتالوں میں زیر علاج رہا لیکن تپتی کے لوگ دلی دلی زبان میں کہتے ہیں کہ اس کے ساتھ پیش آنے والا حادثہ محض اتفاق نہیں تھا۔ کسی نے اسے دھکا دے کر چٹان سے گرایا تھا اور اس سلسلے میں دے دے لکھے میں اس کے بیٹے بلاول کا نام بھی لیا جاتا ہے مگر کسی نے نکل کر آج تک اس شے کا اظہار نہیں کیا۔ بہر حال اسپتال

اسے حیرت ہوئی تھی کہ یہ کیا انداز ہے اور پھر اس وقت جب رات ہو چکی تھی۔ دروازہ کیسے کھلا رہ گیا۔ وہ دروازے سے اندر داخل ہو کر چھوٹے چھوٹے قدیم اٹھانی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ ابھی وہ صحن کے درمیان میں پہنچی تھی کہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ اسے برآمدے میں کوئی انسانی حیوان نظر آیا تھا۔ جو ابھی ابھی کمرے کے اندر وئی دروازے سے باہر نکلا تھا۔ تارکی کی وجہ سے یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ وہ کون ہے۔ ہو سکتا ہے رمضان کا کوئی بیٹا وغیرہ ہو لیکن اس کے خیال میں نہ جانے کیوں یہ احساس آیا تھا کہ یہ رمضان کا بیٹا نہیں ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے اپنی جگہ رک کر اس ہیولے کا اندازہ لگانے لگی۔ پھر اس نے دیکھا کہ یہی وہ ایک ستون سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا ہے۔

”چچی جان! چچی جان۔“ ماریہ نے دوبارہ آواز دی لیکن اس بار بھی جواب نہیں ملا تھا۔ البتہ وہ اس ہیولے کو برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے دیکھ رہی تھی۔ اسے حیرت ہونے لگی اگر وہ رمضان کا کوئی بیٹا وغیرہ بھی ہے تو بولتا کیوں نہیں ہے۔ آخر میں نے اس مخاطب کرنا ہی بہتر سمجھا۔

”سنو تم کون ہو؟“ اس بار بھی جب جواب نہ ملا تو وہ آگے بڑھ کر برآمدے کے قریب پہنچی۔ ابھی اس نے برآمدے میں قدم رکھا ہی تھا کہ وہ ہولا اچانک ہی اپنی جگہ سے اچھلا اور اس کے ساتھ ہی مارہو بولوں لگا جیسے اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ ہیولے نے کوئی وزنی چیز اس کے سر پر ماری تھی۔ اس کے حلق سے جھج نکلی اور وہ نیچے گر پڑی۔ پھر جیسے ہی بھٹی اس نے ہیولے کو پھر وئی دروازے میں غائب ہوتے دیکھا۔ وہ زمین پر گر پڑی تھی اور اس کا لباس پچھڑ میں لت پت ہو گیا تھا۔ سر میں جس جگہ چوٹ لگی تھی وہاں زبردست میسٹیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے سر کو ٹٹول کر دیکھا تو

انگلیوں پر خون کی چیچھا پٹ کا احساس ہوا۔ اس نے ہاتھ کو آنکھوں کے قریب کیا تاہم کی میں کچھ نظر نہیں آیا لیکن یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اس کا ہاتھ خون میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ مشکل تمام وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور برآمدے میں پہنچی۔ اس نے والے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن اندر تاریکی تھی۔ اس نے دو تین مرتبہ چچی جان! چچی جان کہہ کر آواز دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا تو وہ ہمت کر کے اندر داخل ہو گئی۔ پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا سامنے ہی مٹی کے تیل کی لالین نظر آئی جس کی روشنی کو مدھم کر دیا گیا تھا۔ وہ لالین کے قریب پہنچی اور اس نے اس کی کل کھائی تو روشنی تیز ہو گئی اور پھر جیسے ہی اس نے کمرے میں نگاہ ڈالی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ لالین کی مدھم اور زرد روشنی میں ایک چار پانی پر

سے بوندیں مین کے شدید پرموشنی پھیر رہی تھیں۔ کھلی کھڑکی سے پھیلے پھیلے ہواؤں کے مدھم جھوکے اندر آ رہے تھے اور طبعیت میں بلاوجہ ایک جولانی سی پیدا ہو رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے سے باہر نکلی اور بوندوں کی مدھم دیکھنے لگی۔ بارش کی آواز کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ رفتہ رفتہ ایک بار پھر اس کے ذہن پر وہی تمام واقعات حملہ آور ہو گئے۔ وہ ان واقعات سے پریشان نہیں تھی۔ اسی مقصد کے تحت تو یہاں آئی تھی لیکن اس کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا کہ یہاں آنے کے بعد اسے ان خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا اور ایسی کچھ خصوصیتیں اس کی دکن بن جائیں گی جن کے بارے میں اسے کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ سوچوں کے دائرے پھیلتے سکتے رہے پھر اچانک ہی اس کے ذہن کا ایک خانہ روشن ہو گیا۔ یہاں دو فوٹوئیں ہیں! امین خان کا بیٹا بلاول اور دوسری قوت گل زبان کی ہے۔ گو صورت حال ذرا مختلف قسم کی ہے لیکن پھر بھی اگر گل زبان سے ملا جائے تو بہتر رہے گا۔ ممکن ہے وہ پرانا آدمی مجھے میرے باپ کے بارے میں کچھ بتا سکے۔ اس کے علاوہ اس کا اندازہ بھی ہو جائے گا کہ بلاول مجھے یہاں سے کیوں بھگا جاتا ہے۔ یہ فیصلہ کر کے ماریہ ایک بار پھر اپنے کمرے میں واپس پہنچی۔ انا حالہ ٹھوڑا سا درست کیا اور پھر خاموشی سے سرائے سے باہر نکل آئی۔ غالباً وہ بھی دماغی طور پر کچھ ہسکی ہوئی تھی کیونکہ بارش میں سفر اسیان نہیں تھا۔ گل زبان کی جو بلی قبضے کے آخری سرے پر تھی۔ جب وہ دروازے پر پہنچی اور اس نے دروازہ بجایا تو ایک نو عمر ملازم دروازے میں نمودار ہوا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے ماریہ کو دیکھا تو ماریہ نے مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”میں گل زبان خاں سے ملنا چاہتی ہوں۔“
”وہ تو باہر گئے ہیں اور کل شام سے پہلے واپس نہیں آئیں گے۔“ لڑکے نے جواب دیا تو ماریہ کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ وہ وہاں سے واپس چلی۔ سرائے جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ایک بار پھر اس کے ذہن میں رمضان کا گھر آیا۔ نہ جانے کیوں رمضان کی بیوی کے لیے اس کے دل میں یہی خیال تھا کہ وہ بہت کچھ جانتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ بتانے پر آمادہ ہو جائے۔ بارش میں پہنچی ہوئی وہ رمضان کے گھر پہنچ گئی۔ کئی بار دروازہ کھٹکھٹایا لیکن پہلے بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ دروازہ کھلا ضرور ہوتا تھا لیکن اسے کھولنے کے لیے کوئی نہیں آتا تھا۔ کئی بار دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد جب کسی نے دروازہ نہیں کھولا تو اس نے معمول کے مطابق دروازے کو آہستہ سے دھکیلا وہ بند نہیں تھا بلکہ سے باؤ سے کھلتا چلا گیا۔ بہر حال

بیٹھ گئی اس نے کہا۔

”جب تمہارا کاروبار اس طرح بند ہو جاتا ہے تو تمہیں کوئی مالی پریشانی تو نہیں ہوتی۔“ کرن کور نے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی اور کہنے لگی۔

”اصل میں میرا باپ بڑا زیرک آدمی ہے اس نے پوری زندگی کی جمع شدہ ثوابات اور اپنا سہ ماہی بالکل محفوظ رکھا ہے اور یہ سہ ماہی اتنا ہے کہ اس کی اور میری زندگی بڑے آرام سے گزر سکتی ہے لیکن ہم لوگوں نے دنیا پر یہی غلبہ کر رکھا ہے کہ ہمارا ذریعہ معاش یہی سرائے اور مہمان ہیں۔ دیکھو نا مجبوری ہوتی ہے۔“ ماریہ مسکرا دی پھر اس نے کہا۔

”مگر تمہیں یہ بات عام لوگوں کو تو نہیں بتانی چاہیے جیسے میں۔“

”تم عام نہیں ہو۔“ کرن کور نے کہا۔ ماریہ کورات کے واقعات یاد تھے۔ اپنے سر کے زخم کو اس نے احتیاط سے صاف کر کے اسی طرح چھوڑ دیا تھا۔ اگر پتی وغیرہ باندھتی تو کوئی اس سے اس کے بارے میں سوال کر سکتا تھا۔ لیکن بہر حال رمضان کی بیوی کے قتل سے وہ بے حد متاثر تھی اس کا ذہن مسلسل اس ہیوے کے بارے میں سوچ رہا تھا وہ کون تھا اور اس نے رمضان کی بیوی کو کیوں قتل کیا؟ نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں بار بار بلاول کا خیال آ رہا تھا۔ بلاول ہی اس قدر سنگدل انسان تھا جو اتنی آسانی سے کسی انسان کو زندگی سے محروم کر سکتا تھا اور بلاول ہی نے اس پر بھی حملہ کیا تھا لیکن بہر حال پورے اعتقاد کے ساتھ وہ یہ بات نہیں کہہ سکتی تھی کیونکہ اس نے مکمل طور سے بلاول کو دیکھا نہیں تھا اور وہ اسے زخمی کر کے فرار ہو گیا تھا۔ صبح دس بجے کے قریب بارش بند ہوئی اور گیارہ بجے رمضان کی بیوی کی موت کی خبر بستی میں پھیل گئی۔ بستی والے جگہ جگہ چہ میگوئیاں کرتے پھر رہے تھے۔ کچھ افراد یہاں سرائے میں بھی آئے تھے اور آپس میں حیرانی سے باتیں کرتے رہے تھے۔ سری تاہتہ کو بھی انہی کے ذریعے رمضان کی بیوی کے قتل کی اطلاع ملی تھی۔ لوگ حیران تھے کہ رمضان کی بیوی تو معصوم اور بے ضرری عورت تھی۔ پھر وہ کون تھا جس نے اسے زندگی سے محروم کر دیا۔ بہر حال ماریہ بھی باہر نکل آئی تھی اور اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنی رہی تھی۔ رمضان کے بیٹوں وغیرہ نے مال کی تدفین کا انتظام کیا۔ بستی والے طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ بہر حال انہی تک ماریہ اور بلاول کا آمناسا منا نہیں ہوا تھا مگر شام کو چھ بجے جب وہ گل زبان کی حویلی کی طرف جانے کے لیے سرائے سے باہر نکلی تو وہی گاڑی سرائے کے دروازے کے پاس آ کر رکی۔

رمضان کی بیوی بے سندھ پڑی ہوئی ہے۔ اس کا ایک ہاتھ چار بائی سے نیچے لٹکا ہوا تھا اور جو سب سے خوف ناک چیز نظر آ رہی تھی وہ اس کے گلے میں پٹی ہوئی ریشم کی ڈوری تھی اس کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں اور چہرے پر کرب و اذیت کے تاثرات گویا جمجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک لمحے کے اندر یہ احساس ہو گیا تھا کہ اب اس میں زندگی کی کوئی رقت باقی نہیں ہے۔ رمضان کی بیوی کی اس بھیاںک موت نے ماریہ پر لرزہ طاری کر دیا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں وہاں کھڑی رہی۔ بہت سی باتوں کا اندازہ کرنے میں کوئی دقت نہیں تھی۔ ہر چند کہ وہ اس ہیوے کو کچھ نہیں پانی تھی کہ وہ کون ہو سکتا ہے لیکن اتنا سمجھ گئی تھی کہ وہ رمضان کی بیوی کو قتل کرنے کے لیے یہاں آیا تھا۔ اس بات کے امکانات تھے کہ اس قتل کا راز اٹھل جانے کے خوف سے وہ ہیولا اسے بھی قتل کرنے کی کوشش کرتا حالانکہ یہ اتنا آسان کام نہیں ہوتا پھر چاہا کہ اب اس کے ایک اور خیال آیا کہیں رمضان کی بیوی کے قتل کی مصیبت اس کے گلے نہ پڑ جائے۔ ایسی حالت میں یہاں رکنا انتہائی خطرناک ہو سکتا ہے اور پھر اس کے سر میں ایک زخم بھی آ گیا تھا۔ ایک لمحے کے اندر اس کے بدن میں گرم گرم لہریں دوڑنے لگیں۔ کسی قتل کے الزام میں گرفتار ہونے کا نتیجہ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ چنانچہ وہ پھرتی سے واپس پلٹی اور تیز تیز قدم اٹھائی ہوئی حکمرے سے باہر نکل آئی۔ بارش نے زندگی کے نظام کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ شام سے شروع ہونے والی بارش صبح دس بجے تک جاری رہی۔ گلیوں میں پانی بھر گیا اور لوگ اپنے اپنے گھر وں میں قید ہو کر رہ گئے۔ ماریہ پچھلی رات کے بھیاںک تجربے سے گزر کر واپس آ گئی تھی اور شکر تھا کہ اس کے اس برسر اس سفر کا گواہ کوئی اور نہیں تھا۔ بارش نے چونکہ نظام زندگی متعطل کر کے رکھ دیا تھا اس لیے سرائے میں بھی کوئی نہیں آیا تھا۔ کرن کور اور اس کا باپ سری تاہتہ سمجھ گئی آرام سے اپنے کمروں میں موجود تھے۔ کرن کو ریلوے ماریہ کے کھانے پینے کا انتظام بڑی باقاعدگی سے کر پتی تھی۔ بہر حال اس کے بعد صبح کو منہ ہاتھ دھو کر وہ باہر نکل آئی، کرن کور اس کے لیے ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ اس نے ماریہ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے گردن ہلائی اور بولی۔

”اس وقت پورا گاؤں ایک عجیب سی اداسی کا شکار ہے۔ کیا تم بھی ایسی اداسی محسوس کر رہی ہو۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ تم انتہائی دلیر لڑکی ہو۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں تمہارے لیے ایک محبت کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ چلو چھوڑو ان باتوں کو بیٹھو میں تمہیں بہت اچھی چائے پلائی ہوں۔“ ماریہ کرسی پر

شخص گل زبان ہی تھا۔ اس کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ سر کے بالوں میں سفیدی ان کی بھی لیکن صحت قابل رشک تھی۔ دیر تک اس کے منہ سے آواز نہیں نکل سکی لیکن پھر جیسے اس نے اپنے حواس جمع کئے اور بولا۔

”نہ۔“ ماریہ چونکہ خود بھی تصویر دیکھ چکی تھی۔ جواب دینا ضروری تھا۔ چنانچہ اس نے کہا۔

”میں وہ نہیں ہوں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔“ اس نے تصویر کی طرف انکی اٹھا کر کہا۔ پھر بولی۔

”لیکن میں بھی اسی قدر حیران ہوں اور یہ جاننا چاہتی ہوں کہ یہ تصویر کس کی ہے؟“ گل زبان سے یہ سوال کرنے کے باوجود ماریہ یہ سمجھ چکی تھی کہ اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے ایک دم سے اس کے ذہن میں یہاں آنے کے بعد کے کچھ واقعات آگئے تھے۔ اس تصویر کو دیکھ کر کم از کم یہ معصوم ہو چکا تھا کہ روپ نگر کی طرف آتے ہوئے پہلی ملاقات پر بلاول نے اسے سونیا کیوں سمجھا تھا۔ فریم میں وہ تصویر بیسی طور پر سونیا کی ہی ہوگی۔ دونوں میں اس قدر مشابہت تھی کہ اگر بلاول دھوکہ کھایا تھا تو اس میں اس کا تصور نہیں تھا اور گل زبان بھی اسی الجھن میں گرفتار تھا۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”یہ سونیا ہے میری بہن لیکن تم کو؟ بیٹھو بیٹھو آرام سے بیٹھو۔“ اس نے کہا اور خود بھی اس کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ماریہ نے شفاف لہجے میں کہا۔

”میرا نام ماریہ ہے اور میں کون ہوں یہ میں بھی نہیں جانتی۔ اپنی شناخت کے لیے میں روپ نگر آئی ہوں۔ کیا آپ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے ہیں؟“

”بشرطیکہ کوئی بات میری سمجھ میں آجائے۔“ گل زبان نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ روپ نگر کے پرانے باقی ہیں۔ یہاں کی لاتعداد داستانوں کے بارے میں جانتے ہوں گے۔ میں ایسا اور اس کی بیٹی ماریہ کی بات کر رہی ہوں۔ بہت سال پہلے ان دونوں باپ بیٹیوں کو اس قصبے کے مکان میں زندہ جلائے کی کوشش کی گئی تھی۔“

”ایں۔“ گل زبان ایک دم چونک پڑا پھر بولا۔

”ہاں وہ مکان میں جل کر یاٹھ نہیں ہوئی تھیں لیکن ریل کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئیں۔“

”ہاں۔“ ماریہ اس لہجے میں بولی۔ ”میں اپنی قبر دیکھ چکی ہوں۔ اس راز سے صرف وہ افراد واقف تھے۔ دودھ والا رمضان اور اس کی بیوی رمضان کا کچھ عرصے پہلے انتقال ہو

جس میں بلاول ایک بار اسے اغوا کر کے لے گیا تھا اور جس گاڑی کو ماریہ خود رانیو کر کے لائی تھی اور پھر اس نے آبادی کے ایک حصے میں اس گاڑی کو چھوڑ دیا تھا۔ بلاول اس گاڑی میں موجود تھا ماریہ کے قدم رک گئے۔ وہ یہی سمجھی تھی کہ بلاول گاڑی سے اتر کر پیچھے آئے گا اور اس سے بات کرے گا۔ لیکن بلاول ٹھوڑی دیر تک اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتا رہا اور پھر ایک جھٹکے سے اس نے گاڑی آگے بڑھادی۔

ماریہ خاموشی سے اس کی گاڑی کو آگے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو وہ اپنی جگہ سے آگے بڑھی اور پھر مختلف گلیوں میں چکرانے لگی۔ براہ راست وہ گل زبان کی حویلی پر جا کر بلاول کو اپنے پیچھے نہیں لگانا چاہتی تھی لیکن جب اسے یہ یقین ہو گیا کہ بلاول اس باس موجود نہیں ہے تو وہ گل زبان کی حویلی پہنچ گئی۔ اسی ملازمہ لڑکے نے اسے بتایا کہ گل زبان واپس آ چکا ہے۔

”میں اس سے ملنا چاہتی ہوں اسے اطلاع دے دو کہ ایک مہمان لڑکی آئی ہے۔“

”آپ اندر آ جاؤ گی۔“ لڑکے نے اکھڑ آواز میں کہا اور ماریہ کو حویلی کے اندر بھانک سے ملحق ایک وسیع و عریض کمرے میں پہنچا دیا۔ پھر وہ گل زبان کو اطلاع دینے کے لیے حویلی کے اندر دلی حصے میں چلا گیا۔ ماریہ نے کمرے میں چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اسی کمرے کو دیکھ کر گل زبان کی حیثیت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ فرش پر دبیر کا تین بچھا ہوا تھا آرام دہ صوفے فرسینے سے آراستہ تھے۔ دیواروں پر خوب صورت فریموں میں رنگین تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ میٹل پیس برائشیں لیس اسٹیل کا ایک فولڈنگ فریم آراستہ تھا اور اس فریم کے ایک طرف ایک خوب روٹو جوان کی تصویر تھی اور دوسری طرف کسی لڑکی کی تصویر۔ لیکن اس لڑکی کی تصویر کو دیکھ کر ماریہ کے سینے میں سانس رکنا ہوا محسوس ہوا۔ ایک لمحے کے اندر اندر اسے اپنی آنکھوں پر رشک ہوا۔ لیکن حقیقت حقیقت تھی وہ تصویر ماریہ کی اپنی تصویر تھی اور اس تصویر میں وہ اپنی عمر سے بہت کم نظر آ رہی تھی۔ اس تصویر میں وہ زیادہ سے زیادہ سترہ اٹھارہ برس کی لگ رہی تھی۔ ابھی وہ اس تصویر کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ قدموں کی آہٹ پر چونک گئی۔

”ہاں کیا بات ہے تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہو اور تم۔“

ایک آواز ابھری اور ماریہ کا چہرہ گھوم گیا لیکن جیسے ہی اس کا چہرہ اس شخص کے سامنے آیا۔ اس کی حالت بھی ماریہ سے مختلف نہیں ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات مجید ہو گئے تھے۔ لمبے چوڑے بدن اور تقریباً چھ فٹ قد کا مالک یہ

فائدہ کس کو پہنچ سکتا ہے۔“ مارے نے سوال کیا۔

”یہ ظاہر کسی کو نہیں۔ سونیا اپنے باپ کی جائیداد کی واحد وارث تھی۔ اس لیے کسی پر بھی یہ شبہ نہیں کیا جا سکا کہ اس کی موت کا فائدہ کسے پہنچ سکتا ہے۔ لیکن اس کے پانچ سال کے بعد شہباز درانی اچانک لا پتہ ہو گیا۔ جب شہباز درانی لا پتہ ہو گیا تو اس کی جائیداد پر اس کے بھائی امین خان نے قبضہ کر لیا۔ شہباز درانی کو جگہ جگہ تلاش کیا گیا لیکن اس کا نہیں سراغ نہیں مل سکا کہ اسے زمین کھائی یا آسمان نکل گیا۔ رفتہ رفتہ لوگ اسے بھول گئے اور یہ کہانی ماضی کی دھند میں گم ہو گئی لیکن استعصر عرصے کے بعد تمہاری صورت دیکھ کر میرے زخم پھر سے ہرے ہو گئے ہیں۔ میں ایک بار پھر.....“ گل زبان کا جملہ اٹھو را رہ گیا۔ اس کی آواز میں گھبراہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ مارے نے کہا۔

”غالباً آپ اس امین خان کی بات کر رہے ہیں جو ابابج ہو چکا ہے اور اس کا بیٹا بلاول آپ کی بستی والوں کے لیے آسانی عذاب بنا ہوا ہے۔“ گل زبان نے چند لمحات کے لیے خاموشی اختیار کی پھر دوبار پرنگا ہیں جما کر بولا۔

”ہاں وہ بے شک ایک بدکردار انسان ہے۔“

”لیکن انکل اس کے باوجود آپ اس سے اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ گل زبان نے ایک دم چونک کر مارے کو دیکھا پھر بولا۔

”تمہیں اس بارے میں کیسے معلوم ہوا؟“

”انکل میں اپنے ماضی کی تلاش میں یہاں آئی ہوں۔ ہر چیز کے بارے میں معلومات حاصل کر رہی ہوں اور اس کے لیے ظاہر ہے مجھے بہت سے معاملات کو کر دینا پڑ رہا ہے۔ اسی گفتیش کے دوران مجھے اس بات کا علم ہوا کہ آپ اپنی بیٹی کی شادی بلاول سے کر رہے ہیں۔“

”ہاں میری کچھ ایسی تجبوریات ہیں جنہیں میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔“

”خیر مجھے بھی آپ کے ذاتی معاملات کریدنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن براہ کرم میری اتنی مدد تو کیجیے کہ مجھے میرے باپ کے بارے میں بتا دیجیے میرا باپ کون ہے۔“

”گل زبان پر خیال انداز میں مینٹل نہیں کر رہی ہوتی سونیا کی تصویر کو دیکھنے لگا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

”میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ کوئی بھی نہیں بتا سکتا اس بستی کا کوئی بھی آدمی نہیں جانتا کیونکہ تمہاری ماں امینہ نے بھی کسی کو نہیں بتایا کہ تمہارا باپ کون ہے۔“

”کیا میرا باپ کوئی ایسا شخص نہیں ہو سکتا جسے میرے وجود

دکھائے اور پچھلی رات کے حادثے کے بارے میں آپ کو بھی غلم ہو گیا ہوگا کہ رمضان کی بیوی کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے ہم ماں بنی کو زندہ جلانے کی کوشش کی تھی وہ اب یہاں میری موجودگی سے ہولکھائے ہوئے ہیں۔ رمضان کی بیوی کو اسی خیال سے قتل کر دیا گیا کہ وہ ان کا راز فاش کر دے گی۔ محترم بزرگ میری زندگی بھی خطرے میں ہے۔ میں بہت مشکلات کا شکار ہوں یہاں آپ کے علاوے میں اور یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی ہوں کہ یہاں کوئی انسانی قدر نہیں ہے۔ بزدل لوگ ایک کمزوری لڑکی کے خلاف بھی اس طرح کی حرکتیں کر سکتے ہیں کہ اسے زندگی سے محروم کر دیں۔ میں آپ کے پاس اسی غرض سے آئی ہوں کہ آپ میری مدد کیجیے۔ میں اپنی تلاش میں یہاں تک پہنچی اور اپنے آپ کو جانے بغیر یہاں سے واپس نہیں جاؤں گی اور زندہ بچ کر رہوں گی۔“ گل زبان نے سنجیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر بولا۔

”مگر تم کیا جانا چاہتی ہو۔“

”پہلا سوال کہ میرا باپ کون ہے اور اب دوسرا سوال یہ تصویر بن گئی ہے۔ میں سونیا کے بارے میں جانا چاہتی ہوں۔ یہ جانا چاہتی ہوں کہ اس لڑکی کا مجھ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔“

”یہ بات میرے لیے بھی شدید باعث حیرت ہے کہ تمہاری اور سونیا کی شکل اتنی جلتی کیوں ہے تمہارا آپس میں کیا تعلق ہے۔ میں تمہیں سونیا کے بارے میں تفصیل بتاؤں۔ وہ میرے بچپن کے دوست شہباز درانی کی بیٹی تھی۔ شہباز درانی اور میں سببیں اسی گاؤں میں پلے بڑھے۔ سببیں ہماری شادیاں ہوئیں اور ہماری اولادیں جوان ہوئیں۔ جب ہماری اولاد جوان ہوئی تو میرے بیٹے شہباز درانی کی بیٹی سونیا کو پسند کر لیا دونوں کی شادی ہو گئی لیکن کچھ ہی دنوں بعد سونیا پر اسرار حالات میں اپنے کمرے میں مردہ پائی گئی۔ میرا بیٹا اس کی موت کا صدمہ برداشت نہیں کر سکا اور اس نے بھی چٹان سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی لیکن گاؤں کے لوگوں کا خیال تھا کہ شہباز نے خودکشی نہیں کی بلکہ اسے قتل کیا گیا تھا لیکن کسی پر اس قتل کا شہادہ نہیں کیا جا سکا۔ اس واقعے کی حقیقت کی کوئی یقینی بات نہیں چل سکا۔“

”یہ بالکل نہیں چلتا پتا چل سکا کہ شہباز کو کس نے قتل کیا۔“

”نہیں کوئی نگاہوں کے سامنے ہی نہیں تھا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔“

”یہ تو سوچا ہوگا آپ نے کہ شہباز اور سونیا کی موت کا

Downloaded from <https://paksociety.com>

سے خطرہ تھا اور اسی خطرے کے تحت مجھے اور میری ماں کو زندہ جلانے کی کوشش کی گئی تاکہ اس کا راز ہمیشہ محفوظ رہے۔“ ماریہ زہرے لہجے میں بولی۔

”مگر تمہارے گھر کو کسی نے آگ نہیں لگائی تھی وہ حادثہ تو اتفاقی تھا۔“

”اتفاقی نہیں مکان کو جان بوجھ کر آگ لگائی گئی تھی اور اس بات کی آخری گواہ رمضان کی بیوی تھی۔ جسے گزشتہ رات قتل کر دیا گیا۔“

”تمہارے خیال میں اس کا قاتل کون ہو سکتا ہے۔“ گل زباق نے سوال کیا۔

”یہی تو میں جانا چاہتی ہوں اگر مجھے اس کے قاتل ہی کا پتا چل جائے تو میں اپنے باپ تک پہنچ سکتی ہوں۔“ یہ کہہ کر ماریا پیٹ جگ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں تمہیں ایک مشورہ دوں؟ قتل کرنے والا گواہ کے بجائے مدعی کو بھی قتل کر سکتا تھا اور اس کا پتہ نہ چلتا اس نے ایسا نہیں کیا میرا مشورہ ہے کہ تم یہاں سے چلی جاؤ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔“ گل زبان نے کہا۔

”یہاں میری موجودگی آپ کے لیے تو کسی نقصان کا باعث نہیں ہے انکل۔“ ماریہ نے گل زبان کے چہرے پر آنکھیں جماتے ہوئے کہا اور گل زبان ایک دم سے ٹھٹھا سا گیا اس نے ادھر ادھر دیکھا پھر بولا۔

”میں نے اسے اصرار دیکھا تھا بولا۔
 ”میں میں تو تمہاری زندگی بچانے کے لیے یہ بات کہہ رہا تھا اور اگر تم یہاں رہنا ہی چاہتی ہو تو سرائے چھوڑ کر حویلی میں آ جاؤ۔ یہاں تم خطرات سے محفوظ رہو گی۔“
 ”میںیں کرن کور معمولی سا زخم ہے کپڑا باندھ دیا گیا ہے اگر کچھ ہو سکے تو تھوڑی سی ڈریسنگ کر دو ورنہ کوئی بات نہیں ہے۔“
 ”میںیں میرے پاس ڈریسنگ کا پورا سامان موجود ہے۔“

”کیوں انکل! میں کیسے محفوظ رہوں گی۔ جب کہ آپ کی بہو کی برسرِ ارموت بھی اسی حویلی میں واقع ہوئی تھی۔ آپ نے اس کی حفاظت کیوں نہیں کی۔“ ماریہ کا لہجہ اب بھی چبھتا ہوا تھا۔ پھر وہ دروازے کی طرف مڑ کر بولی۔

”آپ کی پیشکش کا شکریہ میں اپنی حفاظت اب تک کرتی رہی ہوں اور اب بھی خود ہی کر سکتی ہوں۔“ یہ الفاظ کہہ کر وہ باہر نکل آئی۔ ماہر نکل کر اس نے آسمان کی جانب دیکھا۔ اس

وقت بھی آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور گہری تاریکی کے باعث ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اندھوں کی طرح گرتی پڑتی آگے بڑھتی رہی۔ ایک گلی کا موڑ گھومتے ہی اسے احساس ہوا جیسے کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ پانی میں قدموں کی شراب شراب کی آواز اسے مسلسل کسی کے تعاقب کا احساس دلایا رہی تھی۔ اس نے ایک دم پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن گلی سنسان تھی۔ قدموں کی آواز بھی ختم ہوئی تھی وہ

میری ماں نے جس طرح زندگی گزار دی وہ میں ہی جانتی ہوں۔
 ”تم آگ سے کھیل رہی ہو۔“
 ”اس کھیل کا آغاز آگ سے ہی ہوا تھا اور اسے آگ پر ہی ختم ہونا چاہیے۔“

”کچھ نہیں ملے گا تمہیں یہاں سے۔“
 ”میں جانتی ہوں اور تم بھی جانتے ہو۔ سب سے زیادہ خوفزدہ تم ہوؤ گے، صرف تم اور مجھے یہاں سے بھاگنے کے لیے یہ گندے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہو۔ لیکن تم کامیاب نہیں ہو سکو گے۔“

”ایک دن صرف ایک دن اور دے رہا ہوں تمہیں اس کے بعد.....“ بلاول نے جملہ اچھوڑا چھوڑا اور باہر نکل گیا۔ ایک بار پھر کرن کو اس کے پیچھے گئی تھی اور دروازہ بند کر کے لوٹ آئی تھی۔ وہ خاموشی سے ماریہ کو دیکھتی رہی ماریہ غور کر رہی تھی اور پھر ٹھوڑی دیر کے بعد اس نے ماریہ سے کہا۔
 ”بہتر ہے اب تم سو ہی جاؤ۔ تمہارا چہرہ بالکل زرد ہو رہا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔



کرن کو صبح چھ بجے اٹھ گئی تھی۔ اس نے پکچن میں چائے بنائی اور دو کپ ٹرے میں رکھ کر اوپر منزل میں پہنچ گئی۔ اس نے سوچا تھا کہ خود بھی ماریہ کے ساتھ ساتھ بیٹھ کر چائے پیے گی۔ جب وہ اندر داخل ہوئی تو ماریہ سو رہی تھی۔ کرن کو رینے ٹرے میز پر رکھی اور اسے جگانے کے لیے اس پر جھک گئی۔ آواز دینے کے ساتھ ہی اس نے ماریہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو بری طرح چونک پڑی۔ وہ بخار میں پھنک رہی تھی اور بخار بہت تیز تھا۔ یقیناً طور پر بازو کے زخم کی وجہ سے اسے بخار آیا تھا۔ کرن کو اور تو کچھ نہ کر سکی بانی کی پٹیاں بھلو بھلو کر اس کی پیشانی پر رکھنے لگی۔ ماریہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کرن کو روک دیکھا۔ کرن کو اس کی آنکھوں میں تشویش تھی۔ اس نے خوفزدہ انداز میں سوچا تھا کہ اگر ماریہ کو کچھ ہو گیا تو وہ کس اور کہاں اطلاع دے گی۔ اتنا تو ایسے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہاں اس کے سارے کے سارے دشمن ہی تھے۔ روپ نگر میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اس کا دوست ہو وہ بڑے دکھ بھرے انداز میں اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ ایک معصوم سی خوب صورت لڑکی جس کا دوست کوئی نہیں اور دشمن بے شمار ہیں۔ واہ گروناں کریں اس بلاول کا کا جس نے ایسے زخمی کیا ہے۔ وہ اپنے دل میں بڑی ہمدردی محسوس کر رہی تھی۔ ماریہ کے لیے اور اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو

روپ نگر چھوڑنے کے لیے مجبور کروں۔ ورنہ تمہارے ساتھ وہ مجھے بھی ختم کر دے گا۔ اس نے رمضان کی بیوی کا حوالہ بھی دیا تھا۔ ماریہ نے کوئی جواب نہیں دیا دیر تک خاموش رہی اور پھر بولی۔

”کچھ بھی ہے کرن کو رہیں کسی ثبوت کے بغیر زبان نہیں کھولنی چاہیے۔ بہر حال تم مطمئن رہو کہ یہ راز بھی اب بہت جلد کھل جائے گا۔“ کرن کو کچھ کہنا چاہتی تھی کہ دروازے کے بجائے آواز آئی اور اس نے ماریہ کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گئی۔ ماریہ کے کان آٹھوں پر لگے ہوئے تھے۔ کچھ ہی دیر کے بعد اس نے کرن کو رے تیز بولنے کی آواز سنی۔ آنے والا جو کوئی بھی تھا کرن اسے روکنا چاہتی تھی اس کے ٹھوڑی دیر بعد زبے پر بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر دروازہ کھلا اور بلاول کمرے میں داخل ہو گیا۔ ماریہ کی آنکھوں میں نفرت کی لہر جاگ اٹھی۔ وہ شبیخی نگاہوں سے ایسے دیکھنے لگی اس دوران کرن کو بھی دروازے پر پہنچ چکی تھی۔ بلاول نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”اور میں نے اسی روز تمہیں وارننگ دی تھی کہ تمہارے لیے یہاں رہنا بے حد خطرناک ہے۔ کیوں اپنی زندگی کی دشمن ہو رہی ہو۔ اب بھی موقع ہے کہ کو یہاں سے چلی جاؤ۔“ گو کیا تم مجھے وارننگ دے رہے ہو۔ ماریہ نے بازو کے زخم کی طرف دیکھ کر کہا۔
 ”ہاں وارننگ ہی مجھ خوش قسمت تھیں بچ گئیں۔ خنجر کا یہ وار تمہارا خاتمہ بھی کر سکتا تھا۔ میں پوچھتا ہوں تم کل زبان سے ملنے کیوں گئی تھیں۔“

”اس سوال کا جواب تمہیں معلوم ہے بلاول اور تم جتنے مرد ہو اس کا مجھے بھی اندازہ ہو چکا ہے۔ میں اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ جب تک کہ مجھے میرے سوال کا جواب نہ مل جائے۔“ ذہن نشین کر لینا اس بات کو اس چھوٹی سی آبادی کے نیک اور معصوم لوگوں کو تم نے اپنی قوت کا مظاہرہ کر کے دبا رکھا ہے لیکن میرا نام ماریہ ہے۔“
 ”تمہاری وجہ سے اس قصبے کا سکون برباد ہو چکا ہے۔ رمضان کی بیوی اپنی جان سے تھوڑی سی بچ گئی ہے۔ تم خود مرتے مرنے پہنچی ہو۔ میں نہیں جانتا تمہاری ضد کیسے کیسے کھلائے گی۔ میں کہتا ہوں تم چلی جاؤ یہاں سے۔“ ماریہ ہنس پڑی پھر بولی۔

”صرف تین دن میں ہی گھبرا گئے تم اور میں جو سالوں سے اس آگ میں جل رہی ہوں۔ اس کا جواب کون دے گا۔“

کرم صرف چند دن کے لیے کہہ کر گھر سے رخصت ہوئی تھیں۔ پھر کافی دن گزارنے پر میرے لیے تشویش لازمی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کچھ کاغذات میں تم تک پہنچانا ضروری سمجھتا تھا۔ یہ کاغذات تین سال پہلے تمہاری ماں نے میرے حوالے کیے تھے اور ہدایت کی تھی کہ میری موت کے بعد اسے فوراً دے دیے جائیں۔ کل پنک سے کچھ کاغذات نکلوانے پر یہ لفافہ بھی نظر آ گیا۔ جسے فوری طور پر تم تک پہنچانا ضروری سمجھا۔ تم یہ کاغذات دیکھو لڑکی، کیا یہاں نہانے کا بندوبست ہو سکتا ہے مجھے معاف کرنا۔ باہر لفظ سرائے لکھا ہے جس کی وجہ سے میں یہ الفاظ کہہ رہا ہوں۔ تمہیں یہاں میرے قیام کا تمہاری پسند کے مطابق معاوضہ ملے گا۔ میں نے رات بھر ڈرائیونگ کی ہے جس سے شدید تھکن ہو رہی ہے۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر جمال شاہ نے خاکی رنگ کا ایک لمبا سا لفافہ ماریہ کی طرف بڑھا دیا اور کرسی سے اٹھ گیا۔

”آپ میرے ساتھ تشریف لائے سر۔“ کرن کور نے کہا اور جمال شاہ کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔ ماریہ کے سارے وجود میں سناٹا تھا۔ وہ یہی تھی یہ لفافہ اس کے لیے بڑا سنسنی خیز تھا۔ ڈاکٹر جمال شاہ نے اس سے پہلے بھی اسے اس لفافے کے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن بہر حال اسے اپنی ماں کی وصیت بھی یاد تھی۔ جمال شاہ نے یہی کہا تھا کہ یہ لفافہ اس کی موت کے بعد یارہ کے حوالے کیا جائے۔ آخر کیا ہے اس لفافے میں وہ لارنٹی انٹیکو کے ساتھ اس لفافے کو چاک کرنے لگی۔ دماغ میں آنندھیاں سی چل رہی تھیں۔ نہ جانے کیوں اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اس لفافے کے اندر اس کی داستان حیات ہنر ہے۔ یقیناً اس سے کچھ ایسے راز منکشف ہوں گے جن کا تعلق اس کی زندگی سے ہے۔ لفافے کے اندر دو کاغذ اور ایک لفافہ اور موجود تھا۔ اس نے پہلا کاغذ کھولا یہ کاغذ فل اسکیب ساز سے کسی قدر بڑا تھا۔ اس کے درمیان میں نکاح نامہ لکھا ہوا تھا۔ وہ اس کاغذ کی تحریر پڑھتی چلی گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے اسے سوال کا جواب مل گیا۔ اس کاغذ کی تحریر کے مطابق آج سے پچیس سال پہلے اس کی ماں کا نکاح شہباز درانی سے ہوا تھا۔ نکاح نامے پر دونوں کی ولدیت اور دستخط موجود تھے اور جامع مسجد کے امام کی مہر اور دستخط بھی موجود تھے۔ اس کے ساتھ ہی گواہوں کے دستخط بھی تھے۔ دوسرا کاغذ اس کی پیدائش کا سرٹیفکیٹ تھا۔ جس پر اس کی جائے پیدائش اور باورق تفصیلات درج تھیں۔ ماریہ کے دماغ میں آنندھیاں چل رہی تھیں۔ اس کی سب سے بڑی امیج ختم ہو گئی تھی لیکن ابھی اور بھی بہت سے سوالات تھے جو اس کے

جائے ماریہ کو بے بسی کی موت نہیں مرنے دے گی۔ ڈاکٹر دو گھنٹے تک ماریہ کے بخار میں کافی کمی ہوئی۔ کرن کور نے دوبارہ چائے بنائی اور ماریہ کو تکیوں کے سہارے بٹھا کر پلائی اس دوران دروازے پر دستک بن کر وہ نیچے چلی گئی۔ ماریہ نے یہ سوچنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی کہ دستک دینے والا کون ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ سرائے بھی کوئی بھی آ سکتا ہے لیکن پھر تقریباً دس منٹ کے بعد کرن کور کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار تھے۔

”ایک صاحب آئے ہیں جو اپنا نام ڈاکٹر جمال شاہ بتاتے ہیں۔ تمہارے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔“ اس نے ماریہ کو دیکھتے ہوئے کہا اور ماریہ برسی طرح چونک پڑی۔

”ڈاکٹر جمال شاہ۔ ارے باب! دے آئیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں۔ بلاؤ انہیں۔“ ابھی کرن کور واپسی کے لیے مڑی ہی تھی کہ ڈاکٹر جمال شاہ کمرے میں داخل ہوا اسے دیکھ کر ماریہ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ جمال شاہ آگے بڑھا اور اس نے کہا۔

”مجھے معلوم تھا کہ تم روپ نگر کے علاوہ کہیں اور..... اس دوران اس کی نگاہیں ماریہ کے بازو پر پڑی بندھی ہوئی دیکھ کر پھیل گئیں۔ وہ جلدی سے آگے آیا اور اس نے کہا۔

”.....کیا ہوا؟“

”تمہیں کچھ پتہ نہیں ہے معمولی سا زخم ہے جس سے رات کو بخار ہو گیا تھا۔ جمال شاہ نے اس کی پیشانی کو چھو کر دیکھا اور پھر اس کے بیڈ پر قریب ہی بیٹھ کر بازو کی پٹی کھولنے لگا۔ زخم کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے کرن کور سے اپنا سوٹ کیس منگو لیا۔ جسے وہ نیچے چھوڑ آیا تھا کسی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے اس کے سوٹ کیس میں ہر قسم کی دوائیں موجود رہتی تھیں۔ زخم کی ڈریسنگ کے بعد وہ دو گواہوں کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”یہ کھو لیا پیشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ایک دو دن میں ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ کرن کور نے فوراً ہی پانی کا گلاس آگے بڑھایا۔ وہ جمال شاہ کا بغور جائزہ لے رہی تھی اور اسے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ آدمی رحمت کا فرشتہ ہی ہے۔ جو عین وقت پر آ گیا لیکن اس کی آنکھوں میں ابھن بدستور تھی۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس بوڑھے ڈاکٹر سے ماریہ کا کیا رشتہ ہے۔ پھر ماریہ نے خود ہی اس سے تعارف کرایا۔

”یہ میرے باس! میرے اٹکل! میرے سر پرست! ڈاکٹر جمال شاہ ہیں۔“ پھر وہ جمال شاہ کی طرف رخ کر کے بولی۔

”لیکن آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں گی۔“

شہباز درانی کی ہمت نہ ہونی کہ وہ کسی کوچھ بتا سکے۔ بستی کے لوگ مجھے گناہ گار سمجھتے رہے۔ پھر شہباز درانی کی بیوی کا انتقال ہو گیا لیکن اس کے بعد بھی اس نے خاموشی اختیار کیے رکھی اور اس کے بعد اچانک ہی وہ غائب ہو گیا۔ اس دوران میری ماں کا انتقال بھی ہو گیا۔ ماں کی موت کے بعد میں نے ایک فیصلہ کر لیا اور شہباز درانی کے باپ زرق خان کو بتا دیا کہ میں اس کی بہو ہوں۔ زرق خان شدید غصے میں آ گیا اسی دوران اس کا دوسرا بیٹا امین خان بھی وہاں پہنچ گیا۔ زرق خان کو دل کا دورہ پڑا اور امین خان نے مجھے گھر سے دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ زرق خان دل کے دورے کے بعد زندہ نہ بچ سکا۔ دو پہر سے پہلے اس کا انتقال ہو گیا۔ ہم بے کسی کے عالم میں ایک جگہ رہنے لگے پھر ایک رات ہمارے گھر میں آگ لگا دی گئی۔ مجھے اب بھی بتائیں کہ آگ لگانے والا کون تھا لیکن بہر حال ہم لوگ وہاں سے نکل بھاگے میں تمہیں ہدایت کر رہی ہوں کہ روپ نگر بھی نہ جانا۔ وہ درندوں کی بستی ہے وہاں تمہیں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔“

خط ختم ہو گیا لیکن ماریہ علی انکھوں کے سامنے اس کی ماں کے نقوش گھومتے رہے۔ پھر ڈاکٹر جمال شاہ بھی آگئے اور ماریہ انہیں تفصیل بتانے لگی۔ ڈاکٹر جمال شاہ ساری تفصیل سننے کے بعد بولے۔

”پھر کیا ارادہ ہے تمہارا بتاؤ۔“
 ”میں تنہا ہوں۔ بے سہارا ہوں لیکن پھر بھی میں اپنے باپ کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ وہ کہاں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا باپ زندہ ہے مجھے ضرور ملے گا۔“ کرن کوڑی آواز سنائی دی۔
 ”واہ گروہی قسم! وہ تمہیں ضرور ملے گا۔“ اس کے لہجے میں ایک عجیب سی کیفیت۔



ہلاول نے ماریہ کو حکم دیا تھا کہ وہ شام تک یہاں سے چلی جائے لیکن اب ماریہ خوفزدہ نہیں تھی۔ وہ اب ان باپ بیٹوں سے برسوں کا حساب کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ وہ خود ہی امین خان کی حویلی پہنچ گئی۔ البتہ اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ کرن کوڑی اس کے ساتھ ہی آ رہی ہے۔ سری ناتھ واپس آچکا تھا حویلی کے ایک ملازم لڑکے نے بتایا کہ ہلاول نہیں گیا ہوا ہے۔ البتہ بڑے صاحب موجود ہیں ٹھوڑی دیر کے بعد ماریہ کرن کوڑی کے ساتھ امین خان کے سامنے پہنچ گئی۔ امین خان ایک صحت مند آدمی تھا۔ بس وکیل جیمز پر نظر آ رہا تھا۔ ماریہ کو دیکھ کر بری طرح چونک پڑا۔

ذہن کو خراب کیے ہوئے تھے اس کا باپ شہباز درانی آخر کہاں ہے۔ زندہ بھی ہے یا مر چکا ہے۔ ماریہ اور اس کی ماں کو مکان میں زندہ جلانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ وہ کون تھا جس کو ان کی موجودگی سے خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ صرف دو ہی نام ذہن میں آئے تھے امین خان اور اس کا بیٹا ہلاول۔ اب تک جو باتیں سننے میں آئی تھیں اس کے مطابق شہباز درانی کی کشتی گدگدائی کے بعد امین خان نے اس کی جائیداد پر قبضہ کر لیا تھا اور اب وہ سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ یہ ساری باتیں بڑی سنسنی خیز تھیں۔ اس کا وجود صرف ان باپ بیٹوں کے لیے خطرہ بن سکتا تھا اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ماریہ شہباز درانی کی اولاد ہے تو ان دونوں کو ساری جائیداد بے دستبردار ہونا پڑے گا اور ظاہر ہے اتنی بڑی جائیداد ان آسانی سے چھوڑ سکتا ہے ہلاول کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ امین نے مرتے ہوئے اپنی بیٹی کو کچھ نہیں بتایا تھا اور وہ سب کچھ معلوم کرنے یہاں آئی تھی اور ایسے لوگوں سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی جو اس راز سے پردہ اٹھا سکتے تھے اور اب راز کھلتے جا رہے تھے۔ بند لٹکانے میں امین کا ایک خط تھا۔ جو اس نے اپنی بیٹی کے لیے لکھا تھا۔

ماریہ!

یہ خط تمہارے ہاتھوں میں جب پہنچے گا تو میں اس دنیا سے جا چکی ہوں گی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے لیے ایک اچھی ماں ثابت نہیں ہو سکی۔ تمہارا تحفظ کرنے کے بجائے میں نے موت کے خوف سے فرار میں پناہ دے ڈی۔ تم ہمیشہ مجھ سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی رہی ہو اب میں تمہیں بتا رہی ہوں تمہارے باپ کا نام شہباز درانی ہے۔ وہ روپ نگر کا سب سے بڑا جاگیردار ہے۔ میں اس کے گھر ایک ملازم کی حیثیت سے بلی بڑھی تھی۔ میری ماں بھی وہیں موجود تھی۔ شہباز درانی ان دنوں جوان تھا۔ اس کی شادی ہو چکی تھی اور وہ ایک بچی کا باپ تھا لیکن اپنی بیوی اسے بالکل ناپسند تھی اور وہ میری طرف مائل تھا۔ ہماری کوہ قصبہ کی ایک عورت رمضان کی بیوی تھی ہم نے روپ نگر کی مسجد میں نکاح پڑھوا لیا اور روپ نگر میں رہنے لگے۔ ابتداء میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی لیکن بعد میں شہباز درانی اپنے جلا وطنی سے خوفزدہ ہو گیا۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ ہمارے نکاح کا کسی کو بتانا نہ چلے۔ پھر کمر اس دنیا میں آئیں تو پہلی بار میں نے اپنی ماں کو یہ راز بتایا کہ شہباز درانی میرا شوہر ہے۔ میری ماں اس گھر کی ملازمہ تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ یہ راز بھی کسی کو نہ بتاؤں کیونکہ یہ راز اگر کھلا تو شہباز درانی کا باپ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ تمہاری پیدائش پر لوگ ہمیں طعنے دینے لگے لیکن

”تم؟“

”پہچانا مجھے، مجھے تم سے صرف ایک سوال کرنا ہے۔ میرا باپ کہاں ہے۔“
”میں کچھ نہیں جانتا۔“

”اپنے بھائی کے بارے میں نہیں جانتے تم؟ اس بھائی کے بارے میں جس کی بیوی اور بیٹی کو تم نے زندہ جلانے کی کوشش کی تھی۔“

”کیا بلواس کر رہی ہو تم میرا بھائی بے شک لاپتہ ہو گیا لیکن اس کی بیوی کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ وہ بیمار ہو کر مری گئی اور بیٹی تو کچھ ہی عرصے پہلے مری ہے تم ہو لو کہ بلواس کر رہی ہو؟“

”ایسے کو بھول گئے۔ امین خان جسے اپنے باپ کی موت کے دن تم نے اپنے گھر سے دھکے دے کر نکال دیا تھا۔ میں شبہاز دورانی کی بیٹی ہوں جس کی جائیداد آج تم قابض ہو۔ مگر ایک بات سنو۔ اس جائیداد سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں صرف یہ جانا چاہتی ہوں کہ میرا باپ کہاں ہے۔“

”تمہارا باپ۔“ امین خان نے ٹھہرائی ہوئی آواز میں کہا۔
”تم یقین کرو مجھے نہیں معلوم وہ غائب ہوا تھا اور اس کے بعد اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ میں نے کسی کے مکان کو آگ نہیں لگائی تھی۔ تمہارا دل چاہے تو یقین کر لو بلکہ چند روز پہلے مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم لوگ زندہ ہو۔ میں نے تمہیں تلاش کرنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔“

”ہاں تم ہمیں اپنے راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔“

”نہیں میں اپنی زبانی کی معافی مانگنا چاہتا تھا۔“

”واہ خوب سنو میں تمہیں کل دوپہر تک کی مہلت دے رہی ہوں امین خان تم سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن اگر تم نے مجھے میرے باپ کے بارے میں کچھ نہ بتایا تو یا تو پھر تم یہ سوچ لو کہ تم بھی غائب ہو جاؤ گے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔“

جب وہ سرائے واپس پہنچیں تو شام کا اندھا بجھل چکا تھا۔ یہاں اسے پتا چلا کہ گل زباق اس سے ملنے آیا تھا اور اسے پیغام دے گیا ہے کہ اس سے مل لے ڈاکٹر جمال شاہ نے کہا۔
”میری اس سے کچھ بات ہوئی تھی اور میں نے اسے تھوڑی سی تفصیلات بتائی تھیں۔ بہر حال شام ہوئی اور پھر رات ہوئی اسے کرن کور کے چہرے پر ایک پراسرار مسکراہٹ نظر آرہی تھی۔ کرن کور نے اس سے کہا۔“

”ماریا اب مجھ پر فرض ہو گیا ہے کہ تمہاری حفاظت کروں اور میں اس کے لیے مکمل طور سے تیار ہوں۔“ ماریہ کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ کرن کور کے جذبات کس کیفیت کے حامل ہیں وہ

اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی چشم تصور سے اپنے باپ کی صورت دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کب تک وہ اس خط میں ٹھہری رہی جو اس کی ماں نے اسے لکھا تھا ابھی بچوں میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ سوئی تھی پھر شاید کسی آہٹ سے اس کی آنکھ کھلی کمرے کے نیم تاریک ماحول میں کچھ نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ باہر کی طرف ٹھٹھنے والی کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے اور کوئی اس کھڑکی سے داخل ہو رہا تھا تارکی میں اس کا چہرہ نمایاں نہیں ہو سکا تھا لیکن فوراً ہی اس کے ذہن میں بلاول کا خیال ابھر اچھا سے دھمکی دے کر گیا تھا۔ وہ کمرے میں کود گیا اور دے پاؤں پلنگ کی طرف بڑھنے لگا۔ اب وہ اس شخص کو غور دیکھ رہی تھی جس نے اپنا چہرہ سیاہ رنگ کے نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ بستر کے قریب پہنچ کر وہ کمرے کا ایک ہاتھ آہستہ آہستہ اوپر اٹھا کہیں سے پڑنے والی روٹی کی کرن نے خنجر کی چمک نمایاں کر دی۔ پھر جیسے ہی اس کا ہاتھ نیچے آیا مارہ کی اسپرنگ کی طرح اچھلی اور نیچے پہنچ گئی۔ اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ بڑی بھیانک تھی۔ خمر بستر میں دھنسا تو اس کے ساتھ ہی وہ کھڑی ہوئی اپنی ہی جھونک میں بستر پر اوندھا ہو گیا اور سے مارہ کی چیخ نے اسے بدحواس کر دیا تھا۔ لیکن دوسرے لمحے وہ سنبھل کر پلنگ کے اوپر سے گھومتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ وہ ایک مخصوص انداز میں خنجر کو حرکت دے رہا تھا۔ مارہ پہنچتی ہوئی پیچھے ہٹ رہی تھی اور پھر وہ کالس کے قریب پہنچ گئی کالس پر کیڑو شیٹ لیٹ کے علاوہ اور کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے ہتھیار بنایا جاسکے۔ اس نے لیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ نقاب پوش نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ مارہ پھر کرسی سے ایک طرف ہٹ گئی تھی۔ نقاب پوش کا خنجر والا ہاتھ لیٹ سے ٹکرایا اور لیٹ نیچے گر گیا۔ لیٹ کے کمرے ہی تیل جینے لگا اور اس نے فوراً ہی آگ پکڑ لی۔ فرس پر بھی ہوئی دری آگ کی لہٹ میں آ گئی۔ مارہ نے دروازے کی سمت چھلانگ لگا دی تھی۔ نقاب پوش بھی خنجر ہلاتا ہوا اس کے پیچھے لگا۔ مارہ باہر نکل گئی تھی۔ زینے کے قریب پہنچ کر اس نے ایک لمحے کے لیے ہٹ کر دیکھا اور اسی لمحے نقاب پوش نے اس پر چھلانگ لگا دی لیکن مارہ پھر سے نیچے بیٹھ گئی۔ نقاب پوش اس کے سر پر سے گزرتا ہوا۔ سر جھون پرکرا اور بے قابو ہو کر سیڑھیوں پر لڑھکنے لگا۔ اسی لمحے ڈاکٹر جمال شاہ بھی نکل آیا۔ نقاب پوش نیچے والی سیڑھی پر سنبھل کر دوبارہ اوپر آ رہا تھا۔ ڈاکٹر جمال شاہ اس کی طرف لپکا اور اس نقاب پوش نے جمال شاہ کے اوپر چھلانگ لگا دی۔ لیکن جمال شاہ بھی کمزور تھا۔ اس نے نقاب

ایک ناقابل یقین کردار لیکن نقاب پوش کو اسی نے پکڑا تھا جو اب دھڑا دھڑل رہا تھا۔ پھر اس کے چہرے سے نقاب ہٹا دی گئی اور سب چیخ مچ رہے تھے۔

کہانی یوں تھی کہ گل زبان کا باپ اپنی بیشتر زمینیں بلاول کے دادا زرق خان کے ہاتھوں فروخت کر چکا تھا گل زبان کو اس کا بڑا غم تھا اس کی نظریں شہباز درانی کی بیٹی سونیا پر تھیں اور اس نے بچپن ہی سے سونیا کا رشتہ اپنے بیٹے سے طے کر دیا تھا۔ کیونکہ سونیا زرق خان کی وارث تھی۔ شادی کے بعد وہ شہباز کو ختم کر دینا چاہتا تھا چنانچہ اس شادی کے بعد اس نے شہباز خان کو غائب کر دیا مگر اس کی بد قسمتی کہ سونیا زندہ نہ رہ سکی اور اس کے غم میں اس کے بیٹے نے بھی خودکشی کر لی۔ لیکن ابھی ایک مہرہ اس کے پاس تھا اس کی بیٹی عدیلہ۔ وہ بلاول کو انا داما د بنا کر ایک بار پھر ان زمینوں پر قبضے کے خواب دیکھنے لگا لیکن اس دوران اسے پتا چل گیا تھا کہ شہباز درانی نے حویلی کی ایک ملازمہ اینسہ سے شادی کر رکھی ہے۔ چنانچہ وہ ان کے خاتمے کی فکر میں لگ گیا۔ پھر ماریہ روپ نگر پہنچی تو وہ پریشان ہو گیا کہ دولت اور جائیداد ایک بار پھر خطرے میں پڑ گئی تھی۔ چنانچہ وہ بھولتا ہنوں میں پیاری پر حملے کرنے لگا۔ بلاول کو واقعات کی کچھ بھنک مل گئی تھی چنانچہ وہ مسلسل کوشش کر رہا تھا کہ ماریہ یہاں سے چلی جائے۔ بہر حال ماں بیٹیوں کو خاکستر کرنے کی کوشش کرنے والا گل زبان خود ہی خاکستر ہو گیا تھا۔ شہباز درانی زندہ تھا۔ مرتے ہوئے گل زبان اس کے بارے میں بتا گیا تھا۔ چنانچہ اسے کھنڈرات کے تہہ خانے سے برآمد کر لیا گیا۔

”جہاں شاہ نے پیش کش کی کہ وہ شہباز درانی کا علاج کرے گا۔“ بلاول نے ماریہ سے کہا۔

”اب تو تم ایک بڑی جائیداد کی مالک ہو۔ روپ نگر میں اپنی ہی حویلی کہاں تعمیر کرو گی؟“

”میں یہاں سے جا رہی ہوں۔ میرے لیے میرا باپ سب سے بڑا سرمایہ ہے۔“ ماریہ نے پیار بھری نگاہوں سے ہڈیوں کے اس ڈھانچے کو دیکھتے ہوئے کہا جس کا نام شہباز درانی تھا۔



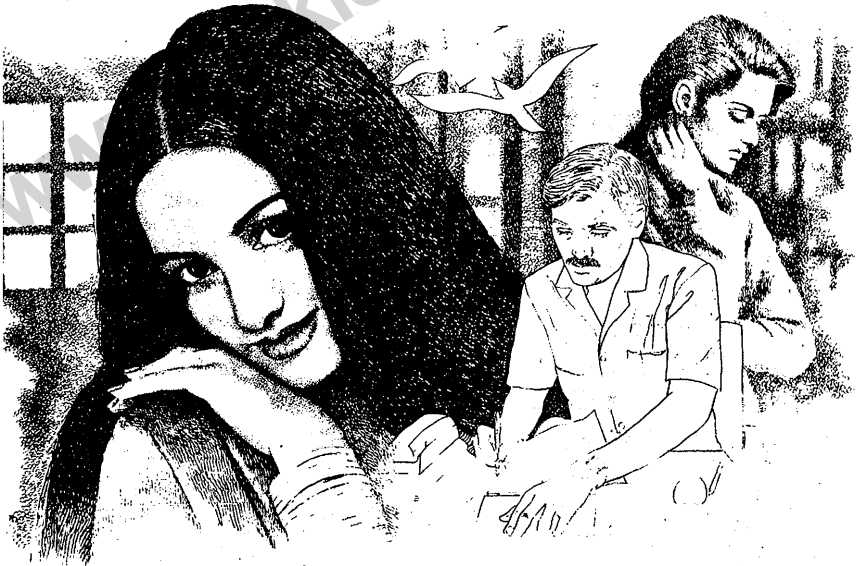
پوش کو اپنے ہاتھوں پر رکھا اور اسے دور سے جھلک دیا لیکن اس نے پھر جھٹاک لگا لی ادھر ماریہ زینے پر کھڑی بیٹھ رہی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اس کے کمرے میں آگ پھیل رہی تھی۔ بستر آگ کی لپیٹ میں آ گیا اس نے دوڑ کر میز پر رکھا ہوا خاک کی رنگ کا لفافہ اٹھا لیا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ نیچے کی صورت حال کافی سنگین ہو چکی تھی۔ آگ پھیل چکی تھی اور ڈاکٹر جمال شاہ اور نقاب پوش ایک دوسرے سے اٹھ بھونے تھے۔ ڈاکٹر جمال شاہ نیچے تھا اور نقاب پوش اس کے سینے پر سوار دفعتاً اس نے جھگر سے وار کیا۔ یہ منظر تمام ڈاکٹر جمال نے اپنے آپ کو اس کے وار سے بچا لیکن جھگر اس کے بازو میں پھنس چکا تھا۔ نقاب پوش نے جھگر والا ہاتھ دوبارہ اوپر اٹھا لیکن اسی وقت کسی طرف سے کوئی چیز اڑتی ہوئی آئی اور نقاب پوش سے ٹکرائی۔ نقاب پوش ڈاکٹر کو چھوڑ کر پیچھے الٹ گیا تھا۔ ماریہ نے بلیٹ کر دیکھا اور دوسرے لمحے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر کاہنہ عجیب سا گلا کر نکل کر اس نے اس کی طرف پھینکا تھا۔ کرن کور کے جسم پر ہلکے نیلے رنگ کا ایک گاؤں تھا۔ اس کا باپاں ہاتھ آگے نکلا ہوا تھا اور دایاں ہاتھ اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ غالباً وہ کرائے جاتی تھی۔ نقاب پوش نے جھگر والا ہاتھ سیدھا کیا اور کرن کور کے قریب پہنچ گیا لیکن جیسے ہی وہ قریب پہنچا کرن کور نے ایک لات اس کے سینے پر رسید کی اور بلیٹ کر دوسری لات اس کے منہ پر ماری۔ نقاب پوش شدید ضرب میں آ گیا تھا لیکن پھر اس نے سانس کی طرح بل کھا کر جھگر کرن کور کے بازو میں پھنس کر دیا۔ کرن کور ایک لمحے لیے لڑکھرائی اس کے بازو سے خون کی دھار نکل پڑی تھی لیکن اس کے ساتھ یوں لگا جیسے اس پر جنون سوار ہو گیا ہو۔ نقاب پوش بھی سنبھل چکا تھا کرن کور اپنی جگہ سے اچھل اور اس کے دلوں پیر پوری فوت سے نقاب پوش کے سینے پر لگے۔ نقاب پوش نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ کرن کور کی دوسری فلائنگ گگ نے اسے ایک بار پھر زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا اور پھر کرن کور مارشل آرٹس کے اس مخصوص انداز سے اس کی مرمت کرنے لگی کہ نقاب پوش کو اس نے بکرا بنا کر رکھ دیا ایک طرف سے آگ پھیل رہی تھی اور دوسری طرف کرن کور نقاب پوش کو ماری تھی۔ اس دوران سری ناتھ بھی باہر نکل آیا اور اس نے جمال شاہ کو سنبھالا۔ اس کے ساتھ ہی ایسا شخص ہوا جیسے دروازہ توڑنے کی کوشش کی جا رہی ہو اب سب نیچے آ گئے تھے اور کرن کور اور نقاب پوش کی جنگ دیکھ رہے تھے۔ اچانک ہی نقاب پوش بلبلاتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اسی لمحے باہر کا دروازہ ٹوٹ گیا۔ سب سے پہلے اندر داخل ہونے والا بلاول تھا۔

آخری بازی

ایم اے راحت

ان دو برسوں میں ڈیڈی کو ان کے دوست میرے بارے میں کیا دیوڑٹیں بھیجتے رہے تھے اس کا مجھے علم نہیں تھا لیکن یہ دیوڑٹیں میرے خلاف تھیں۔ تب بھی ڈیڈی نے اپنے خطوط میں کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ بڑی پابندی سے میرے جملہ اخراجات روانہ کرتے رہے تھے۔ غالباً وہ اس انتظار میں تھے کہ فائنل نتیجہ سامنے آئے تب کوئی حتمی قدم اٹھائیں۔ مگر قسمت کی مہربانی سے انہیں یہ موقع نہیں مل سکا اور اپنی واپسی پر مجھے یہ می بتایا گیا کہ دونوں بہنوں کو تھوڑا سا حصہ دینے کے بعد میں ہوری جائیداد و کاروبار کا مالک ہوں۔ مجھے در آمد، ہر آمد سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ایک معاشرتی کہانی، عمران ڈائجسٹ کے آخری صفحات کے لیے



جی! امر مایے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔“

”سر! میں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ اصل میں ہمارے ملک میں کسی صاحب فن کی قدر نہیں ہوتی۔ میں بھی محدود سا آدمی ہوں۔ ریڈیو ٹی وی یا اسٹیج سے اپنی پہچانی نہیں کروا سکتا۔ اس لیے آپ جیسے قدر دانوں کے در دولت پر خود حاضری دے دیتا ہوں۔“

”آپ کیا چاہتے ہیں اور کیا کام کرتے ہیں آپ۔“

”سر! میں تاش کا فن جانتا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو اپنا فن دکھاؤں۔“

اب یہ بالکل اتفاق ہے کہ میں امریکہ میں رہ کر بھی وہاں تلاش کے کھیل سے بہت متاثر تھا۔ مجھے اس سے دلچسپی محسوس ہوئی تو میں نے اس سے اپنا فن دکھانے کے لیے کہا۔

جب اس نے تاش کی ایک بالکل نئی گڈی نکال کر نکھولتے ہوئے میرے معائنے کے لیے پیش کی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ کوئی ایسی بات یا تخفیف علامت نظر نہیں آئی۔ جس سے امریکہ کے قمار خانوں میں واسطہ پڑ چکا تھا۔ میں نے اسے گڈی واپس دے دی۔ اس نے ماہرانہ چال بازی سے گڈی کوئی بار بھینٹا اور پھر کئی دھبے دھبے کر کے اٹھارے دکھائے۔ مثلاً دل میں سوچا ہوا پتہ بتانا یا بار بار ایک پتہ کھینچنے پر مجبور کرنا۔ یعنی میں تاش کی پھیل ہوئی گڈی میں سے کہیں سے کوئی بھی پتہ نکالتا۔ ہر مرتبہ وہ ہی پتہ ہاتھ میں آتا۔ جو میں پہلے کھینچ چکا تھا۔ یا تاش کا کوئی بھی پتہ اپنے ہاتھ سے غائب کر کے میری جیب سے برآمد کرنا پتوں کا سائز چھوٹا یا بڑا کرنا وغیرہ وغیرہ۔

”یہ بتاؤ۔“ میں نے اس کی فن کاری سے متاثر ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”میں کوئی ایسا کرب آتا ہے کہ اگر کوئی کھیلے بیٹھے تو ہر بار

میں گزرا رہا تھا۔ بھانت بھانت کے لوگوں سے رابطہ رہا تھا۔ تعلیم کے علاوہ دوسرے مشاغل میں بھی دلچسپی لیتا رہا تھا۔ اصل میں ماضی کے نقش و نگار پر چسپاں تھے۔ جنہیں میں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ والد صاحب مرحوم نے ماں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا۔ وہ انتہائی تکلیف دہ تھا۔ بس کبھی کبھی کچھ رشتے بالکل بے دست و پا کر دیتے ہیں۔ میرے اور ڈیڈی کے دو میان تعلقات کچھ خوشگوار نہیں تھے اور اس کی وجہ ماں کے ساتھ ڈیڈی کا سلوک تھا۔ میری والدہ مرحومہ جنہیں ڈیڈی نے پندرہ سولہ سال کی وفات کے بعد طلاق دے دی تھی۔ ہمیں گھر کے حالات کا بھرپور اندازہ تھا۔

ڈیڈی مئی سے ہمیشہ لڑتے رہتے تھے اور آخر کار انہوں نے مئی کو طلاق ہی نہیں دی بلکہ ہمیں بھی ان سے چھین لیا۔ مئی ایک غریب گھر کی بیٹی تھیں۔ اس لیے ڈیڈی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں۔ بعد میں ہمیں بھی مئی سے نہیں ملنے دیا گیا اور وہ دو تین سال میں انتقال کر گئیں۔ میری دونوں بہنوں کی شادی کر دی گئی تھی اور مجھے امریکہ بھیج دیا گیا تھا۔

امریکہ میں میں نے اپنی پسند کی زندگی گزاری اور پھر اس وقت میری واپس ہوئی جب مجھے ڈیڈی کے انتقال کی خبر ملی۔ میں واپس آ کر میں نے ڈیڈی کی تمام جائداد اور کاروبار کی صورت حال سنبھال لی۔ بہر حال زندگی اسی طرح سادگی سے گزر رہی تھی کہ ایک نام نہاد شخص ڈان زان مغل، مجھ سے ملا۔ میرے ملازم نے اسے ڈرائیونگ روم میں بٹھا دیا تھا اور اس کا کارڈ مجھے پیش کیا تھا۔ عجیب سا نام تھا۔ بہر حال میں ڈرائیونگ روم میں پہنچ گیا۔ وہ ایک نوجوان آدمی تھا۔ جو اچھے خاصے سوٹ میں ملبوس کافی اسارٹ نظر آ رہا تھا۔

بریف کیس سے تاش کی ایک دوسری گڈی نکال کر دکھائی۔ بظاہر اس پر کسی طرح کا کوئی نشان نہیں تھا۔ مگر چشمہ لگا کر دیکھا تو ہر پتے کی پشت پر نیلے رنگ کے مختلف نشانات واضح ہو گئے۔ اس نے مجھے بتایا کہ کس نشان سے کون سا پتہ مراد ہوتا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ حال ہی میں امریکہ سے واپس آیا ہوں اور مجھے فلیش سے خاصی دلچسپی ہے۔ نیز یہ کہ کیا وہ مجھے شہر کے خفیہ کلبوں اور خفیہ اڈوں کا پتا بتا سکتا ہے جہاں یہ کھیل کھیلا جاتا ہو اور اونچی بازیاں لگتی ہوں۔ اور وہ مجھے مختلف شہروں کے اڈوں کے بارے میں بتانے لگا۔

☆☆

میرے مرحوم ڈیڈی احمد شاہ درانی شہر کے بہت بڑے امپورٹر اور ایکسپورٹر تھے۔ پندرہ سالہ ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد جسے سن شعور کو پہنچنے کے بعد میں نے ہمیشہ بخ ہی دیکھا معلوم نہیں وہ اس سے پہلے کیسی تھی۔ ممی کو طلاق دینے کے بعد ڈیڈی نے ہمیں یوں چھین لیا کہ بعد میں ان سے ملنے اور ایک نظر دیکھنے کی بھی اجازت نہیں دی اور پھر ممی کا انتقال ہو گیا اور ہماری تعلیم و تربیت ڈیڈی کی زیر نگرانی ان کی پسند و ناپسند کے مطابق ہونے لگی۔ نازیہ باجی مجھ سے تین سال بڑی تھیں اور سجدہ چار سال چھوٹی تھی۔ دولت مند گھرانوں میں لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ انہیں عموماً بی اے یا بی ایس سی کے بعد گھر بٹھا جاتا ہے۔ جس کے بعد ان کی شادی کر دی جاتی ہے اور یہ ہی میری دونوں بہنوں کے ساتھ بھی ہوا۔

مجھے بچپن ہی سے فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی اور میری آرزو تھی کہ میں بڑا ہو کر کوئی نامور موسیقار بنوں یا کوئی مشہور اداکار کوئی ہر دل عزیز موسیقار بنوں مگر ڈیڈی مجھے پہلے ایم بی اے اور پھر امریکہ پلٹ ماہر سرجن بنانا چاہتے تھے۔ کچھ اس اختلاف اور کچھ انہوں نے ممی سے جو سلوک کیا تھا۔ اس

جیت کر ہی اٹھے۔ باوجود اس کے کہ دوسرے کھلاڑیوں میں بھی کوئی ماہر پتے بازی اشارہ ہو۔ اگرچہ مجھے بھی اس فن میں بہت کچھ آتا تھا۔ مگر میں اس کا تجربہ اور قابلیت دیکھنا چاہتا تھا۔

”ایسے کئی کرتب مجھے آتے ہیں سر۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مگر انہیں صرف بتانے یا دکھانے سے ہی نہیں سیکھا جاسکتا۔ جب تک بار بار کی مشق اور مسلسل ریاضت سے مہارت اور ہاتھ کی صفائی نہ آجائے اور یہ خاصا دیر طلب کام ہے لیکن اس لائن سے پرانی وابستگی اور اس میدان میں تازہ ترین معلومات کی بنا پر میں یہ جانتا ہوں سر! کہ آج کل شہر کی ہائی سوسائٹی کلبوں خفیہ قمار خانوں اور خالص پرائیویٹ نشستوں میں جو طریقہ بہت استعمال کیا جا رہا ہے۔ وہ خفیہ نشانات کا ہے۔ جنہیں بادی النظر میں ہرگز نہیں دیکھا جاسکتا خواہ آپ خود بین سے ہی ایک ایک پتے کا جائزہ کیوں نہ لیں۔“

”تو پھر پتے باز انہیں کس طرح دیکھتا ہے۔“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”آپ میز سے جیت کر اٹھنا چاہتے ہوں تو ایک چشمہ آپ کی نذر کر سکتا ہوں۔“

”کس قیمت پر۔“

”اس کی قیمت تو کوئی کیا ادا کر سکتا ہے۔ مگر میں صرف اس کے بنانے پر خرچ ہونے والی رقم اور معلومات سامناغ لیا کرتا ہوں۔“

”کیا لیتے ہو۔“

”صرف دس ہزار روپے۔“

”چیک باکیش۔؟“

”برانہ مائیں تو صرف کیش۔“

”تم چشمہ نکالو۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”میں ابھی رقم لے کر آتا ہوں۔“

چشمہ دیکھنے میں بہت خوب صورت اور جدید ڈیزائن کا تھا۔ مجھے پسند آیا۔ اس نے مجھے

Downloaded from https://paksociety.com کے باعث کشف سی ری۔ اتنا تو بہر حال میں بھی سمجھتا تھا کہ میں جو کچھ بنا چاہتا ہوں اس کے لیے بھی مناسب تعلیم ضروری ہے۔ اس لیے ایف ایس سی تک اس کشف کا انداز کچھ ایسا ہی رہا کہ میں ان سے چھپ کر فلمیں دیکھتا تھا۔ گانے سنتا اور سیکھتا تھا اور پیٹنگ سے ڈرائنگ کی کاپیوں پر کاپیاں بھرتا جاتا تھا لیکن اس کے ساتھ تعلیم پر بھی مناسب توجہ دیتا تھا۔ جس کا عملاً جو نتیجہ نکلا وہ یہی تھا کہ ٹھڈ کلاس سے لے کر ایف ایس سی تک میں کلاس میں بھی سیکنڈ اور بھی ٹھڈ پوزیشن لیتا رہا۔ میٹرک میں نے سیکنڈ ڈویژن میں کیا اور ایف ایس سی میں بھی یہی رزلٹ رہا۔

پوزیشن کے ساتھ پاس ہو گیا۔ اب امریکہ جا کر سرجن بننے کا مرحلہ آیا۔ ڈیڈی نے تمام انتظامات مکمل کر لیے وہاں ان کے کچھ دوست تھے۔ انہیں میرا خیال رکھنے کے بارے میں لکھ دیا گیا۔ مجھے بھی ان کے پتے دیتے ہوئے ہدایات کر دی گئی کہ میں ان لوگوں سے برابر ملتا رہوں پھر عین روائی کے دن ڈیڈی نے مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا اور بالکل تنہائی میں سنجیدگی سے بولے۔

”برخوردار! میں تمہارے تمام معمولات اور خیالات کو جانتا ہوں۔ مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے مستقبل کی بہتری کون سی راہ اختیار کرنے میں ہے۔ ابھی تک تم نے صرف ایف ایس سی تک پڑھا ہے۔ میڈیکل کے سال اول سے لے کر فاسل تک امتحان میں بلاشبہ تم بیٹھے ہو۔ مگر اسے پاس میں نے کیا ہے۔ تم سے آج تک اس لیے نہیں کہا کہ اس ملک میں سب کچھ ملتا ہے۔ جب یہاں کے لیڈر جو سیاست کی الف بے سے واقف نہیں اور پھر بھی عوام کی جان و مال سے کھیلتے ہیں تو ایک ڈاکٹر کا دائرہ کار تو اتنا وسیع بھی نہیں ہوتا لیکن اب تم امریکہ جا رہے ہو۔ اگرچہ وہاں بھی بہت کچھ چلتا ہے۔ مگر وہاں ڈگری بغیر محنت کے نہیں مل سکتی۔ اس لیے اب تمہیں جان توڑ محنت کرنا پڑے گی۔ بشرطیکہ تمہیں میری لاکھوں کی جائداد اور کاروبار سے کوئی دلچسپی ہو۔ کیونکہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر تم وہاں سے ڈگری لے کر واپس نہیں آئے تو میں تمہیں اپنی جملہ وراثت سے عاق کر دوں گا۔ بس مجھے اتنا ہی کہنا تھا۔ اب تم جاسکتے ہو۔“

میں ڈیڈی کی دھمکی سے بہت زیادہ خوف زدہ ہو گیا تھا کہ میں نے امریکہ پہنچنے کے بعد سچ سچ ایمانداری سے پڑھنے کی کوشش کی مگر جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اب تعلیم میں دلچسپی لینا میرے

اصل کشف بلکہ ایک طرح سے سرد جنگ کا آغاز اس کے بعد ہوا ڈیڈی نے فیصلہ دے دیا کہ مجھے میڈیکل میں داخلہ لینا ہے میں نے کچھ زیادہ مخالفت نہیں کی۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ فرسٹ ڈویژن والوں کو ہی بڑے پاڑ پیلٹا پڑتے ہیں۔ سیکنڈ ڈویژن کی باری کہاں آئے گی لیکن مجھے بے حد تعجب بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ جب مجھے نجانے کس طرح میڈیکل میں داخلہ مل گیا۔ غصے کے باوجود انکار کی مجال نہ تھی۔

مگر میں نے بھی سوچ لیا کہ اب آئندہ کسی بھی امتحان میں پاس ہونے والے پر لعنت ہے۔ ڈیڈی نے مجھے ہاسٹل میں داخل کروادیا۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں پڑھائی کا ماحول ہونے کی وجہ سے بہتر نتائج برآمد ہوں گے اور وہ ہوئے بھی۔ یعنی اس کے باوجود کہ میں سارا سال فلم بینی اور آوارہ گردی کرتا رہتا تھا۔ اکثر کلاس میں غیر حاضر رہتا تھا۔ امتحان میں جوابات کی جگہ فلمی گانے اور کارٹون بنا کر آتا۔ مگر ڈیڈی نجانے کون سی جادو کی چٹری گھماتے تھے کہ ہر سال کامیاب طلباء کی فہرست میں سب سے نیچے سہی لیکن ہوتا ضرور تھا۔ یہ صورت حال ایم بی بی ایس

بس کی بات نہیں رہی۔ چنانچہ میں نے ڈیڈی کی مقرر کردہ سزا سے بچنے کا کوئی طریقہ سوچنے کی کوشش کی اور آخر کار اسی نتیجے پر پہنچا کہ یہاں مجھے اپنے شوق کو بائیسہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بہترین مواقع حاصل ہیں۔

اگر میں ان میں سے کسی ایک شوق مثلاً اداکاری میں کامیاب ہو گیا تو پھر مجھے ڈیڈی کی دولت کی بھی پرواہ نہیں ہوگی۔ چنانچہ میں نے ایک طرف تو ہالی وڈ کے چکر لگانا شروع کر دیے اور دوسری طرف قسمت کے سہارے دولت کمانے کے لیے قمار خانوں کا رخ کیا۔ مگر جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ خواب دیکھنا اور چیز ہے اور اس کی تعبیر حاصل کرنا فطرتی مختلف شے ہے۔ دو سال ٹھوکریں کھانے کے بعد صرف اتنا ہو سکا کہ قمار خانوں میں اپنے سٹار پر دوستوں کی مہربانی سے مختلف نوعیت کی بازوؤں کے کچھ خاص خاص گر ہاتھ میں آگئے اور اسٹوڈیوز کے چکروں نے ایک تجربہ کار میک اپ مین کا ہم نوالہ ہم چالہ بنا دیا۔ جس نے ازراہ دوست نوازی اس فن کے کئی سربستہ راز مجھے سکھادیے۔ قریب تھا کہ میں ان دونوں فنون سے ذاتی فائدہ اٹھانے کا آغاز کرتا کہ ڈیڈی کے اچانک انتقال کا کبیل موصول ہوا اور میں بلاتل پاکستان واپس آ گیا۔

ان دو برسوں میں ڈیڈی کو ان کے دوست میرے بارے میں کیا رپورٹیں بھیج رہے تھے اس کا مجھے علم نہیں تھا لیکن یہ رپورٹیں میرے خلاف تھیں۔ تب بھی ڈیڈی نے اپنے خطوط میں کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ بڑی پابندی سے میرے جملہ اخراجات روانہ کرتے رہے تھے۔ غالباً وہ اس انتظار میں تھے کہ فاضل نتیجہ سامنے آئے تب کوئی حتمی قدم اٹھائیں۔ مگر قسمت کی مہربانی سے انہیں یہ موقع نہیں مل سکا اور اپنی واپسی پر مجھے یہ ہی بتایا گیا کہ دونوں بہنوں کو تھوڑا سا حصہ دینے کے بعد میں پوری جائیداد کو رادار

کا مالک ہوں۔ مجھے در آمد برآمد سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اس لیے میں میں نے ڈیڈی کا جملہ برنس مع اس کی گڈول کے ایک پارٹی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس سے بھی ایک وافر رقم ہاتھ لگی اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ اب بظاہر باپ کی کمائی ہوئی دولت سے عیش کرنے کے علاوہ میری کوئی مصروفیت یا کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔

ڈان زان مغل سے میری دلچسپی ملاقات کو تقریباً ایک ہفتہ گزارا تھا۔ ایک شام میں شیر کے ایک معروف کلب میں بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ مجھے اپنے پیچھے ایک قریبی میز سے ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں اس وقت محض حسن اتفاق سے اکیلا تھا۔

ہائی سوسائٹی میں یہ خبر پورے زور و شور سے پھیل گئی تھی کہ ایک لکھ پتی کا اکلوتا بیٹا حال ہی میں اس کی جائیداد کا وارث بنا ہے اور خیر سے کنوارہ ہے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کئی خوب صورت لڑکیوں نے یا تو خود میرا کھر دیکھ لیا تھا۔ یا نہیں دکھایا گیا تھا۔

جلد ہی مجھے ان کی گفتگو سے اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی بڑی رقم کے نقصان کا ماتم کر رہے ہیں۔ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے منگیتر ہیں۔ لڑکا غریب ہے۔ لڑکی امیر باپ کی بیٹی ہے۔ دفعتاً میں نے لڑکی کو سسکیوں کے ساتھ روتے سنا۔ وہ شام کا ابتدائی وقت تھا کلب کا ریفریشمنٹ ہال تقریباً خالی نظر آ رہا تھا۔ اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ یوں بھی اپنی کافی ختم کر چکا تھا۔ اس لیے اٹھا اور بڑی بے تکلفی سے ان کی میز پر جا کر بیٹھ گیا۔ لڑکی نے جلدی سے اپنے آنسو خشک کر لیے میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ نقش و نگار کے اعتبار سے شاید اتنی خوب صورت نہ ہو مگر چہرے کے مجموعی تاثر بڑا کشش انگیز تھا۔ وہ دونوں میری اس مداخلت پر حیران تھے۔ میں نے

سے پوچھا۔ پھر میں کیا کروں۔ اس نے کہا۔
 ”اپنے اکل سے اور روپیہ مانگو۔ کم از کم دو
 لاکھ مگر یہ میرے لیے بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا۔
 میں نے اپنے دوست سے کہا۔ کوئی اور ترکیب
 بتاؤ۔ اس نے جواب دیا کہ پھر تو بس ایک ہی
 ترکیب ہے۔ میں ایک ایسی جگہ جانتا ہوں۔
 جہاں بڑے پیمانے پر قش ہوتا ہے۔ ہزاروں کی
 تعداد میں بازیاں لگتی ہیں۔ تم ایک رات میں
 کروڑ پتی بھی بن سکتے ہو۔ میں نے کہا مجھے قش
 نہیں آتا۔ آج تک بھی کھیلایا نہیں۔ وہ ہنسا کہ
 یہ کوئی مشکل بات نہیں میں تمہیں چند منٹ میں
 سب کچھ سکھا دوں گا۔ میں اس کی باتوں میں
 آ گیا۔

دوسرے دن وہ ایک کار لے کر آ گیا۔ کچھ
 دور جا کر اس نے میری آنکھوں پر پٹی باندھی اور
 کہا۔ ”احتیاط خود تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اگر
 کبھی کوئی پوچھے تو دیانت داری سے کہہ سکتے ہو
 کہ مجھے کچھ نہیں معلوم وہ مجھے نہ معلوم کسی علاقے
 کی ایک شاندار عمارت میں لے گیا۔ جس میں
 بے شمار کمرے تھے اور ہر کمرے میں کچھ نہ کچھ ہو
 رہا تھا۔ اب زیادہ تفصیل میں کیا جاؤں۔ مختصر یہ
 کہ میں نے بازی لگائی شروع میں کافی جیتا۔
 تقریباً پچاس ہزار مگر پھر جو قسمت نے پلٹا کھایا تو
 سب کچھ ہار گیا۔ پورا ایک لاکھ میرا دوست مجھے
 تسلی دینے لگا۔ میں جان سے بیزار تھا۔ خودکشی
 کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس نے مجھے ایک بوتل
 دی کہ اسے پی لو۔ طبیعت سنبھل جائے گی۔ معلوم
 نہیں وہ کیا تھی۔ اسے پینے کے بعد مجھے ہوش
 نہیں رہا۔ آنکھ کھلی تو اپنے گھر کے قریب ایک
 سنان کلی میں پڑا ہوا تھا۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ نونشا نے اسے ڈبڈبائی
 آنکھوں سے دیکھا۔
 ”تمہیں یہ شبہ تو نہیں ہوا کہ وہ لوگ پتے

قدرے کم ہو گئے۔ پھر جب میں نے انہیں بتایا
 کہ میں قریب کی میز پر بیٹھا۔ نادانستہ ان کی جی
 گفتگو سننے کا مرکب ہوا ہوں اور محض برہنہ
 خلوص و انسانیت یہ جانتا چاہتا ہوں کہ کیا میں کسی
 بھی طرح ان کے کچھ کام آ سکتا ہوں۔ میری ان
 باتوں سے وہ دونوں بہت متاثر ہوئے میرا شکریہ
 ادا کیا اور میرے اصرار پر اپنی کہانی کچھ یوں
 بیان کی۔

”میرا نام جاوید عزیز ہے۔“ نوجوان نے
 کہا۔ وہ بھی خاصا برکش لڑکا تھا۔ ”اور یہ میری
 منگیت نونشا ہے۔ ایک بڑے باپ کی اکلوتی بیٹی
 ان سے کچھ دور کی رشتہ داری بھی ہوتی ہے۔
 میرا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا رہا ہے۔ پہلی جماعت
 سے ہی نمایاں پوزیشن لے کر کامیاب ہوتا رہا
 ہوں۔ بی کام میں فرسٹ آیا اس سے آگے تعلیم
 جاری رکھنے کی استطاعت نہیں تھی۔

خیام اکل میرا مطلب ہے۔ نونشا کے ابو
 میری امی سے ملنے آئے دونوں میں کچھ باتیں
 ہوئیں اور پھر ایک ہفتے بعد ہماری گفتگو ہوئی۔
 اکل نے مجھ سے کہا۔

”برخوردار! ملازمت میں کچھ نہیں رکھا۔
 بزنس کرو بزنس وہ خود بھی بہت بڑے بزنس مین
 ہیں۔ پھر انہوں نے مجھے کچھ رقم نقد دی کوئی
 مناسب کاروبار کرنے کے لیے میں بہت خوش
 تھا۔ میرے ذہن میں بے شمار منصوبے خوابوں کی
 مانند آرہے تھے لیکن پھر میرا ایک دوست آ گیا۔
 میں نے اس سے بھی مشورہ کیا کہ کون سا کام
 زیادہ بہتر اور جلد منافع بخش ہو سکتا ہے۔ وہ بولا۔
 ”آج کل تو اتنی رقم میں ان سگریٹ کی
 دکان بھی نہیں کھل سکتی۔ کاروبار کوئی بھی ہو۔
 دکان کے لیے اچھا محل وقوع سب سے زیادہ اہم
 ہے اور ایسی دکان کی صرف چڑی ہی پچاس ہزار
 سے لے کر ڈیڑھ ہزار تک ہے۔ میرے پاس رقم

غزل

طارق حسن طارق

جو شاعری میں بہت کامیاب ہے پیارے
اُسی کا ان دنوں خانہ خراب ہے پیارے

وہی زمانے میں عزت مآب ہے پیارے
کہ مال جس کے یہاں بے حساب ہے پیارے

جو تم بنے ہوئے رہک شباب ہو پیارے
مجھے خبر ہے کہاں کا خضاب ہے پیارے

یہ اور بات کہ کانٹوں سے ہاتھ ہے زخمی
یہ کم نہیں مرے گھر میں گلاب ہے پیارے

ہمارے سارے اثاثے کی ٹوہ میں ہو تم
ہماری جب سے طبیعت خراب ہے پیارے!

میں اس کے گھر جو چلا جاتا ہوں تو کیا نا صبح
تلاشِ رزق تو کارِ ثواب ہے پیارے!

ہے ڈر مجھے ترے والد نہ مسترد کر دیں
میں ایک چراغ ہوں تو آفتاب ہے پیارے

سب بتادوں میں دنیا کی بے جالی کا
تمہارا حسن ، تمہارا شباب ہے پیارے

خدا کے واسطے طارق نہ اس سے تھما ل
لگے گا عیب ، زمانہ خراب ہے پیارے

بازی کر رہے ہیں۔ میں نے جاوید سے پوچھا۔
”شبہ نہیں مجھے یقین ہے کہ انہوں نے مجھے
دھوکے سے لوٹا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”جو آدمی تمہارے ساتھ کھیل رہے تھے۔“
میں نے سوچتے ہوئے سوال کیا۔ ”ان میں سے
کوئی چشمہ تو نہیں پہنے ہوئے تھا۔“

”ہاں ایک آدمی نے پہن رکھا تھا۔“ جاوید
نے کچھ چونک کر جواب دیا۔

میں نے اسے چوں پر کچھ خفیہ نشانات کے
بارے میں بتایا۔ اس نے جواب دیا کہ اس نے
فراڈ کی تصدیق کے لیے ایک استہمال شدہ تاش
کی گڈی چھپا کر جیب میں رکھ لی تھی لیکن گھر پہنچ
کر اسے بہت غور سے دیکھنے پر بھی کچھ نظر نہیں
آیا۔ وہ گڈی اتفاق سے اس وقت بھی اس کی
جیب میں تھی۔ اس نے نکال کر مجھے دکھائی۔ میں
نے اسے دیکھے بغیر جیب میں رکھ لیا۔

میں اسے جتنے کے راز کے بارے میں کچھ
بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اس گڈی
پر خفیہ نشانات ضرور موجود ہوں گے۔ میں نے
اسے تسلی دی اور کہا کہ میں ہر ممکن طریقے سے اس
کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ وہ کل مجھ سے نوشاہہ کے
ساتھ اس جگہ ملاقات کرے تو میں اسے اپنی
سوچی ہوئی تجویز سے آگاہ کروں گا اور مجھے
پوری امید ہے کہ میں صرف اس کا نقصان ہی نہیں
بلکہ کچھ منافع بھی دلوانے کی کوشش کروں گا۔

دوسرے دن وہ مجھ سے پہلے ہی کلب میں
میرے منتظر تھے۔ میں نے گھر پہنچ کر پروفیسر زان
مخل کا دیا ہوا چشمہ لگا کر دیکھا تو تصدیق ہوئی کہ
میرا اندازہ درست تھا۔ تاش کی گڈی کے ہر پتے
پر خفیہ نشانات موجود تھے۔ ایسی صورت میں ظاہر
تھا کہ میرا لائحہ عمل کیا ہو سکتا تھا۔

چنانچہ میں نے کہا۔
”دیکھو میاں جاوید! ہر چند کہ میں کوئی ماہر
کھلاڑی نہیں ہوں۔ مگر قس کے کچھ خاص گر جانتا

بلکہ ایک اور شکار پھانسنے کے لالچ میں اس آڑے پر مجھے بھی لے جانے کے لیے بخوشی آمادہ ہو جائے گا۔ چاہو تو تم دونوں بھی ساتھ چل سکتے ہو۔“

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ جاوید تین دن کے بعد مجھے ملا اور بتایا کہ اگلی شام کے لیے پروگرام طے پا گیا ہے۔ دوسرے دن شام کو وہ مجھے ایک اور کلب لے گیا۔ جہاں ایک نوجوان سے میرا تعارف کرایا۔ جس کا نام دلاور تھا۔ وہ مجھے شکل ہی سے کوئی جھٹا ہوا بد معاش اور عادی جرائم پیشہ نظر آ رہا تھا لیکن اپنی ناگواری کو چھپاتے ہوئے میں اس سے بڑے پرستار انداز میں ملا۔ میرے پاس اپنی کار بھی۔ مگر طے یہ ہی ہوا کہ ہم ان کے معمول کے مطابق اس کار میں چلیں گے۔ جو ہمیں لیجانے کے لیے بھیجی جائے گی۔ اس لیے میں اپنی کار لاک لگا کر کلب ہی میں چھوڑ دوں۔

دوسری شرط یہ بھی تھی کہ کچھ راستہ طے کرنے کے بعد ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ دی جائے گی۔ تقریباً نو بجے تک ہم کلب میں کافی بیٹے اور باتیں کرتے رہے۔ پھر دلاور نے کار کے پینچنے کی اطلاع دی۔ میں جاوید اور نوشابہ بچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ دلاور اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا اور ہم کلب سے روانہ ہوئے۔ چند رہ منٹ کے سفر کے بعد دلاور نے کار روکائی۔ اتر کر خود اپنے ہاتھوں سے ہم تینوں کی آنکھوں پر پٹی باندھی۔

کار پھر چلی اور میرے اندازے کے مطابق نصف گھنٹے کے لگ بھگ چلتی رہی۔ معلوم نہیں وہ حقیقت میں کوئی فاصلہ طے کر رہے تھے یا ہمیں طویل فاصلے کا تاثر دے رہے تھے اور سڑکوں پر یونہی کھوم پھر رہے تھے۔

بہر حال تقریباً دس بجے کار ایک عمارت کے سامنے رکی۔ ہماری پٹیاں کھول دی گئیں۔ میں نے دیکھا کہ ایک تین منزلہ کچھ کچھ قلعہ نما سی

ہوں مجھے تم دونوں سے ہمدردی ہے اور ظالم سماج یا فلک سچ رفتار کو دو محبت کرنے والوں کے درمیان دیوار بنتے نہیں دیکھ سکتا۔ میرے لیے لاکھ دولاکھ کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔ تمہیں یوں بھی دے سکتا ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ محبت کرنے والے بڑے غیرت مند ہوتے ہیں۔ تم لوگ اس انداز میں میرا احسان مند ہونا منظور نہیں کرو گے۔ پھر میں ان لوگوں کو بھی کچھ سبق دینا چاہتا ہوں۔ جو سادہ لوح معصوم لوگوں کو اس سنگدلی سے بھٹکتے ہیں۔

اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے اس دوست سے میرا تعارف کروادو جو تمہیں اس پوشیدہ عمارت میں لے گیا تھا۔ میں خود ان لوگوں کے ساتھ شکاریوں کا اور مجھے یقین ہے کہ چند گھنٹوں میں ایک لاکھ کے تین لاکھ بنالوں گا۔ اس میں سے ایک لاکھ تمہیں دے دوں گا۔ پھر یہ کوئی احسان نہیں ہوگا۔ کیوں کہ تمہارے ذریعے میں خود بھی ایک رات میں ایک لاکھ کمالوں گا۔ بولو کیا کہتے ہو۔ میری تجویز قبول ہے۔“

نوشابہ کا چہرہ تو میری بات سنتے ہی جھکنے لگا تھا۔ مگر جاوید نے جواب دینے سے پہلے کچھ دیر سر کو جھکا کر سوچا پھر بولا۔ ”اس میں شک نہیں ہے کہ آپ کی تجویز بہت خوب ہے لیکن پہلی بات تو یہ کہ وہ لوگ آپ کے اندازے سے کہیں زیادہ چالاک ہیں اور چار سو بیس ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری خاطر آپ اتنی بڑی رقم داؤ پر لگا دیں۔ دوسری بات یہ کہ میرا دوست! اس دن کے بعد سے پھر نظر نہیں آیا ہے۔“

”تم میری رقم کے لیے فکر مند نہ ہو۔ میں بزنس مین ہوں اور کوئی تجربہ کار بزنس مین سوچے سمجھے بغیر رسک نہیں لیتا۔“ میں نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔ ”رہا تمہارے اس دوست کا معاملہ تو تم اس کے مصروف ٹھکانوں پر اسے تلاش کرو۔ مجھے امید ہے کہ وہ نہ صرف مل جائے گا۔

عمارت ہے جو باہر سے بڑی مضبوط معلوم ہو رہی تھی۔ ارد گرد کم و بیش اندھیر تھا۔ صرف بلندی پر چند سرچ لائیں روشن تھیں۔ ایک طرف بڑا سا پارکنگ ایریا تھا۔ جس میں میرے اندازے کے مطابق پچاس سے زیادہ کاریں کھڑی تھیں۔ ہم عمارت کے صدر دروازے میں داخل ہوئے۔ جس کے باہر دو سٹارڈ ڈومو جوتھے۔ ہم تیسری منزل پر پہنچے دونوں اطراف بہت سے دروازے نظر آ رہے تھے۔ جن میں سے بیشتر بند اور نیم واہ تھے۔

ان کے اندر سے مختلف باتیں کرنے ہنی مذاق اور تھپتھپ لگانے اور گانے کی ملی جلی آوازیں آرہی تھیں۔ ڈرائیور کاری میں رہ گیا تھا۔ دلاور ہمیں ساتھ لیے جس کمرے میں داخل ہوا۔ اس میں چھ سات میزوں کے گرد چار یا چار سے زیادہ افراد بیٹھے تھے۔ دو چار میز خالی بھی تھیں۔ دلاور نے کمرے کے ٹکران کو میرے بارے میں بتایا۔ جس نے ایک خالی میز کی جانب اشارہ کیا اور ابھی ہم وہاں بیٹھے ہی تھے کہ تین آدمی نہ جانے کہاں سے نکل کر ہمارے سامنے آ بیٹھے۔ جن میں سے ایک نے میری طرح چشمہ لگایا ہوا تھا۔

دلاور نے ان کا فرداً فرداً تعارف کرایا۔ ان کے نام اور تعارف کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ نام بھی فرضی تھے اور دلاور نے ان کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا۔ وہ سب کچھ مجھ جیٹھ تھا۔ تعارف کے بعد ہم سب اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے۔ میں دانستہ اس چشمے والے کے قریب بیٹھا۔ اس کے بعد جاوید اور نوشابہ تھے اور ان کے بعد دو اور مد مقابل پہچان کے لیے میں انہیں نمبر ایک اور نمبر دو لکھوں گا۔

یہاں امریکہ کے قمار خانوں کی طرح ٹوکن منی کا رواج نہیں تھا۔ ہر کھلاڑی اصل کرسی نوٹ

سامنے رکھ کر بیٹھا تھا۔ میں نے اپنے بریف کیس میں سے پچاس ہزار کے نوٹ نکالے اور جھک کر بریف کیس نیچے رکھا تھا اور ارد دتا کرسی کو اس طرح حرکت دی کہ وہ الٹ کر پیچھے گرنے لگی۔ پھر میں نے جیسے گرنے سے بچنے کے لیے ہوا میں ہاتھ لہرائے اور میرا داہنا ہاتھ ٹھیک چشمہ والے کے چہرے پر لگا۔ دوسرے ہی لمحے چشمہ اس کی ناک سے اچھل کر تیر کی طرح پھیل دیوار سے ٹکرایا اور اس کے دونوں شیشے چور چور ہو گئے۔

میں بھی لڑھک کر نیچے گر چکا تھا۔ جاوید نے جلدی سے مجھے اٹھنے میں مدد دی۔ میں نے انتہائی شرمندہ لمحے میں چشمے والے سے معذرت چاہی۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ تیز نظروں سے مجھے گھور کر رہ گیا۔ ہم دوبارہ اپنی کرسیوں پر بیٹھے۔ تاش کی ایک قیمتی نئی گڈی کھولی گئی۔ ان تینوں کے انداز سے کچھ ہچکچاہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ مگر ظاہر تھا کہ وہ کوئی معقول بہانہ پیش نہیں کر سکتے تھے۔

چنانچہ کھیل شروع ہوا۔ مجھے اپنے چشمے کی مدد سے تاش کے ہر پتے پر لکھے ہوئے نشانات نظر آ رہے تھے۔ انہیں دیکھنا بھی کچھ ایسا مشکل نہ تھا۔ جس وقت پتے فرداً فرداً ہر ایک کو دیے جا رہے تھے۔

اسی وقت تین میں سے دو پتوں کے نشانات تو نظر آ ہی جاتے تھے۔ پھر جب کھلاڑی انہیں اٹھاتا تھا تو باقی رہ جانے والا پتہ بھی نگاہ میں آ جاتا تھا۔ مگر ایک دو بازیوں کے بعد ہی مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ پتوں پر جو خفیہ نشانات ڈالے گئے ہیں۔ وہ بالکل غلط ہیں۔ مثلاً اپنے خفیہ نشان کے مطابق اگر کسی پتے کے حکم کا اکا ہوتا چاہیے تھا تو حقیقت میں وہ حکم کی دگ ثابت ہوتا تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ یہی ہونا چاہیے تھا کہ میں وہ دونوں بازیاں ہار گیا۔

میں نے سوچا کہ جو نشانات میں دیکھ رہا ہوں ممکن ہے وہ اس لیے دھوکہ دینے کے لیے

میں چال چل رہا تھا تو اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنے دو پتے تبدیل کر لیے اور ایک دم سے دس ہزار کی چال چلی۔ میں نے فوراً اس کے پتوں پر ہاتھ مارا اور انہیں جھپٹ لیا۔

”یہ کیا حرکت ہے۔“ وہ بگڑ کر بولا۔
 ”تم پتے بتا رہے ہو۔“ میں نے سخت لہجے میں جواب دیا اور اس کے پتے میز پر کھول دیے۔ وہ تینوں رکے تھے۔ ”میں مطالبہ کرتا ہوں۔“ میں نے بدستور سخت لہجے میں کہا۔ ”کہ تاش کی گڈی چیک کی جائے۔ یقیناً چھ ا کے برآمد ہوں گے۔“

”تم مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔“ چشمے والے نے زور سے میز پر گھونٹہ مارا۔

نمبر ایک اور نمبر 2

تہر آؤد نظروں سے گھور رہے تھے۔ جاوید خاموش تھا اور نوشابہ بڑی پریشان نظر آ رہی تھی۔ ہنگامے کی آواز سن کر نگران بھی آ گیا تھا۔ میں نے اسے صورت حال بتائی۔ اس نے بڑے پرسکون انداز میں میرے اس مطالبے کی تائید کی تاش کی گڈی چیک کی جائے۔ چنانچہ ایک ایک پتہ دیکھا گیا اور جیسا کہ میرا خیال تھا اس میں سے چھ ا کے برآمد ہوئے۔ چار اس کے اپنے اور دو وہ جو چشمے والے نے شامل کیے تھے۔

چشمے والا خاموش بیٹھا تھا۔ مگر وہ کسی طرح بھی گھبرایا ہوا یا پریشان معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ میرے اصرار پر اس کی بھی تلاشی لی گئی اور مختلف جیبوں میں خاص طور سے آستین کے اندر بنی ہوئی خفیہ جیب میں کئی بڑے پتے موجود پائے گئے۔ نگران نے بڑے مہذب انداز میں مجھ سے معذرت کی۔ اس نے کہا کہ ہماری پوری کوشش ہوئی ہے کہ یہاں ہر کھیل صاف ستھرا اور

جائے۔ تب بھی وہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے اور حقیقت میں پتوں کی پہچان کے لیے کسی اور جگہ نشانات موجود ہوں۔ چنانچہ میں نے پتوں کو بڑے غور سے دیکھنا شروع کیا مگر کسی بھی جگہ کوئی اور نشان تلاش کرنے سے قاصر رہا۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ ان کے آدمی کا چشمہ تو میں توڑ چکا ہوں۔ تب پھر وہ لوگ کیسے جیت رہے ہیں۔

کوئی ایک بازی تو میرے ہاتھ میں آتی۔ یقیناً یہ لوگ یا تو پتے لگا رہے ہیں یا پھر چشمے والے کے پاس اضافی پتے موجود ہیں۔ اب تک ہر بازی وہی جیتا تھا وہ حسب ضرورت انہیں استعمال کر رہا تھا۔

میری مسلسل ہار پر جاوید برابر میری ہمت افزائی کر رہا تھا۔ مگر میں نے نوشابہ کو دیکھا۔ وہ خالی افسردہ نظر آ رہی تھی۔ ایک دوسرے جیسے یہ بھی شبہ ہوا جیسے وہ مجھے مزید کھیلنے سے منع کر رہی ہو۔

مگر واضح طور پر کچھ کہنے سے مجبور ہو۔ اب میں نے اپنے امریکہ کے تجربے کا سہارا لیا۔ اس کے بعد جیسے کھیل کا پانسہ پلٹ گیا۔ میں نے لگاتار چار بازیاں جیت کر اپنا تمام نقصان پورا کر لیا۔

نوشابہ کے چہرے پر چمک آ گئی۔ باقی لوگ جاوید سمیت اپنی کرسیوں پر پہلو بدلنے لگے۔ اگلی دو بازیاں بھی میرے حق میں آئیں اور اب میں تقریباً چالیس ہزار روپے جیت چکا تھا۔ چشمے کے بیکار ثابت ہونے پر میری تمام تر توجہ اپنے تینوں مخالفوں پر جمی ہوئی تھی۔ میں ان کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہا تھا۔ ایک بازی چل رہی تھی۔ میرے پاس تین بادشاہ تھے اور میں مطمئن تھا کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی اس سے بڑے پتے موجود نہیں ہیں۔

چنانچہ میں ہر چال پانچ ہزار کی چل رہا تھا۔ کچھ چالوں کے بعد نمبر ایک نمبر دو دونوں نے اپنے پتے پھینک دیے۔ اب میں اور وہ چشمے والا

ایماندارانہ ہو لیکن ہمارے معزز ہماروں میں اگر کوئی فراڈ کرنا چاہیے تو ظاہر ہے کہ ہمارا اس میں کوئی تصور نہیں اس کے بعد اس نے بڑے سخت الفاظ میں چشمے والے کو برا بھلا کہا اور تاکید کی کہ آئندہ وہ بھی یہاں قدم نہ رکھے۔

پھر حکم دیا کہ اس شخص کو کلب سے باہر نکال دیا جائے۔ مگر ان نے دو معاون جو کمرے میں ہی موجود تھے چشمے والے کو پکڑ کر باہر لے گئے اس اثناء میں ایک شخص جس نے بڑے قیمتی کپڑے اور بہترین تراش کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ کمرے میں داخل ہوا۔ مگر ان نے بڑی گرجبوشی سے اس کا استقبال کیا اور مجھ سے تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ یہ امتیاز صواب ہیں۔ شہر کی مصروف سیاسی شخصیت جو کبھی بھی تفریحا کلب آ جاتے ہیں۔ آپ ان کے ساتھ کھیل کے یقیناً لطف اندوز ہوں گے۔

امتیاز بڑے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے خلیقاۃ انداز میں ہاتھ ملایا ہم ایک بار پھر میز پر بیٹھ گئے۔ چشمے والے کی کرسی امتیاز نے سنبھال لی۔ وہ ایک وجہہ آدی تھا۔ مگر اس کی بھوری آنکھوں کی چمک سے انتہائی زیرک اور چالاک ظاہر کر رہی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ اپنے دلکش خدوخال کے باوجود وہ مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ معلوم ہوا۔ تاش کی نئی گڈی کھولی گئی تو کھیل ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

اس کے پتے پھینکنے کے انداز سے میں نے جان لیا کہ وہ خاصا تجربے کا رشار پر ہے۔ میں نے جاوید اور نوشابہ کی طرف دیکھا۔ جاوید حسب سابق بڑا غیر متعلق نظر آ رہا تھا۔ مگر نوشابہ اب بھی مجھے پریشان ہی نہیں کچھ خوفزدہ بھی محسوس ہوئی۔

پتے تقسیم کیے گئے۔ پہلی بار امتیاز نے جیت لی۔ دوسری مرتبہ میں نے گڈی پھینچی اور یہ بازی میرے ہاتھ رہی۔ اس سے مجھے اندازے کی

لھدیہ کرنا مطلوب کی کہ امتیاز رشار پر ہے یا نہیں۔ میں ان لوگوں پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ میں بھی اس فن سے واقف ہوں۔ ایسی صورت حال میں مجھے ایک امریکہ کے بڑے ہی معروف اور ماہریتے باز نے مخالف کی پھینچی ہوئی گڈی کاٹنے کی ترکیب بتائی تھی۔ جس کا انحصار اس بات پر تھا کہ میں مخالف کی وہ ٹرک پہچان لوں جس سے اس نے اس مرتبہ پتے پھینٹے ہیں۔ چنانچہ اگلی بار میں نے امتیاز کو گڈی پھینکنے کا موقع دیا۔ مگر اس کی ٹرک نہ پکڑ سکا نتیجہ میں یہ بازی مجھے ہارنا پڑی۔ مگر اگلی مرتبہ میں نے اس کی چالاک پکڑ لی اور اسی کے مطابق گڈی کو ایک خاص مقام سے کاٹا۔ شاید امتیاز اس ہنر سے انجان تھا۔ اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ وہ بازی میں جیتا۔ اس کے بعد امتیاز نے ہی ہر مرتبہ تاش پھینٹے لیکن اس کی کوئی بھی چالاک بھری باریک بین نظروں سے نہ بچ سکی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک گھنٹے کے کھیل میں میں تقریباً ایک لاکھ روپے جیت چکا تھا۔ امتیاز سپاٹ چہرہ لیے بیٹھا تھا۔ مگر میں جانتا تھا کہ اندر سے بری طرح کھول رہا ہے۔

اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ میں نے کھیل ختم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر امتیاز مجھے یوں کب جانے دے سکتا تھا۔ اس نے مزید کھیلنے پر اصرار کیا میں نے اس شرط پر مان لیا کہ بس تین بازیاں اور ہوں گی۔ امتیاز راضی ہو گیا۔ کھیل پھر شروع ہوا اس دوران جاوید عزیز کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ اگرچہ وہ میری مسلسل جیت پر خود کو بہت خوش ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نوشابہ بھی مطمئن تھی اور ایک ہلی مسکراہٹ اس کے نرم و نازک ہونٹوں پر نقش کر رہی تھی۔ مگر ساتھ ہی اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں کسی موہوم سے اندیشے کی پرچھائیاں بھی گاہے گاہے۔ ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی تھیں۔

غزلیں

ڈاکٹر منور ہاشمی

شہرت کے شہر میں ترے سامان ہیں بہت
اپنے لیے تو اس میں بھی نقصان ہیں بہت

اچھا نہیں ہے توڑنا یکسر کسی کا دل
انکار ہو تو اس کے بھی عنوان ہیں بہت

درد و الم ، جفا و ستم ، بے قراریاں
ہم پر بھال یار کے احسان ہیں بہت

پھیلا ہے چار سو مرے جنگل حیات کا
مل جائیں ایک دو بھی جو انسان ہیں بہت

غم سے گریز کر کے منور لکھے غزل
کاغذ کے دل میں آج بھی ارمان ہیں بہت

☆

سید جواد حسن جواد

کم گڑ ہے وہ نہ ضد ہے مری التماس سے
شیریں دہن ہے لب نہیں کھلتے مٹھاس سے

دیکھا ہے لے کے جائزہ ہوش و حواس سے
دکھ وہ چاند دور سے پیارا ہے پاس سے

چہرہ ہے اس کا منظر رعنائی و مزاج
اندازہ کتاب ہوا اقتباس سے

جواد یوں تو واقعی سادہ سا ہے وہ شخص
چاہت بھری نظر میں ہے کیا کچھ قیاس سے

ان لوگوں نے سی کو میرے گرد لپیٹ کر مزید
اطمینان کر لیا تھا کہ میں کسی بھی طرح اپنے آپ کو
آزاد نہ کر سکوں۔ بریف کیس جو میں لایا تھا
غائب تھا۔

میں نے اپنی تکلیف دہ پوزیشن کو کم کرنے
کے لیے ذہن کو دوسری طرف متوجہ کر لیا۔ اب
تک کے واقعات کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ
بات سمجھنے کے لیے کسی خاص ذہانت کی ضرورت
نہیں تھی کہ پروفیسر ڈان زان کی آمد سے لے کر
جاوید عزیز اور نوشابہ کی ملاقات اور ان کی فرضی
داستان تک ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا جس کے
ذریعے مجھے لوٹنا مقصود تھا کہ غالباً کسی ذہین اور
چالاک جرائم پیشہ کی سربراہی میں نہ صرف وہ قمار
خانہ بلکہ دوسری غیر قانونی سرگرمیاں ہی اس قلعہ
نما عمارت میں جاری تھیں اور احمق ریش زادے
اور سادہ لوح دولت مند لوگوں کو اسی ترکیب سے
پھانس کر لایا جاتا تھا۔ تاکہ غیر ضروری خطرات
مول لیے بغیر لاکھوں روپے حاصل کر سکیں۔

ظاہر ہے میری جگہ کوئی دوسرا شخص بھی ہوتا
تو وہ ایک حسینہ دو شیزہ کی مدد اور کچھ خود بھی فائدہ
اٹھانے کے لالچ میں اس قمار خانے میں اپنی لاکھ
دو لاکھ کی رقم سے ہاتھ دھو بیٹھتا اور مایوسی اور
دلگدگی کے عالم میں جاوید اور نوشابہ سے سخت
آمییز آمیز معذرت خوانی کے ساتھ اسی طرح
آکھوں پر پٹی باندھ کر واپس بھیج دیا جاتا۔ واپسی
کے بعد اس سے کوئی خطرہ بھی نہ تھا۔ اول تو ایسے
سادہ لوح شکار پولیس تک پہنچنے کی ہمت ہی نہیں
رکھتے اور ان میں سے اگر کوئی دل جلا قانون کی
مدد لینے کی کوشش بھی کرتا تو اس کے پاس اپنے
الزامات کو ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت نہ
ہوتا۔ میں بھی اگر ہار چکا ہوتا تو اس وقت اس نیم
تاریک کمرے کے ٹھنڈے فرش پر پڑا ہونے کے
بجائے اپنے شان دار بیڈروم میں نرم و گداز بستر
پر لیٹا اپنی بدعصمتی کا ماتم کر رہا ہوتا۔

میں کامیاب ہو گئے تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گی۔“

”مگر کیوں۔“ میں نے آہستہ آواز میں پوچھا۔ ”انہیں مجھ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ بے ہوش کرنے کے بعد وہ مجھے شہر میں کسی بھی جگہ ڈال کر اپنا پیچھا چھڑا سکتے تھے۔“

”امتیاز..... وہ آدمی جو بعد میں کھیل میں شامل ہوا وہ اس پورے گروہ کا سرغنہ ہے۔ مگر یہ بات صرف چند افراد ہی جانتے ہیں۔ اس وقت شہر میں اگر کوئی کاروباری حریف اور جانی دشمن ہے تو وہ ظہیر الدین ہے۔ جو خود بھی کئی خفیہ اڈوں کا مالک ہے۔ کچھ دن پہلے ظہیر الدین نے امتیاز کے ایک خاص آدمی کو قتل کر دیا تھا۔ آج رات آپ جس طرح بازی کھیلے ہیں۔ اس سے امتیاز کو شبہ ہو گیا کہ آپ ظہیر الدین کے گروہ کے کارکن ہیں اور ظہیر الدین نے آپ کو امتیاز کے اڈوں کا راز معلوم کرنے یا اسے جان سے مارنے کے لیے بھیجا ہے۔ اس لیے وہ نہ صرف اپنے ساتھی کا انتقام لینے بلکہ ظہیر الدین کو سبق سکھانے کے لیے آپ کو ختم کرنا چاہتا ہے۔“

”تم اگر اس کے گروہ کے ممبر ہو تو تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے۔ یقیناً میں تمہارا پہلا شکار تو نہیں ہو سکتا۔ تم اور جاوید پہلے بھی اس شخص رئیس زادوں کو پھانس کر لاتے رہے ہو گے۔“

”یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔“ نوشابہ کے لہجے میں غلٹ اور گھبراہٹ نمایاں تھی۔ ”اس کے آدمی کسی بھی لمحے یہاں آ سکتے ہیں۔ ابھی آپ یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں غنیمت ہے کہ انہوں نے آپ کو اتنی لمبی رسی سے باندھنا ضروری سمجھا یہ کہہ عمارت کے عقبی حصے اور تیسری منزل پر واقع ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ کھڑکی سے رسی باندھی جائے تو وہ آپ کو زمین تک پہنچا دے گی۔ اس کے علاوہ یہ ریوالور ہے۔ جو آپ کو اپنی حفاظت میں مدد دے سکتا ہے۔ بس میں اتنا ہی

لیکن قابل غور سوال یہ تھا کہ مجھے بے ہوش کر کے اپنی اور میری رقم پر قبضہ کرنے کے بعد انہوں نے مجھے یہاں بند کرنا کیوں ضروری سمجھا۔ اس کمرے کے بجائے اگر وہ مجھے شہر کے کسی فٹ پاتھ یا کسی پارک وغیرہ میں ڈال دیتے تو میں ان کا کیا باگا ڈسکتا تھا۔ ظاہر تھا کہ مجھے نہ اس عمارت کا کوئی پتہ معلوم تھا اور نہ اب تک اس ڈرامے میں حصہ لینے والے کرداروں کے بارے میں کچھ جانتا تھا۔ پھر انہیں میری ذات سے ایسا کیا خطرہ محسوس ہوا کہ مجھے گرفتار کرنا ضروری سمجھا اور یہ کہ اب آئندہ میرے بارے میں ان کے کیا ارادے ہیں۔۔۔

میں اس مسئلے پر سوچ ہی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور نوشابہ بڑے محتاط انداز میں اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر مجھے کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ دشمن کے کمپ میں اگر کوئی میری مدد کر سکتا ہے تو وہ یہ ہی حسین لڑکی ہے۔ آہٹ سن کر میں آنکھیں بند کرنے اور بدستور بے ہوش ظاہر کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ مگر اسے دیکھ کر یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس نے بھی دروازہ اندر سے بند کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا کہ میں ہوش میں آچکا ہوں۔ وہ دبے پاؤں میرے قریب آئی۔

رسی کھولنے میں کچھ دیر لگی مگر وہ مصلحت جس کے پیش نظر اس نے میری بندشیں کاٹنے کے بجائے کھولنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ اپنے منہ پر لگا ہوا شپ میں نے خود ہی ایک جھلکے سے الگ کر دیا۔

”وہ لوگ آپ کو ختم کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔“ اس نے سرکشی میں کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ اس مصیبت میں گرفتار ہوئے۔ آپ کو رہا کر کے میں خود اپنی زندگی کے لیے خطرہ مول لے رہی ہوں۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اگر وہ لوگ آپ کی جان لینے

کر سکتی تھی۔“

میں کسی معمولی چوٹ کا بھی خطرہ مول لیے بغیر کود سکتا تھا۔

یہ ایک تنگ تاریک گلی تھی۔ نیم تاریک اس لیے کہ گلی کی اپنی کوئی روشنی نہیں تھی۔ صرف عمارت کی کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر آنے والی روشنی نے اندھیرے کو اس حد تک ضرور کم کر دیا تھا کہ ٹھوکر کھائے بغیر گلی پار کی جا سکتی تھی۔ ابھی تک عمارت میں کوئی ہنگامہ اٹھتا معلوم نہیں ہوا تھا۔ اس لیے یہ بی سوچا جا سکتا تھا کہ وہ لوگ ابھی میرے فرار سے واقف نہیں ہوئے۔ گلی سے نکل کر ایک بڑی لڑکی پر آیا۔ میں نے گہری سانس لی اور شہر کی جانب چل دیا۔

نوشاہ اپنے وعدے پر پوری اتری۔ اگرچہ جب وہ یہ بات کہہ رہی تھی تو مجھے کچھ زیادہ یقین نہیں تھا لیکن وہ ٹھیک دو بجے میرے بنگلے پر پہنچ گئی۔ اس کے خیال میں یہ ٹائم اس لیے محفوظ تھا کہ اس کی اپنی ڈیوٹی پانچ بجے سہ پہر سے شروع ہوئی تھی اور رات کے تین بجے تک جاری رہتی تھی۔ میں اسے ڈیڈی کے اسٹڈی روم میں لے کے گیا اور مولا داد کو ہدایت کر دی کہ خواہ کوئی بھی ملے آئے کہہ دے کہ میں اس وقت گھر میں موجود نہیں ہوں اور نہ یہ معلوم ہے کہ کہاں گیا ہوں۔ یا کب واپس آؤں گا امریکہ سے واپسی کے بعد پہلا موقع تھا کہ کوئی لڑکی بلکہ کوئی خوب صورت لڑکی مجھ سے ملنے آئی تھی۔

مگر مولا داد نے کوئی حیرت ظاہر نہیں کی ممکن ہے وہ ڈیڈی سے میرے بارے میں سنتا رہا ہو یا پھر اس نے سوچا ہو کہ امریکہ میں دو برس رہ کر آیا ہے ابھی تک پیر شادی شدہ ہے۔ اس سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے یا شاید اس نے کچھ سمجھ داری سے کام لیا ہو۔ بہر حال اس نے بڑی سنجیدگی سے سر ہلایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

اب میں نوشاہہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے پاس وقت کم تھا یا اسے یہ اندیشہ تھا کہ ممکن ہے وہ

اس نے اعشاریہ 38 بور کا ایک کولٹ ریوالور میرے ہاتھ میں دے دیا۔ مگر میں نے اس وقت تک جانے پر آمادگی ظاہر نہ کی جب تک نوشاہہ نے دوسرے دن میرے بنگلے پر آ کر ملنے کا وعدہ نہیں کر لیا۔ وہ میرے بنگلے کا پتہ جانتی تھی اور ظاہر تھا کہ ان حالات میں ہمارا کسی عام کلب یا پبلک مقام پر ملنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ واپس چلی گئی اور جاتے ہوئے باہر سے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ جیسا کہ اس کے کہنے کے مطابق پہلے گئی ہوئی تھی۔

اختیار کے آدمیوں نے قفل لگانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ میں نے اس کے جاتے ہی کھڑکی کھولی اور چچی کے کمرے میں رسی باندھی خوش قسمتی سے رسی نائیلون کی ہونے کی وجہ سے کافی پتلی مگر بے حد مضبوط تھی ورنہ مجھے کوئی باندھنے کی جگہ تلاش کرنا مشکل ہو جاتا۔ پھر میں نے اپنا کولٹ اتار کر اسے الٹا یعنی پشت کا حصہ آگے کی جانب کر کے اس طرح پہنا کہ آستینیں ہاتھوں سے آگے نکلی رہیں اور نائیلون کی پتلی رسی پکڑ کر نیچے اترنے یا پھسلنے میں میرے ہاتھ زخمی نہ ہوں۔

ابھی تک کوئی ایسا تجربہ تو نہیں ہوا تھا۔ البتہ طالب علمی کے زمانے میں جب میں ڈیڈی سے چپ کر فلموں کا سیکنڈ شو دیکھنے جاتا تھا تو ایک رسی کی مدد سے اپنے کمرے سے نیچے اترنے اور پھر دوبارہ چڑھنے کی کافی مشق حاصل تھی۔ شاید وہی مشق اس وقت کام آ رہی تھی اور میں کسی خاص دشواری کے بغیر نیچے اترتا بلکہ کہتا جا رہے کہ پھسلنا چلا گیا۔ عمارت میں جتنے بھی کمروں کی کھڑکیاں اس جانب تھیں ان میں سے کوئی بھی ملتی ہوئی نہیں تھی۔ اس لیے کسی نے بھی مجھے اترتے نہیں دیکھا۔ رسی کے بارے میں نوشاہہ کا اندازہ قریب قریب درست ہی نکلا وہ زمین تک تو نہیں پہنچی مگر مجھے اتنے فاصلے تک ضرور اتار دیا۔ جہاں سے

مکان فروخت کرنے کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں۔

پھر ایک دن امتیاز اپنے قرض کی وصولی کے لیے قرتی لے کر آ پہنچا اس دوران اس کے والد کی حالت خراب تھی۔ پیسہ پاس نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی خوراک نہیں خرید سکتے تھے۔ وہ نئے بازوؤں کو جب ان کی مطلوبہ خوراک دستیاب نہ ہو یا وہ اسے خریدنے سے قاصر ہوں تو ان کی کیسی بری حالت ہو جاتی ہے۔ یہ کوئی منشیات کا عادی شخص ہی جان سکتا ہے۔ امتیاز قرتی لے کر آیا تھا۔ مگر اسے دیکھ کر وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے پیش کش کی کہ اگر نوشاہہ اس کی مرضی کے مطابق کام کرنا منظور کر لے تو وہ نہ صرف تمام قرض معاف کر سکتا ہے۔ بلکہ اس کے والد کو بھی چرس کی ایک خوراک روزانہ فراہم کر سکتا ہے اور اگر نوشاہہ نے ہوشیاری اور وفاداری سے کام لیا تو اس کی خدمات کا معقول معاوضہ بھی دیا جائے گا۔ جس سے وہ بہ آسانی اپنی گزراوقات کر سکے گی۔ نوشاہہ نے صرف ایک شرط عائد کی کہ اسے جسم فروشی پر آمادہ نہ کیا جائے اور امتیاز نے یہ شرط منظور کر لی۔ تب سے وہ اس کے گروہ میں کام کر رہی ہے اور اب اس حادثے کو تقریباً تین سال گزر چکے ہیں۔ امتیاز نے اس سے مختلف کام لیے۔ کلب کے ریسپشنسٹ کاؤنٹر پر بھی بٹھایا اور منشیات گاہکوں کو فراہم کرنے کا ذریعہ بھی بنایا۔ اب لگ بھگ ایک برس سے وہ دولت مند احمقوں کو کھانسنے کا قرار خانے تک لے جاتی ہے۔ نوشاہہ مجھے اس کی پوری تفصیل بتانے لگی تھی۔ مگر میں نے اسے روک دیا اور مسکراتے ہوئے بتایا کہ میں اتنا اندازہ لگا چکا ہوں کہ اس طرح بھانسنے کے پروگرام کا آغاز پروفیسر ڈان زان محل کی آمد سے شروع ہوتا ہے۔

نوشاہہ نے حیرت اور تعریف کے ملے جلے انداز سے میری طرف دیکھا اور چند لمحے ٹھہر کر

اپنی بات پوری نہ کر سکے کہ اس نے کسی تمہید کے بغیر آغاز کلام کر دیا۔ پہلے اس نے بتایا کہ گزشتہ رات میرے فرار کے دو اثرات مرتب ہوئے۔ پہلا تو یہ کہ امتیاز مجھے غیر معمولی طور پر ذہین اور چالاک خیال کرنے لگا ہے اور اپنے گروہ سے ایک آدمی کو حکم دیا ہے کہ میرے بارے میں جملہ معلومات فراہم کی جائیں۔

دوسرے یہ کہ اسے کچھ شبہ ہو گیا ہے کہ اس کے اپنے گروہ میں ظہیر الدین کا کوئی جاسوس کام کر رہا ہے۔ بہر حال غنیمت ہے کہ اسے کسی بھی طرح نوشاہہ پر شک نہیں ہوا۔ پھر اس نے اپنے متعلق بتایا کہ اس کا تعلق ایک شریف اور عزت دار خاندان سے ہے۔ اس کے والد ایک بڑے بزنس مین تھے۔ انہوں نے اس کی ماں سے اپنے خاندان کی مرضی کے خلاف محبت کی شادی تھی۔

چنانچہ خاندان کے دیگر لوگوں نے ان سے تعلقات ختم کر دیے مزید بد قسمتی یہ ہوئی کہ اس کی والدہ شادی کے دوسرے سال ہی اس کی پیدائش کے وقت کسی چھپیدگی اور کیس بکڑ جانے کی وجہ سے انتقال کر گئیں۔ ان کی موت کا والدہ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ غم غلط کرنے کے لیے پہلے شراب اور پھر چرس کے عادی ہو گئے۔ اس کی پرورش، تعلیم و تربیت اس کی بیوہ خالہ نے کی مگر جب تک وہ سن شعور تک پہنچی۔ اس کے والد کا کاروبار ہتھوڑا ہوا ہو چکا تھا۔ اپنی لت پوری کرنے کے لیے انہوں نے ذاتی اور موردنی جائیداد فروخت کرنا شروع کر دی اور ابھی وہ پورے بیس سال کی بھی نہیں ہوئی تھی اور تھرڈ ایئر کی طالبہ تھی کہ تمام جائیداد بھی نئے کی بھینٹ چڑھ چکی تھی۔

صرف وہ چھوٹا سا مکان رہ گیا تھا۔ جہاں وہ اور اس کی خالہ سر چھپائے بیٹھی تھیں۔ والد ہزاروں کے نہیں لاکھوں کے مقروض ہو چکے تھے۔ مگر اتنا ہوش ان کو باقی تھا کہ انہوں نے وہ

وہاں شب و روز ہر قسم کے مجرمانہ اور غیر قانونی کام ہوتے رہتے ہیں۔ مختلف قسم کا جوا ہونے کے علاوہ وہاں بڑے بڑے پیمانے پر فاشی بھی ہوتی ہے۔ ایک حصہ ایسا بھی ہے۔ جہاں اوجھی سوسائٹی کے لوگ جو کسی نہ کسی نشے کے عادی ہیں۔ بڑے راز دارانہ طریقے پر آتے ہیں اور شاندار سچے سچائے آرام دہ کمروں میں کئی کئی دن نشے کے عالم میں مدھوش پڑے رہتے ہیں۔ وہاں اسمگلنگ کا اڈا بھی ہے۔ جہاں مال بیچتے اور خریدنے والے دونوں خفیہ طریقوں پر ملاقاتیں کرتے ہیں اور روزانہ لاکھوں کا ہیر بھیر ہوتا رہتا ہے۔

میں نے نوشاہہ کو بتایا کہ مجھے خوا خواہ خدا کی فوجدار بننے کا کوئی شوق نہیں ہے لیکن امتیاز نے مجھ پر ہاتھ ڈال کر اچھا نہیں کیا۔ اب میں نے اس سے انتقام لینے اور نوشاہہ کو اس کی قید سے آزاد کرانے کے لیے کوئی دقیقہ نہیں رکھوں گا۔ خاص طور سے اس حقیقت کے پیش نظر کہ امتیاز کا ارادہ بھی مجھے اکیلا چھوڑ دینے کا نہیں معلوم ہوتا اسی لیے اس نے اپنے آدمیوں کو میرے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا حکم دیا ہے اور قلعہ بندی ہے۔ نیز یہ کہ آئندہ نوشاہہ کا میرے بچنے پر آنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ ملاقات اگر دن کے اوقات ہی میں ہو سکتی ہے تو ہم گاہے گاہے ضرور ملیں گے۔ یہ دوسری جو بات سے بھی ضروری ہے لیکن ہر مرتبہ کسی نئے اور مصروف مقام پر۔

اس کے بعد بھی میں اور نوشاہہ ملتے رہے۔ میں اس سے امتیاز کے بارے میں جو کچھ اسے معلوم تھا پوچھتا رہا لیکن خود اسے اپنے منصوبے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ پندرہ بیس دن تک میں اسے اپنے پلان کے بارے میں سوچتا اور اس کی ہر چھوٹی بڑی تفصیل پر غور اور اسی مناسبت سے اس کی تیاری کرتا رہا۔ یہ ظاہر تھا کہ اگر میں واقعی امتیاز اور اس کے گروہ کو تباہ و برباد

دوبارہ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ وہ اب تک بے شمار احمق دولت مندوں کو جن میں نوجوان اور ادھیڑ عمر دونوں ہی شامل ہیں ممتاز خانے لے چا چکی ہے۔ اس کا ضمیر شروع سے ہی اسے امتیاز کا آلہ کار بننے پر ملامت کرتا رہا ہے لیکن اپنے والد کی نشے کی عادت اور پھر گزر اوقات کے لیے ایک ذریعہ آمدنی کی مجبوری کے باعث وہ امتیاز کے اشاروں پر جلتی رہی ہے۔ ویسے امتیاز نے بھی اپنے کیے ہوئے وعدے کا پوری طرح لحاظ رکھا ہے۔ آج تک بھی اسے اسکی مرضی کے خلاف کسی بات پر مجبور نہیں کیا گیا۔ اتنا ہی نہیں۔ وہ خود اور اس کے گروہ کا ہر آدمی اس کے ساتھ بڑی شرافت سے پیش آتا رہا ہے۔ نیز یہ کہ اب امتیاز اسے پانچ ہزار ماہانہ معاوضہ بھی ادا کرتا ہے۔ جو اس کی بوڑھے والد اور بیوہ خالہ کی گزر بسر کے لیے کافی سے زیادہ ہے۔

جب مجھے پھانسنے کے لیے جال بچھایا گیا تو وہ جاوید عزیز کے ساتھ پہلی مرتبہ کلب میں مجھ سے ملاقات کے بعد ہی سے میری شخصیت سے کافی متاثر ہوئی تھی۔ اس کا دل مجھے دھوکہ دیتے ہوئے کچھ زیادہ ہی ملامت کر رہا تھا لیکن پھر بھی وہ میرے لیے شاید اپنے آپ کو خطرے میں نہ ڈالتی لیکن شاید کلب میں جو کچھ ہوا اور اس کے بعد جب امتیاز اور اس کے آدمیوں نے مجھے قتل کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کا ضمیر ٹپ اٹھا اور اس نے میری مدد کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ مجھے معلوم ہی تھا۔ میں نے نوشاہہ سے اس عمارت کے بارے میں سوالات کیے۔ جو شہر کی ایک ماڈرن سوسائٹی کے علاقے میں واقع تھی۔ اس نے بتایا کہ بظاہر وہ عمارت ایک جدید طرز کا بورڈنگ اور لاجنگ ہاؤس ہے۔ جہاں صرف لوگوں کو دکھانے اور قانون کو دھوکہ دینے کے لیے امتیاز کے سامی شریف اور معزز کرائے داروں کے گھیس میں رہتے ہیں لیکن حقیقت میں

کچھ دیر کے بعد ایک اور لمبی داڑھی والے صاحب اندر سے نمودار ہوئے میں انہیں ایس پی صاحب سمجھ کر سلام کرنے ہی لگا تھا کہ چوکیدار نے بتایا کہ یہ صاحب کا خانساں ہے۔ میں اس کے ذریعے آپ کے آنے کی اطلاع کرائے دیتا ہوں۔ خانساں چوکیدار سے کچھ گفتگو کرنے کے بعد اندر واپس گیا تو میرے سوال کے جواب میں چوکیدار نے کہا کہ اس کا نام کریم بخش ہے۔ کبھی فرید کالونی کے تھانے میں کانسٹیبل ہوا کرتا تھا۔ کسی چکر میں پھنس کر ملازمت سے نکالا گیا تو صاحب نے ملازم رکھ لیا۔

نقریاً دس منٹ کے بعد اندر سے میری طبی ہوئی۔ کریم بخش مجھے اپنے ساتھ جس کمرے میں لے گیا وہاں ایک سفید باریش بزرگ جائے نماز پر بیٹھے۔ ایک دوسرے باریش کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انداز گفتگو سے ظاہر ہوا کہ ان میں سے ایک بزرگ سابقہ ایس پی شیر جنگ ہیں اور دوسرے مولانا ان کے سیکرٹری ہیں۔ جنہیں ایس پی صاحب اپنی وسیع دیکھی اراضی کے متعلق کچھ ضروری احکامات دے رہے تھے۔ سیکرٹری صاحب سر ہلاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ تو میں نے ایس پی صاحب سے اپنا تعارف کرایا۔ وہ میرے والد مرحوم کا نام سنتے ہی اتنے جوش میں آئے کہ مغلے سے اٹھ کر بغل گیر ہوئے اور کالی دیر تک ہوتے رہے۔

خیر و عافیت کے موضوع پر باتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو میں نے اپنی آمد کا مدعا عرض کیا۔ ایس پی صاحب بڑی سنجیدگی اور خاموشی کے ساتھ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے رہے اور گاہے گاہے سر ہلاتے ہوئے میری گزارشات سنتے رہے۔ پھر اٹھے۔ میز کی دراز سے ایک رائیٹنگ پیڈ نکال کر اس پر کچھ لکھتے رہے۔ پھر وہ کاغذ پیڈ سے چھڑ کر بڑی ہی احتیاط، نفاست سے تہہ کر کے ایک سادہ لفافے میں رکھا۔ لفافے پر کسی انکسٹر جمال بیک کا

کرنا چاہتا ہوں۔ کہ اس کے بغیر نوشاہہ کو ہر خطرے سے آزادی نہیں مل سکتی تھی تو اس کے لیے مجھے لازماً قانون کی مدد لینا ہوگی مجھے یاد تھا کہ ڈیڈی کے دوستوں میں کئی اعلیٰ پولیس افسران بھی شامل تھے۔ ان میں سے ایک ایس پی شیر جنگ صاحب کا نام ابھی تک میری یادداشت میں موجود تھا۔ مگر اس بات کو خاصا عرصہ گزر چکا تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ شیر جنگ صاحب اب بھی پولیس کے محکمے میں موجود ہوں گے۔ ان کا ریٹائرمنٹ ہی نہیں بلکہ خود ان کا مرحوم ہونا بھی غیر متوقع نہیں تھا۔ پھر بھی دریافت حال میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ چنانچہ ایک دن میں پولیس ہیڈ کوارٹر جا پہنچا کتنے ہی کمرے جھانکنے کے اور کافی سے زیادہ سرخ فیتے کی پیمائش کے بعد مجھے بتایا گیا کہ ایس پی شیر جنگ ریٹائر ہو چکے ہیں اور میں ضرور ہی ان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں تو میر بلاک میں فلاں نمبر کی کٹھی پر پہنچ جاؤں۔ ایس ایس پی صاحب کا موڈ ہوا تو شرف ملاقات حاصل ہو جائے گی۔

میں تلاش کرتے کرتے منزل مقصود پر پہنچا تو عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت تھا گیٹ پر ایک باریش چوکیدار سے دعا سلام ہوئی میں نے بتایا کہ میں ایس پی صاحب کے مرحوم دوست سیٹھ احمد شاہ درانی کا بیٹا ہوں اور ایک ضروری کام کے سلسلے میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ چوکیدار نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سیج کے دانے شمار کرتے ہوئے بتایا کہ صاحب عصر کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ جس سے ٹھیک چھ بجے فارغ ہوں گے میں چاہوں تو انتظار کر سکتا ہوں۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ چھ بجتے میں دس منٹ باقی تھے۔ چنانچہ میں وہیں چوکیدار کے پاس ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ وقت گزاری کے لیے بائیں کرنے لگا۔ تو انکشاف ہوا کہ موصوف ریٹائرڈ ہیڈ کانسٹیبل ہیں۔

غزلیں

اعتبار ساجد

ہر اک رہو، ہر اک رہ گیر کو زنجیر کیا کرنا
آنا کے نام پر ہر شخص کو تسخیر کیا کرنا

خبر اس گھر کی بھی لینی ہے جس کی چھت شکستہ ہے
فقط خوابوں میں اک قصرِ حسیں تعمیر کیا کرنا

بہت کافی ہے سن لیتا ہیں دیواریں مرے ڈکڑے
سنا کر حال دل ہر شخص کو دلگیر کیا کرنا

ہمیشہ جس کو عزت دی سر آنکھوں پر بٹھایا ہے
ذرا سی بات پر اب اس کو بے توقیر کیا کرنا

اسی کنیا میں رہتا ہے ابھی کل جائیں گی آنکھیں
تو پھر لے کر تمہارے خواب کی جاکیر کیا کرنا

وہی رکھتی ہے آشفٹ سری جو اُن کا شیوہ تھی
دفا میں کام کوئی بھی خلاف میر کیا کرنا

غالب عرفان

تسم ہے اس بل کی جب تجھے میں نے دیکھا دیوانہ دیکھا
وجود سے ماورا بھی تجھ کو خیال کے آر پار دیکھا

نظر پڑی ہے جہاں بھی تم پڑو صرف زلفوں کا ذکر ہی کیا
تمہارے ملبوس پر بھی میں نے ہواؤں کا اعتبار دیکھا

سحر سے پہلے مہکنے والی وہ شب کہیں لوٹ کر نہ جائے
تھی ہوئی شام نے جو میرا کبھی درِ انتظار دیکھا

نام لکھا اور لفظ مجھے دیتے ہوئے ہدایت کی کہ
میں مکتوبہ الیہ سے کل ہی ملاقات کروں۔ وہ جو
کچھ بھی کر سکے گا۔ ضرور کرے گا کیونکہ عنقریب وہ
ان کا داماد بننے والا ہے میں نے شکریہ ادا کیا اور
رخصتی کی اجازت چاہی چلتے چلتے ایک یوں ہی
خیال سا آیا اور میں نے ایس پی صاحب سے ان
کے سیکرٹری کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔ میرا
اندازہ درست تھا۔ وہ ایک سابقہ ایس ایچ او
تھے۔

☆☆

پولیس ہیڈ کوارٹر میں انسپٹر جمال بیک نے
شیر جنگ صاحب کا نام سنتے ہی بڑی گرمجوشی سے
میرا استقبال کیا۔ مگر لفظانے کے اندر رکھا ہوا خط
پڑھ کر ان کا چہرہ اتر گیا۔ مسکراہٹ جاڑوں کی
دھوپ کی طرح چمکی پڑ گئی۔

”کیا بات ہے۔ جمال بیک صاحب!“
میں نے پوچھا۔ ”آپ کس سوچ میں ڈوب
گئے۔“

”کیا عرض کروں ناصر شاہ صاحب!“ وہ
ایک گہری سانس لے کر بولے۔ ”آج کل میں
ایک انتہائی پیچیدہ کیس میں الجھا ہوا ہوں۔ نوشاد
رائی نامی ایک بہت بڑے اسمگلر کی تلاش کی
ذمے داری مجھ پر ڈال دی گئی ہے۔ یہ ایک
انتہائی خطرناک بین الاقوامی اسمگلر ہے جو ناجائز
منشیات خاص طور سے ہیروئن کی بڑے پیمانے پر
اسمگلنگ کرتا ہے۔ انٹر پول تک اسے پکڑنے میں
ناکام رہی ہے۔ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے
کہ اس کا ہیڈ کوارٹر ایک بڑے شہر میں کہیں واضح
ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ اپنے خفیہ مجسروں کی
اطلاعات پر پولیس نے مختلف افراد اور مقامات پر
چھاپے مار کر گزشتہ ایک سال میں ہیروئن کی چھٹی
بڑی مقدار پکڑی ہے۔ اس نے تمام گزشتہ ریکارڈ
توڑ دیے۔“

مگر ان تمام کامیاب چھاپوں کے باوجود

اونچی سوسائٹی میں اٹھنا بیٹھنا ہے۔ اونچے کلبوں اور ایک دو خفیہ قمار بازی کے اڈوں پر ان کی آمد و رفت ممکن ہو سکتی ہے۔ مگر ابھی تک ان کے خلاف پولیس کے پاس جرائم پیشہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے کا کوئی ریکارڈ یا کوئی اطلاع نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ایک مقتدر شخصیت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کریں اور بعد میں کف افسوس ملنا پڑے۔ کسی غلطی کی صورت میں آپ کا جو حشر ہوگا۔ وہ تو ہو گا ہی مگر آپ سے تعاون کی پاداش میں، میں بلاوجہ مشکل میں چھس جاؤں گا۔“

”آپ اطمینان رکھیں۔“ میں بولا۔ ”میں بلاشبہ کوئی تجربہ کار پولیس آفیسر نہیں لیکن میں نے دو سال تک امریکہ میں وہاں جرائم پیشہ افراد اور ان کی سرگرمیوں کو کافی قریب سے دیکھا ہے میں ہرگز کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے آپ پر کوئی آج آئے۔ اس کے علاوہ مجھے اپنی موجودہ زندگی اور اس کے مفادات بھی بے حد عزیز ہیں میں اس قاضی کے فیصلے سے بھی نہیں ہوں جو شہر کے اندیشے میں دبلا ہوا کرتا ہے۔ آپ یقین رکھیں آپ تک تو بات بعد میں پہنچے گی۔ اس سے پہلے اگر مجھے اپنے لیے کوئی حقیقی خطرہ محسوس ہوا تو بغیر شرمندہ ہوئے بھاگ کھڑا ہوں گا۔“

انسپکٹر جمال بیک مسکرانے لگے۔ غالباً اب انہیں کچھ اطمینان ہو گیا تھا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ اگر میں نے اسی محتاط سوچ اور طرز عمل سے کام لیا تو ضرورت پڑنے پر وہ ہر ممکن تعاون کے لیے آمادہ ہیں۔ میں ان سے رابطہ قائم رکھوں اور اپنی کارگزاری کی رپورٹ دیتا رہوں گا۔ اس کے لیے انہوں نے مجھے دونوں بھی دیے جس پر ہنگامی حالات یا آفس میں ان کی عدم موجودگی کے بالواسطہ یا بلاواسطہ رابطہ قائم کیا جاسکتا تھا اور اس ملاقات کے تیسرے دن میں اپنے بنگلے سے غائب ہو گیا۔

میں شبہ ہے کہ مجرم اب بھی نامعلوم ذرائع اور وسائل سے ہیر و کن بھاری مقدار میں دو طرفہ طور پر اسمگل کر رہے ہیں۔ فوشاد راہی کا فوٹو اگرچہ پولیس ریکارڈ میں موجود ہے۔ مگر اس کے علاوہ اس کے بارے میں کوئی اور بنیادی معلومات حاصل نہیں ہیں۔ اس کی گرفتاری کے لیے گزشتہ دو سال میں چار ہوشیار اور ذہین آفیسر مقرر کیے گئے مگر وہ تمام جدوجہد کے باوجود کامیاب نہ ہو سکے اور اس کی پاداش میں نہ صرف ان کا کیمیز ریکارڈ خراب ہوا۔ بلکہ انہیں کہیں پر جزیوی معطلی اور تبادلہ وغیرہ کی مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑا۔

اب اس مہم کا قرعہ فال میرے نام پڑا ہے۔ بس خدا ہی ہے جو عزت و آبرو کے ساتھ مجھے سرخرو کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کیس میرے لیے انتہائی اہم ہے اور میں اس میں اس قدر مصروف ہوں کہ کسی اور معمولی مجرم کی طرف توجہ نہیں دے سکتا میں آپ سے صاف انکار کر دیتا۔ مگر آپ سفارش ایسی زبردست لائے ہیں کہ میں سختی میں پڑ گیا ہوں کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔“

”آپ بلاوجہ پریشان نہ ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں نے جو منصوبہ بنایا ہے۔ اس میں بنیادی کردار میرا ہی ہوگا۔ آپ کو صرف اس قدر زحمت دوں گا کہ جب میں کافی ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو آپ میرے بتائے ہوئے مقررہ وقت پر چھاپا مار کر مجرموں کو گرفتار کر لیں۔“

میں نے انہیں امتیاز کے بارے میں کچھ تفصیلات بتائیں انسپکٹر جمال بیک کچھ فکر مند ہو گئے۔

”آپ کے بیان نے مجھے الجھا دیا ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”امتیاز صاحب کوئی بڑے سیاسی لیڈر نہیں لیکن مقامی اور صوبائی سطح پر ان کی کافی اہمیت ہے۔ دولت مند ہونے کی وجہ سے ان کا

انہوں نے وہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ جس پر پہلے بھی عمل پیرا ہو چکے تھے۔ مگر آٹے سامنے ہونے کے باوجود مجھے اعتقاد تھا کہ وہ مجھے ہرگز نہیں پہچان سکیں گے۔ سیٹھ رحیم خان کی اس حیثیت سے میں نے میک اپ ہی ایسا کیا تھا کہ مجھے نہ صرف ان کے بلکہ نوشاہیہ کے بھی شناخت کرنے سے قاصر رہنے کا مکمل یقین تھا۔ چھوٹی سی فریج کٹ داڑھی، ناک پر سنہری فریم کا چشمہ جس کے بغیر پاؤں کے نیلگویشوں کے پیچھے آنکھوں میں سبزی مائل کنٹیکٹ لینس چھپنے لگے، ہاتھوں، بازوؤں، پیروں اور جہاں تک جسم کے کھلنے کا امکان تھا۔ قدرے سانولار رنگ، گالوں کی ہڈیوں پر معمولی سی پڈنگ، یہ سب ایسی چیزیں تھیں جنہیں نے میرا حلیہ کچھ سے کچھ کر دیا تھا۔

ڈان زان مغل نے حسب معمول اپنے کچھ کرتب دکھائے پھر میرے شوق اور مشغلوں کے بارے میں سوال کیا میں نے محض انہیں تھوڑا سا پریشان کرنے کے لیے موسیقی، مصوری، گھڑ سواری اور ایسی ہی کچھ اور چیزوں کا ذکر کیا۔ انہوں نے بار بار پہلو بدلنے کے بعد آخر پوچھ ہی لیا کہ کیا آپ کو فٹس، بوکس، ری می ایسے کھیلوں سے کوئی لگاؤ نہیں میں اچھل پڑا جھٹ سے جواب دیا کہ فٹس پر تو میری جان جانی ہے لیکن میں بڑی بازیاں کھیلتا ہوں۔ انہوں نے گہری سانس لی اور یوں چشمہ بھی ان کے بریف کیس سے باہر آ گیا۔ میں نے کوئی خاص دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ کہا کہ میں ایسی چیزوں کا قائل نہیں۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر ناز ہے کیسا ہی شار پر ہو میرے مقابلے پر آ کر اس کی ساری ترکی تمام ہو جاتی ہے اور بالآخر جیت میری ہی ہوتی ہے۔ مغل صاحب نے چشمے کی افادیت پر مزید کچھ فرمایا اور میں یوں جیسے ان پر کوئی احسان کر رہا ہوں اسے خریدنے پر آمادہ ہو گیا۔ ڈان زان نے سمجھ لیا تھا کہ اس کا ہک سے زیادہ ملنے کی امید نہیں اس لیے انہوں نے دور

☆☆

سوسائٹی کے جس چھوٹے مگر خوب صورت اور ویل فرنڈڈ بنگلے کو میں نے سیٹھ رحیم خان کے نام سے کرائے پر لیا تھا۔ اس میں پہلی ہی شام کو میں نے علاقے کے تمام عزیزین کو ایک تعارفی دعوت پر مدعو کیا اور اپنی افتتاحی تقریر میں بتایا کہ میرے آباؤ اجداد ایک بہت بڑے سیٹھ تھے اور ہندوستان سے ہجرت کر کے افریقہ چلے گئے تھے۔ خدا نے اپنا فضل و کرم کیا اور ہم جو یہاں سے خالی ہاتھ گئے تھے۔ ایک نسل کے بعد ہی آسودہ جالی کے دور میں داخل ہو گئے۔ ہم نے وہاں ہاتھی دانت کی تجارت اور اس کی مصنوعات کو اپنا ذریعہ معاش بنایا اور اب تین چار نسلوں کے بعد ایک مرتبہ پھر پرانی شان و شوکت کے حامل بن گئے۔ ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کی آزاد اسلامی مملکت کے قیام کے بعد ہم لوگ پھر اپنے وطن واپس آنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے میں یہاں حالات کے جائزے اور ابتدائی ضروری انتظامات کے لیے آیا ہوں۔

رفتہ رفتہ باقی اعزاز آتے جائیں گے۔ سردست میں نے رہائش کے لیے آپ کے مہذب تعلیم یافتہ اور معروف کاروباری علاقے کا انتخاب کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ لوگ مجھے ایک اچھا بڑوسی پائیں گے اور جو اب خود بھی اچھے بڑوسیوں کی طرح حقوق مساوات کا پاس رکھیں گے۔ اس کے بعد میں نے فردا فردا ہر مہمان سے تعارف حاصل کیا۔ بعد ازاں لذیذ اور خوش ذائقہ کھانوں اور ایک مختصر سے تفریحی پروگرام کے بعد یہ دعوت اختتام پذیر ہو گئی۔

اس تعارفی تقریب کے بعد میں کسی بھی دن پروفیسر ڈان زان مغل کی آمد کا منتظر تھا۔

اور مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پانچویں دن صبح دس بجے ڈان زان موصوف میرے ڈرائیونگ روم میں موجود تھے۔ ملاقات کے لیے

ہو۔ اپنے کھلونا اور اس وقت میرے ساتھ ڈرائیگ روم میں جو بھی بیٹھا ہو۔ اپنے کھلونا پستول سے اسے پینڈ زاپ کئے اور لیلیٰ دبا دے یہ کھلونا پستول ایسا تھا جس میں پانی بھرا جاتا تھا اور لیلیٰ دبانے پر ایک پتلی سی دھار سامنے والے پر پڑتی تھی۔

میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ جب میں بلاؤں تو وہ پستول میں پانی نہیں بلکہ روشنائی بھر کر لائے۔ بس تھوڑی سی چٹاچٹا عین اسی وقت جب کہ ڈان زان مغل صاحب اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ وہ شوخ لڑکا آیا۔ زان صاحب سے بڑے بارعب لہجے میں پینڈ زاپ کیا اور پککاری چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اب یہ اس کی نشاۃ بازی کی مہارت تھی یا حسن اتفاق کہ روشنائی ڈان زان صاحب کے روئے مبارک پر پڑی جس نے انہیں رویہا کر دیا اور انہیں منہ دھونے کے لیے ہاتھ روم جانا پڑا۔ ان کے جاتے ہی میں نے ان کا بریف کیس گھولا اس میں مٹی چھتے رکھے ہوئے تھے۔ جن میں سے ایک چشمہ بالکل ویسا ہی معلوم ہوا جیسا اس رات چھتے والے نے لگا رکھا تھا اور جسے میں نے توڑ دیا تھا۔ میں نے وہ چشمہ نکال کر محفوظ کر لیا اور اطمینان سے ڈان زان صاحب کے ہاتھ روم سے واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ معذرت وغیرہ میں پہلے ہی کر چکا تھا کہ پڑوس کا یہ بچہ بہت شریر ہے اور میرے معزز مہمانوں کے ساتھ پہلے بھی اس طرح کی شرارت کر چکا ہے۔ پہلے میں نے اسے صرف ڈانٹنا کافی سمجھا تھا۔ مگر اب میں یقیناً اس کے باپ سے شکایت کروں گا کہ وہ اسے مناسب سرزنش کریں۔ کیونکہ آئندہ ایسی کوئی حرکت ناقابل برداشت ہوگی۔

مغل صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد میں نے تاش کی گلدی نکالی۔ وہ چشمہ لگا جو مغل صاحب فروخت کر گئے تھے۔ حسب سابق چٹوں پر نیلے رنگ کے نشانات نظر آنے لگے اس

اندیشی سے کام لیا اور یوں وہ چھتے جو پہلے میں نے اپنے شوق اور انجانے پن میں ایک بڑی رقم دے کر خریدا تھا۔ پانچ سو میں لے لیا۔

اس کے بعد جاوید اور نوسابہ سے بھی ملاقات لازمی تھی۔ مگر یہ ملاقات سابقہ کلب میں نہیں ایک دوسرے کلب میں ہوئی۔ مجھے کم و بیش پہلی ہی داستان سننے کو ملی۔ صرف اس جزوی تبدیلی کے ساتھ اس مرتبہ ان دونوں کی شادی ہو چکی تھی اور مالدار سر نے داماد کو ایک لاکھ نہیں دو لاکھ روپے دے دیے تھے۔ جیسی کہ توقع تھی۔ نوسابہ مجھے نہیں پہچان سکی اگرچہ کسی نامعلوم وجہ سے وہ گاہے گاہے مجھے بڑی گہری نگاہوں سے دیکھنے لگتی تھی۔ جیسے اسے کسی چیز کی تلاش ہو۔ میں نے بڑے پر جوش انداز میں ان کی مدد کا وعدہ کیا اور اس ملاقات کے تیسرے دن رات کے دس بج کر پانچ منٹ پر ایک مرتبہ پھر اسی عمارت میں موجود تھا۔ مگر ایک دوسرے کمرے میں یہ قدرے حیرت کی بات تھی کہ امتیاز نے میرے فرار کے بعد بھی اس اڈے کو بند یا تبدیل نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ کسی نہ کسی وجہ سے اسے یہ اعتماد ہے کہ اول تو یہاں چھاپہ نہیں پڑ سکتا اور پڑ بھی جائے تو وہ اس سے بچ نکلے گا۔ نئے شکار کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر غالباً صرف اس لیے لایا جاتا تھا کہ وہ غیر ضروری طور پر آئے دن کی دردسری مول لینا نہیں چاہتے تھے۔

اس بار میں نے چھتے کے سلسلے میں ایک دوسرا طریقہ کار اختیار کیا تھا۔ جس کا ذکر کرنا میں ڈان زان سے ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے بھول گیا۔ پڑوس کے ایک شریر بچے کو جو ہر وقت گلی میں کھیلتا رہتا تھا اور جس کی عمر آٹھ دس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے بیل گم کے ایک پورے پیکٹ کا لالچ دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ جب بھی اسے بلاؤں وہ آجائے اور اس وقت میرے ساتھ ڈرائیگ روم میں جو بھی بیٹھا

غزلیں

ناصر زیدی

ذہن میں اپنے بسا تا' دل کے اندر دیکھتا
میں تصور میں تیری تصویر اکثر دیکھتا

اور تو کچھ بھی نہیں بس ایک خواہش ہے مری
سامنے تجھ کو بٹھاتا ، زندگی بھر دیکھتا

یہ بھی اچھا تھا کہ ان آنکھوں میں بیٹائی نہ تھی
کس طرح اُس سے بچھڑ جانے کا منظر دیکھتا

اُس کو ہی ادراک ہو جاتا کہ کیا ہے اکھب غم
قہتہوں میں جو بٹھپا تھا وہ سمندر دیکھتا

زندگی دیتی اگر فرمت تو ناصر ایک دن
جس قدر دیکھا ہے اس کو اس سے بڑھ کر دیکھتا

ڈاکٹر پرویز احمد

بند بجرے سے ڈر گیا ہر ہر

سچ سے ایسے مکر گیا ہر ہر

دیکھ کر پرکھنے پرندوں کو

اپنے ہونے سے ڈر گیا ہر ہر

کاش رکھتا نہ سر پہ تو کفنی

دیکھ تیرا بھی سر گیا ہر ہر

چوٹ لپی ہے اس لیے یارو

بات لپی سی کر گیا ہر ہر

☆☆

کے بعد میں نے وہ چشمہ ناک پر رکھا جو خود اڑایا
تھا۔ اب جو چٹوں پر نظر ڈالی تو چودہ طبق روشن
ہو گئے۔ اسی گڈی کے ہر پتے پر دوسرے خفیہ
نشانات بھی تھے جو غلط نہیں سہی مائل تھے اور ان
سے ہر پتے کی بالکل صحیح قدر و قیمت کا اظہار ہو رہا
تھا۔ دونوں بلکہ تینوں چشموں کے فریم کا ڈیزائن
یکساں تھا۔ رنگ مختلف تھے۔ وہ جو خریدے
تھے۔ کتنی رنگ کے تھے اور جو اڑایا تھا اس کا
فریم کالے رنگ کا تھا۔ ایک اور نازک سا فرق
بھی تھا۔ میرے چشموں کے شیشوں کا رنگ ہلکا
قرمزی تھا۔ جبکہ کالے فریم کے شیشے نیلگوں تھے۔
دونوں رنگ اتنے ہلکے تھے کہ دن میں تو آسانی
سے نظر آ جاتے تھے۔ مگر رات کے وقت بجلی کی
روشنی میں انہیں دیکھنا تقریباً ناممکن تھا۔ میں
دوسرے دن ایک عینک سازی دکان پر گیا اور
کالے فریم والے چشمے کے شیشے نکلا کر اپنے
خریدے ہوئے چشمے میں لگوا لیے۔

یہ داستان ابھی یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک
بار پھر اسی عمارت میں لے جایا گیا۔ جہاں پہلے جا
چکا تھا لیکن کمرہ وہ نہیں تھا۔ دوسرا تھا۔ کام یہاں
بھی وہی ہو رہا تھا۔ چار پانچ میزوں پر بازیاں
جھی ہوئی تھیں اور یہ شاید اتفاق تھا کہ ایک میز پر
امتیاز بھی چشمہ لگائے ٹھیل میں مصروف تھا۔
یہاں بھی ایک نگران میز کرسی ڈالے سب سے
الگ بیٹھا تھا۔ مگر اس کا انداز سابقہ نگران سے
زیادہ پر اعتماد تھا۔ مجھ سے اس کا تعارف شوکت
خان کے نام سے کرایا گیا۔

کمرے کے ایک گوشے میں دو میز خالی
تھیں شوکت خان نے ان کی جانب اشارہ کرتے
ہوئے بیٹھنے کی دعوت دی۔ مگر میں امتیاز کی میز کی
طرف بڑھ گیا۔ قریب پہنچ کر متوجہ کیا اور کہا کہ
آپ شہر کی معروف شخصیت ہیں میں حال ہی
یورپ سے آیا ہوں۔ اس کے باوجود آپ سے
غائبانہ تعارف ہو چکا ہوں۔ کیا آپ مجھے پہچانے کا

لاکھ ہارے اور پھر اپنی لائی ہوئی رقم میں سے بھی تقریباً پچھتر ہزار امتیاز کے سامنے پڑے ہوئے ڈھیر میں شامل کر دے۔ اس موقع پر میں نے پہلی مرتبہ جب سے سگریٹ کیس اور لائٹر نکالا۔ گویا اپنے اعصاب کو تباہی کے نشے سے تسکین دینے کی متوقع کوشش کی لیکن میری یہ حرکت اس سے کہیں زیادہ اہم سمجھی گئی نظر اُٹھ کر نظر آ رہی تھی۔

چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ٹھکانہ شوکت خان کی میز پر رکھے ہوئے فون کی کھنٹی بجی اس نے ریسیور کان سے لگایا کچھ سا اور چند الفاظ میں کچھ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ اٹھ کر امتیاز کے پاس آیا۔ اس کے دائیں کان میں سرگوشی کی انتہا نے سر ہلایا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔

شوکت خان نے بلند آواز میں کمرے میں موجود افراد کو اپنی جانب متوجہ کیا اور بتایا کہ حضرات پولیس نے عمارت پر چھاپہ مارا ہے۔ مگر گھبرانے کی اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ سب شہر کے معززین ہیں۔ ہم آپ پر کوئی آج نہیں آنے دیں گے۔ ایسی ہنگامی صورت حال کا مکمل تدارک ہمارے ہاتھ میں ہے۔ آپ صرف اتنا کریں کہ اپنے اپنے بریف کیس ہمارے حوالے کر دیں۔

سب نے بریف کیس دے دیے شوکت خان نے انہیں کمرے میں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی آہنی الماری میں رکھا۔ وہیں بجلی کے سوچ بورڈ پر لگے ہوئے ایک بٹن کو دبایا دیوار کا ایک حصہ الماری سمیت دوسری جانب مھوم گیا اور پہلی الماری کی جگہ ایک دوسری اسی طرح کی الماری سامنے آ گئی۔ اسی کے ساتھ میز پر بیٹھا ہوا اسی کا ایک آدمی اٹھامیز کو کچھ کہا پھر اسے دبایا۔ اس کے پائے چھوٹے ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ جو میز ٹین فٹ اونچی تھی۔ اس کی اونچائی انچوں میں باقی رہ گئی۔

شوکت خان نے سوچ بورڈ میں لگا ہوا دوسرا

موقع دے کر عزت افزائی کریں گے۔ امتیاز نے مجھے غور سے دیکھا۔ اٹھ کر ہاتھ ملایا اور مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ آپ دوسری میز پر تشریف رکھیں میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

میں جاوید عزیز اور نوشاہہ خالی میز پر بیٹھ گئے۔ چند منٹ بعد امتیاز بھی آ گیا۔ دو افراد اور بھی نمودار ہوئے اور خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنے بریف کیس سے بالکل نئی کرنسی نوٹوں کی گڈیاں نکال کر سامنے رکھیں۔ سیل پیک تاش کی گڈی کھولی گئی اور کھیل شروع ہو گیا۔ مجھے ہر پتے کے سرخ نشانات بالکل صاف نظر آ رہے تھے اور وہ پتوں سے پوری مطابقت رکھتے تھے۔ ایک دو بازیاں مجھے دانستہ جیتے کا موقع دیا گیا۔

پھر امتیاز نے سنبھالا لیا اور اچھے پتوں پر بڑی بڑی رقموں کی چالیں چلنے لگا مگر ظاہر تھا کہ میں بھی اس کے پتے پڑھ رہا تھا۔ اس لیے جب بھی اس کے ہاتھ میں بڑے پتے آتے تھے۔ میں مقابلے سے دستبردار ہو جاتا تھا اور جب میرے پاس اچھے اور اس کے پاس کمزور پتے ہوتے تھے تو اس کے بلف کھیلنے کے باوجود کبھی شو نہیں کراتا تھا اور چال پر چال چلتا رہتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میں بعد کی زیادہ تر بازیاں بھی جیت کر مجموعی اعتبار سے اپنی رقم میں ایک لاکھ سے اوپر کا اضافہ کر چکا تھا۔ یہ صورت حال امتیاز کے لیے ناقابل قبول تھی۔ وہ قدرے حیرت زدہ سا نظر آ رہا تھا۔ گاہے گاہے غور سے مجھے اور پھر میرے جیسے کود کھینے لگتا تھا۔

بالآخر اس نے شارپنگ اور پتے بازی شروع کر دی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ متواتر جیتنا میرے پلان میں شامل نہیں تھا۔ ہارنا اس لیے ضروری تھا کہ میرے تمام نوٹ نشان زدہ تھے جنہیں بعد میں برآمد کر کے بطور ثبوت استعمال کیا جانا تھا۔ چنانچہ میں نے ان کی چالوں کا کوئی توڑ نہیں کیا اور ہارنے لگا پہلے وہ جیتے ہوئے لاکھ سوا

کے محاصرے میں ہے اور میں ہر کمرے کی تلاشی لیتا چاہتا ہوں۔“

”کس نے آپ کو غلط رپورٹ دی ہے۔“

شوکت خان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”یہاں صرف شریف کرائے دار رہتے ہیں۔ جو زندگی کے مختلف شعبوں سے منسلک ہیں۔ رہی تلاشی کی بات تو آپ جس طرح چاہیں اپنا اطمینان کر سکتے ہیں۔“

”یہ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔“ شوکت خان نے ریوالور سے ہم سب کی طرف اشارہ کیا۔

”ان میں سے کچھ بورڈنگ ہاؤس کے کرائے دار ہیں اور کچھ میرے ذاتی دوست۔“

شوکت خان نے مطمئن انداز میں کہا۔ ”میں نے آج انہیں ایک چھوٹی سی تقریب کے سلسلے میں مدعو کیا تھا۔“

شوکت خان نے پلٹ کر ایک کانٹیل کی طرف دیکھا۔

”نور محمد جاؤ۔ سب انسپکٹر فرید سے کہو کہ وہ مختلف کمروں کی تلاشی لے۔ ہر منزل کا ہر کمرہ دیکھنا سروسٹ ضروری نہیں ہے۔ بشرطیکہ کوئی مشکوک بات یا چیز نظر نہ آئے۔ ابتدائی کارروائی کے نتیجے سے مجھے پندرہ منٹ کے اندر مطلع کیا جائے۔“

کانٹیل نے امینشن ہو کر سیلوٹ کیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ اب جمال بیک پھر شوکت خان کی طرف متوجہ ہوا۔

”کیا یہاں فلیش نہیں ہو رہا تھا۔“ اس نے پوچھا۔

”آپ کو میز پر تاش کے پتے اور نوٹ نظر آرہے ہیں۔“ فیجر نے پہلی مرتبہ ناگواری کا اظہار کیا۔

”ظہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ جمال نے ڈانٹا۔ ”جو پوچھا جائے اس کا جواب دو۔“

بٹن دبایا اور میزوں کی لمبائی چوڑائی کے برابر فرش کا حصہ گھوم گیا اور جو نچلا حصہ اوپر ہماری نظروں کے سامنے آیا اس پر صرف ایک بڑی سی میز فرش کے ساتھ چمکی ہوئی تھی۔ جلد ہی اسے صبح کر بلند کر دیا گیا اور اب اس کے فولڈنگ پاؤں کی اونچائی کم و بیش تین فٹ ہو گئی۔ کمرے کے تمام حاضرین اپنی اپنی کرسیاں گھسیٹ کر میز کے گرد آ بیٹھے۔ الماری کھولی گئی۔ اس کے نچلے خانوں میں پھولوں، میوؤں، کریم کیک، پیسٹریوں کی طشتریاں بھری رکھی تھیں۔ انہیں میز پر چن دیا گیا۔

کمرے میں پہلے سے موجود لمبے چوڑے فریق سے ٹھنڈے مشروبات کی بوتلیں ہمارے سامنے رکھ دی گئیں۔ سارا کام پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں انجام پا گیا۔ ہم تیسری منزل پر تھے اور پولیس کو وہاں تک پہنچنے میں اتنا وقت تو لگ ہی سکتا تھا۔

ہم بیٹھے ہی تھے کہ دروازہ پر شور آواز کے ساتھ کھلا اور انسپکٹر جمال بیک دو مسلح کانسٹیبلوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور اور کانسٹیبلوں کے ہاتھ میں رائفلیں تھیں۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اس مرتبہ مجھے جس کمرے میں لایا گیا تھا۔ وہ عمارت کے ٹمران اور ذاتی کمرہ اور آفس تھا اور یہ کہ شوکت خان ہی فیجر کا رول ادا کرتا ہے۔

”اس بورڈنگ ہاؤس کا فیجر کون ہے۔“

جمال بیک نے پوچھا۔

شوکت خان جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ ”میں ہوں جناب۔ فرمائیے۔“

”ہمیں رپورٹ ملی ہے کہ بورڈنگ ہاؤس کی آڑ میں یہاں ہر قسم کی غیر قانونی سرگرمیاں ہوتی ہیں۔“ جمال بیک نے سخت لہجے میں کہا۔

”مثلاً قمار بازی، جسم فروشی، منشیات کی تجارت اور اسلگنگ وغیرہ۔ یہ بلڈنگ اس وقت پولیس

دیدنی تھی۔

”سیٹھ صاحب! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں۔“ شوکت خان جلدی سے میری طرف بڑھا اور شانہ دبا کر بولا۔ ”بات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔“

”مجھے جو کچھ سمجھنا تھا۔ وہ میں اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔“ میں نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”اب آپ ذرا آنکھیں اور کان کھول کر حالات کو جاننے کی کوشش کریں۔“

میں نے اس طرح جیسے انسپکٹر جمال میرے لیے بالکل اجنبی ہوا اور میں پہلی مرتبہ اسے بتا رہا ہوں۔ ڈان زان مغل کی ملاقات سے لے کر آج تک کی داستان بیان کی اور کہا کہ میں نے ایک دنیا دیکھی ہے۔ اس طرح کے جھکنڈے میری لیے نئے نہیں ہیں۔ میں کلب میں پہلے جاوید اور نوشاہی کی ملاقات کے بعد ہی سمجھ گیا تھا کہ میرے لیے جمال بچایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اپنی پوری تیاری کر کے آیا تھا۔

”میری جیب میں ایک مائیکرو کیسٹ ریکارڈ موجود ہے۔ جس میں وہ سب کچھ ریکارڈ ہو چکا ہے جو یہاں ہوتا رہا ہے۔ میں نے میسر امتیاز کے ساتھ ٹھیلنے کی خواہش اسی لیے ظاہر کی تھی کہ کسی اور کی آواز پہچانی جائے یا نہ پہچانی جائے لیکن وہ سیاسی لیڈر ہیں۔ ہزاروں کان ان کی مخصوص آواز اور لب لہجے سے آشنا ہیں کوئی اسے شناخت کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ ویسے ان لوگوں کی ہوشیاری اور چالاکی کا جواب نہیں۔ پولیس کے چھاپے کی اطلاع ملتے ہی انہوں نے جس طرح کمرے کا حلیہ بدلا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ پھر میں نے جمال بیک کو اس میکینیکل نظام اور سوچ بورڈ کے ان بٹنوں کے بارے میں بتایا جس کے ذریعے پانچ منٹ میں جوئے کا اڈا بورڈنگ ہاؤس کے میجر کے آفس میں تبدیل ہو گیا تھا۔“

”جی نہیں۔ یہاں ایسا کوئی کام نہیں ہو رہا تھا۔ آپ ان معززین سے دریافت کر سکتے ہیں۔“ جمال نے اب پورے غور اور توجہ سے ہماری طرف دیکھا امتیاز اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

”غالباً ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔“ وہ نرمی سے بولا۔

”درست ہے۔ میں آپ کو جانتا ہوں امتیاز صاحب!“ جمال نے جواب دیا۔ ”اور آپ کی شہرت سے بھی واقف ہوں۔“ ”تو پھر میری بات کا یقین کیجیے۔ یہاں سچ سچ ایک دعوت ہی جاری تھی۔“

اب میں اپنی کرسی سے کھڑا ہوا ظاہر ہے کہ یہ پوری پلاننگ میری تھی۔ میں انسپکٹر جمال بیک کو برابر رپورٹیں دیتا رہا تھا اور ہونے والے اقدامات سے آگاہ کرتا رہا تھا۔ آج چھاپے کے لیے بھی ہمارے درمیان طویل گفتگو ہو چکی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ پولیس کی کتنی نفری بلڈنگ کے باہر محاصرہ کیے ہوئے ہیں اور کتنی تعداد عمارت کے اندر مختلف منزلوں پر تلاشی لے رہی ہے۔ چھاپے کا سسٹل اس وقت دیا گیا تھا۔ جب میں نے جیب سے لائٹر نکالا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا ٹراسمیٹر تھا۔ جو کئی مخصوص سسٹل نشر کر سکتا تھا۔ یہ اشارہ پاکر ہی جمال عمارت میں داخل ہوا تھا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ میں بھی اپنی زبان کھولوں لیکن پہلے سے طے شدہ فیصلے کے مطابق مجھے ظاہر نہ ہی کرنا تھا جیسے میرا اور انسپکٹر جمال کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

”یہ جھوٹ ہے۔ انسپکٹر صاحب!“ میں نے بلند آواز میں کہا۔ ”باقی عمارت کے بارے میں تو میں نہیں جانتا مگر یہاں واقعی جوا ہو رہا تھا۔“ امتیاز اور شوکت خان نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ جاوید عزیز اور نوشاہی کی حیرت بھی

پر کاری دکھائی ہو۔ آپ یہ مانیکروکیٹ ریکارڈ سنہال لیں۔ جس میں یہاں ہونے والی تمام گفتگوار ریکارڈ ہے۔“

”ان شریف آدمیوں کو آہنی زیور پہنائیں اور پھر میرے ساتھ چلیں۔ میں بھی ذرا بورڈنگ ہاؤس کے معزز کرائے داروں سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کمرے میں جو کاریگری کی گئی ہے۔ اس کا مظاہر کسی بھی وقت دیکھا جاسکتا ہے۔“

میں نے جیب سے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈ نکال کر جمال کے ہاتھ میں دے دیا۔ امتیاز مجھے کینہ تو نظروں سے گھور رہا تھا۔

”سیٹھ صاحب! آخر آپ کو ان شریف آدمیوں سے کیا دشمنی ہے۔ کیا ہم آپس میں اس معاملے کو طے نہیں کر سکتے۔“ وہ بولا۔

”محترم شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔“ میں نے نرمی سے کہا اور دو قدم اس کی طرف بڑھا۔ بڑے اطمینان سے اپنی فرنیچ داڑھی اتار کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ چشمہ اتارا۔ گالوں کی پیڈنگ اور آنکھوں کے کنٹیکٹ لینس علیحدہ کیے۔ ”اب آپ کہیں تو منہ بھی دھو آؤں۔ میرے خیال میں اس کی ضرورت تو نہیں ہونا چاہیے کہ آپ اتنے بھی گدھے نہیں ہیں۔“

”اوہ تم!“ بے اختیار امتیاز کے منہ سے نکلا۔

”جناب والا!“ میں نے سر کو خم کرتے ہوئے جواب دیا۔

﴿.....﴾

شوکت خان کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔ نویشابہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے مجھے گھور رہی تھی۔ شہر کے ان پانچ چھ شرفاء کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں جو آسان دولت کمانے کے لالچ میں ان جلسازوں کا شکار بنے تھے۔ مگر امتیاز انتہائی سنجیدہ اور خاموش تھا۔ اسی وقت سب انکسپٹر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے جمال کو بتایا کہ تینوں منزلوں پر تقریباً تیس کمروں کی تلاشی لی جا چکی ہے مگر کہیں سے کوئی قابل اعتراض چیز برآمد نہیں ہوئی۔

”ہر کمرے میں ایک کرائے دار مقیم ہے جس کے پاس شناختی کاغذات موجود ہیں۔“ جمال بیک نے فکر مند انداز میں میری طرف دیکھا۔

”انکسپٹر جمال!“ امتیاز بھاری آواز میں بولا۔ ”اس نوجوان نے ابھی جو دلچسپ کہانی سنائی ہے۔ اس میں کتنی حقیقت ہے اور کتنی اس کی ذہنی اختراع یہ میں نہیں جانتا مگر تم زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت کر سکتے ہو۔ وہ صرف اتنی ہے کہ سوسائٹی کے کچھ معزز افراد اپنا دل بھلانے کے لیے شوکت صاحب کے آفس میں تاش کھیل رہے تھے جو ہم سب کے مشترکہ دوست ہیں۔ بلاشبہ اس سے ہماری کچھ ذلت و رسوائی ہوئی مگر یہ سوچو کہ تمہارے ہاتھ کیا آئے گا۔ اس بااثر طبقے کی دشمنی۔ جس کے ایک اشارے سے تمہاری یہ وردی بھی اتر سکتی ہے۔ جس میں اس وقت تم اتنے اسرار نظر آ رہے ہو۔“

”انکسپٹر صاحب!“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”ایک عظیم کارنامہ آپ کی دسترس میں ہے۔ دشمن کی باتوں میں آگئے تو ساری زندگی کف افسوس ملتے رہیں گے۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ جو شخص چند منٹ میں قمار خانے کو آفس میں بدل سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی بعید نہیں کہ بورڈنگ ہاؤس کے دوسرے کمروں میں بھی یہی

ادیت گاہ

ایم، اے، راحت

سیاحوں کے ایک گروپ کی پیش آنے والی
پراسرار و دلچسپ واقعات، مزاح کی
لطیف جگاشی کے ساتھ آپ کے محبوب
مصنف کی ایک شگہان کہانی کا انتخاب،

پراسرار کہانیوں کے شائقین کے لیے بطور خاص

پچھلی جیب میں سامنے کے رخ پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں
میں مسکراہٹوں کے تبادلے جاری تھے!
یہ قافلہ پاکستان کے ایک کالج سے آیا تھا کالج کی
طرف سے ان لوگوں کو بنگلہ دیش کے حسین مناظر
دکھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایسے بہت سے قافلے
آئے تھے اور مختلف سمتوں میں نکل گئے تھے ان
لوگوں نے رانگامانی کے علاقے کا انتخاب کیا تھا۔
پروفیسر فاروق نے ایک چھوٹی سی بستی سے ایک مقامی
آؤں کو ساتھ لے لیا تھا۔ جو اس علاقے کے چپے چپے
سے واقف تھا، وہی انہیں یہاں کی سرکارا رہا تھا۔

شام کی ککلاہٹ ماحول پر مسلط ہوئے لگی اور
پروفیسر کی بے چین نظریں قریب و جوار میں کچھ تلاش
کرنے لگیں پھر اس نے دو چرخوں پر چڑھ کر ایک
”قریب و جوار میں کوئی جگہ ہے جہاں رات کو قیام
کیا جاسکے میرا خیال ہے بستی میں واپس پہنچنے کی
شکل میں تو زیادہ رات ہو جائے گی۔“

”جی ہاں۔ بستی میں واپس نہیں جایا جاسکتا۔ ہم
تقریباً تین میل چل کر ایک سرکاری رست ہاؤس
تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے لئے ہمیں ایک میل چل

رنگامانی کے روح پرور مناظر قدرت کی تمام تر
صناعی اپنے دامن میں سمیٹے پر شوق نظروں سے اس
قافلے کو دیکھ رہے تھے جو دو جیبوں پر مشتمل تھا۔ ایک
جیب میں رنگین لباسوں میں لٹی ہوئی نوجوان لڑکیاں
زندگی سے بھرپور قمقمے لگا رہی تھیں۔ دوسری جیب
میں نوجوان لڑکے، بوڑھے پروفیسر کے تسلط پر منہ
بنائے بیٹھے اسے کوس رہے تھے۔ لڑکیوں کے ساتھ
ان کی گورنس بھی تھیں لیکن اس نے چالیس سال سے
اوپر ہونے کے باوجود خود کو لڑکیوں سے تعاون پر آمادہ
کر لیا تھا اور لڑکیوں کے رتسمین قمقموں میں اس کے
بھدے قمقمے بھی شامل تھے بالکل اسی طرح جسے
بانسری کی سرلی آوازوں میں ڈھول کی آواز۔ البتہ
بوڑھا پروفیسر بھالے سے پوری طرح مشتاق تھا اور ہر
بات پر اپنے تجربے کی کسوٹی لگا لیتا تھا۔ اس نے
لڑکیوں کی جیب اپنی جیب سے بیس گز دور رکھی تھی
تاکہ لڑکے لڑکیاں آپس میں اشارے بازی تک نہ
کر سکیں۔ لیکن یہ فاصلہ اس نے اپنی کمزور بینائی سے
ٹپا تھا اور فاصلے کا صحیح تعین کرنے میں ناکام رہا تھا۔
کیونکہ جیب کی پچھلی سمت کھڑے ہوئے لڑکے اور

”ہاں جناب! ابھی کافی روشنی ہے ہم آسانی سے وہاں پہنچ سکتے ہیں۔“ گائیڈ نے کہا۔ اور پروفیسر نے گردن گھمائی پھر اس نے ڈرائیور کو ریسٹ ہاؤس چلنے کی ہدایت کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ریسٹ ہاؤس

کر سڑک چھوڑ دینا ہوگی ریسٹ ہاؤس تک جانے کا راستہ کچا ہے۔“ گائیڈ نے بتایا۔
”تین میل۔“ بوڑھے پروفیسر نے اس طرح کہا جیسے اسے تین میل کا سفر بتایا گیا ہو۔



نے پوچھا۔
 ”میں نے تو نہیں دیکھا صاحب، البتہ یہاں سے
 متعلق کچھ پراسرار واقعات سنے ہیں۔“
 ”عمارت یہاں سے کتنی دور ہے؟“
 ”تقریباً دو فرلانگ۔“

”چھوڑو بھی کیا جن، بھوتوں کے قصے لے بیٹھے اپنا
 اپنا بندوبست کرو۔ اس کے بعد گفتگو کرنا۔ میں پروفیسر
 کو دیکھنے جا رہی ہوں۔“ گورنس نے کہا۔ اور لڑکیاں
 ایک دوسرے کو اشارہ کرنے لگیں اور پھر بھین بھینی
 مسکرائیں گورنس، ان مسکراہٹوں سے بے خبر یا ہر
 نکل گئی۔ اور لڑکے لڑکیوں کو آزادی مل گئی۔

”خدا کرے پروفیسر فاروق کو بخار آجائے اور ہم
 کل پورا دن یہاں قیام کر سکیں۔“ ایک لڑکی نے کہا۔
 ”تمہاری گورنس کو ہیضہ ہو جائے۔ پروفیسر کو کیوں
 کوستی ہو؟“ ایک نوجوان نے کہا۔

”ارے کچھ بھی ہو بس یہاں رکنے کا موقع مل
 جائے۔“ وہی لڑکی جلدی سے بولی اور سب ہنسنے لگے۔
 اس کے بعد وہ کمروں میں ڈبرہ جمانے لگے۔ قیام کے
 انتظام سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ گورنس لڑکوں کے
 پاس پہنچ گئی۔

”پروفیسر فاروق کو بخار ہو گیا ہے۔ میں نے انہیں
 کونین دے دی ہے بخار کافی تیز ہے۔“
 ”خدا کا شکر ہے۔“ ایک نوجوان نے چھت کی
 طرف منہ کر کے کہا۔ اور گورنس حیرت سے اسے
 دیکھنے لگی۔

”کیا مطلب؟“ اس نے کڑی آواز میں پوچھا۔
 ”مممم میرا مطلب ہے کہ۔ کہ بدن میرا بھی ٹوٹ
 رہا تھا لیکن مجھے بخار نہیں ہوا دیکھیں۔“
 نوجوان نے جلدی سے کلائی گورنس کی طرف
 بڑھادی گورنس نے میسانتہ اس کی کلائی چھو کر دیکھا
 اور نفی میں گردن ہلانے لگی۔ دوسروں نے بشکل
 مسکراہٹ رد کی تھی۔

رہسٹ ہاؤس کے ملازم نے ان کی عام ضروریات کا

جانے والی سڑک پر پہنچ گئے اور پیپس ریت اڑائی
 ہوئی آگے بڑھنے لگیں۔ راستہ بہت تکلیف دہ تھا۔
 لیکن اس تکلیف کا احساس بوڑھے پروفیسر اور شاید
 ادھیڑ عمر گورنس کو ہی ہو رہا تھا۔ نوجوان تو ہر قسم کی
 تکلیف سے بے نیاز شام کے سرمئی دھند لکوں میں
 ڈوبے ہوئے چروں میں رومان تلاش کر رہے تھے۔

دو میل کے تکلیف دہ سفر نے بوڑھے فاروق کو
 بے حال کر دیا۔ اور لڑکوں کو اسے جیب میں لینے کے
 لیے جگہ دینی پڑی۔ پھر دور سے دھند میں لپٹا ہوا
 رہسٹ ہاؤس نظر آیا اور واضح ہو گیا۔ چند لمحات کے
 بعد وہ رہسٹ ہاؤس کے گیٹ کے نزدیک پہنچ گئے!

”تقریباً“ چھ افٹ اونچی چار دیواری کے درمیان ایک
 آہنی گیٹ لگا ہوا تھا جس پر بنگلے کا محاذ ان کے
 استقبال کے لئے کھڑا تھا شاید اس نے دور سے ان
 لوگوں کو آتے دیکھ لیا تھا۔ جیپیں کمپاؤنڈ میں داخل
 ہو گئیں۔ اور سب لوگ جیپوں سے نیچے کود آئے
 لیکن پروفیسر فاروق خود سے اٹھ نہیں سکا۔ اس کی
 طبیعت زیادہ ہی خراب ہو گئی تھی۔ لڑکوں نے
 نزاکت محسوس کر کے پروفیسر فاروق کو جیب سے اٹھایا
 اور سہارا دے کر اندر لے گئے۔ عمارت کے ایک
 کمرے میں پروفیسر کے آرام کا بندوبست کر لیا گیا۔

عمارت بہت اچھی تھی۔ اور اس دور دراز علاقے
 میں اتنی عمدہ عمارت دیکھ کر سب کو حیرت ہوئی تھی۔
 لیکن گائیڈ نے بتایا کہ ”اس علاقے میں سیاح آتے

رہتے ہیں اس لئے حکومت نے خاص طور سے یہ
 عمارت تعمیر کروائی ہے اس سے قبل ایک پرانی
 عمارت یہاں موجود تھی لیکن وہ بوسیدہ ہو گئی ہے اور
 اب وہاں جن بھوتوں کے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا۔“
 جن بھوت؟ لڑکوں نے حیرت و دلچسپی سے پوچھا۔
 ”جی ہاں صاحب! ایسی ویران عمارتیں جن بھوتوں
 ہی کا مسکن ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے جہاں انسان کا گذر نہ
 ہو وہاں جن بھوت ہی رہیں گے۔“
 ”کیا آپ نے انہیں دیکھا ہے؟“ نوجوان عارف

تقمہ ہوا۔ اور اس قسم کی آواز گورنس کے کانوں تک پہنچ گئی اور دوسرے لمحے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے آواز کی سمت لپکی اور چند لمحات کے بعد اس ہال نما کمرے کے دروازے پر بھی لڑکے اور لڑکیاں اسی طرح خوش گپیوں میں مصروف تھے وہ دروازے میں کھڑی ہو کر انہیں گھورنے لگی اور اچانک ہی ایک لڑکے کی اس پر نگاہ پڑ گئی۔

”بھوت۔“ وہ خوفزدہ آواز میں چیخا اور سب چونک کر دروازے کی سمت دیکھنے لگے۔ لڑکا سخت خوفزدہ ہونے کی ادکاری کر رہا تھا۔ ایک دوسرے لڑکے نے اسے جلدی سے سنبھالا اور اس کے کپکپاتے ہوئے جسم کو پھینچ کر ہولا۔

”ہوش میں آؤ افضل۔ یہ تو اپنی گورنس ہیں۔“ افضل کی کپکپاہٹ آہستہ آہستہ دور ہو گئی۔ گورنس دوڑ کر آئی۔

”تم لوگ یہاں کیوں جمع ہوئے ہو؟“ اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”اوه! مادام سب کو خوف محسوس ہو رہا تھا ہم سب یہ طے کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے کہ اگر برائے رست ہاؤس کے بھوت ادھر آنکے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے دیکھئے اتنے دماغ کا انتظام ضروری ہے۔“

”ہوں۔“ گورنس ہونٹ پھینچ کر ہولی۔ ”پھر تم نے کیا فیصلہ کیا؟“

”وہ دیکھئے ہم نے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ سب اپنے اپنے کمروں کے دروازے بند کر کے سوئیں۔“ عارف نے دانت دکھاتے ہوئے کہا۔ اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اور پھر وہ جلدی سے دروازے سے باہر نکل گیا۔ پھر لڑکے اور لڑکیاں ایک ایک کر کے ہال نما کمرے سے باہر نکل آئے۔



دوسرے دن پروفیسر فاروق کو بخار تو نہیں تھا لیکن وہ نقاہت بہت محسوس کر رہے تھے۔ لڑکوں کے شدید اصرار پر انہوں نے واپسی کے سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

بندوبست کیا۔ اور پھر کھانے پینے کا انتظام کرنے چلا گیا۔ پروفیسر کا بخار کافی تیز ہو گیا تھا۔ لڑکے اور لڑکیوں نے فردا فردا ”مزاج پرسی کی اور اس کی ہدایت پر آرام کرنے چلے گئے۔ رات کو نو بجے تک آرام کیا گیا۔ پروفیسر ہلکی غذا کھانے کے بعد سو گیا تھا۔ گورنس بھی اپنے خیال میں فرائض انجام دینے کے بعد ایک کمرے میں لیٹ گئی۔ اور پھر لڑکے اور لڑکیوں کی کارروائی شروع ہو گئی۔ کچھ لوگ دوڑنے لگے۔ کانا پھوسی ہوئی اور پھر سب ایک بڑے ہال نما کمرے میں پہنچ گئے جہاں دری وغیرہ بچھا کر بیٹھے کا انتظام کر لیا گیا تھا۔

”اس کالی زبان کی لڑکی نے پروفیسر کو ایسی بد عادی کہ انہیں واقعی بخار آ گیا۔“ عارف نے اس لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا جس نے پروفیسر کو بخار آ جانے کی بد عادی تھی۔

”میری زبان بالکل سفید ہے جناب۔ آپ۔“ اس نے زبان باہر نکال دی۔ اور سب ہنس پڑے۔

”بہر حال قدرت مہربان ہے۔ ہماری دعا پوری ہو گئی ہے۔ خدا انہیں پروفیسر کا بخار اتار بھی گیا تب بھی انہیں آرام کرنے پر مجبور کریں گے۔ ہمیں ان کی زندگی عزیز ہے۔“ یوسف نے سنجیدگی سے کہا۔

”پھر کل کا کیا پروگرام رہے گا؟“

”قرب و جوار کے پورے علاقے کی سیر۔ اور ہاں وہ بھوت بنگلہ ضرور دیکھیں گے۔“

”نہیں تو پروفیسر کی تیمارداری کروں گی۔ مجھے بھوتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ ایک ڈرپوک لڑکی نے کہا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے محترمہ عارفہ بھوتوں کو بھی آپ سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ ان کا ذہن بھی اتنا گھٹیا نہیں ہوگا۔“ ایک نوجوان عارفہ کے موٹائے پر طنز کیا۔

”بیشک خدا اگرے تمام بھوت تمہیں پسند کر لیں۔“ عارفہ نے خلوص سے کہا اور ایک بار پھر

”کوئی بات نہیں ہے! آپ لوگوں کو دیکھ کر مسرت ہوئی ہے۔“ اس کی پاٹ دار آواز گونجی۔

”کیا آپ سیاح ہیں؟“ فرزانہ نے پوچھا۔

”ہاں یہی سمجھ لیں۔ لیکن ان وادیوں کے حسن نے مجھے اپنا لیا ہے۔ اور اب میں یہیں رہتا ہوں۔“

”یہاں اس جنگل میں؟“ فرزانہ حیرانی سے بولی۔

”ہاں یہ جنگل سکون کا خزانہ رکھتا ہے۔ یہاں رہنے والے ننھے ننھے پرندے محبت کے گیت گاتے ہیں۔ یہ گیت لمبے بیک نہیں ہوتے۔ اصل آواز“

اصل جذبات۔“ یہاں نفرت کرنے والے درندے بھی رہتے ہیں لیکن وہ صرف نفرت کرتے ہیں۔ اور ان کی نفرت سے بچنے کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ یہ

درندے باہر کی دنیا کے ان درندوں سے کہیں زیادہ مذہب اور قابل احترام ہیں۔ کیونکہ وہ درندے محبت کا لبادہ اوڑھ کر نفرت کرتے ہیں۔ اور موقع ملتے ہی قتل کر دیتے ہیں جبکہ یہ درندے صرف چیرھاڑ کرتے ہیں، کھلے عام ڈنکے کی چوٹ پر۔“

”اوہ کبھی معلوم ہوتے ہو؟“ فرزانہ نے کہا۔

”جی نہیں خدا کا شکر ہے، میں نے ایک حقیقت بیان کی ہے۔ آپ لوگ سچے ذہنوں کی مالک معلوم ہوئی ہیں۔ بالکل ان پولیس والوں کی طرح جو جرم کی اطلاع دینے والوں کو ہی مجرم سمجھنے لگتے ہیں، خدا کا شکر ہے میں تندرست و توانا ہوں اور میرا وزن میری

جسامت کے لحاظ سے بالکل ٹھیک ہے۔“ اس کے لہجے میں قدرے جھلاہٹ بھی جو لڑکیوں نے محسوس کر لی لیکن وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھیں۔ ان کی نگاہیں اس کیسوں کی طرف اٹھ گئیں جہاں اس کے برش کی دھڑکنیں بکھری ہوئی تھیں۔ عام طور سے کسی ایسی تصویر میں جو صرف اپنے لئے بنائی گئی ہو اور اس کی نمائش مقصود ہو میں اپنے جذبات کی اپنی فطرت کی عکاسی کی جاتی ہے ہر انسان غیر شعوری طور پر اپنے جذبات کا بھرا ہوا ہے۔ اور اس تصویر میں جو کچھ نظر آ رہا تھا۔ اگر وہ اس شخص کے ذہن کا عکس تھا تو فرزانہ نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس کی زندگی میں

اور اسی رستہ ہاؤس میں مزید ایک روز قیام کا فیصلہ کر لیا سب لوگ بہت خوش تھے دن کو دس بجے انہوں نے سیرو تفریح کا پروگرام بنایا۔ اور پروفیسر کی معینتیں گھر میں باندھ کر چل پڑے پروفیسر نے اصرار کر کے گورنس کو ان کے ساتھ بھیجا تھا۔

رائنگمانی کا حسین علاقہ سیاحوں کے دل موہ لینے کے لئے مشہور ہے۔ وہ لوگ فطرت کے حسین مناظر سے لطف اندوز ہونے لگے۔ گورنس کے تسلط کو بے اثر بنانے کے لئے لڑکے اور لڑکیوں نے ٹولیاں بنالی تھیں۔ اور مختلف سمتوں کو نکل گئے۔ ظاہر ہے وہ انہیں اس طرح تفریح کرنے سے نہیں روک سکتی تھی چنانچہ اس نے ایک پرانے درخت کے نیچے ڈیرہ ڈال لیا۔ اور وہیں لیٹ گئی اس طرح ان ٹولیوں کو آزادی مل گئی۔ لڑکیوں کا ایک گروپ اس جھوٹے

سمے جھرنے کے دوسری طرف پہنچ گیا جس کا شفاف پانی ایک نالے کی شکل میں بہہ رہا تھا۔

اور وہاں انہوں نے ”سمے“ دیکھا اس کے جسم پر فیض پتلون تھی ہاتھ میں ایلن برش، سامنے ایک بورڈ پر کیونس چڑھا ہوا تھا اور اس پر برنگ بکھرے ہوئے تھے وہ کوئی مصور تھا۔ لڑکیاں بجمکتی ہوئی اس کی طرف بڑھیں اس نے بھی ان کے قدموں کی چاپ سن لی اور چونک کر پلٹ پڑا۔ انہیں دیکھ کر اس نے اپنا کام روک دیا اور ساٹ نظروں سے انہیں اپنے قریب آتے ہوئے دیکھا رہا۔

”معاف کیجئے ہم آپ کے مشغلے میں مغل ہوئے“ شوخ و شنگ فرزانہ نے شائستگی سے کہا۔

لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ صوفیہ کو گھور رہا تھا۔ اور صوفیہ کو اس کی گھیری سیاہ آنکھوں میں عجیب سی چمک محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی نہ جانے کیوں اس کے دل میں ایک ہوک سی پیدا ہو گئی۔ وہ اسے کیوں گھور رہا ہے؟

چند لمحات کے بعد اسے بھی اپنی ناشائستگی کا احساس ہو گیا۔ اور وہ سنبھل گیا۔

نہلے پہ دہلا

ایک کجوس کا بیٹا نہاتا نہیں تھا، اس لیے اس نے اپنے بیٹے کو نہانے کے لیے کہا۔
 ”بیٹا! اگر تم بلا ناغہ نہاؤ گے تو میں تمہیں ایک ماہ بعد ایک سو روپیہ انعام میں دوں گا۔“
 بیٹا خوش ہوا اور بلا ناغہ نہانے لگا۔ آخر کار ایک ماہ پورا ہوا اور بیٹے نے باپ کو اس کا وعدہ یاد دلادیا۔
 باپ نے مسکراتے ہوئے ایک بل اسے دے دیا جس پر ایک سو پچیس روپے صابن کے درج تھے۔
 کجوس نے بیٹے سے کہا: ”تمہارا سو روپیہ انعام اور پچیس روپے جب خرچ سے کاٹ کر یہ بل دکھانے کو ادا کیا جائے گا۔“

بیٹے نے مسکراتے ہوئے کہا: ”آپ سو روپیہ مجھے دے دیں کیونکہ میں تو صابن کے بقیہ پر نہاتا رہا ہوں۔“

دور صوفیہ بھی عجیب سے انداز میں مصور کو گھور رہی تھی اسی وقت ایک گروپ اس طرف آتا نظر آیا اس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل تھے۔ مصور کی نظریں بھی اس طرف اٹھ گئیں۔ اور وہ کئی سیکنڈ تک آتے ہوئے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ انہوں نے بھی شاید لڑکیوں کو دیکھ لیا تھا اس لئے سب اسی طرف آ رہے تھے۔

”آپ لوگوں نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔“ مصور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی مسکراہٹ بہت دلکش تھی۔

”ہم لوگ پاکستان کے شہر کراچی سے آئے ہیں رائگاٹی کا دلکش حسن، ہم لوگوں کو سمندر عبور کر کر یہاں لے آیا ہے۔“ فرزانہ نے جواب دیا۔

”شاید طالب علم ہیں؟“ اس نے کہا۔

”ہاں۔ آپ کا خیال درست ہے۔ ویسے ہم ابھی تک آپ کا نام بھی نہیں معلوم کر سکے۔“ ندیمہ بولی۔
 ”میرا نام؟“ وہ چند لمحات کے لئے رکا۔ ”میرا نام نصرت ہے لیکن میری شخصیت میرے نام کا مذاق

ضروری کوئی دکھ تھا۔ تصویر میں ایک ننھا سا پودا نظر آ رہا تھا جس کے نزدیک خوبصورت پتے بکھرے پڑے تھے پودا بالکل ننگا تھا اگر یہ پتے اس پر رہے ہوتے تو بلاشبہ وہ حسین ترین ہوتا۔ پودے کے قریب ایک خوبصورت برندہ بیٹھا ہوا اسے حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سب تصویر کی گمراہیوں میں کھو گئیں مصور کی نظریں صوفیہ کے سر پہا کا جائزہ لے رہی تھیں اور ان نظریں میں عجیب سی بے خودی تھی۔ چند لمحات کے بعد وہ تصویر کے سحر سے آزاد ہوئے اور فرزانہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگی۔ وہ بھی سنبھل گیا تھا اور اب اس کے ہونٹوں پر ایک لمح مسکراہٹ تھی۔
 ”کیا یہ تصویر آپ کے جذبات کی عکاس نہیں ہے؟“

”ہاں آپ کہہ سکتی ہیں۔ لیکن یہ صرف ایک خوبصورت خیال ہے۔ مصور اپنے خیالات کو تصویر میں ڈھال سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی زندگی ان خیالات کا محرک ہو۔“
 ”اس تصویر میں آپ نے کون سا خیال پیش کیا ہے؟“

”آپ نے رائگاٹی کی حسین وادیوں کو دکھایا ہے یہاں حسن ہی حسن ہے۔ اس حسن میں خزاں کا تصور ضرور ہونا چاہئے کیونکہ ہر عروج کو زوال ہوتا ہے۔ میں اس حسن کو دیکھتا ہوں محفوظ ہوتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ حسن پائیدار نہیں ہے۔ اس میں نیچے ہوئے پتوں کا تصور ضرور ہونا چاہئے میں اس علاقے کے کسی حصے کو ویران نہیں کر سکتا چنانچہ میں نے اس احساس کو تصویر کی زندگی دے دی ہے۔“

”عجیب خیالات ہیں۔“ ندیمہ نے شانے ہلائے۔
 لیکن فرزانہ مصور کو گہری نظریں سے دیکھ رہی تھی اس کے ذہن کے کسی گوشہ سے یہ آواز ابھر رہی تھی کہ اس نے تصویر کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ حقیقت نہیں ہے۔ تصویر کی حقیقت کچھ اور ہے لیکن دیوانے مصور کو حقیقت بتانے پر مجبور نہیں کیا

میں وہ صرف مسکراتا رہا۔
”بھئی ہمارا بھی تعارف کراؤ ویسے آپ بھی پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں شاید؟“

”ہاں۔ یہ نصرت صاحب ہیں بڑی دلچسپ شخصیت کے مالک ہیں ہمیں ان جنگلوں میں ملے ہیں۔“
فرزانہ نے کہا۔

”خوب گویا رانگماتی کی حسین وادیوں پر آپ کا قبضہ ہے جس خوبصورت علاقے کو چابا برش اور رنگ کی مدد سے کیونوس میں قید کر لیا۔“ عارف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہم انہیں چند گھنٹوں کی دعوت دے چکے ہیں عارف بھائی۔ نصرت صاحب سے رانگماتی کے مختلف علاقوں کے بارے میں گفتگو کریں گے۔“ صوفیہ بولی۔
”ضرور بھی لیکن نصرت صاحب آپ ان جنگلوں میں رہتے کہاں ہیں؟“

”ان وادیوں کی زندگی بے حد حسین ہے کسی جگہ شمین بنائیں گویا روکنے والا نہیں ہے۔“

”کیا یہاں رہنے والے درندوں کو آپ سے رغبت رہتی ہے؟“ جاوید پھر بولا اور حسب عادت بے ٹکا بولا۔

”یہاں ایسا ہی لگتا ہے شاید وہ مجھے درخود اعتنا نہیں سمجھتے ممکن ہے انہیں آپ جیسے محرب انسان کی تلاش ہو۔“ نصرت نے جواب دیا اور تمام لوگ قہقہے لگانے لگے نصرت نے خوبصورت فقرہ چست کیا تھا۔
کیونکہ جاوید کا جسم قدرے مٹاپے کی طرف مائل تھا۔ جاوید بھی جھینٹے ہوئے انداز میں ہنسنے لگا۔

”چلے نصرت صاحب تھوڑا سا وقت ہمارے ساتھ گزاریں نہ جانے کب پروفیسر کی طبیعت ٹھیک ہو جائے اور وہ جانے کے لئے تیار ہو جائیں۔“ فرزانہ نے کہا۔

”کیا میں یہ رنگ اور کیونوس اٹھالوں؟ فرید نے پوچھا۔

”نہیں شکریہ انہیں یہیں رہنے دیں۔“

اڑاتی ہے۔ کیا میں آپ کو فتح مند نظر آتا ہوں۔ میں مجسم شکست ہوں، محترمہ، مجسم شکست۔“ اس کی آنکھوں میں غم کی پرچھائیاں رقص کرنے لگیں اور ایک لمحے کے لئے لڑکیاں اس کی آواز کے سوز میں کھو گئیں۔ لیکن دوسرے لمحے وہ سنبھل گیا۔ اور پھر اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”دراصل ایک طویل عرصے کے بعد میں نے اپنا نام لیا ہے جانے کیوں آپ لوگوں کو کوئی غلط نام نہیں بتا سکا میں نے کوشش کی تھی لیکن مجھے کوئی اور نام یاد ہی نہیں آ سکا۔ اور مجھے اپنے نام سے سخت چیز ہے مجھے اس سے مطمئن ہوتی ہے نہ جانے میرا نام نصرت کیوں رکھا گیا ہے تھا؟“

”ہم لوگ ریست ہاؤس میں مقیم ہیں، کیا آپ کچھ وقت ہمارے ساتھ نہیں گزار سکتے؟“ پہلی بار صوفیہ نے لب کشائی کی اور وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اتنی دیر میں لڑکے لڑکیوں کا گروپ وہاں پہنچ گیا۔

”کیا ہو رہا ہے بھئی؟ کیا کوئی جنگلی جانور شکار کر لیا۔“ منہ پھٹ جاوید نے بے دھڑک کہا۔

”آپ سے بڑا جانور کہاں مل سکتا ہے جاوید صاحب جب آپ جیسے جانور شہر سے ساتھ لگالائے ہیں تو بے چارے جنگلی جانوروں کو کیوں تکلیف دی جائے؟“ صوفیہ نے بلبلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس بات پر ایک قہقہہ پڑا لیکن جاوید ڈھٹائی سے کیونوس پر بنی ہوئی تصویر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”آہا ہا ہا“ اس نے صوفیہ کی بات کا نوٹس لئے بغیر کہا۔ ”یہ تصویر شاید جو شاخ نازک پہ آسیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا۔ کی تعبیر ہے۔“

”یہ آپ کے سمجھنے کی بات نہیں ہے۔ کیوں نہی سے دماغ پر زور دے رہے ہیں۔“ فرزانہ مسکراتے ہوئے بولی۔ دوسرے لوگ بھی مسکرا رہے تھے۔
خود مصور کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔

”بڑی حسین تصویر ہے، آپ کی تخلیق ہے؟“
عارف نے براہ راست مصور سے پوچھا۔ اور جواب

کرنے پر مجبور کر لیا تھا۔ ڈنر کے بعد اسے اجازت مل گئی اور چند لڑکے اور لڑکیاں اسے رخصت کرنے باہر تک آئے سب سے اجازت لے کر وہ چل پڑا اس کا رخ اسی علاقے کی طرف تھا جہاں اس کا ایرل اور کینوس بورڈ رکھا ہوا تھا۔ ابھی وہ ریسٹ ہاؤس سے چند گز دور ہی آیا تھا کہ اس کے کانوں میں ایک لرزتی ہوئی آواز گونجی۔

”نصرت صاحب!“ اور وہ چونک کر رک گیا تاریکی سے ایک سایہ نکل کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ یہ صوفیہ تھی۔ ”نصرت صاحب“ اس کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی لیکن وہ خاموش کھڑا تھا ”کیا یہ ممکن نہیں ہے نصرت صاحب کہ آپ ہمارے ساتھ ہی واپس چلیں۔“

”کہاں؟“ مصور کے ہونٹوں سے خوابناک سرگوشی نکلی۔

”واپس انسانوں کی دنیا میں۔ میں۔ میں آپ کو اس جنگل میں ان درندوں میں نہیں بھٹکنے دوں گی۔“ صوفیہ جذباتی آواز میں بولی۔

”یہ درندے ان انسان نما درندوں سے زیادہ خوفناک نہیں ہیں مس صوفیہ مجھے یہیں رہنے دس میں ان درندوں سے بہت خوفزدہ ہوں براہ کرم مجھے یہاں رہنے دیں۔“

”میں کوشش کروں گی نصرت صاحب کہ آپ کے

دل سے ان درندوں کے لگائے ہوئے زخموں کا ایک ایک نشان صاف کر دوں۔“ صوفیہ بے اختیار ہوجی تھی وہ شروع ہی سے مصور سے بے حد متاثر تھی اور وہ بھی خصوصی طور سے اس کی طرف مائل تھا۔

چند لمحات کے لئے خاموشی چھا گئی پھر اس خاموشی پھر مصور نے خاموشی کا ظلم توڑ لیا۔ ”کیا آپ ٹھیک بارہ بجے مجھے اسی جگہ پر مل سکتی ہیں مس صوفیہ میں“ میں آپ سے کچھ گفتگو کروں گا۔“

”میں ٹھیک بارہ بجے یہاں پہنچ جاؤں گی اور اگر آپ نہ پہنچے تو تمام رات یہیں کھڑی رہوں گی اور دعا

”ارے نہیں اتنی حسین تصویر خراب ہو جائے گی۔“ صوفیہ بولی۔

”تصویر خراب ہونے کے لئے بنائی جاتی ہیں آپ اسے یونہی رہنے دیں یہ خراب نہیں ہوگی۔“ مصور نے جواب دیا۔ اور پھر وہ اسے لے کر ریسٹ ہاؤس کی طرف چل پڑے پروگرام کے مطابق سیر کرنے والی ٹولیاں بچ کے لئے واپس ریسٹ ہاؤس پہنچ رہی تھیں، تھوڑی دیر کے بعد تمام لوگ واپس پہنچ گئے سب سے نصرت کا تعارف کرایا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ انہی میں سے ایک ہو اس کی باتیں بے حد دلچسپ تھیں اس کی گفتگو کا انداز دلکش تھا اور سب نے اسے پسند کیا تھا لیکن کبھی کبھی اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل جاتی تھی اور اس مسکراہٹ کا ابھی تک محسوس نہ ہوا تھا اس نے اپنی بچھلی زندگی کے بارے میں بہت مختصر ”بتایا تھا اس

نے بتایا کہ پوری دنیا میں وہ بالکل تنہا ہے دنیا والوں نے اس سے اچھا سلوک نہیں کیا اس لئے وہ ان سے دل برداشتہ ہو کر ان جنگلات میں چلا آیا ہے جب یہاں سے دل بھر جائے گا تو کہیں اور چلا جائے گا پھر اس نے رائگامانی کے دوسرے علاقوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا اس نے چکما قبائل کی داستانیں

سنائیں اور اس طرح شام ہو گئی۔

پروفیسر کی طبیعت اب ٹھیک تھی لیکن وہ ایک رات اور آرام کرنا چاہتے تھے جس کی اطلاع کورٹس کے ذریعہ لڑکے اور لڑکیوں کو مل گئی تھی اور وہ بے حد خوش تھے۔

”نصرت صاحب کیوں نہ رات بھی آپ ہمارے ساتھ گزار دیں دلچسپی رہے گی اس کے بعد تو ہم دور ہو جائیں گے اور شاید پھر کبھی نہ مل سکیں۔“ عارف نے کہا۔ اور دوسروں نے اس بات پر صاف کیا لیکن نصرت نے عاجزی سے معذرت طلب کر لی اس نے کہا کہ وہ کسی قیمت پر رات ان کے ساتھ نہیں گزار سکتا۔ بہر صورت انہوں نے اسے ڈنر اپنے ساتھ

”صرف ایک منٹ مس صوفیہ میں روشنی کر رہا ہوں۔“ پھر تاریکی کا ننھا سا شعلہ لپکا اور اس کے بعد موبی شمعیں روشن ہو گئیں، کمرہ میں روشنی پھیل گئی تھی سال خوردہ عمارت کا یہ کمرہ بالکل ٹھیک حالت میں تھا اس کے فرش پر سرخ رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک سمت آنسو کی بنی ہوئی میز اور کرسیاں بڑی ہوئی تھیں، دیواروں پر بے شمار تصویریں آویزاں تھیں یہ تمام تصویریں ہاتھ سے بنائی ہوئی تھیں۔ صوفیہ نے پورے کمرے کا جائزہ لیا عمارت کے پر اسرار ماحول سے ابھی تک اس کے دل میں خوف کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔

اس خوف کو نصرت کی آواز نے کسی حد تک دور کر دیا۔ ”یہ میرا غریب خانہ ہے مس صوفیہ۔“ ”بڑی پر اسرار جگہ پر رہتے ہیں آپ۔“ صوفیہ نے آواز کی لرزشوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں لیکن یہ جگہ مجھے بہت پسند ہے کتنا سکون ہے اس جگہ پر میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا آپ کھڑی کیوں ہیں؟“ شریف رکھیں۔

”یہ تمام تصویریں آپ نے ہی بنائی ہیں؟“ صوفیہ نے اس کی بات کا نوٹس لئے بغیر کہا۔ ”ہاں دیکھئے شاید آپ کو پسند آئیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور صوفیہ دیوار پر لگی ہوئی تصویروں کے قریب پہنچ گئی بلاشبہ نصرت ایک عظیم مصور تھا اس نے قدرتی مناظر کو اس طرح کیونٹس پر اتارا تھا کہ انسان ان میں گم ہو جاتا تھا۔ ایک دیوار پر صرف قدرت کے حسین مناظر کی تصاویر تھیں، تمام

تصویریں دیکھ کر صوفیہ دوسری دیوار کی طرف متوجہ ہو گئی یہاں نصرت کے ذہن نے ایک کروٹ لی تھی ان تصویروں میں نفرت و محب کا عجیب سا تصادم تھا کسی تصویر میں محبت عظیم تر جذبات کے ساتھ موجود تھی اور کسی میں نفرت شباب پر تھی لیکن خاص طور سے صوفیہ نے ایک بات محسوس کی تھی۔ ان تصویروں پر بھی اسی عورت کا چہرہ تھا اور ان چہروں میں ذرا فرق نہیں تھا گویا وہ عورت نصرت کی زندگی سے

کرتی رہوں گی کہ کوئی درندہ میری تھکے بونی کر دے تاکہ جنگل کے درندہ پر سے آپ کا اعتماد ختم ہو جائے۔“

”ایسا نہیں ہو گا مس صوفیہ، میں بارہ بجے آپ کو یہاں ملوں گا ٹھیک بارہ بجے خدا حافظ۔“

رات کو ٹھیک بارہ بجے جب چاندنی درختوں کے پتوں سے چھن کر زمین کو روشن کرنے کی کوشش میں مصروف تھی وہ دونوں اسی جگہ پہنچ گئے دونوں ایک ہی وقت پہنچے تھے کوئی بھی وعدے کا جھوٹا ثبوت نہ ہوا تھا صوفیہ شب خوالی کا لباس پہنے ہوئے تھی چونکہ وہ ریسٹ ہاؤس کے کمرے میں لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ سوتی تھی اس لئے اسے لباس پہننے کا موقع نہیں ملا مجبوراً اسے شب خوالی کے لباس میں آنا پڑا۔ جبکہ مصور حسب معمول پتلون اور قمیض پہنے ہوئے تھا۔ ”نصرت!“ صوفیہ نے سرگوشی کی اور نصرت نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ صوفیہ نے مزاحمت نہیں کی تھی۔ نصرت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف چلنے کو کہا۔ صوفیہ نے اب بھی کوئی دخل نہیں دیا تھا۔ پر اسرار چاندنی میں وہ آوارہ روحوں کی مانند لگ رہے تھے نصرت کا رخ پرانے ریسٹ ہاؤس کی طرف تھا اور صوفیہ وہ سب کچھ بھول چکی تھی اسے صرف نصرت یاد تھا اس کے ہاتھ کا سرد لمس یاد تھا وہ سحرزدہ آگے بڑھ رہی تھی۔ چند منٹ کے بعد وہ ریسٹ ہاؤس کے قریب پہنچ گئے بوسیدہ عمارت کا زنگ خوردہ دروازہ کھول کر نصرت اندر داخل ہو گیا۔ عمارت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی لیکن نصرت اس کے ایک ایک چپے سے واقف معلوم ہوتا تھا وہ آگے بڑھتا رہا اس نے صوفیہ کو ایک بھی ٹھوکر نہیں کھانے دی تھی پھر اس نے کسی کمرہ کا دروازہ کھولا اور ایک لمبے کے لئے صوفیہ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

اس کے ہاتھ چھوڑتے ہی صوفیہ ہوش میں آ گئی۔ اسے نہ جانے کیوں اس تاریکی سے خوف محسوس ہونے لگا۔ اس کے جسم میں سردی کی لہریں دوڑنے لگیں اور اس کی کپکپاتی آواز گونجی۔ ”نصرت“

پذیرائی کی اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ زندگی کے ہر موڑ پر میرا ساتھ دے گی میں اس سے بھی زیادہ غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ میرے حالات بہت خراب تھے لیکن میں خوش تھا۔ اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ میں ملازمت کر کے جلد از جلد عظمیٰ کو اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا میں اس مل کو مقدس رشتوں میں بندھنے کے بعد جو مانا چاہتا تھا جو میری زندگی کا حاصل تھا وقتی طور پر مجھے ایک معمولی سی ملازمت مل گئی اور میں نے اپنی ضعیف والدہ کو بڑی اسمتوں کے ساتھ عظمیٰ کے گھر بھیج دیا۔ میری والدہ نے عظمیٰ کے لئے میرا رشتہ دیا۔ اور عظمیٰ کے والد نے چند شرائط عائد کر دیں وہ عظمیٰ کے عوض بہت کچھ چاہتے تھے لاپلائی انسان تھے اور بیٹی کی پوری قیمت وصول کرنا چاہتے تھے عظمیٰ کے عوض میں پوری کائنات کی دولت دے سکتا تھا لیکن میں کم مایہ تھا۔ میں نے اس کے والد سے وعدہ لیا کہ وہ میرا انتظار کریں گے۔ میں ان کا مطالبہ پورا کر دوں گا۔ انہوں نے وعدہ کر لیا اور اس کے بعد میں مشین بن گیا میں رات دن محنت کرتا تھا میں نے ہر وہ کام کیا جو میرے شایان شان نہیں تھا۔ میں دن کو ملازمت کرتا رات کو مزدوری کرتا میری زندگی کا ایک ایک لمحہ کٹھن گزر رہا تھا لیکن ان کٹھن لمحات میں عظمیٰ کی تھوڑی کے گڑھے میں مسکراتے ہوئے مل کا تصور مجھے حوصلہ دیتا اور میری ہمت پہلے سے بلند ہو جاتی اور پھر میری لگن کام آتی میں نے عظمیٰ کے والد کا مطالبہ پورا کر لیا اور وہ مل مجھے مل گیا۔ میں خود کو پوری کائنات کا مالک سمجھنے لگا اور ہماری زندگی کے چار ماہ آنکھوں میں گزر گئے میں نے جو کچھ جمع کیا تھا وہ عظمیٰ کے والد کو دیدیا عظمیٰ کو خوش رکھنے کے لئے میرے پاس صرف محبت تھی جسے اس نے صرف تین ماہ قبول کیا اور اس کے بعد وہ اس محبت سے آگاہ گئی اس نے مجھ سے بنیادی چیزوں کا مطالبہ شروع کر دیا۔ میں اس مل کی مسکراہٹ برقرار رکھنا چاہتا تھا میں نے پھر پچھلی زندگی کو دہرایا اور محنت و مشقت کرنے لگا صرف چند

کوئی تعلق رکھتی تھی۔ صوفیہ تیسری دیوار پر پہنچ گئی اور اس دیوار پر لگی ہوئی تصویر یوں میں نصرت کے ذہن کی جھلاہٹ تھی ان تصویروں میں جگہ جگہ اسی عورت کا چہرہ تھا لیکن نصرت نے اس چہرے کو بری طرح مسخ کر دیا تھا ایک تصویر میں عورت کی زبان نکلی ہوئی تھی لیکن وہ سانس کی زبان کی طرح پوشا نہ تھی ایک تصویر میں وہ کنڈلی مارے بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے جسم کے نیچے ہیرے دبے ہوئے تھے غرض عجیب عجیب تصویریں تھیں۔

پورے کمرے کا جائزہ لے کر صوفیہ نصرت کے قریب پہنچ گئی نصرت ایک کرنٹی پر بٹھا مسکرا رہا تھا۔ وہی غمزہ سی مسکراہٹ صوفیہ گہری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”کیا اب بھی تم مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے۔ نصرت مجھے بتاؤ یہ عورت کون ہے اور اس کا تمہاری زندگی سے کیا تعلق ہے؟“

”یہ عورت نصرت کی محراب ہے یہ ایسا زہر ہے جو پہلے پورے جسم کو نیلا کر دیتا ہے اور پھر اسے گلا کر پانی بنا دیتا ہے یہ یہ میری بیوی ہے صوفیہ۔ میری چھٹی بیوی جسے پانے کی آرزو میں میں نے اپنی ہستی فنا کر دی تھی تم اس کی تھوڑی کے گڑھے میں یہ ننھاسا تل دیکھ رہی ہو بالکل ایسا ہی مل جو تمہاری تھوڑی کے گڑھے میں موجود ہے یہ مل میری زندگی کی میراث تھا۔ میں نے اس مل کو چومنے کی تمنا میں دن رات مشقت کی۔ جانوروں کی طرح اور میں اس مل کو چوم کر خود کو تمام کائنات کا شہنشاہ سمجھنے لگا لیکن یہ مل مجھے آسمان کی بلندیوں سے تحت الثریٰ میں لے آیا

ہاں صوفیہ اس کا نام عظمیٰ تھا اور میانے درجے کے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور میرے ساتھ ہی کالج میں زیر تعلیم تھی۔ میں نے کالج میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے عظمیٰ کو دیکھا تھا اور پوری کائنات میری نظروں میں حقیر ہو گئی تھی میں صرف عظمیٰ کو دیکھتا رہا اسے چاہتا تھا اور اسے پانے کی آرزو میں کامیابی کی منازل طے کرتا رہا عظمیٰ نے میری

آگیا۔ وہ پھر خوش انتھی میری حیثیت کباب میں ہڈی کی سی تھی۔ لیکن میں اسے برداشت کرتا رہا۔ اور یہاں تک کہ ہم رائگامانی کے حسین علاقے میں پہنچ گئے۔ یہ ریسٹ ہاؤس اس وقت جوان تھا اور نئے ریسٹ ہاؤس کا وجود تک نہیں تھا۔ ہم اسی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے لیکن مجھے علم نہیں تھا کہ وہ لوگ کباب میں ہڈی نکالنے یہاں آئے تھے ایک رات ہم لوگ اسی کمرے میں بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ عظمیٰ نے اپنے ہاتھوں سے کافی بنا کر چمچے دی۔ اور میں اس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا۔ کافی کامزہ کچھ بدلا ہوا سا تھا لیکن میں نے اس پر توجہ نہیں دی اور کافی پی لی عظمیٰ کے ہونٹوں پر فتح کی تحسکراہٹ رقص کر رہی تھی اور مجھے اختلاف ہو رہا تھا۔

اور پھر جب میری حالت بگڑ گئی تو عظمیٰ نے مجھ سے معافی مانگی اس نے کہا کہ مجھے زہر دینے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ وہ اچھی زندگی گزارنا چاہتی ہے اور اسے یقین ہے کہ میں خلوص دل سے اسے اجازت دوں گا۔

مصور خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر اذیت کے نقوش گہرے ہو گئے تھے۔ وہ دانتوں سے ہونٹ کاٹ رہا تھا جیسے زہر کی جلن اب بھی اسے اپنے سینے میں محسوس ہو رہی ہو اور صوفیہ ساکت نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی اس کا دل غم کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تھا دفعتاً "مصور اپنی جگہ سے اٹھا اور وہ اسے دیکھنے لگی۔ "آؤ میرے ساتھ میں تمہیں کچھ اور دکھانا چاہتا ہوں۔"

صوفیہ خاموشی سے کھڑی ہو گئی۔ اور وہ اس کمرے سے نکل کر ایک اور کمرے میں پہنچ گیا اس کمرے میں بھی تاریکی تھی۔ اس نے وہاں بھی موی شمعیں روشن کر دیں جو ایک شمع دان میں لگی ہوئی تھی اور کمرے میں روشنی پھیل گئی۔

لیکن روشنی ہونے پر صوفیہ بشکل اپنی جج روک سکی، کمرے میں دو انسانی ڈھانچے پڑے ہوئے تھے خونخاک ڈھانچے

"عظمیٰ اسے" نصرت نے ایک ڈھانچے کو ٹھوکر

لمحات عظمیٰ کیلئے بھی رکھ کر باقی وقت بھی اسے خوش رکھنے کی کوششوں میں گزار دیتا تھا لیکن عظمیٰ اس سے مطمئن نہیں تھی اسے کچھ اور چاہئے تھا میں جو کچھ کر رہا تھا وہ کافی نہیں تھا۔

اور پھر میری زندگی میں ایک طوفان نے جنم لیا۔ یہ طوفان عظمیٰ کا ماموں زاد بھائی عرفان تھا عرفان جو بچپن سے آوارہ گرد تھا۔ والدین مر چکے تھے اور وہ خود کسی طرح لندن چلا گیا تھا۔ لندن میں نہ جانے کیا کیا کر کے اس نے کچھ دولت جمع کر لی تھی۔ وطن واپس لوٹا تو اپنے ساتھ کار اور عیشات زندگی کا کافی سامان لایا۔

کراچی میں اس نے ایک خوبصورت علاقے میں بنگلہ خریدا۔ اور پھر اس نے اپنے تمام اعزہ کو مدعو کیا جس میں میں اور عظمیٰ بھی شامل تھے اور عظمیٰ اس امارت سے مسحور ہو گئی وہ عرفان کے خواب دیکھنے لگی عرفان بھی اس میں پوری پوری دلچسپی لے رہا تھا کیونکہ عظمیٰ لاکھوں میں ایک تھی۔ عرفان نے ہمارے گھر آنا جانا شروع کر دیا وہ کئی بار عظمیٰ کو اپنی کار ہی پر سیر کرانے بھی لے گیا۔ اور عظمیٰ ہر وقت اسی کے گرن گانے لگی

میں اپنی زندگی میں طوفان کی آہٹ محسوس کر چکا تھا میں نے دبے الفاظ میں عظمیٰ کو بھی اس طوفان سے آگاہ کیا اور وہ جھلا گئی۔ اس نے کہا کہ میں جسے طوفان سمجھتا ہوں وہ اس کی زندگی کا مقصد ہے اور میرے پیروں تلے زمین نکل گئی میں نے عظمیٰ کی منتیں کیں لیکن وہ بہت دور نکل گئی تھی۔ میں اسے واپس نہ لاسکا۔ میں اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا اس لئے اس سے سختی نہ برت سکا۔ عرفان پوری طرح عظمیٰ پر جھا گیا تھا۔ اور پھر ان لوگوں نے اپنا پروگرام ترتیب دیا عظمیٰ نے انتہائی محبت سے مجھ سے درخواست کی کہ وہ بنگلہ دیش کی سیر کرنا چاہتی ہے میں محبت کے اس لہجے کے لئے ترس گیا تھا میں نے عظمیٰ کی درخواست فوراً

قبولی کر لی۔ لیکن میں یہ جان کر بھج گیا کہ عرفان بھی ہمارے ساتھ جا رہا ہے۔ اور سفر کے اخراجات کی پیشکش اسی کی طرف سے ہے میں اس پیشکش کو ٹھکرا دینا چاہتا تھا لیکن عظمیٰ کی رسیں التجاء میرے کانوں میں گونج رہی تھی ہم ڈھاکہ پہنچ گئے اور عظمیٰ پر نکھار

ہوش ہو جاتی ہے تو میں اسے ستون سے کھول دیتا ہوں اور پھر اس کے سر کو اس شے میں کس دیتا ہوں۔ وہ شے میں پھسی رہتی ہے۔ اور وہیں بھوک پیاس سے دم توڑ دیتی ہے۔“

صوفیہ کے جسم سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ اس نے مصور کے حسین چہرے کی طرف دیکھا اور بری طرح چونک پڑی اس کے خوبصورت خدوخال کرخت ہوتے جا رہے تھے آنکھوں سے وحشت برنے لگی تھی۔ اور اس کے منہ سے بھیاںک آواز نکلی۔

”عظمی! میری پیاری عظمی! میں آج بھی تم سے اسی قدر محبت کرتا ہوں۔ تمہاری تھوڑی کایہ تل آج بھی میرے دل میں محبت کے سوتے کھول رہے رہا آؤ میرے قریب آؤ۔“ وہ دونوں ہاتھ پھیلائے صوفیہ کی طرف بڑھنے لگا۔ اور صوفیہ کے روٹنے کھڑے ہو گئے۔ وہ چند منٹ قبل کا معصوم نصرت نہیں تھا اس کی خوفناک آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی، منہ بھیاںک انداز میں کھلا ہوا تھا اور دانتوں کی قطار باہر جھانک رہی تھی وہ دیوار سے لگ گئی اور نصرت اس کے قریب پہنچ گیا۔ ”تم آج بھی مجھے دھوکا دینا چاہتی ہو عظمی! کیا تم میرے لئے کوئی نیا زہر لائی ہو بتاؤ وہ زہر کہاں سے جواب دو؟“ اس نے صوفیہ کو جھجھوڑا۔ صوفیہ کا حلق خشک ہو رہا تھا نصرت کی خوشخوار آنکھیں اس کے چہرے کے قریب اسے گھور رہی تھیں۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ بلند ہوئے اور اس نے صوفیہ کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا اور دوسرے لمحے گریبان نیچے تک پھٹ گیا۔ صوفیہ کے اوپری جسم پر صرف ایک باریک سی باڈی رہ گئی اور نصرت کا ہاتھ اس کے زیریں لباس کی طرف بڑھا صوفیہ کو صورت حال کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا اس نے مدافعت کی کوشش کی لیکن نصرت کی خوفناک قوت کے سامنے ایک نہ چل سکی اور چند لمحات میں وہ برہنہ تھی نصرت نے اسے بازوؤں میں دلوچا اور ستون کے قریب لے گیا اور پھر اس نے اسے ستون سے لٹکی ہوئی زنجیر سے باندھ دیا۔ صوفیہ کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور وہ ستون کے

مارتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ اس کا محبوب عرفان ہے۔“ اس نے دوسرے ڈھانچے کو بھی ٹھوکر رسید کر دی اور صوفیہ کا دل دال گیا۔

”تو کیا تم نے انہیں قتل کر دیا؟“ اس نے لرزتی ہوئی آوازیں پوچھا اور مصور مسکرانے لگا۔

”ہو۔“ اس نے کہا اور وہ شمعیں بجھا کر صوفیہ کے قریب پہنچ گیا پھر اس نے صوفیہ کا ہاتھ پکڑا اور ریسٹ ہاؤس کے ایک اور کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ حسب دستور اس نے اس کمرے میں بھی شمعیں روشن کیں اور صوفیہ ایک بار پھر لرز گئی۔ اس کمرے میں چھ انسانی ڈھانچے بڑے ہوئے تھے وہ خوفزدہ نظروں سے ان ڈھانچوں کو دیکھ رہی تھی۔

”سہ یہ کون ہیں؟“ اس نے پوچھا۔ لیکن مصور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اس کمرے کی شمعیں بھی گل کر دیں اور صوفیہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے وہاں سے بھی نکل آیا۔ اور پھر وہ چوتھے کمرے میں داخل ہو گیا اس نے یہاں بھی شمعیں روشن کیں اور کمرہ جاگ اٹھا، یہ کمرہ بہت پر اسرار تھا یہاں عجیب ساخت کے شے اور اذیت دینے کے دوسرے سامان موجود تھے عین درمیان میں ایک موٹا سا ستون تھا جس سے زنجیر لٹکی ہوئی تھی نصرت نے کمرہ کا دروازہ بند کر دیا۔ اور صوفیہ کی طرف مڑا تم مجھ سے ان چھ ڈھانچوں کے بارے میں پوچھ رہی تھیں؟“

”ہاں وہ کسی کے ڈھانچے تھے؟“ صوفیہ نے پوچھا۔ ”وہ رانگائی کی سیر کو آنے والی سیاح لڑکیوں کے ڈھانچے تھے۔ ایسی لڑکیاں جو مجھے پسند آئیں تھیں یہ لڑکیاں کسی نہ کسی طرح عظمی سے مشابہت رکھتی تھیں مختلف اوقات میں یہ لڑکیاں میرے ہاتھ لگی تھیں۔ اور میں انہیں یہاں لے آیا۔ یہ کمرہ جسے تم دیکھ رہی ہو۔ میں نے اسے ”اذیت گاہ“ کا نام دیا ہے۔ یہاں میں عظمی سے انتقام لیتا ہوں اپنی محبت کا انتقام پہلے میں عظمی کو اس ستون سے جکڑ لیتا ہوں۔ تم سامنے دیوار پر وہ کوڑا لٹکا ہوا دیکھ رہی ہو میں عظمی کے جسم کو برہنہ کر کے اس پر کوڑے برساتا ہوں اس کے جسم پر جگہ جگہ خون رہنے لگتا ہے اور جسم بدل

عارف وغیرہ کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ اور عارف نے دروازے پر دھکا دیا لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ ”دروازہ کھولو ورنہ توڑ دوں گا۔“ عارف گرجا اور پھر اس نے انتظار کے بغیر دروازے پر ٹکریں مارنا شروع کر دیں۔ رانا دروازہ تھا جس کو دیمک نے خستہ کر دیا تھا چند ٹکڑوں نے کواڑ چوکت سے علیحدہ کر دیئے اور وہ لوگ بھرا مار کر اندر گھس گئے کمرے میں موی شمعیں روشن تھیں پورا کمرہ پرانے زمانے کی اذیت گاہ معلوم ہوتا تھا۔ جہاں بادشاہ وغیرہ اپنے مجرموں کو سزا دیتے ہیں۔ اور کمرے کے درمیان ایک ستون کی آڑ سے صوفیہ کے برہنہ پاؤں نظر آ رہے تھے اس کے ہاتھ زنجیر سے بندھے ہوئے تھے اور آنکھیں بند تھیں۔ شاید بیہوش ہو گئی تھی۔ عارف دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا اور پھر وہ ٹھسک گیا کیونکہ صوفیہ برہنہ تھی۔

”فرزانہ اس کا لباس درست کرو۔ کیا یہ زندہ ہے؟“ عارف نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ لڑکیاں صوفیہ کی یہ حالت دیکھ کر سکتے میں رہ گئی تھیں۔ بہر حال اسے ستون سے کھولا گیا صوفیہ جگہ جگہ سے زخمی تھی اور گہرے گہرے سانس لے رہی تھی فرزانہ وغیرہ نے اسے لباس پہنایا۔

”مگر اس کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا؟“ عارف حیرت سے بولا۔

”وہ بد معاش مصور کہاں ہے؟ دیکھو کمبخت جانے نہ پائے۔“ اچانک جاوید چینا اور نہ جانے کیوں بات سب کی سمجھ میں آگئی۔ نوجوان لڑکے دیوانہ دار اسے تلاش کرنے لگے اتنی دیر میں گورنس اور پروفیسر بھی نئے ریٹ ہاؤس کے چوکیدار کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ انور نے انہیں صورتحال سے آگاہ کیا ریٹ ہاؤس کے چوکیدار کا جسم آہستہ آہستہ کانپنے لگا۔

”فلزوں سے کیسے واپس چلیں سرکار! یہاں کوئی نہیں ملے گا میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ پرانا ریٹ ہاؤس آسیب زدہ ہے بیٹیوں کو یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔“ چوکیدار نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ اور وہ

طرف بڑھا اور اس نے چڑے کا کوڑا اتار لیا۔ ”تو دنیا کے کسی گوشے میں میرے انتقام سے نہیں بچ سکے گی عظمیٰ! میں تیرے جسم کی کھال اٹا دوں گا اور پھر تجھے اس جتنے میں کس دلاں گا۔“ اس کی خوفناک آواز گونجی اور پھر اس نے دانت پیس کر ایک کوڑا صوفیہ کے مرمیں جسم پر رسید کر دیا صوفیہ کوشش کے باوجود اپنی دلدوز چیخ نہ روک سکی اور اس کی چیخ برصرت نے ایک فتنہ لگایا اور پھر اس کا ہاتھ چلنے لگا۔ صوفیہ کی دلخراش چیخیں رات کے سانے کو مجبور کر رہی تھیں۔

”ندیمہ! اچانک فرزانہ نے ندیمہ کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ اور ندیمہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

”کیا ہے؟“ ”یہ چیخیں کیسی ہیں؟ سن رہی ہو؟“ اس نے کہا اور ندیمہ غور کرنے لگی۔ ہواؤں کے دوش پر انسانی چیخیں سانی دے رہی تھیں۔ وہ چیخیں سستی رہیں اور پھر بری طرح چونک پڑی۔

”ایں“ فرزانہ بھی چونک پڑی اور پھر وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ ”ندیمہ کیا یہ صوفیہ کی آواز نہیں ہے؟“ ”کیسی ہی لگتی ہے۔“ ندیمہ نے اضطراب سے کہا۔ اور فرزانہ باہر کی طرف پھاگی لڑکوں کے کمرے میں بھی کسی نے چیخیں سن لی تھیں۔ چنانچہ جیسے ہی فرزانہ باہر نکلی عارف نے اس سے پوچھا۔

”کیا بات ہے فرزانہ کون چیخ رہا ہے؟“

”عارف بھائی صوفیہ، صوفیہ نہیں ہے، ہمارے ساتھ ہی سوئی تھی۔“ فرزانہ رد ہاسی آواز میں بولی۔

”وہ!“ عارف نے کہا اور تمام لڑکے بے تحاشہ باہر دوڑے، چیخوں کی آواز دور کی معلوم ہوتی تھی لڑکے اور لڑکیاں آواز کی سمت دوڑ رہے تھے کسی کو تن بدلا ہوا ہوش نہیں تھا چیخیں ان کی رہنمائی کر رہی تھیں ان کی آن میں وہ پرانے ریٹ ہاؤس کے نزدیک پہنچ گئے اس وقت کسی کو کچھ یاد نہ تھا صوفیہ کی چیخیں اب بھی سانی دے رہی تھیں اور ریٹ ہاؤس میں ایک کمرے سے ہوشی چھن رہی تھی۔

نقشِ دوام

ایم اے راحت

مجبوراً اس نے ہانگ کانگ جانے کی تیاری کرنی پڑی۔ سیٹھ سکندر علی نے بذات خود اسے بریف کیا اور پھر وہ ہانگ کانگ جانے کے لیے تیار ہو گیا جہاز کا سفر اس کے لیے بڑا دلچسپ تھا اسی طرح ہانگ کانگ جہاں اسے ایک ہوٹل میں ٹھہرنا تھا ہوٹل کی رات ایک مقامی شخص نے اس سے ملاقات کی جو صاف اردو بولتا تھا اپنی شناخت کرانے کے بعد اس نے وہ سوٹ کیس شہریار سے لے لیا جو وہ ساتھ لایا تھا پھر دوسرے دن ایک لڑکی نے اس سے ملاقات کر کے ایک نایاب ماڈل اس کے حوالے کیا اور مسکراہٹ کی بجلیاں گراتی ہوئی چلی گئی۔

ایک معاشرتی کہانی، عمران ڈائجسٹ کے آخری صفحات کے لیے



گلابی لباس میں مہکتا گلاب سر پر پلاسٹک اوٹھھے ہوئے دودھ جیسے چہرے پر بھیکے بالوں کی تین چپکی ہوئی۔

”سوری سر۔ ہم آج ہی آپ کے برابر والے گھر میں شفٹ ہوئے ہیں۔ آپ کو تکلیف دینے کی معذرت اگر ماچس دیدیں تو شکریہ۔“ وہ بول رہی تھی اور شہر یار اس کی آواز کی نفی میں کھویا ہوا تھا۔

”آپ اندر آ جایے بری طرح بھیگ رہی ہیں۔“

”پلیز آپ ماچس دے دیجیے۔“

”یہ لائٹر رکھ لیجیے۔“ اس نے جیب سے لائٹر نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ لائٹر لیے ہوئے اس کی انگلیاں شہر یار کے ہاتھ سے چھو کیں اسے زور کا کرٹ لگا تھا۔

”شکریہ پلیز۔“

زور آسمان پر بجلی چمکی بادلوں کا کڑا کا ہوا اور لڑکی غائب ہو گئی۔

”بھائی جان۔ کون ہے۔“ اندر سے ریشم کی آواز سنائی دی جو اس کی بہن تھی۔

شہر یار دروازہ بند کر کے پلٹا تو اس کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی بارش میں بھگی لڑکی اس کے حواس پر بھگی بن کر کھڑی تھی۔

”کون تھا شہر یار۔“ اسی نے پوچھا۔

”اے بھائی جان۔ بولتی بند ہوئی ہے۔“

”وہ لڑکی۔ ماچس مانگنے آئی تھی۔“

”کون۔“

”برابر والے گھر میں نئے کرائے دار آئے ہیں۔“

”ہاں۔ تو پھر۔“

”وہیں سے لڑکی آئی تھی۔ ماچس مانگ رہی تھی۔“

”ہاں۔ آج ہی ان کا سامان آیا ہے چلو

صاف ستر اعلیٰ تھا پڑھ لکھے لوگ

آباد تھا پر امن اور مہذب ایک دوسرے سے رابطہ رکھنے والے اس دن بارش ہو رہی تھی۔ صمد یار صاحب نے نیگم سے بارش کے پکڑے کی فرمائش کی تھی چنانچہ اس وقت باورچی خانے میں چھن چھن کی موسیقی جھکاریں آرہی تھی اور گول گول پوریاں تیل کی کڑاہی میں رقص کر رہی تھیں۔

”یار یہ کڑاہی سے باہر کب آئیں گی۔“ شیر یار نے تنیدوں کی طرح پوریوں کو غور سے ہوئے کہا۔

”کیوں قبلہ والد صاحب۔“ شہر یار بولا۔

”کیونکہ میں تمہارا باپ ہوں۔“

”آہ کاش۔ ہم بھی کسی کے باپ ہوتے۔“ شہر یار حسرت سے بولا۔

”صاحبزادے۔۔۔۔۔“ صمد یار کے جملہ پورا

ہونے سے پہلے دروازے کی کھٹی تیز آواز میں بجی اور سب چونک پڑے۔

”یہ کون آ گیا۔ بارش میں۔“

”جاؤ دیھو۔“ صمد یار بیٹے سے بہت بے

تکلف تھے۔

”میں۔“ شہر یار چپٹاتے ہوئے بولا۔

”اور کیا میں۔ باپ تم ہو کہ میں۔“ صمد یار

نے کہا اس دوران کسی دوبارہ بجی تھی۔ شہر یار

منہ بسورتا ہوا تھا۔ ”مالک دو جہاں مجھے بھی

جلدی سے ایک بیٹے کا باب بنادے۔“ اس کی

بدلے لوں کا سرے سے۔“ وہ دروازے کی

طرف بڑھتے ہوئے بولا اور اس کی چھوٹی بہن

عشنا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

وہ بڑبڑاتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ بارش

خوب تیز تھی وہ دروازے تک جاتے جاتے

بھیگ گیا اس نے جلدی سے دروازہ کھولا۔

دروازہ کیا کھلا جیسے کائنات چمک اٹھی۔

اتنی حسین لڑکی تھی کہ انسان سب کچھ بھول جائے

یہ حقیقت بھی تھی، معاملات تو زندگی کی آخری رات تک کا۔ بن گئی تھی شہر یار نے کچھ اس طرح دل ہارا تھا کہ محبت کے سمندر میں ایک جزیرہ بن گئی ا تھا دل کے اس جزیرے پر جو دستک اتری تھی وہ کبھی نہ بیٹنے والی تھی رفتہ رفتہ اس کی شدت بڑھتی جا رہی تھی اور جب دل کی سرکشی حد سے بڑھ گئی تو اس نے ماں سے کہا۔
”امی۔“

”ہاں۔ کیا بات ہے شہر یار۔“
”امی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“
”خدا خیر کرے۔ ایسی کیا بات ہے کہ تم اتنے سنجیدہ ہو گئے۔“
”امی۔ میں عالیہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے سہوئے لہجے میں کہا اور امی مسکرا دیں پھر بولیں۔
”میں بھی عالیہ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

”اس۔“ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔
”تمہاری.....“ امی نے کہا اور وہ خوشی سے ہانکل ہو گیا۔ اس ہانکل پن میں اس نے عالیہ کے سامنے زبان کھول دی۔
”عالیہ..... میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ عالیہ میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ عالیہ بڑی مشکل سے میں نے تم سے یہ الفاظ کہے ہیں میں جواب چاہتا ہوں۔“
اسے امید نہیں تھی کہ عالیہ بھی اسی آگ میں سلگ رہی ہے اور صرف ایک لمحے کے فاصلے پر ہے اس کی زبان بھی کھل گئی۔
”میں جواب دوں اس کا شیر۔ میں۔ میں ہوں کہاں۔ میں تو تم ہو چکی ہوں شیریں جواب میں نہیں دے سکتی تم دو۔ تم شیریں تم۔“
”تم اپنی امی سے بات کرو۔“

شہس صاحب کا یہ ویران گھر آباد تو ہوا ورنہ وہاں بس بھوت ہی آنے والے تھے۔“
”خدا کرے اچھے لوگ ہوں۔“ امی نے کہا۔
بارش کی یہ رات نقش دور بن گئی ایسا نقش جو کبھی نہیں مٹتا۔

بعد میں عالیہ کے بارے میں سب کچھ پتہ چل گیا وہ چار بہنیں تھیں اور ایک بھائی جو سب سے چھوٹا تھا اس کے والد ایک سرکاری محکمے میں ہیڈ کلرک تھے عالیہ گھر کی سب سے لاڈلی سب سے خوبصورت اور سب سے ذہین تھی گریجویشن کر رہی تھی جبکہ شہر یار کے والد صمد یار کا اپنا چھوٹا سا کاروبار تھا اور شہر یار بھی ملازمت کرتا تھا یوں گھر کے حالات کافی بہتر تھے۔

وہی ہوا جو ہوتا ہے۔ دونوں گھرانوں میں بہت جلد گہرے تعلقات ہو گئے۔ عشنا، عالیہ سے کافی چھوٹی تھی لیکن دونوں گہری دوست بن گئیں۔ عشنا میٹرک میں پڑھتی تھی اور عالیہ یہ کافی۔ عشنا کو بہت جلد پتہ چل گیا کہ بھائی عالیہ میں بہت دلچسپی لیتا ہے وہ دونوں سے خوب چھیڑ چھاؤ کرتی تھی۔
شہر یار یکدم اندر آیا تو وہ بولی۔

”ارے ارے کہاں گھسے چلے آ رہے ہیں۔ پردہ ہے۔“
”کیسے پردہ ہے۔“ پہلے تو شہر یار کچھ نہ سمجھا پھر عالیہ کی ہنسی کی آواز سنا دی تو سمجھ گیا کہ بہنیں شرارت کر رہی ہے اندر داخل ہو کر بولا۔

”ٹھیک ہے ذرا پردہ نشین کی زیارت تو کریں۔“
”وہ تو آپ کر چکے ہیں۔“
”کب۔“

”زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات۔“ عشنا شرارت بھرے انداز میں کہتی۔

”ہاں۔ کہنے لگیں ایک ہفتہ لگ جائے گا
غور کرنے میں۔“
”اف۔ ایک ہفتہ۔“ وہ بولا اور امی اسے
تیز نظروں سے دیکھنے لگیں وہ ٹھنڈی سانس لے
کر خاموش ہو گیا۔

لوگ دن گنتے ہیں وہ لمحے گنتے لگا۔ ایک
ہفتہ دو ہفتے اور پھر ایک مہینہ گزر گیا کوئی جواب
نہیں آیا۔ غضب نہ ہوا کہ عالیہ کا ان کے گھر آنا
جانا بھی بند کر دیا گیا۔ شہریار پر زندگی و بال
ہو گئی۔ وہ عالیہ کو دیکھ کر جیتا تھا اب ایک دم اس پر
قیامت ٹوٹ پڑی تھی کوئی الٹا سیدھا قدم وہ
اٹھانا نہیں چاہتا تھا ورنہ کہیں اور ملنے کی سعی کرتا
کسی کو پتہ چل گیا تو قیامت آ جائے گی۔
اس دوران بے چاری امی کئی بار عالیہ کے
گھر گئی تھیں لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا۔
پھر صبر کا پیکانہ جھلک اٹھا اس نے امی سے کہا۔
”آخر وہ جواب کیوں نہیں دے رہے۔“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“
”آپ ان سے صاف بات کریں امی۔
میں پریشان ہوں۔“
”ٹھیک ہے تم کہو تو میں ان سے دو ٹوک
بات کروں۔“
”ہاں میری امی لیکن کوئی سخت بات نہ
کریں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں کوئی پاگل ہوں۔“ امی
کو اس کے دل کا اندازہ ہو گیا تھا۔ امی کہیں
واپس آئیں تو ان کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ شہریار کا دل
دھک سے ہو گیا بمشکل تھام اس نے امی سے
کہا۔

”کیا ہوا امی۔“
”سر پھرے لوگ ہیں۔ پتہ نہیں خود کو کیا
سمجھتے ہیں۔“
”کیا ہوا امی۔“ اس نے اندھی آواز میں

”میری امی اس سے میں ہمارے
گھر آنا چاہتی ہیں۔“
”میں کیسے کہوں شیری۔ ایسی باتیں بیٹیاں
اپنے منہ سے نہیں کرتیں۔ منہ پر پھٹکا رہی نہ لگتی
ہے۔“ وہ ہنس پڑی۔
”پھر میں کیا کروں۔“ میں بے بسی سے

بولا۔
”امی کو بھیج دو۔“
”اور لیکن تمہاری امی مان جائیں گی۔“
”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“
”عالیہ۔ میری محبت عبادت کی منزل میں
داخل ہو گئی ہے اگر تم مجھے نہ ملیں تو میں زندگی کھو
بیٹھوں گا۔“
”خدا نہ کرے۔ میں بھی تمہارے بغیر جینے
کا تصور نہیں کر سکتی۔“
صدیوں کے فاصلے لمحوں میں طے ہو گئے۔
دونوں کے دل ایک دوسرے کے سامنے کھل
گئے۔

شہریار نے امی کو عالیہ کے گھر بھیج دیا اور
لمحہ لمحہ ان کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ عشنا بھی
امی کے ساتھ گئی تھی۔ امی واپس آئیں تو ان کا
موڈ عجیب سا تھا۔
”کیا ہوا امی۔“ اس نے بے قراری کا
مظاہرہ کیا۔

”کیا ہو سکتا تھا تیرے خیال میں۔ ایسے
فیصلے لمحوں میں ہوتے ہیں۔“
”پھر بھی کچھ تو کہا ہوگا انہوں نے۔“
”ہاں کہنے لگیں اپنے شوہر سے بات
کریں۔ وہ جو بھی فیصلہ کریں گے۔“
”آپ کے خیال میں وہ ہمارے حق میں
فیصلہ کریں گی۔“

”میں نہ تو ولی ہوں نہ درویش کہ سب کچھ
بتا دوں۔ ویسے بھی بڑی گہری عورت ہیں عالیہ کی
آمی۔“

میں ٹپک پڑا اور ابوبات بدل گئے ورنہ سب ٹھیک ہو گیا تھا ہاں کبھی جانے والی تھی اور اب۔
اب۔“

”ہاں اب کیا۔“
”اگلے ماہ شادی کی تاریخ طے ہو گئی ہے۔“

”تم انکار کیوں نہیں کر دیتیں۔“
”کاش میں ایسا کر سکتی۔“
”کیوں نہیں کر سکتیں۔“
”مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے لیکن۔“
”لیکن کیا۔“

”میں خودکشی کر لوں گی۔ یقین کر دو میں زندہ نہیں رہوں گی۔“
”ایسا کبھی نہ کرنا عالیہ۔ ایسا کبھی مت سوچنا۔“

”شیری۔ میں تمہاری جگہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔“
”میں جانتا ہوں عالیہ۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ میں تمہارے بغیر زندہ رہ سکتا ہوں۔“
”شہریار نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

”اب کیا کریں شیری۔ وقت پر لگا کر اڑا جا رہا ہے۔“

”ہاں مجھے اندازہ ہے۔ کروں گا عالیہ کچھ کروں گا۔“ شہریار اتوں کو جاننے لگا کچھ بھی ہو جائے عالیہ کی شادی کسی دوسری جگہ نہیں ہو سکتی۔ ایک ہی راستہ ہے عالیہ کو لے کر کہیں دور نکل جائے دو خاندانوں کو رسوا کر کے۔

کوئی موثر فیصلہ نہیں ہو سکا اور شادی کا دن قریب آ گیا تب اس نے عشنا کے ذریعہ عالیہ کو ایک خط بھجوایا جس میں اس نے عالیہ سے کہا تھا کہ اس کے ساتھ فرار ہونے کے لیے فلاں جگہ آ جائے اور پھر وقت مقررہ پر وہ طے شدہ جگہ اس کا انتظار کرنے لگا۔

عشنا کو نہیں معلوم تھا کہ بھائی ایسا کرے گا۔

”پہلے ہی منع کر دیتے تو کیا تھا اتنے دن تک کیوں زبان بند رکھی اب کھہری ہیں کہ عالیہ کی بات نہیں اور طے ہے۔“
”کیا۔“ شہریار کو چکرا آ گیا۔

”ہاں۔ میں نے کہا پہلے ہی بتا دیتیں تو کیا تھا۔“
”پھر۔“

”میں شرمندہ تھیں۔ ویسے مجھے کچھ اور بھی پتہ چلا ہے۔“
”کیا امی۔“

”ان کے بھائی کا لڑکا ہے جو دہی میں تھا اب وہاں سے واپس آ کر کراچی میں کاروبار کرے گا سب دولت کا کھیل ہے پہلے ان کے دل میں یہ خیال نہیں تھا اب یہ موقع نظر آیا تو چہرہ بدل گئیں سنا ہے وہ بڑے پیسے والے ہیں۔“
”غلط ہے۔ یہ غلط ہے نقصان اٹھائیں گے وہ لوگ۔ نقصان اٹھائیں گے۔“ شہریار نے کہا۔ عالیہ کے لیے وہ ہزاروں زندگیاں قربان کر سکتا تھا اس نے عشنا کے ذریعے عالیہ سے ملاقات کا انتظام کیا۔ عالیہ خود اس کے لیے پاگل تھی مطلوبہ جگہ پہنچ گئی اس نے سسکتے ہوئے شہریار سے کہا۔

”تم میرے روئیں روئیں میں ہو شیری۔ مجھے کسی اور کا ہونے سے بچالو۔“
”نہیں ہونے دوں گا میں تمہیں کسی اور کا عالیہ۔ چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔“
”مجھے یقین دلا دو۔ ورنہ میں کچھ کھا کر مر جاؤں گی۔“

”نہیں مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں ساری دنیا سے لڑ جاؤں گا۔ وہ لڑکا کون ہے جو دہی سے آیا ہے۔“

”ابو کے دوست کا بیٹا ہے۔ ہمارے گھر میں تمہارا رشتہ منظور ہو چکا تھا کہ وہ کمبخت درمیان

بالا خر تھک ہار کر یارو ہم نے تو تسلیم کیا
اپنی ذات سے عشق ہے سچا، باقی سب
افسانے کوئی منزل نہیں تھی، کوئی نظریہ نہیں تھا،
ریل میں ٹکٹ خریدی اور کراچی پہنچ گیا۔ روشنیوں
کے طوفان میں گھرا کراچی جس کی وسعت قلب
بے پناہ ہے وہ سب کو اپنے دل میں جگہ دے دیتا
ہے۔

تھوڑی سی رقم ساتھ لایا تھا سوچا تھا کہ عالیہ
کا ساتھ ہوگا سر چھپانے کا ٹھکانہ تلاش کرے گا
پھر نوکری تلاش کرے گا اور عالیہ کے ساتھ
پریش زندگی گزارے گا لیکن۔
الٹی ہو گئیں سب تدبیریں۔

ایک گندا سا ہوٹل مل گیا اس میں قیام کیا غم
کے طوفان سمیٹے وہ ہوٹل کے کمرے میں پڑا
رہتا۔ ہوٹل کے ایک پیرے نے جس کا نام مجید
خان تھا اس کی۔ کے کیفیت بھانپ کی اور بولا۔
”کس غم کے مارے ہو بابو۔“

”کیوں۔“
”اپن کو لگتا ہے۔ چاہے تو اپن کو یار
بنالو۔“

”کیا فائدہ۔“
”فائدے نقصان کی بات اپن نہیں کرتا۔

باقی تمہارا مرضی۔“ مجید خان نے کہا۔
اور اس نے مجید خان کی پیشکش قبول کر لی۔
مجید خان واقعی کام کا آدمی تھا۔ چند روز کے بعد
اس نے پیشکش کر دی۔

”اپن تمہارے کو مشورہ دے شیریا بابو۔“

”ہاں بولو۔“

”تم ادھر بیرا گیری کرلو۔“

”بیرا گیری۔“

”ہاں جگہ خالی ہے۔ سیٹھ مجید میرے بولا

کوئی بندہ ہو تو لے آؤ۔“

”سیٹھ مجید کون ہے۔“

اس نے تو فرض پورا کر دیا تھا لیکن خط پڑھ کر
عالیہ کے اعصاب کشیدہ ہو گئے اسے شدید چکر
آ گئے۔ اس نے لکھا تھا کہ میں ایسا تو کر سکتی ہوں
لیکن ماں باپ کی عزت کو اس طرح جو توں تلے
روند کر نہیں جاسکتی۔

شیری تمہاری محبت میرے ساتھ قبر تک
جاوے گی میں چھپیں بھی نہیں بھلا سکوں گی مگر میں
ماں باپ کو اپنے لیے ہلاک نہیں کر سکتی۔

وہ آنسو بہاتے ہوئے خط پڑھتی رہی کتنی
بار اس کا دل چاہا کہ شہر یار کے پاس جائے اس
کے سامنے جا کر اس سے بات کرے لیکن رات
کے اس پہر باہر جا کر اس سے ملنا بھی خطرناک تھا
کوئی دیکھے تو کیا سمجھے کل اس کی شادی بھی آنسو
بہانے کے علاوہ کچھ نہ کر سکی ساری رات نیکے پر
سر رکھے سکتی رہی۔

ادھر شہر یار اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وقت
شدید وحشت کے عالم میں گزر رہا آکھیں اس
راستے کو دیکھتے دیکھتے پتھر گئی تھیں۔ سے عالیہ کو
آنا تھا مقررہ وقت گزر گیا۔ ایک بجے، دو بجے
تین بج گئے۔ آس دم تھوڑے لگی۔ پاؤں سن
ہو گئے۔ دماغ تھک کر سو گیا۔

وہ نہیں آئی۔ وہ نہیں آئے گی۔

یہاں تک کہ روشنی نمودار ہونے لگی۔ پر
امید دم توڑ گئی۔ ٹھیک سوچا تم نے عالیہ واقعی ٹھیک
سوچا تم نے۔ میں جانتا ہوں تم کیوں نہیں
آئیں۔ موازنا کیا ہوگا تم نے اس دولت مند
فحش کا اور میرا۔ واقعی دولت ہمیشہ جیت پاتی
ہے ایک کلرک کے پاس نہیں کیا ملتا۔ اب کیا
کردوں یہاں رہنا میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔

وہ وہاں سے سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچا اور
ایک ٹرین آئی تو اس میں بیٹھ گیا۔ انسان کتنا
خود غرض ہوتا ہے صرف اپنے بارے میں سوچتا
ہے وہ اپنی محبت میں ناکام ہوا تو، ماں باپ نہیں
سب کو بھول گیا۔

”اس ہوٹل کا مالک۔ اس کا نام بھی مجید خان ہے۔ بس تھوڑا سا فرق میرے اور اس کے ساتھ۔“

”کیا ہوا کیا بات ہے مجھے بتاؤ تو سہی۔“ اس نے کہا۔
”ہائے معصوم فرشتے۔ جوئے کا اڈہ چلا رہا ہے اور فرشتہ بن رہا ہے چل آگے بڑھ۔“ پولیس والے نے اسے دھکا دے کر کہا۔
”میری بات سنیں۔ یہ گھر میرا نہیں ہے میں تو کچھ روز پہلے ہی یہاں آیا ہوں۔“
”پھر کس کا گھر ہے۔“

”مجید خان کا۔“
”مجید خان کہاں ہے۔“
”اس وقت مجھے نہیں معلوم۔“

”اچھا تو تو تھانے چل۔ مجید خان کو بھی دیکھ لیں گے۔“ پولیس والوں نے کچھ اور جواریوں کو بھی پکڑا تھا لیکن مجید خان اس میں نہیں تھا۔ اسے ساری رات تھانے میں بند رکھا گیا صبح کو مجید خان اس سے ملنے آیا تو وہ غصے سے بولا۔

”یہ تو نے کیا کیا مجید خان۔“

”میری بات سن شیریں۔ تیری زندگی بن جائے گی تھوڑی سی سزا بھگت لے میری جان میں جیل میں تجھے کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔“
”کیا بکواس کر رہا ہے۔ میں شریف آدمی ہوں۔“

”اویار..... شرافت بیکار چیز ہے کوئی فائدہ نہیں ہوگا تجھے شرافت سے۔ ویسے بھی میرا کام پکے پولیس تجھے چھوڑ دے گی۔“
مجید خان کچا کھلاڑی نہیں تھا اس نے خود کو صاف بچالیا اور شیریں کو جوئے کا اڈہ چلانے کے الزام میں سزا ہوگئی۔

تب اس نے جیل کی دنیا دیکھی خود پر سہنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ عالیہ تم نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا محبت کتنی نامراد شے ہے لیکن عالیہ تقدیر نے ساتھ دیا تو تم سے ایک بار ملوں گا

”وہ سیٹھ مجید خان ہے اور اپنا بیروہ مجید خان۔ وہ اپن کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتا ہے۔“

”ٹھیک ہے تم بات کرلو۔“ شیریں نے کچھ سوچ کر کہا۔ دل کے زخم کبھی چین سے سونے نہیں دیتے تھے پیسے بھی ختم ہوتے جا رہے تھے اس نے سوچا یہاں کب تک رہے گا جینے کے لیے کچھ تو کرنا تھا کیوں نہ زندگی کو یکسر بدل دیا جائے چنانچہ اس نے بیروہ گیری قبول کر لی مجید خان نے اسے اپنے کوارٹر میں رہنے کے لیے جگہ دیدی تھی وہاں خوب رونق رہتی تھی مجید خان جو اکراتا تھا اور بہت سے جواری وہاں جو اکھلتے تھے۔ شیریں کی تقدیر نے اسے چمکا دیا تھاپارش کی وہ رات اس پر عذاب بن کر نازل ہوئی تھی اور وہ عشق کے ازار میں مبتلا ہو گیا تھا جس کے لیے در بدر کر دیا تھا لیکن ابھی بہت سے عذاب اس کے منتظر تھے سب کچھ چھوٹ گیا تھا گھر بار ماں باپ بہنیں، لیکن تقدیر ابھی اس سے بہت کچھ چھیننا چاہتی تھی۔

ایسی ہی ایک رات تھی۔

وہ اس رات میں نہ جانے کب تک آنسو بہا کر سویا تھا کہ اچانک زلزلہ سا آ گیا بہت سے لوگ کوارٹر کی دیواریں پھلانگ کر اندر آ گئے تھے۔ یہ پولیس والے تھے جو پوری طرح مسلح تھے انہوں نے اس کی چارپائی الٹ دی وہ زمین پر گرا تو انہوں نے اس کے بدن پر کئی ٹھوکریں ماریں۔

”اٹھ اوئے کھڑے ہو۔“

وہ کھڑا ہو گیا دوسرے پولیس والے نے اسے بالوں سے پکڑ کر دھکا دیا۔ ”بٹھاؤ سالے کو

”تقدیر لے گئی تھی۔“
 ”ہاں پہلے تقدیر ہی لے جاتی ہے۔ اس
 کے بعد بندے کا باہر جی نہیں لگتا۔ کچھ پڑھے
 لکھے ہو۔“
 ”ہاں۔“
 ”ہش کے کام کرو گے۔“
 ”کرنا ہی ہے۔“

”مل جائے گا۔ میرے پاس ہر مرض کی
 دوا ملتی ہے۔ چلو کھانا کھا لو پھر تمہیں آرام کے
 لیے بھجوا دیتا ہوں۔ کسی نئے کام کے لیے خود کو
 تیار رکھنا۔“ کھانا بہت اچھا تھا کھانے سے فارغ
 ہوا تو فضلہ نے ایک آدمی کو بلایا اور بولا۔
 ”انہیں بیس نمبر پہنچا دو۔“ بیس نمبر ایک فلیٹ نمبر
 تھا جس کا تالا کھول کر شہر یار کو اندر جانے کی
 ہدایت کی گئی۔ شہر یار کو کوئی ہتھک نہیں ہوئی تھی
 اب وہ بالکل بدل گیا تھا۔ جیل کے دوستوں نے
 اسے نئی دنیا دکھادی تھی ماضی کو بھلا دیا تھا اس نے
 سوائے ایک نقش کے یہ نقش دوام تھا آخری
 سانسوں کے ساتھ قبر کی گہرائیوں تک کا ہمسفر۔
 فلیٹ خوب آرام دہ تھا سکون کی نیند سویا۔
 صرف عالیہ آئی تھی خواب میں وہ بھی تھوڑی دیر
 کے لیے۔ رات کو فضلہ نے عمدہ کھانا کھلایا تھا۔
 ناشتہ اس نے خود تیار کیا۔ کچن میں ہر چیز موجود
 تھی۔

دن کو گیارہ بجے استاد فضلہ آ گیا۔
 ”مبارک ہو تمہارے لیے پہلا کام نکل آیا۔“
 ”کام۔“

”ہاں تمہیں ہانگ کا نگ جانا ہوگا۔ بہت
 بڑے سیٹھ کا کام ہے تم نے سکندر علی کا نام سنا
 ہے۔“
 ”نہیں۔“

”اب سن لو۔ تمہارا اسی سے واسطہ رہے
 گا۔“

نیل ایک یونیورسٹی ہوتی ہے جہاں ہر طرح
 کی تعلیمات کا بندوبست ہوتا ہے۔ ایک سے
 ایک چھٹے ہوئے مجرم سے اس کی دوستی ہونے
 لگی۔ وہ سب اسے اپنے داؤ پیچ سکھانے لگے اور
 وہ فنکار بنتا چلا گیا پھر ایک دن مجید خان اس سے
 ملنے آیا۔
 ”کیسے ہو دوست۔“

”بالکل ٹھیک ہوں انتظار کر رہا ہوں یہاں
 سے نکلنے کا سب سے پہلے تمہارا میں ادھار
 چکاؤں کا فکر مت کر دو۔“ وقت گزرتا رہا شہر یار
 اب شہر یار نہیں رہا تھا۔ وہ سچ سچ شیر یار بن چکا تھا
 پہلے سے بالکل مختلف جیل میں جیلا اس کا بہترین
 دوست تھا۔

”تیری رہائی آرہی ہے۔“ جیلانے کہا۔
 ”ہاں یار۔“
 ”کیا کرے گا باہر جا کر۔“
 ”کوئی فیصلہ نہیں کیا۔“

”پتہ دیتا ہوں۔ سائیں فضلہ سے مل
 لیتا۔“ جیلانے اسے فضلہ کے بارے میں تفصیل
 بتائی پھر اس کا پورا پتہ بتا دیا اور آخر کار ایک نیا
 شیر یار جیل سے باہر آ گیا۔ ایک معصوم نوجوان
 محبت کا مارا ایک خوفناک روپ اختیار کر گیا تھا۔
 سب سے پہلے اس نے فضلہ کو تلاش کیا باقاعدہ
 ایک اڈہ چلاتا تھا۔

”مجھے استاد جیلانے بھیجا ہے۔“
 ”اوئے ہش کے جیل سے آئے ہو۔“
 ”ہاں۔“

”شکل سے تو شیرینے کا پھول لگتے ہو۔“
 ”اس کے برعکس ہوں۔“
 ”کیا نام ہے۔“
 ”شیری۔“

”اوئے ہش کے نام تو ٹھیک ٹھاک ہے
 شیری بد معاش، ہا ہا چلے گا۔ چلے گا جیل کیوں گئے

بجلیاں گرائی ہوئی چلی گئی۔
 بس یہی کام تھا جس کی اسے ہدایت کی گئی
 تھی اپنے کام کی انجام دہی کے بعد تین دن تک
 اس نے ہانگ کانگ کی سیر کی پھر پاکستان چل
 پڑا۔ ایرپورٹ پر اس کے لیے مکمل انتظام تھا
 چنانچہ اس مجسمے کو ایرپورٹ سے باہر لانے میں
 اسے کوئی دقت نہیں ہوئی اور وہ مجسمہ اس نے
 فضلا کے حوالے کر دیا۔
 ”سیٹھ صاحب تم سے بہت خوش ہیں۔
 ہانگ کانگ میں لطف آیا۔“
 ”ہاں۔“
 ”یہ لو۔ یہ تمہارا معاوضہ ہے۔“ ایک لاکھ
 روپے کے نوٹ اس نے اکٹھے بھی نہیں دیکھے
 تھے۔
 ”یہ۔“
 ”تمہارا معاوضہ ہے۔ اب تین ہفتے تک
 آرام کرو۔“
 ”تین ہفتے تک۔“
 ”ہاں پھر تمہیں دوبارہ ہانگ کانگ جانا
 ہوگا۔ دوسری بار معاوضہ ڈبل ہوگا اور ہاں ایک
 کام اور کرو۔“
 ”کیا۔“
 ”شیو بڑھالو۔ دوسری بار تمہیں داڑھی
 میں جانا ہوگا۔“
 ”ٹھیک ہے۔“
 دوسرا دورہ بھی کامیاب رہا پہلے پیسے ہی ختم
 نہیں ہوئے تھے دو لاکھ اور مل گئے۔ فضلا نے
 کہا۔
 ”یار دنیا بہت خوب صورت ہے دولت
 کماؤ اور لٹا دو۔ یہی زندگی ہے۔“ فضلا نے
 اسے ریس کی لت لگا دی اسے ٹھوڑوں کا کوئی
 تجربہ نہیں تھا چنانچہ ٹھوڑوں نے اس سے وفا نہیں
 کی اور پھر وہ اپنی کمائی کھونے لگا سارے پیسے ختم
 ہو گئے فضلا سے اس نے بھی کچھ نہیں مانگا

”مجھے ہانگ کانگ جانا ہوگا۔“
 ”ہاں۔ بندہ آجائے گا۔ تصویریں وغیرہ
 نکلوا لو تا کہ پاسپورٹ بن جائے۔ اس ہفتے
 تمہیں جانا ہوگا۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ شہریار نے خوش ہو کر کہا۔
 پھر بولا۔ ”استاد فضلا ایک ذمے داری ہے میری
 جس کے لیے میں نے قسم کھائی تھی کہ جیل سے نکل
 کر اسے پوری کروں گا۔“
 ”چھ بٹاؤ۔ اور یہ بھی بٹاؤ کہ میں تمہاری
 کیا مدد کر سکتا ہوں۔“ فضلا نے کہا اور شہریار نے
 اسے پوری کہانی سنا دی جسے سن کر فضلا نے کہا۔
 ”بدلہ لگتا تو نہیں ہے کیونکہ اس نے تمہیں
 انشٹیٹیوٹ آف کرائم بھجوا دیا تھا۔ جہاں سے تم ہیرو
 بن کر نکلے لیکن قسم قسم ہوئی ہے اسے ضرور پوری
 کرنا چاہیے۔“ البتہ ایک ہدایت ضرور کروں گا۔“
 ”جی۔“
 ”قاتل بننے سے گریز کرنا۔“
 ”میں اسے قتل نہیں کرنا چاہتا بس اسے
 تھوڑا سا پیار کرنا چاہتا ہوں۔“ شہریار نے
 سفاک ہنسی ہتے ہوئے کہا اور فضلا بھی ہنسنے لگا۔
 لیکن مجید خان کی تقدیر اچھی تھی وہ اس گھر
 کو چھوڑ کر چاچا کا تھا مسلسل کوشش کے بعد بھی کہیں
 سے اس کا پتہ نہیں چل سکا۔
 مجبوراً اس نے ہانگ کانگ جانے کی تیاری
 کرنی پڑی۔ سیٹھ سکندر علی نے بذات خود اسے
 برف کیس دیا اور پھر وہ ہانگ کانگ جانے کے لیے تیار
 ہو گیا جہاز کا سفر اس کے لیے بڑا دلچسپ تھا اسی
 طرح ہانگ کانگ جہاں اسے ایک ہوٹل میں
 ٹھہرنا تھا، ہوٹل کی رات ایک مقامی شخص نے اس
 سے ملاقات کی جو صاف اردو بولتا تھا اپنی
 شناخت کرانے کے بعد اس نے وہ سوٹ کیس
 شہریار سے لے لیا جو وہ ساتھ لایا تھا پھر دوسرے
 دن ایک لڑکی نے اس سے ملاقات کر کے ایک
 نایاب ماڈل اس کے حوالے کیا اور مسکراہٹ کی

تھوڑا سا بارش میں برے خیالات آئے تھے اس دن وہ بہت پریشان تھا جیب میں پھولی کوڑی نہیں تھی سوائے لمبے چاقو کے جو اسے فضلا نے تحفے میں دیا تھا۔

اسے اپنی رہائش گاہ جانا تھا جو یہاں سے کافی دور تھی وہ سڑک پر پیدل جا رہا تھا کہ ایک ٹیکسی قریب آ گئی ڈرائیور نے اس کے قریب آ کر اس ٹیکسی کی رفتار سست کی کہ شاید کوئی سواری مل جائے۔

وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور اسے چلنے کے لیے کہا پھر اچانک اس کے ذہن میں شیطان داخل ہو گیا اس نے جیب سے چاقو نکال کر ڈرائیور کی گھٹکھٹکی پر رکھ دیا۔ ”چلو ٹیکسی روکو۔“ ڈرائیور کی گھٹکھٹکی بندھ گئی تھی۔

”کتنے پیسے ہیں جیب میں۔“

”تین چار سو مانی باپ۔“ ڈرائیور بری طرح کانپ رہا تھا۔

”نکالو۔“ وہ بولا۔

”مانی باپ میرے چھوٹے چھوٹے۔“

”نکالو اور نہ کھڑے کھڑے کر دوں گا۔“ اس نے گرج کر کہا اور ڈرائیور نے جلدی سے جیب سے ساری رقم نکال کر اس کی طرف بڑھادی۔

”مے لے کر اس نے کہا۔“ چلو گاڑی سے نیچے اتر جاؤ۔“

”مر جاؤں گا مانی باپ۔“ ڈرائیور رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

”نیچے اتر۔“ شہریار گر جا اور ڈرائیور دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا وہ دھیمی آواز میں رو رہا تھا لیکن اس نے پرواہ نہ کی تو ٹیکسی آگے بڑھا دی اس کا ذہن سادہ تھا ان ظلم و ستم کا عادی ہو چکا تھا ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اچانک ایک ذیلی سڑک سے ایک پولیس موبائل نکل آئی یہ سڑک اس سمت سے آئی تھی یہاں اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو چھوڑا تھا۔

پولیس موبائل نے اس کا راستہ بند کر دیا اور مسلح پولیس والے ایک افسر کی سرکردگی میں نیچے اتر آئے وہ ٹیکسی روک کر اسے روک دیا اسے بھون کر رکھ دیتے یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا پھر موبائل سے ٹیکسی ڈرائیور کو نیچے اترتے دیکھ کر اس نے گہری سانس لی تھی چنانچہ وہ ٹیکسی سے نیچے اتر آیا۔

پھر جو ہونا تھا جو ہوا ایک بار پھر اسے جیل یا تراسرانا کر دیا گیا لیکن وہاں اس کا دوست جیلا موجود تھا جو اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

”آ گیا میرا شیر۔ اوئے بڑا بدل گیا تو کتنے دن کی ہے۔“

”صرف ایک مہینہ۔“ شہریار نے لا پرواہی سے کہا۔

”ایک مہینہ۔“ جیلا اگلیوں پر حساب لگانے لگا پھر ایک دم خوش ہو کر بولا۔ ”اوئے۔“

پھر تو ساتھ ساتھ کھلیں گے۔“

دونوں کی ساتھ ساتھ رہائی ہوئی تھی جیل سے باہر فضلا ان کا منظر تھا۔ بن گیا خوب کمانی ہونے لگی لیکن پیسے رکنا کہاں ہے بڑی بڑی رقمیں حاصل ہوتی تھیں بھی ریس کورس کی سیر ہو جانی تھی۔

”مزے کر رہے ہو جانی۔“ جیلا نے ایک دن کہا۔

”مہربانی ہے تمہاری جیلا لیکن ایک حسرت ہے۔“

”کیا میری جان۔“

”ایک بندہ۔ لگ رہا اس سے بدلہ ضرور لیتا ہے۔“

”کون ہے چندا۔“ جیلا نے پوچھا اور شہریار نے مجید خان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا جیلا ہنسنے لگا تھا وقت کچھ اور گزرا پھر ایک دن جب وہ فضلا کے ساتھ موٹر سائیکل پر جا رہا تھا کہ اسے مجید خان نظر آ گیا وہ ایک اسٹور سے نکلا تھا

اور ایک گاڑی میں بیٹھ کر چل پڑا تھا اس کی شان ہی بدلی ہوئی تھی۔
”استاد“ شہریار کے منہ سے گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

”خیر ہے کیا بات ہے۔“
”وہ نیلی گاڑی۔“
”ہاں کیا ہے اس میں۔“

”مجید خان۔“ وہ بولا اور فضلانے موڑ بانیک نیلی کار کے پیچھے لگا دی رات کا وقت تھا ٹریفک بہت کم تھا وہ آرام سے مجید خان کا پیچھا کرنے لگے۔

”کیا کرنا ہے۔“ فضلانے پوچھا اس کی زندگی بس یہیں تک تھی۔ شہریار نے خوشوار لہجے میں کہا۔ مجید خان ایک فلیٹوں کے علاقے میں رکا اور کار کھڑی کر کے آگے بڑھ گیا فضلانے بھی بانیک پارکنگ میں کھڑی کر دی اور مجید خان کے پیچھے پیچھے چل پڑے مجید خان کو گمان بھی نہیں تھا کہ موت پیچھے آ رہی ہے اس نے ایک فلیٹ کی بیل بجائی اور دروازہ ایک خوبصورت سی عورت نے کھولا یہ دونوں سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

”ہاں کیا کہتے ہو۔“ فضلانے بولا۔
”چلتا ہوں۔“ شہریار نے کہا۔ ”تم نگرانی رکھو۔“

”درواہ مت کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ فضلانے بولا اور شہریار آگے بڑھ کر فلیٹ کے دروازے پر پہنچ گیا پھر اس نے کال بیل پر انگلی رکھ دی دروازہ مجید خان نے ہی کھولا تھا شہریار نے چاقو ہاتھ میں سنبھال رکھا تھا دوسرے لمحے اس نے چاقو مجید خان کے پیٹ میں اتار دیا مجید خان کے پیچھے سے پہلے اس نے مزید دو وار اور کئے پھر لات مار کر مجید خان کو اندر بھینک دیا اور خود دروازے سے اندر داخل ہو گیا مجید خان انہیں پر جا پڑا تھا۔

”ہاں میری جان پہچان لے اپنے شیر

لو۔“ اس نے کہا اور جھک کر مجید خان کی ناک کاٹ لی پہچان گئے تا وہ دوبارہ بولا اس وقت عورت آگئی جو شاید مجید خان کی بیوی تھی۔
”نہیں اگر تمہارے حلق سے آواز نکلی تو تم بھی ناک سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔“
یہ دھمکی سن کر عورت کی چیخ حلق میں ہی رک گئی شہریار بولا۔

”کیا کروں تمہارا مجید خان سوچا تو یہ تھا کہ تمہیں اوپر بھیج دوں لیکن مزہ نہیں آئے گا چلو جو اور یاد کرتے رہو کہ تم نے کسی بے گناہ کو جیل بھجوا یا تھا میں نے اپنا قول پورا کر دیا ہے۔“
اس کے بعد وہ باہر نکل آیا تھا اور پھر وہ واپس چل پڑے۔

”مار دیا۔“ فضلانے پوچھا۔
”نہیں۔“
”خوش ہو۔“

”ہاں بڑی آرزو تھی۔“
”اب تو کوئی خلش دل میں نہیں رہ گئی۔“
”خلش۔“ اس کی آواز میں حسرت پیدا ہو گئی جو خلش اس کے دل میں تھی وہ تو زندگی کا حصہ بھی اس رات پھر عالیہ اس کے دل میں جیسے لگی اور اس نے جی پھر کر شراب پی لیکن عالیہ ساری رات سکستی رہی تھی۔

برائی جب قریب آتی ہے تو اسے دور کرنا بہت مشکل ہوتا ہے شہریار کے دل سے بھی سارے احساسات نکل گئے تھے وہ ماں باپ کو بہن کو بھول گیا تھا ہاں اسے عالیہ یاد بھی عالیہ کا نقش اس کے دل میں ایسا بیٹھا تھا کہ نکالنے نہ نکلتا اس نے عالیہ کو شراب میں ڈوبنے کی کوشش کی لیکن یہ بھی ممکن نہیں ہوا ابھی تو عالیہ اس کے دل میں بری طرح سلتی تھی اب وہ شیریں دادا بن گیا تھا ایک خطرناک مجرم قاتل اور نہ جانے کیا فضلانے جیلا اور نہ جانے کون کون پر سب سیٹھ سکندر علی کے لیے کام کرتے تھے اور وہ انہیں اپنے

”سوری سر۔ وہ ہمارے سر پرست ہیں اور آپ ان کے دوست معاوضے کا فیصلہ وہیں کریں گے آپ صرف ہمیں اس بندے کے بارے میں بتائیں۔“

”مجھے حیرت ہے کون تفتیش کرے گا کہ تم کس کو قتل بھی کر سکتے ہو پڑھے لکھے اور شریف آدمی جیسے لگتے ہو۔“

”لگتا ہوں مگر ہوں نہیں کسی کو قتل کرنے کی منزل تک پہنچے پہنچے نہ جانے خود کشی بار قتل ہوتا پڑتا ہے۔“

”ہاں یہ انسان کی زندگی کی کوئی نہ کوئی کہانی ہوتی ہے خیر یہ لو اس میں تمہاری محنت کا معاوضہ ہے۔“ سیٹھ شہباز نے ایک وزنی لفافہ اسے دیتے ہوئے کہا اور اس نے لفافہ جیب میں رکھ لیا۔ ”اور یہ اس کی تصویر جسے تم شکار کرو گے۔“

شہر یار نے تصویر دیکھی اور گردن ہلانے لگا۔ ”کہاں ملے گا۔“

”یہ بھی بتاتا ہوں لیکن ایک خاص بات اور ہے۔“

”بولیں۔“

”قتل کی یہ واردات ڈکیتی کی واردات لگتی چاہیے۔“

”ڈکیتی کی۔“

”ہاں۔“

”کیوں۔“

”قتل کا شبہ میری طرف بھی جاسکتا ہے کیونکہ حال ہی میں میرا اس سے جھگڑا ہو چکا ہے بہت سے لوگ اس کے گواہ ہیں۔“

”ٹھیک ہے اس کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل بتائیں۔“

”وہ میرا بزنس پارٹنر ہے شاید بیک نام ہے میرے ساتھ فیکٹری میں بیٹھتا ہے شہباز اس کے

ایک دن سکندر علی نے اسے طلب کر لیا اسے دیکھ کر وہ مسکرایا۔

”یار تو شکل سے وہ نہیں لگتا جو تو ہے۔“

”میرا قصور نہیں ہے سر۔“

”ہاں مگر یہ بڑے کام کی بات ہے خیر چھوڑ کام کرنا ہے تجھے۔“

”حاضر سر حکم کریں۔“

”پتہ دے رہا ہوں تجھے میرے دوست ہیں شہباز دتی بہت بڑے سیٹھ ہیں ان کا کوئی کام ہے جو تجھے کرنا ہے۔“

”جی سر جی۔“

”کل ٹھیک بارہ بجے اس کے پاس پہنچ جاؤ۔ وہی بتائیں گے۔“

”ٹھیک بارہ بجے وہ شہباز دتی کے آفس میں داخل ہو گیا شہباز دتی نے اسے دیکھ کر خشک لہجے میں کہا۔“

”ہاں کون ہوتا۔ کیا بات ہے۔“

”سکندر علی نے بھیجا ہے مجھے۔“

”تمہیں۔“

”جی سر۔“

”آؤ بیٹھو۔ کیا سکندر نے مجھ سے مذاق کیا ہے۔“

”یہ تو وہی بتا سکیں گے سر۔“

”نہیں میرا مطلب ہے تمہیں معلوم ہے کہ میرا کام کیا ہے۔“

”نہیں سر۔“

”ایک بندے کو اڑانا ہے۔“

”اڑ جائے گا نام اور پتہ بتا دیں۔“

”کتنا معاوضہ لو گے۔“

”آپ سکندر صاحب کے دوست ہیں۔“

”ہاں۔“

”پھر یہ کام وہی کریں گے۔“

بارے میں مکمل یمن میں جاتے ہیں اور وہ ہر ایک کے لیے ایک
 خیال آیا کیا واقعی یہ عالیہ ہی کی تصویر ہے اس
 سے ملتی جلتی کوئی اور بھی ہو سکتی ہے۔

اب کیا کروں۔
 وہ سوچتا رہا تصویر کو گھورتا رہا پھر اس کی
 نظریں ادھر ادھر بھٹکنے لگیں کوئی اور تصویر کوئی اور
 ثبوت اور یہ ثبوت اسے بیڈروم کی ایک الماری
 سے مل گیا یہ تصویروں کا الموم تھا عالیہ اور شاہد بیگ
 کی شادی کا الموم۔

اب شبے کی کوئی محجاش نہیں تھی اس الموم
 میں عالیہ اور شاہد کی شادی کی تصویریں تھیں اس
 کے گھر والوں کی تصویریں بھی تھیں شہر یار پر
 سکوت سی کیفیت طاری ہوئی اس کی آنکھوں میں
 آنسو آ گئے اسے وہ رات یاد آ گئی جب وہ صبح
 تک پتھر کے بت کی طرح کھڑا انتظار کرتا رہا تھا
 اور وہ نہیں آئی تھی۔

آہ کس قیامت کی رات تھی۔

کس قدر جان لیوا انتظار تھا۔

اور پھر صبح ہو گئی تھی۔

لیکن ایک تاریک صبح جس نے سب کچھ
 چھین لیا۔

اس کا شہر۔

ماں باپ۔

عشنا۔ بہن۔

گھر۔ جہاں سارا بچپن گزرا تھا۔

پانچ سال ہو گئے تھے دنیا بدل گئی تھی لیکن
 اب تک ان سے عالیہ کی یاد نہیں نکلتی تھی وہ اب بھی
 اسے اتنا ہی چاہتا تھا وہ شاید اور عالیہ کی شادی کی
 تصویریں دیکھتا رہا اور اس کی آنکھوں سے خون
 چھایا قیامت گزر گئی تھی اس کے دل پر۔

رشتہ منظور ہو چکا تھا مگر اچانک کوئی دینی
 سے آ گیا اور عالیہ اس سے چھین گئی تو یہ شاہد بیگ
 تھا جس نے دولت کے بل پر عالیہ اس سے چھین
 لی تھی۔

تمام تر منصوبہ بندی کرنے کے بعد
 دوسرے دن شہر یار اس خوبصورت پروجیکٹ پر
 پہنچ گیا جہاں شاہد بیگ رہتا تھا شاہد بیگ کا
 ابارٹمنٹ اس وقت لاک تھا ابارٹمنٹ کا تالا
 کھول لینا شہر یار کے لیے معمولی بات تھی اس
 نے مہارت سے تالا کھولا اور اندر داخل ہو گیا
 فلیٹ میں اندھیرا تھا اس نے تمام روشیاں جلا
 لیں اور فلیٹ کی اندرونی سجاوٹ دیکھنے لگا بے حد
 شاندار فلیٹ تھا اور لگتا تھا کہ بے حد دولت مند
 شخص کی رہائش گاہ وہ بڑے بڑے لیمب البتہ دیوار
 پر صرف ایک تصویر لگی ہوئی تھی تیر روشنی میں اس
 نے اس حسین عورت کی تصویر دیکھی اور ان کا دل
 بند ہونے لگا۔

یہ عالیہ کی تصویر تھی۔

اس کی عالیہ کی۔

”عالیہ.....“ اس کے منہ سے نکلا اور وہ

آہستہ آہستہ تصویر کی طرف بڑھ گیا اس کے منہ
 سے آواز نکلی۔ ”تم یہاں کیا کر رہی ہو عالیہ۔
 بولو تم اتنے عرصہ کے بعد میرے سامنے کیوں آئی
 ہو اور مگر تم یہاں کیا کر رہی ہو تم جانتی ہو میں
 یہاں کیوں آیا ہوں اوہ آہ عالیہ تم..... تم اتنے
 عرصے کے بعد آخر کیوں تم یہاں کیوں ہو میں
 یہاں قاتل بن کر آیا ہوں ایک مجرم تمہارے
 سامنے ہے عالیہ آہ کیا یہ تمہارا گھر ہے تمہارے
 شوہر کا گھر کون ہے تمہارا شوہر کیا شاہد بیگ اگر
 ایسا ہے تو میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی
 بات اور کوئی نہیں ہے تقدیر نے مجھے اس شخص
 سے انتقام لینے کا موقع دیا ہے میں نے تمہیں مجھ
 سے چھین لیا تھا آج میں اس سے اس کی زندگی
 چھین لوں گا۔“

”بہت چھپو چھپا ہے۔“
 ”کیا تمہارا نام شہریار ہے۔“
 ”ہاں تم نے یہ نام کیسے سنا۔“
 ”مجھے عالیہ نے ہی تمہارے بارے میں بتایا تھا۔“

”کیا کہا تھا میری روح نے۔“
 ”بس اتنا کہ تم اس کے بڑوس میں رہتے تھے اور اچانک گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔“
 ”بس۔“

”ہاں تمہارے والدین بہت غمزدہ تھے۔“
 ”اور..... اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی زندگی تھے ایک دوسرے کے ساتھ جیتے تھے پھر تم ہماری جنت میں سانپ بن کر آ گئے۔“

”نہیں دوست مجھے تمہاری محبت کا پتہ نہیں تھا۔ میرا تصور نہیں ہے اگر بات مجھے پتہ چل جاتی تو میں خود تم دونوں کی شادی کرانا لیکن عالیہ ہمیشہ مجھ سے دور رہی آج مجھے پتہ چلا کہ وہ کیوں۔ اس قدر اداس رہتی ہے لیکن ایک بات بتاؤ۔“

”پوچھو۔“
 ”تم یہاں ڈاکہ ڈالنے آئے ہو۔ یا مجھ سے اپنے پیار کا بدلہ لینے۔“
 ”میں تمہیں قتل کرنے آیا ہوں لیکن اس کی وجہ کچھ اور ہے۔“
 ”بتاؤ گے۔“

”ہاں سیٹھ شہباز دستی نے تمہارے قتل کی سپاری دی ہے۔“
 ”اوہ۔ مجھے اس کہنے سے یہی امید تھی دیکھو۔ زندگی موت اللہ کے ہاتھ ہے زندگی جانے کے لیے آئی ہے لیکن تم ایک برے انسان کے لیے میری زندگی لے رہے ہو۔ میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں جواب دو گے۔“
 ”بولو۔“

اس نے جیب سے چاقو نکالا اور پھر اس نے شاہد کی ایک ایک تصویر کو چاقو سے گود کر رکھ دیا اب عالیہ کے ساتھ اس کی کوئی تصویر سلامت نہیں رہی تھی اچانک میری دونی دروازے پر ایٹ ہوئی اندر آنے کی آواز سنائی دی اور کوئی سیٹی بجاتا اندر آنے لگا پھر۔ والا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

سامنے شہریار چاقو سنبھالے خونی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ شاہد کا چہرہ خوف سے بڑ گیا اس نے پلٹ کر بھاگنے کی کوشش کی تو شہریار جھلانگ لگا کر اس پر جا پڑا اس کے دو تین گھونسوں نے شاہد کے حواس چھین لئے تب شہریار نے اسے ایک کرسی پر بٹھا کر اس کے ہاتھ پاؤں بکڑ دیے۔

”کک کون ہو تم اور یہ..... یہ تصویریں۔“
 اس نے فرش پر پڑی تصویروں کے ٹکڑوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم ڈاکو ہو۔“
 ”ڈاکو..... ڈاکو میں نہیں تم ہو۔“ شہریار غرایا۔

”ہیں۔ کیا مطلب۔“ وہ بولا۔
 ”تم عالیہ کے شوہر ہو۔“
 ”ایں۔“ وہ چونک پڑا۔ ”تم عالیہ کو کیسے جانتے ہو۔“

”وہ میرا پیار تھا وہ مجھے زندگی سے زیادہ پیاری تھی اور تم نے میری زندگی مجھ سے چھین لی تم دینی سے لوٹنے والے کس سے کیا کیا چھین لیتے ہو تم نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔“
 ”لیکن پانچ سال ہو گئے میری شادی کو اور تم اب۔ تم اب مجھ سے بدلہ لینے کے لیے آئے ہو۔“
 ”پانچ سال بعد میری۔ یہ خوبصورت موقع عطا کیا ہے۔“

”اوہ ایک بات بتاؤ۔“
 ”ہاں پوچھو میری جان پھر مجھے بھی تم سے

”تمہیں عالیہ سے اب بھی محبت ہے۔“
”ہاں اپنی روح سے محبت کبھی کم ہوتی ہے۔“

”پھر تم مجرم کیوں اور کیسے بن گئے محبت تو دلوں میں رحم پیدا کرتی ہے۔“
”تقدیر نے مجھے اس راستے پر لا ڈالا ہے۔“

”ایک بات اور بتاؤ۔“
”ہوں۔“
”تم نے اب تک یہ نہیں پوچھا کہ عالیہ کہاں ہے۔“
”اپنے والدین کے گھر مئی ہوگی۔“

”ہاں وہ وہیں ہے آج مجھے پتہ چلا ہے شہر یار کہ وہ آج تک نہیں جا رہی ہے ہم دونوں کبھی میاں بیوی نہیں بن سکے کیونکہ اس کے دل میں تم تھے..... اور..... ہوا اور بس تمہیں شہباز دستی کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔“

”ہاں ضرور بتاؤ تمہاری اس سے کیا دشمنی ہے۔“
”وہ میرا پرانا دوست ہے کالج کے زمانے کا ساتھی۔ میں نے دہلی میں بڑی دولت کمائی پھر پاکستان آ گیا یہاں میری شادی کا سلسلہ چل پڑا میں نے شہباز دستی کے ساتھ مل کر ایک فیکٹری قائم کی میرے پاس سرمایہ تھا اس کے پاس تجربہ کاروبار میں میرا حصہ پچھتر فیصد تھا اور اس کا پچیس فیصد۔ ہم نے سخت محنت کر کے اپنے کاروبار کو بہت آگے بڑھا لیا ہے لیکن اب شہباز دستی کی نیت خراب ہو چکی ہے وہ پورے کاروبار پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور۔“

”اور کیا۔“
”کہتا ہے اپنا سرمایہ واپس لے کر فیکٹری سے دور ہو جاؤ لیکن کچھ اور بھی عوامل ہیں جن کی وجہ سے وہ ایسا ہو گیا ہے۔“

”مثلاً۔“

”کیا مطلب۔“ شہر یار کا سانس رک گیا۔
”عالیہ بھی اس میں ملوث ہے۔“
شہر یار کا ذہن ہوا میں اڑنے لگا اس نے جاتو کھول لیا اور خونی نظروں سے شاہد بیگ کو گھورنے لگا۔
”مجھے اندازہ تھا کہ تم یہ سن کر برا مان جاؤ گے لیکن پوری بات سن لو۔ عالیہ نے مجھ سے بے وفائی نہیں کی بلکہ شہباز دستی نے عالیہ پر نیت خراب کی اور مجھے اپنے راستے صاف کرنے کے لیے تمہیں میرے قتل پر مجبور کیا۔“
”عالیہ کا کیا رویہ رہا۔“
”وہ ایک پاکباز لڑکی ہے یقین کرو اگر وہ آج بھی تم سے محبت کا اقرار کرے تو میں اس سے دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔“

”یعنی۔“
”میں اس کی اور تمہاری محبت کو یکجا کر دوں اس کے پس پردہ ایک اور خواہش بھی ہے۔“ شاہد بیگ نے کہا۔
”کیا۔“
”ظاہر ہے پھر تم مجھے قتل نہیں کر دے لیکن افسوس آج وہ یہاں نہیں ہے۔“
”تو کیا تم۔“
”ہاں میں آج تک اس کا شوہر نہیں بن سکا میں اسے طلاق دے کر تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔“
”کیا۔“ شہر یار کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔
”عالیہ کبھی میری نہیں ہو سکی۔ میرا خیال تھا وہ میری عمر سے منحرف ہے مگر اب مجھے اس کی حقیقت معلوم ہو گئی ہے چنانچہ میں تم سے سودا کر سکتا ہوں۔“
”سودا۔“
”ہاں سودا، مجبوری کا سودا۔“ شاہد بیگ

اداس لہجے میں بولا۔ ”لیکن تم کو کچھ نہیں پتا۔“
 بلاوجہ نہیں کہا۔“
 ”کیا مطلب۔“
 ”کیا تم عالیہ کو حاصل کر کے اپنی مجرمانہ زندگی ختم کرو گے۔“
 ”میں اس کے لیے زندگی ختم کرنے کو تیار ہوں۔“

”ٹھیک ہے عالیہ کو حاصل کرنے کے لیے تمہیں آخری جرم کرنا ہوگا بھی عالیہ تمہیں مل سکتی ہے۔“
 ”آخری جرم۔“

”ہاں۔“
 ”وہ کیا۔“
 ”تمہیں شہباز دستی کو ختم کرنا پڑے گا۔ اس کے لیے میں تمہیں اس ریم سے چار گنا زیادہ ریم دے سکتا ہوں جو اس نے تمہیں دی ہے۔“
 ”شہباز کو سنا گیا عالیہ کے حصول کے لیے وہ سب کچھ کر سکتا تھا اسے ریم کی ضرورت نہیں تھی اسے بس عالیہ درکار تھی محبت بھی ایسے رنگ بھی اختیار کر لیتی ہے پھر اس نے کہا۔ ”مجھے تمہاری بات پر بھروسہ کیسے ہو۔“

”طلاق نامہ“ میں ابھی تمہیں لکھ کر دے سکتا ہوں لیکن تمہیں شہباز دستی کو ختم کرنا ہوگا عالیہ اس وقت تمہیں ملے گی۔“
 ”میں تیار ہوں۔“ شہباز نے کہا اور شاید بیک کے ہاتھ کھولنے لگا۔

واپسی میں وہ عالیہ کی قربت کے نئے میں سرشار جب فلیٹ میں داخل ہوا تو اسے احساس ہوا کہ کوئی اندر موجود ہے اس نے جلدی سے خنجر نکال کر ہاتھ میں لے لیا سامنے کے کمرے میں روشنی تھی وہ آہستہ آہستہ اس کمرے کی طرف بڑھنے لگا اندر جو کوئی موجود تھا اسے بھی کسی کے فلیٹ میں آنے کا احساس ہو گیا لیکن روشنی بند نہیں ہوئی اور دروازہ کھل گیا۔

اس وقت اسے فضلا کی آواز سنائی دی۔ ”اوئے شیر دل“ اوئے شیر دل میں ہوں یار میں ہوں۔“
 ”شہباز نے خنجر والا ہاتھ نیچے کر لیا۔“
 ”تم۔“ وہ بولا۔

”ہاں نا جانی تیری نئی بھابی کے ساتھ۔“
 ”اندر کیسے آ گئے۔“
 ”او بھول گیا دوسری چابی میرے پاس ہے۔“

”اوہ کہاں ہے نئی بھابی۔“
 ”اندر ہے۔“
 ”چلو ٹھیک ہے میں اپنے بیڈروم میں جا رہا ہوں۔“

”اوئے نہیں جانی حیرے ساتھ چائے پیوں گا۔“
 ”ٹھیک ہے چائے بنائی ہے کیا۔“
 ”او نہیں بھابی اب تو میرے لیے چائے بھی نہیں بنائے گا۔“

”ٹھیک ہے بنانا ہوں ڈرائنگ روم میں آ جانا تھوڑی دیر کے بعد۔“ شہباز نے کہا اور فضلا نے اندر جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

فضلا کے بڑے احسانات تھے اس پر اسے فضلا کے اعمال سے غرض نہیں تھی وہ شرابی تھا عیاش تھا شہباز کو اس سے بھی اختلاف نہیں تھا وہ جانے اور اس کا کام فضلا کے کئی بار اسے بھی عیش کوشی کی دعوت دی تھی لیکن یہاں وہ عالیہ سے متخلص تھا اس نے عالیہ کو اپنے دل میں بسا رکھا تھا وہ اس کے خیال سے غدار ہی نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس نے فضلا کی کوئی پیشکش قبول نہیں کی تھی۔

اور آج..... اسے اس کی وفا کا صلہ مل گیا تھا اچھا ہوا اس نے جلد بازی نہیں کی اور شاید بیک کو دیکھتے ہی ٹھکانے نہ لگا دیا ورنہ عالیہ کی کہانی راز میں رہ جاتی شاید بیک اچھا آدمی تھا اس کے عالیہ کی محبت کی قدر کی تھی اور آخر کار۔

پوری کہانی سنائے لگا اس نے شہباز دستی کی پوری کہانی بھی اسے سنا دی اور وہ طلاق نامہ بھی فضلا کو دکھایا جسے دیکھ کر فضلا بہت حیران ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

”کیا بات ہے؟“ شہریار نے پوچھا۔

”یار گڑ بڑ ہو گئی۔“

”ایں..... کیا۔“

”تم شہباز دستی کو قتل کر دو گے۔“

”ہاں۔ میں نے وعدہ کر لیا ہے۔“

”مگر وہ سکندر سیٹھ کا گہرا دوست ہے اور تم جانتے ہو کہ ہم سکندر علی کے گروپ کے بندے ہیں اور وہ ہماری پشت پناہی کرتا ہے۔“

شہریار خاموش ہو گیا پھر اس کی آنکھوں سے آنسو چلک پڑے اس نے آنسو دھوئی آواز میں کہا۔

”فضلا۔ یہ میری زندگی کی پہلی خوشی ہے میرے دوست۔ میں نے آج تک زندگی ترس ترس کر گزاری ہے۔ تڑپتا ترستا رہا ہوں میں زندگی بھر۔ عالیہ مجھے مل رہی ہے مجھے میری کائنات مل جائے گی سب کچھ چھوڑ دیا ہے میں نے عالیہ کے لیے سب کچھ۔“

اس کی سسکیاں جاری ہو گئیں اور فضلا جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

”ارے۔ ارے میری جان۔ ارے ارے تیری آنکھوں میں آنسو ارے میرے یار۔“

”ماں باپ، بہن بھائی سب چھوٹ گئے فضلا بھائی عالیہ کے لیے اور اب وہ مجھے ملی ہے تو..... تو میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔“

”بھائی کہہ دیا تو نے سرے۔ بھائی کہہ دیا ارے پاگل میں بھی تو ترسا ہوں ساری زندگی کسی سے بھائی کا لفظ سننے کے لیے۔ بھائی کہہ دیا تو نے۔ اب کسی کی مجال ہے کہ میرے بھائی کا

آخر کار۔ اسے زندہ رہنا چاہیے وہ میرا اور عالیہ کا محسن ہے۔ بہت بڑی قربانی دے رہا ہے وہ ہم دونوں کے پیار کے لیے۔“

اس نے چائے تیار کی اور ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا کچھ دیر کے بعد فضلا بھی مسکراتا ہوا اندر آ گیا۔

”کیا زبردست خوشبو آ رہی ہے چائے کی۔“

”بیٹھو.....“ اس نے کہا اور فضلا بیٹھ گیا۔

”ہاں جانی۔ تم سناؤ۔“

”بہت بڑی خوش خبری ہے۔“ شہریار نے کہا۔

”اوئے زبردست جانی۔“ فضلا نے چائے کی پیالی اپنی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔

”مجھے عالیہ مل گئی۔“ شہریار خوشی کے عالم میں بولا اور فضلا کے ہاتھ سے چائے کی پیالی مل گئی، عالیہ کے بارے میں اسے تفصیل معلوم تھی۔

”کیا۔“ وہ حیرت سے بولا۔

”ہاں یار مجھے میری زندگی مل گئی۔“

”او میری جان۔ تو میرا میں تیری خوشی میں شریک ہوں۔ کہاں مل گئی۔ کیسے مل گئی مجھے بتا تو سہی۔“ فضلا واقعی خوش ہو گیا۔

”میں..... شاید بیگ کوٹھکانے لگانے گیا تھا مگر شاید بیت وہی بندہ نکلا جو دینی سے آ گیا تھا اور اس نے عالیہ کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ عالیہ اس کی بیوی ہے۔“

”وہ مارا۔ پھر تو تو نے اس ماں کے۔ کے ٹوٹے کر دیے ہوں گے۔“

”نہیں۔“

”ایں۔ چھوڑ دیا اسے۔“

”ہاں۔“

”کیوں۔“

”وہ تو بڑے کام کا بندہ نکلا۔“

”کیسے۔“ فضلا نے پوچھا اور شہریار اسے

کی تو شہر یا رغا کر بولا۔
 ”اپنی زندگی کو اور کم کرنے کی کوشش مت
 کرو مسٹر شہباز۔ دونوں ہاتھ میز پر رکھ لو۔“ یہ
 کہہ کر شہر یار نے چاقو حملہ کرنے کے انداز میں
 پکڑ لیا اور شہباز دستی نے گھبرا کر دونوں ہاتھ میز
 پر سامنے رکھ دیے پھر گھبرائے ہوئے لہجے میں
 بولا۔

”لیکن میں نے تمہیں۔“
 ”ہاں بولو میں تمہیں بات کرنے کی مہلت
 دے رہا ہوں۔“
 ”میں نے تمہیں اسے قتل کرنے کا بھاری

معاوضہ دیا ہے۔“
 ”میں تمہیں وہ رقم واپس بھی کر سکتا ہوں
 لیکن اب کیا کرو گے موت کے بعد وہ رقم
 تمہارے مرس کام آئے گی اسے میرے پاس ہی
 رہنے دو۔“
 ”آخر تمہارا مائنڈ کیسے بدل گیا مجھے بتاؤ تو
 سہی۔“

”میں یہ چاقو پھینک کر تمہیں قتل کر سکتا
 ہوں۔ اس میں ایک لمحہ نہیں لگے گا چاقو تمہارے
 حلق میں پیوست ہو جائے گا۔“
 ”مگر مجھے میری موت کی وجہ تو بتا دو۔“
 ”مجھے باتوں میں لگا کر تم کوئی چالاکی
 کرنے کی کوشش کرو گے تو فوری موت کے شکار
 ہو جاؤ گے۔“

”میں ایسا نہیں کروں گا۔“
 ”شاید بیگ نے تمہارا کپا چٹھا مجھے بتا دیا
 ہے۔“
 ”آہ گویا اس نے تمہیں الٹا میرا دشمن بنا
 دیا۔“
 ”یہ سمجھ۔“

”وہ بہت شاطر ہے شیری آخر کار اس نے
 تمہیں بھی بے وقوف بنا دیا۔“

فضلا کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے دیر
 تک دونوں تاثر میں ڈوبے رہے پھر فضلا نے
 کہا۔

”میں تجھے نئی زندگی کی مبارک باد دیتا
 ہوں۔ اور سن۔ اب شہباز دستی کو تو نہیں میں
 ٹھکانے لگاؤں گا۔“
 ”نہیں بھائی فضلا۔ یہ آخری کام مجھے
 دیانت داری سے کرنے دے۔“

”میری بات سن شیری۔“
 ”جی بھائی۔“
 ”وہ بہت شاطر ہے تجھے کوئی نقصان بھی
 پہنچ سکتا ہے۔“

”نہیں بھائی۔ یہ کام مجھے ہی کرنے دو۔“
 شہر یار نے کہا اور فضلا خاموش ہو گیا۔
 حسب پروگرام شہر یار اس وقت شہباز دستی
 کے آفس میں داخل ہوا جب وہ تھا تھا شہباز کسی
 سے فون پر بات کر رہا تھا شہر یار کو دیکھ کر اس نے
 فون بند کر دیا اور مسکرا کر بولا۔

”آؤ شیری! یقیناً تم شاید بیک کی موت کی
 خوشخبری لائے ہو۔“
 ”نہیں شہباز دستی۔“ شہر یار نے جیب سے
 چاقو نکال کر اسے کھولتے ہوئے کہا اور شہباز کو
 کسی خطرے کا احساس ہو گیا اس نے گھبرائے
 ہوئے لہجے میں کہا۔

”ٹک۔ کیا مطلب۔“
 ”کھیل بدل گیا۔ شہباز سیٹھ۔“
 ”کیا کہنا چاہتے ہو۔“
 ”یہ کہ شاید بیگ کے بجائے اب تمہیں مرنا
 ہوگا۔“

”کیا بکو اس کر رہے ہو۔“
 ”تمہیں تمہاری موت کی خوشخبری دے رہا
 ہوں۔“
 ”لیکن کیوں۔“ شہباز دستی نے چالاکی

”دیہو۔ دیہو۔ میں یہ چاؤ تمہاری گردن پر پھیر دوں گا میں تمہارے کٹڑے کردوں گا مجھے بتا دو تم جھوٹ بول رہے ہو وہ تو بہت اچھا آدمی ہے اس نے میرے لیے اپنی بیوی کو طلاق دیدی ہے یہ دیکھو طلاق نامہ۔“

شہریار نے طلاق نامہ اس کے سامنے کر دیا۔

شہباز دتی نے طلاق نامہ دیکھا اور اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے پھر اس نے کسی قدر زہریلے لہجے میں کہا۔ ”اب تم بیشک مجھے مل کر دو ورنہ میں تمہیں ایک افسوسناک کہانی سنا دوں گا۔“

”کیسی کہانی بتاؤ۔ پلیز بتاؤ۔“

”تمہارا نام شہریار ہے نا۔“

”ہاں۔“ شہریار نے دھڑکتے دل سے کہا۔

”اس کی بیوی کا نام عالیہ تھا۔“

”تھا نہیں ہے۔“ شہریار بولا۔

”تمہیں شہریار عرف شہری۔ ہے نہیں تھا۔“

”تم بکواس بند نہیں کرو گے کیا مطلب ہے تمہارا۔“

”چلو بند کیے دیتا ہوں تمہاری مرضی۔“

”کٹڑے کردوں گا سمجھے کٹڑے کردوں گا تمہارے۔“ شہریار نے شدید جنوب کے عالم میں لبا تیز دھار چاؤ شہباز دتی کے زخروں پر رکھ دیا۔

”اپنے بارے میں سنو تم شاہد بیگ کی بیوی عالیہ کے بڑی تھے پھر تم دونوں کے درمیان عشق ہو گیا تمہاری عالیہ سے شادی ہونے والی تھی لیکن اچانک شاہد بیگ درمیان میں ٹپک پڑا اور عالیہ کے والدین نے دولت کی ریل پیل سے چکا چوند ہو کر عالیہ کی شادی عمر رسیدہ شاہد بیگ سے کر دی۔ کیا سمجھے۔ یہ جھوٹ ہے۔“

”نہیں۔“

”اس نے نہیں تم نے دنیا کو بے وقوف بنا دیا ہے وہ ایک شریف اور بے ضرر آدمی ہے۔“

”بے ضرر۔“ شہباز نے پھینکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

”ہاں بے حد شریف۔“

”ہاں وہ اتنا شریف اور بے ضرر ہے کہ اس ظالم نے اپنی معصوم اور خوب صورت بیوی تک کو سکا سکا کر ہلاک کر دیا۔“

”ویری گڈ۔ نئی کہانی۔“ شہریار ہنس پڑا۔

”کہانی نہیں ایک ایسا سچ جسے دنیا جانتی ہے۔“ شہباز دتی نے کہا۔

”اور دنیا یہ نہیں جانتی کہ تم نے اس کی بیوی کو اپنے جال میں پھانسا چاہا تھا یہیں سے تم دونوں کی دوستی میں جال پڑا۔“

”کیا ہاں نے تمہیں یہ کہانی سنا کی ہے۔“

”یہ کہانی ہے۔“ شہریار نے طنز یہ کہا۔

”ہاں شیریں صرف کہانی۔ اس کی معصوم بیوی اب اس دنیا میں نہیں ہے وہ منوں مٹی کے نیچے سو رہی ہے۔“

شہریار کا دل جیسے بند ہونے لگا اس کے پورے بدن میں کپکپی دوڑ گئی۔ آہ یہ مردود کیا بک رہا ہے شہباز دتی پھر بولا۔

”میں تمہیں اس کی قبر بھی دکھا سکتا ہوں جس پر اس نے برا۔ کتبہ لگوا یا ہے۔“

”بکواس مت کرو۔“ شہریار حلق پھاڑ کر چیخا۔ اور شہباز دتی حیرت سے اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔

”تم اس کی بیوی کے تذکرے پر اس قدر حواس باختہ کیوں ہو گئے۔“

”پلیز۔ یہ بکواس مت کرو۔ پلیز۔ مجھے بتاؤ تم جھوٹ بول رہے۔“

”مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے شہری کیا اس کی بیوی سے تمہارا کوئی رشتہ تھا براہ کرم بیٹھ جاؤ میں تم سے جھوٹ نہیں بول رہا۔“

”اور تم وہی شہر یار ہو۔“
 ”ہاں۔ آگے بولو۔“
 ”چاقو میری گردن کاٹ رہا ہے۔ اسے
 ہٹاؤ۔“

”ایک شرط پر۔“
 ”کیا۔“
 ”تم صرف سچ بولو گے۔“
 ”تمہاری شناخت میرا سچ نہیں ہے۔“
 ”ہاں۔“

”تب میں آگے بھی سچ بولوں گا چاقو
 ہٹاؤ۔“ شہر یار نے جلدی سے چاقو شہباز کی
 گردن سے ہٹا لیا تو اس نے کہا۔ ”یہ طلاق نامہ
 بہت بڑا فراڈ ہے اس نے جان بچانے کے لیے
 تمہارے ساتھ یہ فریب کیا ہے جبکہ تمہارے اور
 عالیہ کے عشق کی کہانی سن کر اس نے عالیہ سے
 بھیاٹک انتقام لیا شادی کے بعد وہ کبھی اپنے میکے
 نہیں جاسکی اس نے چار سال شدید اذیت میں
 گزارے اور پھر زندہ نہ رہ سکی اور سسک سسک
 کر مر گئی۔“

”خدا کے لیے۔ یہ مت کہو۔“
 ”وہ سوکھ کر کاٹا ہو گئی تھی۔ شاید اسے
 ہفتوں بھوکا پیاسا رکھتا تھا شدید اذیتیں دیتا
 تھا۔“

”نہیں پلیز نہیں۔“
 ”بہت سے لوگ گواہ ہیں فیکٹری کے ملازم
 بھی۔ تم چاہو تو میں انہیں بلا کر عالیہ کی موت کی
 تصدیق کرا سکتا ہوں۔“
 ”نہیں۔“ شہر یار پھوٹ پھوٹ کر رو
 پڑا۔

شام کو شہر یار گھر پہنچا تو فضلا اسے دیکھ کر
 چونک پڑا۔ شہر یار کے چہرے پر وحشت برس
 رہی تھی۔ رنگ زرد تھا اور وہ برسوں کا بیمار لگ رہا
 تھا۔

”ارے خیر ہے جانی۔ تمہیں کیا ہوا۔“

”برباد ہو گیا یار۔ نقدیر نے ایک بار پھر
 چرکہ لگا دیا۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔“
 ”مجھے بتاؤ تو..... کیا ہوا۔“
 ”اس نے بہت بڑا دھوکہ کیا ہے میرے
 ساتھ۔“

”کس نے۔“
 ”شاہد بیگ نے۔“
 ”ایں۔ کیسے کیا طلاق نامہ۔“
 ”جسے اس نے طلاق دی ہے وہ اب اس
 دنیا میں ہی نہیں ہے۔“

”کیا۔“ فضلا اچھل پڑا۔
 ”عالیہ کو مرے ہوئے ایک سال گزر چکا
 ہے۔“
 ”کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔“ فضلا سر کھجاتا ہوا
 بولا۔

”ہاں یار۔ اس نے میری عالیہ کو مار دیا۔“
 شہر یار ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا پھر اس نے
 ساری کہانی فضلا کو سنادی۔
 ”یہ تمہیں شہباز نے بتایا ہے۔“

”ہاں۔“
 ”ممکن ہے اس نے بھی اپنی جان بچانے
 کے لیے یہ کہانی گھڑی ہو۔“

”نہیں ہر بات کی تصدیق ہو گئی ہے بہت
 بری طرح اذیت دی ہے شاید نے اسے۔ بہت
 بڑی سزا ملی ہے اسے۔ مار دیا اس نے میری
 عالیہ کو۔ مر گئی میری عالیہ۔“
 ”حوصلہ کرو شہری میرے یار۔ تمہاری
 عالیہ تو اس دن مر گئی جب تم ساری رات اس کا
 انتظار کرتے رہے اور وہ نہ آئی۔“

”وہ بے وفا نہیں تھی مجبور تھی۔“
 ”اس کی مجبوری نے تم سے سب کچھ چھین
 لیا شہری۔“

”میں اس سے شکایت کرنے جا رہا ہوں
 فضلا میرے بھائی۔“

اندازِ فکر

آپ نے
شوہر کیسے ہیں مسز
کون؟

جواب: بہت بیمار

ہیں انہیں خون کی کمی کی شکایت ہے۔ ان کے جسم
میں خون اتنا کم ہے کہ اگر کبھی رات کو دیر تک جاگتے
ہیں تو آگلی صبح صرف ایک آنکھ سرخ ہوتی ہے۔

☆☆☆

سوال: میں نے سنا ہے آپ کے شوہر کی حادثے کا
شکار ہو گئے تھے؟

جواب: ہاں اور اس حادثے میں ان کی ٹانگ ٹوٹ
گئی۔ ہوا یہ کہ انہوں نے کھلے مین ہول میں پہلے
سگریٹ پھینکا اور عادتاً جوتے کی نوک سے اسے
بجھانے کی کوشش کی تھی۔

☆☆☆

ایک استاد نے بچوں کو ہمارے ماں باپ کے عنوان
سے مضمون لکھنے کے لیے دیا۔ ایک بچے نے کچھ اس
طرح سے لکھا ہوا تھا۔

”ہمارے ماں باپ ہمیں اس وقت ملتے ہیں جب
وہ بڑے ہو چکے ہوتے ہیں لہذا ان کی عادتوں کو بدلنا
ہمارے لیے مشکل ہوتا ہے۔“

☆☆☆

ایک مرتبہ میاں بیوی دونوں ایک ساتھ بیمار ہو گئے
مثلاً پیٹ میں درد، چکر آنا، متلی وغیرہ۔ ڈاکٹر کے
خرچے سے بچنے کی خاطر دونوں میاں بیوی نے یہ
طے کیا کہ دونوں میں سے ایک ڈاکٹر کے پاس
جائے۔ انہوں نے ٹاس کیا اور فیصلہ بیوی کے حق
میں ہوا۔

ڈاکٹر سے ملاقات کے بعد واپسی پر جب شوہر نے
بیوی سے پوچھا کہ ڈاکٹر نے کیا کہا تو بیوی نے
مسکراتے ہوئے کہا کہ ”ڈاکٹر کی تشخیص کے مطابق
ہم دونوں امید سے ہیں۔“

”مسک“
”اس دنیا میں۔ جہاں وہ چلی گئی ہے۔“
”کیا فضول بات کر رہے ہو۔“ فضلا

ترپ کر بولا۔

”ہاں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا میں۔ یہ اس
سے بے وفائی ہوگی۔“

”اور شاہد بیک..... اس کا قاتل۔“

”اسے بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ عالیہ کی
عدالت میں۔ وہ روپوش ہو گیا ہے لیکن میرا نام
بھی شہر یار ہے ڈھونڈ لوں گا اسے۔ کتے کی
موت ماروں گا اسے۔ ایسی موت کہ اس نے
خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا۔“

”میری بات سنو شہری۔“

”میرے دوست۔ میرے بھائی۔ مجھے دعا

دو کہ میں اپنی عالیہ کے قاتل کو تلاش کروں۔“

اس کی لگن بچی تھی کہ صرف تین دن کے بعد
ہی شاہد بیک اسے نظر آ گیا وہ ایک ہوٹل میں
داخل ہوا تھا اور شہر یار نے اسے دیکھ لیا تھا۔

پھر کئی گھنٹے شہر یار کو انتظار کرنا پڑا۔ البتہ وہ
اس کی کار کا دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گیا تھا
اسے کام اب اس کے لیے مشکل نہیں ہے۔ پھر
شاہد بیک واپس آیا اور کار میں بیٹھ کر چل پڑا۔
شہر یار کو اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں جا رہا ہے
لیکن ایک سنسان سڑک پر وہ سیٹوں کے درمیان
سے نکل کر سیدھا ہو گیا اور اس نے سیٹوں کی نال
شاہد کی گدی پر رکھ دی۔ شاہد کے ہاتھ اسٹیرنگ
پر بہک گئے تھے۔

”چلتے رہو۔ چلتے رہو میری جان۔ گاڑی

مت روکنا۔“

”تتم..... شہری..... شہر یار۔“

”عالیہ کا شہر یار۔“

”مگر یہ کیا ہے۔“

”پستول۔“

”میری گردن پر کیوں ہے۔“

Downloaded from <https://paksociety.com> "عالیہ" شہر یار کے گھر سے پیرنا چلا گیا۔ شاید بری طرح اپنے فلیٹ پر چلو۔

ترہنے لگا تھا۔
 "تم نے اسے بھوکا رکھا تھا۔"
 شاید کھفی میں گردن ہلانے لگا تھا۔
 "مارا بھی ہوگا۔"
 "اور..... اور۔"

ہر جملے کے ساتھ وہ شاید کے جسم پر چاقو کے وار کرتا جا رہا تھا اور شاید کے جسم سے خون کی دھاریں پھوٹ رہی تھیں لیکن شہر یار کا جنون ختم نہیں ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہے نا عالیہ۔ دیکھو بس میرے آنے کی دیر تھی۔ سارے بدلے چکا دیتا ہوں میں تمہارے۔" شہر یار پر جنون طاری تھا اس کے لبو میں وحشتیں ناچ رہی تھیں اس کے ہاتھ میں دبا چاقو وحشتانہ انداز میں شاید بیک کے جسم کو چھتی کر رہا تھا۔ وہ ہر ضرب کو لگاتے ہوئے مسکرا کر عالیہ کی تصویر کو دیکھتا تھا۔

"ٹھیک ہے نا عالیہ۔ ٹھیک ہے نا میری زندگی، چار سال اذیتیں برداشت کی ہیں نا تم نے میرے لیے دیکھو۔ میں اس سے تمہارا بدلہ لے رہا ہوں۔ دیکھو عالیہ کیا پھڑپھڑا رہا ہے یہ۔"

شاید کا جسم سرد ہو گیا لیکن شہر یار کی وحشت کم نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے شاید کے جسم کا قیمہ کر کے رکھ دیا تھا۔ ایک انچ کی جگہ بھی نہیں چھوڑی تھی۔ پھر وہ خود بھی تھک گیا اور اس نے غور سے شاید کو دیکھا۔

"ارے یہ تو چل بسا مجھ سے پہلے تمہارے پاس پہنچ گیا نہیں میری جان اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں بس ایک منٹ میں آ رہا ہوں۔ آیا میں۔" اس نے چاقو پھینک کر جب سے پستول نکالا اس کی نال اپنی کینٹی پر رکھ کر ٹریڈر دبا دیا۔

﴿.....﴾

کچھ دیر کے بعد شہر یار شاید بیک کو پستول کے۔ فلیٹ میں داخل ہو گیا۔ اندر پہنچ کر روئیاں جلاں اور پھر ایک زوردار لالت شاید کی کمر پر رسید کی اور شاید پھل کر دور جا گرا۔

"آخر..... آخر....." اس کے منہ سے نکلا۔ موت کے سائے اس کے چہرے پر قصاں ہو گئے تھے۔

"تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے شہر یار۔"

"عالیہ کہاں ہے۔" شہر یار غرایا۔

"میکے۔ میکے گئی ہے وہ۔"

"افسوس۔ میکے تو تم نے اسے ایک بار بھی

نہیں جانے دیا۔"

"اس مکار شہباز نے تمہیں یہ کہانی سنائی ہوگی۔"

"نہیں اس نے نہیں بہت سے لوگوں نے۔ تم میری اس سے بات کر سکتے ہو لو میرے فون سے اس کا نمبر ملاؤ۔ بات کر اؤ میری اس سے۔"

"میری بات تو سنو۔"

"ساری باتیں سن لی ہیں میں نے بس اب دیر نہ کرو۔ ہم دونوں عدالت عالیہ میں چل رہے ہیں وہیں چل کر باتیں کریں گے۔"

شہر یار نے پستول جیب میں رکھ کر چاقو نکال لیا اور شاید لڑ گیا۔

"شہر یار..... مجھے معاف کر دو۔ میں تمہیں اتنی دولت دوں گا کہ....." ابھی شاید نے اتنا ہی کہا تھا کہ شہر یار باز کی طرح چھٹا اور اس نے شاید کو دیو بج لیا پھر اس کی فیص کی آستین کاٹی اور اسے رول کر کے شاید کے حلق میں ٹھونس دیا۔

اب شاید صرف اشاروں سے اس سے معافی مانگ رہا تھا۔ زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا تب شہر یار نے اس کے بازو میں چاقو پیوست

مستور کہ جرم

ایم، اے، راحت

اُس ذہین دوشیزہ کی داستان عبرت جس
نے اپنی عیاری سے دو امیر کیوں اشخاص
کو اس انداز سے ٹوٹا پھانکے....

ایم، اے راحت کے قلم سے ایک کرائم کہانی،

ہو گئے تھے اور لے دے کر پرویز کی تنخواہ رہ جاتی تھی اسی
تنخواہ میں مستقبل بھی بنانا تھا۔ آنے والے دنوں کا خیال
بھی کرنا تھا۔ آج دو کل تین اور پھر چار۔ گھر کے اخراجات
میں اور تو کوئی کمی نہیں کی جاسکتی تھی بس ہارون کی کمی
کردی گئی۔

ہارون شروع ہی سے پچھ حساس تھا۔ دل میں اس نے
سوچ رکھا تھا کہ بس دو سال اور بڑھ لے اس کے بعد بھائی
کے کاندھے سے کاندھا ملا کر کھڑا ہو جائے گا۔ لیکن بھانج
گھر میں آئی تو بھائی کے اطوار ہی بدل گئے۔ پھر جب پرویز
نے کہا ”ہارون! اب تم بڑھنا چھوڑ دو۔ میٹرک کر چکے ہو
کوئی نوکری کرو۔ تم کو تو میں تمہارے لئے کوشش
کروں؟“ تو وہ حیران رہ گیا۔

”بھائی جان بس دو سال بعد۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہو ہارون۔ یہ دو سال کیسے گزر س
گے؟“ نہ تن پر کپڑا نہ پیٹ میں روٹی پہلے اور بات تھی
ہارون اب حالات بدل گئے ہیں۔ میں تمہارے لئے فاتے
بھی کر سکتا ہوں لیکن تمہاری بھابی۔“

”مگر میرا مستقبل بھائی جان۔“

”مستقبل تو ہمارے سامنے بھی ہے۔ ہارون۔“

”بھائی جان۔“

بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو عالم جوانی ہی میں اپنی
ذاتی کوششوں سے کچھ بن جاتے ہیں۔ ورنہ عموماً جب
ذمہ داریوں کا بوجھ حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے اور جوانی
آنے سے پہلے ہی رخصت ہونے لگتی ہے تو انسان دولت
کمانے کی جدوجہد میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اس وقت کی
دولت اس کی اولاد یا دوسرے لواحقین کے لئے کار آمد
ہوتی ہے۔

ہارون بھی ان خوش نصیبوں میں سے ایک تھا۔ جو
ابتدائی جدوجہد سے ہی اپنا مستقبل تانباک بنانے میں
کامیاب ہو گیا تھا۔ والدین بچپن ہی میں سدھار گئے تھے
بڑے بھائی پرویز نے زندگی کے سات سال اس پر صرف
کئے اور جب اس کی جیب میں بھائی کی کفالت اور چھوٹے
سے مکان کی خریداری کے باوجود بیس ہزار روپے جمع
ہو گئے تو اس نے شادی کر لی۔ دس ہزار روپے کی شادی
میں ایسی ہی بیوی مل سکتی تھی جس کے گھرانے میں کبھی
پانچ ہزار روپے بھی نہ جمع ہوئے ہوں۔ وحیدہ کے والدین
نے صاف کہہ دیا کہ لڑکی کے علاوہ ان کے پاس کچھ اور
نہیں چنانچہ پرویز نے لڑکی پر ہی اکتفا کیا۔

لیکن اس کی بیوی نے اس چھوٹے سے گھر میں اتنی
ذمہ داریاں پسند نہ کیں۔ اب تو دس ہزار روپے بھی خرچ



اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ۔ خود کو بہت تجربہ کار سمجھتا ہوں۔ اس لئے تمہارے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

”جی۔“ اس نے متحیرانہ انداز میں توصیف صاحب کو دیکھا۔

”ہاں تم اپنے طور پر اس پیشے کے آدمی معلوم نہیں ہوئے جس میں کام کر رہے ہو۔“

”میں نہیں سمجھا جناب۔“

”سیدھی سی بات ہے، تم نے کسی انتہائی مجبوری کے حالات میں یہ زندگی اپنائی ہے ممکن ہے اس زندگی کو اپناتے ہوئے تمہیں چند روز سے زیادہ نہ گزرے ہوں۔“

توصیف صاحب مسکرا کر بولے، ”انہیں اس بات کی بہت خوشی تھی کہ وہ اپنے تجربے سے کام لے کر ایک مخصوص کے بارے میں انکشاف کر رہے ہیں۔ لیکن ہارون کو اپنے بارے میں بتانے میں کوئی قیاحت نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے کہا۔“ جی ہاں آپ کا خیال درست ہے جناب، میں واقعی مجبوری کی حالت میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔“

”کیوں آخر؟“

”اس لئے کہ انتہائی کوشش کے باوجود مجھے کوئی ملازمت نہیں مل سکی اور ضرورت میری مجبوریوں کی پابند نہیں ہے۔“ ہارون نے جواب دیا۔

”ہاں بیٹے ضرورت انسان کو اتنا ہی مجبور کر دیتی ہے بہر حال میں خود بھی برے حالات سے گزرا ہوں اس لئے تمہارے لئے دل میں درد رکھتا ہوں بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟“

”کچھ نہیں جناب، آج کا کام تو چل جائے گا لیکن میں چاہتا ہوں کوئی باعزت نوکری مل جائے۔“

”میں تمہیں ایک مشورہ دے سکتا ہوں۔“ توصیف صاحب نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“

”میرے پاس ایک دوکان ہے، وہی دوکان جس میں بیٹھ کر میں نے انتہائی عسرت کے دن گزارے تھے لیکن جس نے مجھے ایک بہترین زندگی بخش دی، اسٹیٹ ایجنسی کی حیثیت سے وہ دوکان خاصی مشہور تھی لیکن اپنی مصروفیات میں پھنسنے کے بعد میں نے اسے نظر انداز کر دیا اور اب میرا ایک خوبصورت دفتر ہے تم اگر چاہو تو میں وہ

”نہیں ہارون یقین کو گنجائش نہیں ہے۔ ورنہ میں تم سے یہ بات نہ کہتا میں بالکل مجبور ہوں۔“ پردیز نے کہا اس کے بعد ہارون کے پاس کھنکھانے کے لئے کچھ نہیں رہا۔ اس نے پڑھائی چھوڑ دی اور نوکری کی تلاش شروع کر دی۔

لیکن نوکری ملنا اتنا آسان تو نہیں ہے۔ اس کا بھائی بھی کوشش کر رہا تھا لیکن تقدیر ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ تب ایک شام بھائی برس پڑی۔ ”نوکری کبھی نہیں ملے گی کوئی مزدوری بھی تو کی جاسکتی ہے۔ اتنی سی تعلیم ہے کوئی افسری تو ملنے سے رہی۔“

”نوکوش تو ہو رہی ہے بیگم۔“ پردیز نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”زندگی بھر ہوتی رہے گی اور ہمیشہ ناکامی ہوگی۔“

”تو پھر کیا کیا جائے؟“ بھائی نے پوچھا۔

”یہ تو خود ہارون کو سوچنا چاہیے کہ اب بھائی پر بوجھ نہ بنے تو بہتر ہے۔ ہماری بھی ضروریات ہیں ہمارے بھی ارمان ہیں آپ کان کھول کر سن لیں اگر اب ہارون یہاں رہا تو میں نہیں رہوں گی۔“

اور ہارون کی غیرت بھی جاگ اٹھی۔ ”نہیں بھائی۔ آپ بیس رہیں گی۔ خدا حافظ۔“ وہ اسی وقت گھر سے باہر نکل آیا۔ وہ طبیعتاً نیک فطرت اور سادہ لوح تھا کسی جھل فریب سے بھی واقف نہیں تھا۔ دنیا اچانک اس طرح اجنبی بن جائے گی کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ آج بھرے پرے شہر میں تنہا رہ گیا تھا۔

رات ایک فٹ پاتھ پر سو کر گزاری۔ دوسری صبح بھوک سے نڈھال تھا۔ بھادج کے تیرکانوں میں اتر رہے تھے۔ اس نے سوچا ٹھیک تو ہے۔ مزدوری بھی تو انسان ہی کرتے ہیں ایک کنسٹرکشن کمپنی کے پروجیکٹ پر پینچا۔ مزدوروں کی ضرورت تھی۔ خود بھی مزدوری پر لگ گیا۔ اور شام تک بھوکے پیاسے رہ کر خوب محنت کی۔

اجرت روزانہ ملتی تھی۔ جب دوسرے مزدوروں ساتھ کے اجرت لینے پینچا تو توصیف صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کے ہاتھوں کو دیکھا شکل کو دیکھا اور پھر اسے رک جانے کا اشارہ کیا۔ ”میرے دفتر میں آؤ۔“

اور وہ ان کے پیچھے دفتر میں چلا گیا۔

”میں اس کنسٹرکشن کمپنی کا مالک ہوں۔ اس سے قبل

دوکان تمہیں دے سکتا ہوں۔“

”جناب عالی میری ایک گزارش ہے۔“ ہارون نے کہا۔
”کیا؟“

”دوکان چلنے کا انتظار کرنا ہوگا لیکن میرے حالات مجھے
قطعی اس کی اجازت نہیں دیتے۔“

”میں تمہاری مدد کروں گا۔“ توصیف صاحب نے کہا۔
”کیا کریں گے آپ؟“

”بھئی اس وقت تک جب تک تم اس دوکان کو چلا
نہیں لیتے میں تمہیں ایک مخصوص رقم دے دیا کروں گا۔
یہ رقم قرض کے طور پر ہوگی۔ اگر تمہاری دوکان چل جائے
تو تم مجھے یہ رقم واپس کر دینا۔ ظاہر ہے تمہیں اتنی ہی رقم
کی ضرورت ہوگی کہ تم اپنا کام چلا سکو یا کچھ اور لواحقین
بھی ہیں؟“ توصیف صاحب نے پوچھا۔

”جی نہیں تمنا ہوں اس دنیا میں۔“ ہارون نے جواب
دیا۔

”یہ تو اور اچھی بات ہوئی تمنا لوگ بڑے عیش کی زندگی
گزارتے ہیں تو پھر تم یوں کرو تھوڑی دیر رک جاؤ میں
یہاں کے حساب کتاب دیکھ لوں پھر تمہیں دوکان پر لے
جاؤں گا اگر مناسب سمجھو تو وہیں سو بھی رہنا۔“ توصیف
صاحب نے کہا۔ اور ہارون بخوشی تیار ہو گیا۔

چھوٹی سی دوکان بھی لیکن جیسا کہ توصیف صاحب نے
بتایا تھا بڑی بابرکت تھی۔ ہارون نے اس میں بیٹھنا شروع
کر دیا۔ اسٹیٹ ڈیلر کا بورڈ اس پر دوبارہ آویزاں کر دیا گیا
تھا۔ مکانات کرائے پر اٹھانا اور خرید و فروخت کا کام ہارون
نے سنبھال لیا۔

اور تقدیر یاد رکھتی تھی، کام ایسا چلا کہ وارے نیارے ہو گئے
یا تو یہ دوکان کی برکت تھی یا ہارون کی لگن۔ اس نے دوکان
چلانے میں دن رات ایک کر دیئے تھے، ہر وقت اپنے کام
میں مصروف رہتا تھا اور اتنی محنت کرتا تھا کہ لوگ تصور
بھی نہیں کر سکتے۔ اسے اپنے کام سے دلچسپی تھی اور
توصیف صاحب کی بابرکت دوکان اس کے لئے بھی بابرکت
ثابت ہوئی، اسے دھڑا دھڑکنٹ پلنے لگے مکانات
کرائے پر اٹھواتا تھا۔ خرید و فروخت کا کام کرتا تھا اور
اچھی خاصی کمائی ہو جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ انتہائی
اچھی حالت میں آگیا اور توصیف صاحب کے مشورے
اس کے شامل حال تھے اس نے توصیف صاحب سے جو
رقم لی تھی وہ تو پہلی ہی کوشش میں واپس کر دی تھی۔ اس

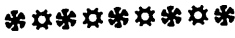
جملہ

جماعت میں استاد نے شاگرد سے کہا کہ لفظ ”مریم“ کو
جملے میں استعمال کرو۔“

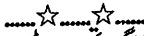
شاگرد نے نہایت سنجیدگی سے یوں جملہ بنایا۔ ”کل
میری بہن بازار گئی۔“

استاد نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”لیکن اس جملے میں مریم
کہاں استعمال ہوا ہے؟“

”جناب میری بڑی بہن کا نام مریم ہے۔“ شاگرد نے
معصومیت سے جواب دیا۔



کے بعد توصیف صاحب کے مشوروں کے مطابق وہ کام
کرتا رہا۔



دوکان ہی اس کا گھر تھی۔ ہوٹل سے کھانا کھایا اور
دوکان میں سو رہا۔ پھر توصیف صاحب نے اسے اسکوٹر
خریدنے کا مشورہ دیا اور اس نے عمل کیا۔ اس کی ساری
آمدنی توصیف صاحب کے پاس جمع ہوتی تھی۔ اس نے
کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کی اتنی رقم جمع ہوگئی ہے۔
پھر ایک دن توصیف صاحب اس کی دوکان پر آئے وہ
اپنے ساتھ کچھ کانڈزٹ لائے تھے۔

”میاں یہاں دستخط کر دو۔“ انہوں نے کہا اور اس نے
آنکھیں بند کر کے دستخط کر دیئے۔

”شکریہ۔ تم نے یہ نہیں پوچھا کہ یہ کانڈزٹ کیسے
ہیں؟“

”پوچھنا بھی نہیں چاہتا۔“

”کیوں؟“

”اس لئے کہ آپ نے دستخط کرنے کے لئے کہا ہے۔
اور یہ بات میں زندگی کے آخری لمحات تک نہیں بھولوں
گا کہ آپ ہی کی وجہ سے میں اس پوزیشن میں آیا ہوں۔“
اودہ شکریہ۔ ہاں تو یہ ایک پلاٹ ہے چھ سو کر کا میں نے
تمہاری جمع شدہ رقم سے خرید لیا ہے۔ اس بریلیوں کی
تعمیر کا اعلان کر دو۔ اور یہاں کا پتا دے کر ان کی بلنگ شروع
کر دو۔“

توصیف صاحب کے مشورے سے ہارون سینٹر کی بلنگ
شروع ہو گئی۔ ہارون سینٹر کے بعد ہارون اپارٹمنٹس اور پھر
ہارون کمپلیکس اور پھر نہ جانے کیا کیا۔

بھی تھا لیکن اس کی زبان لمبی کے سامنے نہ کھل سکی۔ اسے تو کسی ایسی چیز کی ضرورت تھی جو خود آگے بڑھ کر تمام مراحل طے کر لے۔ جو خود اس کی مشکلات کا حل پیش کر دے خود وہ کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ لیکن نا تجربہ کار لڑکیاں اسے ایک مغرور انسان سمجھتی تھیں اور بہت جلد اس سے بدل ہو جاتی تھیں۔

زندگی پر تنہائی کا بوجھ کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تو اس نے ایک اعلیٰ پائے کے کلب کی رکنیت اختیار کر لی۔ وہ باقاعدگی سے کلب جانے لگا۔ کلب میں اس کے بہت سے شناسا تھے طرح طرح کی باتیں کرتے تھے لیکن خود اس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ ان باتوں میں عملی حصہ بھی لے لیتا۔ بس ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ کوئی اسے پہچان لے اور لے اور پہچانے والوں میں اسے جاوداں امام نے پہچان لیا۔

نازک سے خدو خال کی مالک، خوبصورت، خوش لباس اور بچہ امارت لڑکی خود ہی اس کی میز پر پہنچی تھی۔ ہارون اس وقت تنہا بیٹھا سگریٹ سے شغل کر رہا تھا اس کی نظریں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ بہت سے شناساؤں نے اسے سر کی جنبش سے خوش آمدید کہا تھا۔ لیکن اکثر لوگ اپنی اپنی محبواؤں، دوستوں یا بیویوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اس لئے جب تک کوئی اسے دعوت نہ دیتا وہ کسی کی میز پر کیسے جاسکتا تھا؟ چنانچہ اس نے اپنی میز پر تنہا بیٹھنے پر اکتفا کیا اور بیٹھا سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ جاوداں امام خود ہی اس کے عقب سے نکل کر اس کے سامنے پہنچ گئی تھی۔

”بیٹھ سکتی ہوں۔“ اس نے مترنم لہجے میں کہا۔ اور ہارون نے چونک کر اسے دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کی انگلیوں میں سگریٹ لرز گئی اور اس نے دھواں چھوڑتے ہوئے خوش اخلاقی سے کہا۔

”تشریف رکھیے۔“ کم از کم وہ کسی لڑکی کو دیکھ کر اس طرح نروس نہیں ہوتا تھا جس طرح ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس وقت اس نے خود پر کاروباری موڈ طاری کر لیا اور جاوداں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ اور چمکدار آنکھوں نے ہارون کو کسی حد تک ہلکا دیا تھا۔ ”جی فرمائیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ اس نے وہی الفاظ دہرائے جو وہ اپنے آفس میں بیٹھ کر ادا کیا کرتا

دولت کی ریل پیل ہو گئی۔ توصیف صاحب نے ایک خوبصورت دفتر کی چابی اسے دیتے ہوئے دوکان کی چابی مانگ لی تھی۔ ”اس مشربک دوکان کو اب کسی اور ضرورت مند کے لئے خالی کر دو۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

اور ہارون نے چابی ان کے حوالے کر دی۔ توصیف صاحب زیادہ عرصہ اس کا ساتھ نہ دے سکے اور دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے لیکن ہارون کو انہوں نے جن بلندیوں کا راستہ بتایا تھا وہ ان پر بڑھتا ہی چلا گیا۔

اب شہر کے بیچوں بیچ اس کا شاندار دفتر تھا اور اس کے کئی پروجیکٹ کام کر رہے تھے بیشمار ملازم اس کے لئے کام کرتے تھے۔ لیکن اس نے پرویز سے کوئی انتقام نہیں لیا تھا۔ طویل عرصے تک اس نے پرویز کی طرف رخ ہی نہیں کیا۔ لیکن جب اس کی مالی پوزیشن مستحکم ہو گئی تو پرویز سے ملا۔

پرویز اس کے ٹھٹھٹھ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا تھا اب اس کے دو بچے تھے۔ ہارون نے اسے ایک بڑی رقم دی اور کہا کہ وہ آئندہ بھی اس کی ضروریات پوری کرتا رہے گا۔ بھائی نے بھی جلد بلا دیا تھا وہ تین بار وہ اس کی کوشی میں آئیں۔ انہوں نے اپنی چھوٹی بہن کے لئے پیشکش کی لیکن ہارون نے انہیں منہ نہیں لگایا تھا۔

تعمیر کی زندگی میں وہ کنکریٹ کی دیوار بن کر رہ گیا تھا۔ اس کی زندگی میں کبھی کوئی حسین پھول نہیں کھلا تھا خشک اور بے آب و گیہ چٹانوں کی سی زندگی لیکن کبھی کبھی اسے تنہائی کا احساس ہوتا تھا۔

کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ اس کی عالیشان کوشی تنہا اس کی نہ ہو کوئی اور بھی اسے اپنا لے۔ کوئی اور بھی اس کی ذات میں شریک ہو جائے۔ لیکن خود اس کی اپنی صلاحیتیں اس سلسلے میں مفقود تھیں۔

وہ بڑے سے بڑا سودا نمائیت اختیار سے کر سکتا تھا۔ اس سلسلے میں اس کی ذہانت بے مثال تھی۔ لیکن کوشش کے باوجود کسی حسین وجود کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کر سکا۔ حالانکہ اس کی دولت شان و شوکت بچہ متاثر کن تھی ایک بڑے آدمی کی حیثیت سے اسے بڑے لوگوں کی تقاریب میں خاص اہمیت حاصل تھی۔ بہت سی حسین لڑکیوں نے اسے اپنی طرف راغب کیا تھا۔ وہ راغب ہوا

تھا۔

”خوب تو آپ یہاں بھی خدمت کرنے کا جذبہ لے ہوئے بیٹھے ہیں۔“ جاوداں الہک کر بولی اور کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔ ہارون خود بھی مسکرا اڑا تھا۔

”معاف کیجئے گا، عادت سی پڑ گئی ہے۔“

”کیا کرتے ہیں آپ؟“

”جی۔“ ہارون چونک کر بولا۔

”میں نے کہا آپ کیا کرتے ہیں؟“

”بس ایک چھوٹی سی کنسرکشن کمپنی کا مالک ہوں۔“

”جی، آپ کا نام جان سکتی ہوں؟“

”ہارون۔“

”ہارون کنسرکشن؟“ جاوداں نے متحیرانہ انداز میں آنکھیں پھاڑیں۔

”جی ہاں۔“

”واہ۔ آپ تو فرما رہے تھے کہ آپ چھوٹی سی کنسرکشن کمپنی کے مالک ہیں لیکن آپ کی کمپنی تو بہت بڑی ہے، بہت بڑا بزنس کرتے ہیں آپ، کمال کی بات ہے میں تو سوچ ہی نہیں سکتی تھی کہ میں اتنے بڑے آدمی سے مخاطب ہوں۔“

”جی۔“ ہارون نے مختصراً کہا اور سگریٹ سے دوسرا سگریٹ سلگایا۔ اور دھوئیں کے مرغولے بنانے لگا۔

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر ہارون صاحب، دراصل میں کئی دن سے یہاں آ رہی ہوں۔“ جاوداں نے کہا۔

”اچھا، ممبر ہیں آپ یہاں کی؟“

”جی ہاں۔“

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“

”مجھے بھی۔“

”شکریہ۔“ ہارون مسکرا کر بولا۔

”لیکن ہارون صاحب میں نے آپ کو یہاں تنہا دیکھا ہے۔“

”جی ہاں، بد قسمتی نہ ہے میری۔“

”کیوں بد قسمتی کیوں؟ میرا خیال ہے بہت سے لوگ آپ سے شامانی اور دوستی کے خواہاں ہوں گے۔ شائد

آپ ہی انہیں منہ نہ لگاتے ہوں گے۔“

”میں ایسی بات نہیں ہے۔“

”تو پھر کیا بات ہے؟“

”میں نہیں جانتا۔“

”واقعی؟“ جاوداں نے متنبہ لگا ہوں سے اسے دیکھا۔

”جی ہاں میرا خیال ہے میں بد اخلاقی نہیں ہوں۔“

ہارون نے جواب دیا۔ اب وہ کسی قدر کھل رہا تھا۔ اب

ایسی بھی کیا حماقت کہ کسی سے بات کرنے میں بھی ہٹکائے

لگے۔ چنانچہ وہ جاوداں سے بے ٹکان گفتگو کرنے لگا۔

”بہتر ہے آزمائیں گے۔“ جاوداں بولی۔

”ضرور آزمائے۔“

”ہارون صاحب میں آپ کے بارے میں جاننا چاہتی

ہوں، میں جب بھی آپ کے بارے میں سوچتی تھی میرے

ذہن میں عجیب و غریب خیالات جنم لیتے تھے۔“

”مثلاً؟“ ہارون نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”یہی کہ آپ کوئی دھمی انسان ہیں پریشان حال ہیں

ابن النشاہ کے سفرناموں کے

سلسلے کا نیا سفرنامہ،

نگری نگری پھر مسافر

ابن النشاہ کے سفرناموں کے سلسلے کا آخری سفرنامہ

ہے جو جولائی ۱۹۸۹ء میں پہلی بار چھپ کر تیار

ہوا ہے اس سفرنامہ میں جاپان، روس اور لندن

کے سفر کا احوال درج ہے۔

یہ کتاب خوبصورت گٹ اپ کے ساتھ شائع ہوگئی ہے

اور مشہور کارٹونسٹ بھی نے کارٹون بنائے ہیں،

قیمت، ۵۰ روپے

اس پتے پر خط لکھیں یا قریبی بکسٹل سے خریدیں،

لاہور ایڈیڈ ۲۰۵ سرکل روڈ، لاہور،

مسکند عظیم خان ڈائجسٹ، ۳۰۲، اردو بازار، لاہور

ماہوار مجھے ملتا ہے۔ اور یہی میری گزر کا ذریعہ ہے۔“ اس نے بڑی صاف گوئی سے بتادیا۔
 ”ہارون کو اس کا طرز گفتگو اور صاف دلی بے حد پسند آئی تھی۔“ آپ کہاں رہتی ہیں مس جادواں؟“
 ”بروٹو روڈ کے ایک فلیٹ میں۔ وہ فلیٹ پندرہ سو روپے ماہوار کرائے پر میرے پاس ہے ایک ملازمہ ہے اور بس۔“

”آپ سے مل کر واقعی دلی خوشی ہوئی ہے مس جادواں۔“

”جھوٹ“ وہ ہونٹ سیٹھ کر بولی۔

”کیوں جھوٹ کیوں؟“

”مجھ میں ایسی کون سی خوبی ہے کہ کسی کو مجھ سے مل کر خوشی ہو۔“ اس نے نچلا ہوا ایک ادا سے سیٹھرتے ہوئے کہا۔

”یہ بات آپ نہیں جان سکتیں۔“

”جاننا چاہتی ہوں۔“

”آپ کی صاف گوئی۔ آپ کی خوش مزاجی، خوش لباسی وہ قیمتی تھیلے ہیں جو آپ کی ذات میں جڑے ہوئے ہیں۔ ان کی چمک رنگ آپ کی ذات کو لاکھوں میں نمایاں کرتی ہے۔“ ہارون نے کہا۔

”ہارون صاحب، خوابوں میں نہ گھسیٹیں۔“ جادواں حسرت سے بولی۔

”کاش آپ خوابوں میں آئیں۔“ ہارون نے آج پرانی حماقتوں کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس حماقت کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا جو کرتا آیا تھا۔ جادواں نیم باز آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ جیسے سچ سچ خوابوں میں کھو گئی تھی۔
 ”آپ کے دوسرے عزیز ہوں گے؟“ تھوڑی دیر کے بعد ہارون نے پوچھا۔

”نہیں، میں اس معاملے میں بھی بد قسمت ہوں۔“

”تو پھر مس جادواں۔ ممکن ہے حالات کی یکسانیت نے ہی ہمیں ایک دوسرے کے قریب کیا ہے۔ میں بھی تقریباً“ اسی حالات کا شکار ہوں۔“

”کیا مطلب؟“

”تہا۔ تہا۔“ ہارون مسکرا کر بولا۔

”اوہ۔ آپ کے بیوی بچے۔ میرا مطلب ہے گھر کے دوسرے لوگ؟“

”کوئی نہیں ہے۔“

”نجانے کیا ٹریجڈی ہے آپ کے ساتھ۔“
 ”نہ پریشان حال ہوں نہ دکھی ہوں۔ البتہ تیری بات سے میں متفق ہوں۔“ ہنستے ہوئے ہارون نے کہا۔
 ”یعنی کوئی ٹریجڈی ہے آپ کے ساتھ؟“

”جی ہاں۔“

”بھلا کیا؟“

”لوگوں کو متاثر کرنے میں ناکام رہتا ہوں۔ کسی کو دل کی گہرائیاں نہیں دکھا سکتا ہوں یہ صلاحیت نہیں ہے مجھ میں۔“

”کیا واقعی؟“

”یہ حقیقت ہے خاتون۔“ ہارون نے مضحل مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”میں تو نہیں مانتی۔“

”کیوں؟“

”آپ ہر لحاظ سے ایک مکمل انسان ہیں۔ دلکش شخصیت کے مالک، پر اثر حیثیت کے مالک۔ میرا خیال ہے بہت سے لوگ آپ کی قدرت کے خواہاں ہوں گے۔“
 ”نہیں ہیں۔ اب دیکھئے۔ آپ نے میرے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا لیکن اپنے بارے میں بتانے سے گریز کر رہی ہیں۔ صرف اس لئے تاکہ آپ آئندہ مجھ سے ربط نہیں رکھنا چاہئیں۔“ ہارون نہ جانے کیسے کھل گیا۔

”بہت چالاک ہیں آپ لیکن جناب۔ اس خوش فہمی میں نہ رہیں میں آسانی سے آپ کا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔“ جادواں نے ایک انگوٹھی ادا سے کہا۔

”خدا کرے۔“

”کیا کرے خدا؟“

”یہی کہ آپ میرا پیچھا نہ چھوڑیں۔“ ہارون نے کہا اور جادواں پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

آپ دیکھتے رہیے۔ خدا ایسا ہی کرے گا۔ میرا نام جادواں امام ہے۔ میرے والد عادل امام بہت بڑے کاروباری آدمی تھے ماں مریچکی تھی لیکن پانچ سال قبل والد صاحب بھی حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مالی مشکلات کا شکار ہو گئے تھے۔

”اوہ۔ افسوس ہوا۔“ ہارون نے اخلاقاً کہا۔

”لیکن انہوں نے مجھے مالی مشکلات کا شکار نہ ہونے دیا چار لاکھ روپے کا انشورنس مجھے مل گیا اور ایک کوٹھی جو کرائے پر اچھی ہوئی تھی۔ کوٹھی کا کرایہ دس ہزار روپے

ایک حسین لڑکی ہے پرکشش ہے لیکن اس کے باوجود صرف ایک ملاقات میں۔۔۔

اس نے دوسرے روز آنے کا وعدہ کیا تھا۔ ہارون کو دوسرے روز کا انتظار تھا چنانچہ وہ وقت سے پہلے ہی کلب پہنچ گیا۔ جاوداں موجود تھی۔

”ارے۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ میں وقت سے پہلے آگیا ہوں۔“ ہارون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔“ جاوداں دلربا انداز میں بولی اور دونوں کھکھلا کر ہنس پڑے۔

”آپ پہلے کیسے آئیں جاوداں؟“

”بس سوچا تھا کہ کہیں دیر نہ ہو جائے۔“

”آپ لیٹھن کریں میں بھی یہی سوچ کر جلدی آگیا تھا۔“

”ہارون صاحب یہ آثار تو اچھے نہیں ہیں۔“

”میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں۔“ ہارون نے کہا اور دونوں پھر ہنسنے لگے۔

شام ساتھ گزری، لوگوں نے دلچسپ نگاہوں سے اس نئے جوڑے کو دیکھا تھا۔ جاوداں اور ہارون کی جوڑی خاصی خوبصورت لگ رہی تھی۔ اور اس کے بعد روزانہ ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔

واپسی میں ہارون جاوداں کو اس کے فلیٹ پر چھوڑتا، جاوداں عموماً رات کا کھانا اسے اپنے ساتھ ہی کھلاتی تھی۔ بڑی ہی اپنائیت ہو گئی تھی ان دونوں کے درمیان۔ اور ہارون محسوس کر رہا تھا کہ جاوداں بلاشبہ ایک شائستہ اور خوش مزاج لڑکی ہے۔ پھر ایک دن جاوداں نے کہا۔

”کل آپ دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیے۔ ہارون صاحب۔“

”کیوں خیریت ہے؟“

”بس دل چاہتا ہے کہ آپ کو اپنے ہاتھ سے کچھ کھلایا جائے اور کچھ باتیں بھی کرنا ہیں۔“

”بہتر ہے حاضر ہو جاؤں گا۔“

”کوئی خاص کام تو نہیں ہے آپ کو؟“

”نہیں کوئی خاص نہیں۔“

”میں بس ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔“

”میرا خیال ہے ہم اس پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کر لیں۔“ ہارون نے کہا۔

”وہ کیا ہے؟“

”اگر یہ حقیقت ہے تو انوکھا اتفاق ہے۔ میں بھی خود کو بیچہ تنہا محسوس کرتی ہوں ہارون صاحب۔ یہ احساس شدت سے میرے ذہن میں جاگزیں تھا کہ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ آپ کو یوں تنہا بیٹھے دیکھا تو دل کونہ جانے کیوں دکھ ہوا اور میں ہمت کر کے یہاں چلی آئی۔“

”میں آپ کا شکر گزار ہوں جاوداں۔ کیاں پلاؤں آپ کو؟“

”آپ نے ابھی تک کچھ نہیں منگوایا؟“

”آپ کا انتظار کر رہا تھا۔“ ہارون نے مسکراتے ہوئے کہا اور جاوداں بھی مسکرا دی۔ پھر انہوں نے ایک مشروب طلب کیا اور دونوں مشروب کی چکیاں لینے لگے۔

واپسی میں جاوداں ہارون کی خوبصورت کار میں تھی۔

”گھر چھوڑ دیجئے۔“ اس نے کہا اور ہارون اس کے ساتھ چل پڑا۔ چھوٹے سے خوبصورت فلیٹ میں جاوداں اسے ضد کر کے لائی تھی۔

”دیکھیے یہ آپ کے شایان شان تو نہیں ہے لیکن یہی میرا گھر ہے اور بس میں آپ کی دوست ہوں۔“

”جاوداں۔ میں بھی اپنا ماضی بھولا نہیں ہوں۔ جب میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اس لئے براہ کرم ایسی باتیں مت کرو۔ میرا دل دکھتا ہے۔“

جلسہ نہیں کتنی لیکن آپ اطمینان سے بیٹھ جائیے۔ میں آپ کے لئے کافی بنا کر لاتی ہوں۔ کافی پی لیں پھر جائیے گا۔“

”ضرور۔“ ہارون نے کہا۔ اور جاوداں کچن کی طرف چلی گئی۔ ہارون بیچہ خوش تھا۔ اسے ایسے ہی کسی ساتھی کی تلاش تھی۔ جاوداں نے اس کی خوشیوں کو جاوداں کر دیا تھا۔ وہ کافی بنا کر لے آئی۔ اور ہارون نے بڑی شوق سے وہ کافی پی۔ پھر وہ جاوداں سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلا آیا۔

لیکن آج اسے یہ گھر پر رونق معلوم ہو رہا تھا۔

مسمری پر جاوداں اس کے ساتھ تھی۔ اس کے خواب آنکھوں میں بے ہوئے تھے۔ یہ لڑکی۔ یہ لڑکی اگر میری زندگی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آجائے۔

لیکن پھر احتیاط نے دامن پکڑ لیا۔ ”تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو۔ ایک اچھا برنس مین ایک ذہن انسان بھی ہونا چاہیے کسی بھی خوبصورت چیز کو دیکھ کر گر پڑنا سود مند نہیں ہوتا پہلے پرکھو پھر عمل کرو۔“

اور وہ محتاط ہو گیا۔ ہاں ٹھیک تو ہے۔ جاوداں بلاشبہ

کر رکھا ہے۔“
”یہیٹا“ رکھا ہو گا فطرت انسان کو بہت کچھ دیتی ہے۔“
جاوواں نے کہا۔

”تو پھر کیوں نہ آج ہی یہ پروگرام بھی ہو جائے۔“
”نہیں آج نہیں پھر کسی دن۔ اب تو تم کسی دن میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔“

”یہ سب کچھ تمہارا ہی ہے جاوواں۔“
”ہارون کیا تم میرے مسئلے میں اتنے سنجیدہ ہو؟“
”ہاں جاوواں، تم میرے اندر تک میں سنا گئی ہو۔“
”ہارون میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“
”ہاں ہاں کہو تم نے کہا تھا کہ تم مجھ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہو۔“ ہارون نے کہا۔

”ہارون میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میرے پاس کچھ پیسے بڑے ہوئے ہیں۔ میں ان پیسوں کا کوئی صحیح مصرف دریافت نہیں کر سکی، مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“
جاوواں نے کہا۔

”میں دل و جان سے حاضر ہوں جاوواں۔“
”میں یہ چار لاکھ روپے نکال لائی ہوں اور انہیں تمہارے حوالے کرنا چاہتی ہوں۔ میرے مستقبل کو سامنے رکھ کر ان کا کوئی مصرف دریافت کر لو تاکہ میں زندگی کے کسی ایسے پرکسمپری کا شکار نہ ہو جاؤں۔“
جاوواں نے چار لاکھ روپے کے نوٹوں کی گڈیاں اپنے بڑے برس سے نکال کر ہارون کے سامنے رکھ دیں۔ اور ہارون ہنسنے لگا۔

”کیا چاہتی ہو جاوواں؟“
”بس تم انہیں رکھ لو۔“
”تمہاری امانت کے طور پر؟“
”جس طرح بھی چاہو۔“
”جاوواں تمہیں میرے اوپر اس قدر اعتماد ہے؟“
”کیا مطلب؟“
”اگر میں یہ رقم با جاؤں تو؟“
”تو میں یہ سمجھوں گی کہ یہ اس کا صحیح مصرف تھا۔“
جاوواں اس لیے میں بولی۔

”میں پھر وہی سوال کروں گا؟“
”کونسا؟“
”تمہیں میرے اوپر اس قدر اعتماد ہے؟“
”ہاں ہے۔“

”کہوں نہ اب کل میرے آفس آجائیں۔ آفس میں ہی کھانا کھائیں گے پھر شام کو کلب چلے آئیں گے۔“
”جیسی آپ کی مرضی میں تو سوچ رہی تھی کہ آپ کے لئے اپنے ہاتھ سے کچھ پکاؤں۔“
”پھر کسی دن سہی۔ میرا خیال ہے آپ میرے آفس ہی آجائیے۔“ ہارون نے کہا۔ اور جاوواں نے دلربا انداز میں گردن خم کرتے ہوئے کہا۔
”جو مرضی میرے سرکار کی۔ بہتر ہے حاضر ہو جاؤں گی۔“

اور دوسرے دن جاوواں، ہارون کے آفس پہنچ گئی۔ اس نے متحیرانہ انداز میں ہارون کے آفس کو دیکھا اور بولی۔

”ہارون صاحب آپ تو واقعی بہت بڑے آدمی ہیں۔ میں تو آپ کے سامنے احساس کمتری کا شکار ہو گئی ہوں۔“
”نہیں ہونا چاہیے آپ کو۔“
”کیوں نہیں جی۔ میں کیا اور میری بباط کیا، ایک گھٹیا سے فلیٹ میں رہتی ہوں، اب تو میں آپ کا مکان ضرور دیکھوں گی۔“

”ضرور، خود میری دلی خواہش ہے۔“ ہارون نے کہا۔
”جی ہاں میں کسی خواہش کا اظہار کروں تو وہی خواہش آپ کی بن جاتی ہے۔ اس سے پہلے آپ نے بھی اپنے آفس نہیں بلایا۔“ جاوواں شکایتی انداز میں بولی اور ہارون ہنسنے لگا۔

”غلطی تو ہے میری تسلیم کرتا ہوں چلو معاف کر دو۔“
”کیا؟“

”بہت بہت شکریہ جاوواں۔“
”قبول کیا۔“ وہ پھر آنکھیں بند کر کے گردن کو خم دیتے ہوئے بولی اور ہارون نے مسکراتے ہوئے کھانا منگوایا۔
”عمدہ قسم کے کھانے کھاتے ہوئے جاوواں بہت خوش نظر آرہی تھی، وہ مسکراتی نگاہوں سے بار بار ہارون کو دیکھنے لگتی تھی، کھانا کھانے کے بعد انہوں نے کافی پانی اور پھر آرام کرسیوں میں نیم دراز ہو گئے۔“
”تو تمہیں میرا آفس پسند آیا؟“

”واقعی ہارون بہت خوبصورت ہے اس سے تمہاری خوش فہمی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔“
”شکریہ۔ نوازش، کسی دن گھر اور دیکھ لیجئے تمہا ہوں لیکن میں نے اپنے گھر کو کسی گھر عورت کی طرح سے بنا

تھا۔ اور اس سے زیادہ وہ ہارون کو کیا اعتماد دیتی۔ ہارون کئی دن تک اس بارے میں سوچتا رہا۔

جادواں سے ملاقاتیں اور بڑھ گئیں تھیں۔ ہارون نے اسے خوبصورت کوٹھی دکھائی۔ جادواں نے اپنے ہاتھ سے اسے کھانے کا کچرا کھلائے۔ اب انہیں کلب کے سارے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ جب دل چاہتا جادواں ہارون کے آفس پہنچ جاتی۔ ہارون اس کے فلیٹ پہنچ جاتا۔

اس شام بارش ہو رہی تھی موسم کی شراب حواس پر چھائی ہوئی تھی ہارون نے جادواں کو اس کے فلیٹ سے لیا اور وہ بارش میں آوارہ گردی کرنے نکل گئے۔ آج جادواں بسکری رہی تھی۔ دونوں بہت خوش تھے۔

تب اچانک جادواں نے کہا۔ ”ارے ہاں ہارون۔ ایک بات میں تمہیں بتانا بھول گئی۔“

”کیا؟“

”کل دن میں مجھے ایک فون ملا تھا۔“

”کیسا فون؟“

”بڑا جرت انگیز۔ کسی نے مجھے فون کر کے کہا کہ میں آج کل کلب نہیں آ رہی میں نے پوچھا کہ کون صاحب بول رہے ہیں تو اس نے اپنا نام نہیں بتایا۔“

”کون ہو سکتا ہے؟“

”خدا جانے۔ تمہارے خیال میں کون ہو سکتا ہے؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں، کلب میں تو تمہاری کسی سے کوئی خاص شناسائی بھی نہیں تھی۔“

”بالکل نہیں۔ ظاہر ہے میں زیادہ عرصے تک وہاں گئی بھی نہیں اور جب سے گئی ہوں تمہارے ساتھ ہی رہی ہوں۔ کون ہو سکتا ہے۔“ جادواں پر خیال انداز میں بولی۔

”اوندہ ہوگا کوئی چھوڑو۔ موسم کی بات کرو، یہ موسم آج کیا کہہ رہا ہے؟“ ہارون نے کہا۔

”جو کچھ کہہ رہا ہے بہت برا کہہ رہا ہے۔“ جادواں نے شرابے ہوئے انداز میں کہا اور گردن جھکائی۔ وہ در تک بارش کی پھواروں میں بھگتے رہے اور جب تھک گئے تو واپس چل پڑے فلیٹ پر پہنچے تو جادواں نے اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوپر نہیں آؤ گے؟“

”کیوں نہیں۔“ ہارون نے کہا۔ اور کارلاک کر کے اس کے ساتھ فلیٹ پہنچ گیا۔

”کیا کھاؤ گے؟“

”اگر اعتماد ہے جادواں تو تم یہ کیوں سوچتی ہو کہ زندگی کے کسی ایسے پر کم کسی کمپری کا شکار ہو جاؤ گی۔“ ہارون نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”لیکن ہارون؟“

”ہاں جادواں جب تک میں زندہ ہوں تمہارا ساتھ دوں گا۔ میں ابھی کمپری کا شکار نہ ہونے دوں گا۔“

”ہارون ایک بات کہوں برا تو تمہیں مانو گے؟“

”نہیں۔ کہو۔“

”میں تم سے شادی کبھی نہیں کروں گی۔“

”کیوں جادواں؟“ ہارون چونک پڑا۔

”اگر ایسا ہو گیا ہارون تو میرا ضمیر کبھی مطمئن نہ ہوگا۔“

”آخر کیوں؟“

”میں سوچوں گی کہ دنیا میرے بارے میں ہمیشہ غلط انداز سے سوچے گی۔ وہ سوچے گی کہ میں نے ہارون سے صرف اس کی دولت کے لئے شادی کی ہے۔“

”دنیا کی سوچتی رہے جادواں۔ ہم تو نہیں سوچیں گے۔“

”پھر بھی ہارون۔“

”نہیں جادواں۔ میں تمہیں زندگی کا ساتھی بنانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ تمہیں بھی میری بات ماننا ہوگی۔“

”ہارون۔“ جادواں نے احتجاج کیا۔

”ہاں جادواں ایسا ضرور ہوگا۔“

”لیکن ابھی نہیں ہارون۔ خدا کے لئے میری اتنی بات ضرور مان لو۔ میں دل و جان سے تمہاری ہوں۔ لیکن۔“

”لیکن بس میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔“

”میں اس کے لئے تمہیں مجبور نہیں کروں گا جادواں۔“

جب تمہارا ضمیر تمہیں اجازت دے مجھے بتادینا۔“

”وعدہ کرتے ہو؟“

”ہاں وعدہ کرتا ہوں۔“ ہارون نے پورے خلوص سے کہا۔ اور اپنے ان الفاظ میں وہ امل تھا۔

”یہ روپے اٹھاؤ تم کسی کمپری کا شکار کبھی نہ ہوگی۔“

”نہیں ہارون۔ ہر ذات کو ایک سارے کی ضرورت ہوتی ہے اور جب اسے سارا مل جائے تو پھر کسی شے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ یہ روپے تم اٹھا لو خواہ مجھے ان کے لئے پریشان رہنا پڑتا ہے ہارون ڈیر۔“

اور ہارون مجبور ہو گیا وہ معمولی رقم نہیں تھی۔ جادواں نے اپنا سب کچھ اسے دیدیا تھا۔ اپنا مستقبل اسے دیدیا

”کچھ نہیں۔“ ہارون نے جواب دیا۔

”نہیں کچھ تو۔“

”بالکل نہیں جادواں یوں بھی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو پھر جائیں گے اور کھانا کھالیں گے۔“

”پھر چلو گے؟“

”کھا کر جے کیا تم مصروف ہو؟“

”ہرگز نہیں۔ میری بھلا کیا مصروفیت ہو سکتی ہے“ اور

سب سے بڑی مصروفیت اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ تم میرے ساتھ ہو۔“ جادواں نے کہا اس کا لہجہ خمار آلود تھا۔

ہارون بھی موسم کے اثر سے ہلکا رہا تھا۔ دیر تک دونوں خاموش رہے۔ دونوں اپنے اپنے خیالوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ تب ہارون نے ہی اس خاموشی کو اپنی ٹھہیر آواز سے توڑا۔

”جادواں تمہاری معیت نے مجھے کچھ نئے جہانوں سے روشناس کرایا ہے مگر میں نہیں جانتا جادواں کہ میری تقدیر میں یہ بے بسی کیوں لکھی ہوئی ہے؟“

کیسی بے بسی ہارون؟“ جادواں نے اداس لہجے میں پوچھا۔

”یہی کہ زندگی میں ایک ساتھی ملا اس قدر قریب آیا لیکن اس کے باوجود اتنا دور ہے۔“

”میں تم سے دور تو نہیں ہارون جب دل چاہے چھو لو، سمولو خود میں۔“ جادواں نے کہا اور ٹھک کر اس کے نزدیک آگئی۔ اس نے اپنا سر ہارون کے سینے پر ٹکا دیا۔

”میں“ میں تمہیں دور ہی محسوس کرتا ہوں جادواں۔“

”میں چاہتی ہوں ہارون کہ تم دوری کے ہر احساس کو مٹا دو۔“

”جادواں۔“ ہارون کا لہجہ کپکپا گیا۔

”ہاں ہارون، میرا بھی اب اس دنیا میں تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ میں، میں۔“ جادواں کے ہونٹ کپکپانے لگے اور ہارون اس پر جھک گیا۔ اس نے جادواں کو بازوؤں میں بھینچ لیا اور اس کے بعد انہوں نے جو منصوبے بنائے تھے سب پاش پاش ہو گئے۔ موسم ان کے اوپر حاوی ہو گیا۔ جادواں آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھی اور ہارون بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گیا پھر وہ دونوں ایک دوسرے کی قربت میں اس طرح کھو گئے کہ دوری کا احساس باقی نہ رہا۔

ہاں جب احساس ہوا تو جادواں لرزتی آواز میں بولی۔

”ہارون کیا ہم نے اچھا کیا ہے؟“

”ہاں جادواں اچھا کیا ہے۔“ ہارون نے پراعتما لہجے میں کہا مگر جادواں کچھ پریشان نظر آنے لگی۔

”لیکن ہارون۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا۔

”تمہاری ہی ضد ہے جادواں۔ ورنہ میں تو تمہیں اپنی

دنیا میں شامل کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں، تم جس دن مجھے

اجازت دو گی میں تمہیں دلمن بنا کر اس فلیٹ سے لے جاؤں گا اور اس کے بعد ہمارے درمیان کوئی دوری نہ رہے گی۔“

”ہارون۔“ جادواں نے اس کے سینے میں سر چھپا لیا۔

”اگر یہاں تک پہنچ ہی گئی ہو جادواں تو مجھے بتا دو کب

تک ان حسین لمحات کا انتظار کرنا ہو گا۔“

”ابھی نہیں ہارون ابھی نہیں۔“ جادواں نے گردن

ہلائی اور ہارون مسکرائے لگا۔

”بہر صورت میں تمہارا انتظار کروں گا۔ اور آخری

فیصلہ تم ہی کر سکو گی۔“ ہارون نے کہا اور جادواں مسکرائے

لگی رات ہارون، جادواں کے فلیٹ پر ہی رہا تھا۔ دوسرے

دن بھی وہ کافی دیر سے دفتر پہنچا۔ اب رہ ہی کیا گیا تھا۔

جادواں اپنا تین من دھن سب کچھ دے چکی تھی ہارون کے

ذہن میں اب اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔

جادواں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ دونوں قریب سے

قریب تر آتے گئے موسم کی ایک لغزش نے ان کے

درمیان سے تمام پردے ہٹا دیے تھے۔ لیکن اس کے بعد

وہ سنبھل گئے ہارون جادواں کے حساس دل سے بخوبی

واقف تھا۔ وہ اس کے ضمیر پر مزید کوئی داغ نہیں دیتا جانتا

تھا۔

بارش والے دن سے آٹھویں دن کی بات تھی۔ ہارون

دفتر پہنچ کر کام دیکھنے لگا اور ایک انجینی لفافہ اس کی آنکھوں

کا مرکز بن گیا۔

لفافہ کافی موٹا تھا۔ ہارون نے اسے ٹٹولا اور پھر بھاڑ لیا

لیکن لفافے سے جو کچھ نکلا اسے دیکھ کر ہارون کا دل بند

ہونے لگا۔ وہ اس کی اور جادواں کی تصویریں تھیں انتہائی

حد تک عریان تصویریں۔

یہ تمام تصاویر اس رات کی تھیں جس رات وہ جوانی

اور موسم کی لغزش کا شکار ہو گئے تھے۔ ان تصاویر کو دیکھ کر

ہارون کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں لیکن پھر اس نے

بے چین ہو کر لفافے سے وہ پرچا نکال لیا جو ٹائپ کیا ہوا تھا۔

ڈیڑھ گھنٹہ

انسان اس دنیا میں اس لئے آتا ہے کہ عیش و عشرت سے زندگی بسر کرے۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اس زندگی میں کچھ حاصل نہیں کر سکتے اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جن پر زندگی کے تمام دروازے کھل جاتے ہیں۔

لیکن وہ جنہیں سب کچھ مل جائے انہیں نہ بھولیں جنہیں کچھ میسر نہیں ہے۔ میں بھی انہیں میں سے ایک ہوں۔ ایک مفلوک الحال آدمی جسے زندگی گزارنے کے لئے بہت کچھ درکار ہے۔ بڑی محنت کی ہے تم پر ہارون اور اب اس محنت کا معاوضہ درکار ہے۔ فی الحال صرف پانچ لاکھ۔

تم اس نوٹوں کو پھاڑ کر پھینک سکتے ہو۔ ان تصویروں کو آگ میں جلا سکتے ہو یہ تمہارا حق ہے میں ان کے دوسرے پرنٹ نکلا کر انہیں پولیٹریک شکل میں چھاپ دوں گا۔ اور یہ پوسٹر پورے شہر میں تقسیم ہو جائیں گے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں پہنچ جائیں گے اور جاوڑاں امام۔ ایک معزز شخص کی بیٹی اور ہارون ایک بڑا سرمائے دار عوام کی نگاہوں میں آجائیں گے اور انہیں بڑے آدمیوں کے کرۂ معلوم ہو جائیں گے اور یہ میرا حق ہے مسٹر ہارون۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو اس کے حق سے محروم نہیں کر سکتے۔ اگر آپ میری زبان کو بند رکھنا پسند کریں تو پانچ لاکھ روپے نقد لیکر ہوا محل پہنچ جائیں اور انہیں وہاں رکھ کر واپس آجائیں یہ کام کل تک ہو جانا چاہیے اور اب یہ کہنے کی کوئی ضرورت تو نہیں ہے کہ اگر کوئی غلط کارروائی ہوئی تو۔

تمہارا مخلص!

ہارون کو چکر اٹھ گیا تھا خط کی تحریر اس کے حواس چھین رہی تھی۔ وہ بھڑپیشان ہو رہا تھا۔ جاوڑاں کا مصوم چہرہ اس کی نگاہوں میں آ رہا تھا۔ وہ خود کشی کر لے گی کتنی جذباتی اور حساس تھی وہ لیکن یہ بلیک میلر یہ بلیک میلر ان تک کیسے پہنچ گیا؟

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ جاوڑاں کاٹون آیا تو اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

”آج نہیں ملیں گے جاوڑاں۔“

”کیوں؟“ جاوڑاں کے لہجے میں حیرت تھی۔

”بس کچھ ایسی ہی کاروباری مصروفیت ہیں۔ امید ہے

خیال نہیں کرو گی؟“

”نہیں ہارون۔ ظاہر ہے تمہاری مصروفیت میری اپنی

ہے۔ کل؟“

”ہاں کل شام کو میں آؤں گا۔“

”اوکے۔“ جاوڑاں نے کہا اور فون بند کر دیا وہ سوچ میں

ڈوبا رہا۔ پانچ لاکھ روپے ادا کئے جاسکتے تھے کیا وہ بلیک میلر

اس کا چھپا چھوڑے گا۔ اور اگر جاوڑاں کو معلوم ہو گیا تو۔

جاوڑاں زندہ نہ رہ سکے گی۔ یہ خیال ہارون کے لئے بڑا

روح فرسا تھا۔ وہ جاوڑاں کی زندگی چاہتا تھا۔ اس نے لفافہ

بند کیا اسے احتیاط سے اپنے لباس میں رکھ لیا اور پھر رات

بھر جاگنے کے بعد اس نے یہی فیصلہ کیا کہ پانچ لاکھ روپے

ادا جائیں دوسرے روز اس نے رقم کا انتظام کیا۔

دل تو چاہتا تھا کہ پولیس کو اطلاع کر دے اس بلیک میلر

کو شوٹ کر دے لیکن بدنامی کا خیال۔ جاوڑاں کا خیال۔

ہوا محل شہر سے دور ایک پرانی عمارت کا نام تھا اس

سنان اور ویران عمارت میں اس نے اپنی محنت کی کمائی

رکھ دی اور واپس چلا آیا شام تک اس کا دل عجیب سی

اداسیوں کا شکار رہا تھا۔

پھر شام کو وہ جاوڑاں سے ملا۔ ٹکھری ٹکھری جاوڑاں

لاکھوں میں ایک لگ رہی تھی اسے دیکھ کر پھول کی طرح

شگفتہ ہو گئی تھی۔

”یوں لگ رہا ہے جیسے کئی ہفتے گزر گئے ہوں۔“ وہ

ہارون سے لپٹ گئی۔

”ہاں واقعی۔“ کیا بات ہے تھکے تھکے سے ہو؟“

”واقعی تھک گیا ہوں۔“

”تب آج کہیں نہیں جاتے گھر پر آرام کریں گے۔“

ٹھہرو میں تمہارے لئے کافی بنا کر لاتی ہوں۔“ جاوڑاں چلی

گئی تھوڑی دیر کے بعد وہ کافی لے کر آئی۔ بہت خوش تھی

ہارون بھی اس کی خوشی میں شریک ہو گیا۔

لیکن اب اس کے ذہن میں ہر وقت ایک پھانسی

چھبستی رہتی تھی وہ اتنا خوش نہیں رہتا تھا جتنا پہلے۔

جاوڑاں نے کتنی ہی بار اسے ٹوکا تھا لیکن ہارون نے اسے

کچھ نہیں بتایا دوسرے مہینے کی پہلی تاریخ کو اسے پھر وہی

لفافہ مل گیا جسے دیکھ کر اس کا خون خشک ہو گیا تھا۔ اس بار

بھی ٹاپ شدہ تحریر موجود تھی۔

ڈیڑ ہارون

فرخاندی سے کہا۔
”جادواں میں چاہتا ہوں کہ ایک ہفتے کے اندر اندر ہم

دونوں شادی کر لیں۔“

”کیوں؟“ جادواں نے چونک کر پوچھا۔

”بس یہ میری خواہش ہے۔“

”لیکن ہارون تمہارا وعدہ۔“

”افسوس جادواں اب میں اس وعدے پر قائم نہیں رہ

سکتا۔“ ہارون نے کہا اور جادواں کا چہرہ ماریک ہو گیا۔

خاصی اداس نظر آنے لگی پھر لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

”آخر کیوں؟“

”بس ایسے ہی کچھ الجھنیں ہیں جادواں۔“

”مجھے نہیں بتاؤ گے؟“

”افسوس جادواں، میں تمہیں ان الجھنوں کے بارے

میں کچھ نہیں بتا سکتا۔“ ہارون نے کہا اور جادواں کی

آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے۔

”کیوں آخر کیوں؟“

”تم نہیں سمجھتیں جادواں، بس ایسی ہی کچھ بات ہے۔

ہمارا شادی کر لینا پیچیدہ مناسب ہو گا ہم بہت سی الجھنوں سے

بچ جائیں گے۔“

”مگر کوئی الجھنیں درپے ہیں تمہیں ہارون؟“

”یہ میں نہیں بتا سکتا جادواں۔“

”آخر کیوں؟ یہ بات مجھے الجھن کا شکار کر رہی ہے

ہارون آخر تم اس بات کو کیوں نہیں سمجھتے۔“ جادواں کے

لبے میں کسی قدر ٹیکھا پن آیا اور ہارون چونک گیا۔

”کیا مطلب؟“

”میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ اب تمہارا کوئی راز مجھ

سے راز رہے گا۔ اور تم مجھ سے کیوں چھپا رہے ہو؟“

”اس لئے جادواں کہ جو حقیقت ہے اسے سن کر دیکھ

کر تم برداشت نہیں کر سکو گی۔“

”میں برداشت کر لوں گی ہارون، تم اس کی پرواہ مت کرو

آخر کیا بات ہے؟“

”جادواں تم ضد کر رہی ہو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تم

میری ہی بات مان لو۔“

”نہیں میں تمہاری الجھن تک پہنچنا چاہتی ہوں

ہارون۔ یہ میری محبت کا تقاضا ہے۔“

”تم برداشت نہ کر سکو گی۔“

”لیکن ہارون یہ احساس میرے دل میں ہمیشہ کھٹکتا رہے

امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ وہی مرغے کی ایک

ٹانگ۔ یعنی پانچ لاکھ روپے لیکن یہ ماہوار حساب نہیں

ہے بس دو یا تین بار تمہیں اور تکلیف دوں گا اس کے بعد

یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا تمہاری امانت وہ ٹیکسٹ تمہارے

سپر کردی جائے گی، لیکن شرط یہی ہے کہ اس وقفے میں تم

اسی شرافت کا ثبوت دو گے جیسا کہ پہلی بار دیا ہے اور یہ

دھمکی دوہراتے ہوئے مجھے بھی شرم آتی ہے کہ اگر تم نے

یہ سب کچھ نہ کیا تو اس کی رسوائی تمہارا مقدر بن جائے

گی۔ وہی پہلا پروگرام خدا حافظ۔

تمہارا مخلص

”یعنی پانچ لاکھ۔“ ہارون نے سوچا دس لاکھ روپے کی رقم

سرمائے سے نکل جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے ظاہر ہے

وہ کروڑ پتی نہیں بن گیا تھا بس یہی چالیس پچاس لاکھ کا

آدمی تھی۔ کاروبار چلتا رہتا تھا اتنی بڑی رقم نکالنے کے بعد

اسے خاصی مشکلات کا شکار ہونا پڑا تو نہیں چل سکے

گی گاڑی کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہو گا کیا کیا جائے ظاہر ہے

ایک بلیک میل کا منہ تو بند نہیں کیا جاسکتا۔ اس وقت تک

جب تک کہ تصاویر اس کے پاس موجود ہیں، وہ اسی طرح

کرنا رہے گا لیکن بہت کچھ سوچنے کے باوجود اسے ہر

راستہ مسدود نظر آیا، وہ سازش، ذہن کا مالک نہیں تھا ایک

سیدھا سادا بزنس مین تھا چنانچہ پانچ لاکھ بھی اسے دینا ہی

پڑے۔

لیکن اس کے بعد وہ دو دن تک جادواں سے نہیں مل

سکا تھا مگر جادواں اس کی کیفیت کا انداز نہ لگا لے لیکن

اب اس کے دن رات سو لی پر گزرنے لگے تھے۔ کوئی ایسا

حل جو قابل اطمینان ہو لیکن کوئی حل سمجھ میں نہ آیا۔

یہ دو دن اس نے شدید پریشانی میں گزارے کسی

مناسب حل کی تلاش کے لئے وہ بہت کچھ سوچتا رہا پھر

ایک ہی حل اس کے ذہن میں آیا اس نے دس لاکھ روپے

دینے کے بعد سوچا کہ جادواں سے اس موضوع پر آخر

گفتگو کر لی جائے چنانچہ اس شام جب وہ جادواں سے ملا تو

اس کا موڈ اتنا خوشگوار نہیں تھا۔

”جادواں میں آج تم سے کچھ سنجیدہ گفتگو کرنا چاہتا

ہوں۔“

”تو کرو اس میں الجھنے کی کیا بات ہے؟“ جادواں نے

گا کہ تم نے اپنا کوئی راز مجھ سے چھپایا ہے۔
”یہ راز ایسا نہیں ہے جادواں خدا کے لئے ضد مت کرو۔“

”اگر میں یہ کہوں ہارون کہ میں اسے ہر قیمت پر جاننا چاہتی ہوں تو؟“ جادواں نے سنجیدگی سے پوچھا اور ہارون اسے دیکھنے لگا پھر اس نے ایک لمبھی سانس لے کر کہا۔
”اگر تمہاری یہی مرضی ہے جادواں تو میں تیار ہوں چلو اٹھو۔“

”کہاں...؟“

”میرے ساتھ چلو۔“

”لیکن کہاں؟“

”میرے گھر۔“

جادواں نے گردن ہلا دی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ اس کے ساتھ کار میں بیٹھ کر اس کی کوٹھی کی جانب جاری تھی۔ ہارون اسے اپنے کمرہ خاص میں لے آیا۔ دونوں لفافوں کی تصاویر اس نے سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔ چنانچہ اس نے بڑی بے دلی کے ساتھ ایک لفافہ نکال کر جادواں کے سامنے رکھ دیا۔

”اسے کھول کر دیکھو جادواں۔“ اس نے کہا اور کسی حادثے کا انتظار کرنے لگا اور وہی ہوا۔ جادواں نے لفافہ کھولا تحریر پڑھی تصویریں دیکھیں اور دوسرے لمحے اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ ابھری، وہ بیہوش ہو گئی تھی ہارون پریشان ہو گیا۔ اسے جادواں کی اس کیفیت کی توقع تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جادواں اس صدمے کو برداشت نہیں کر سکے گی وہ اسے ہوش میں لانے کی کوششوں میں مصروف ہو گیا۔ بمشکل تمام جادواں ہوش میں آئی اس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے ہارون کو دیکھا اور پھر اس کی آواز ابھری۔

”اب کیا ہو گا؟“

”میں نے تم سے کہا تھا جادواں تم نہ پوچھو۔“

”لیکن ہارون یہ ضروری تھا۔ آہ تم تنہا اس عذاب کا شکار رہنا چاہتے تھے۔ میرے ہارون یہ کیسے ممکن تھا؟“ جادواں رونے لگی۔

”میں تو وہاں سے اس عذاب کا شکار ہوں جادواں۔“

”کیا مطلب؟“

”یہ رقم میں ادا کر چکا ہوں اور یہ دوسرا لفافہ ہے۔“ جادواں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے لفافہ دیکھا۔ اور پھر

بولی۔ ”یہ دوسرا ہے۔“

”ہاں۔ میں مزید پانچ لاکھ دے چکا ہوں۔“

”کیوں ہارون کیوں؟ تم نے دس لاکھ روپے ضائع کر دیئے ہاں ٹھیک ہے اگر ہم دونوں اس منزل تک پہنچ چکے ہیں تو کسی کو کیا۔ رسوائی ہوتی ہے ہوتی رہے میں تمہارے لئے ساری دنیا سے لڑنے کو تیار ہوں۔ ہاں مجھے پرواہ نہیں ہے کوئی کچھ کہے۔“

”ہم اسے اس طرح شکست دے سکتے ہیں جادواں کہ ہم دونوں شادی کر لیں۔ اس کے بعد وہ خود بخود میل ہو جائے گا۔“

وہ لیکن وہ ذلیل انسان کون ہے ہارون میں اس کا پتا لگا کر رہوں گی۔“ جادواں نے ایک عزم سے کہا۔

”لعنت بیٹو جادواں۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب ہم۔“
”کاش تم مجھے پہلے ہی بتا دیتے کاش تم یہ رقم اسے ادا نہ کرتے۔“

”بس جادواں بھول جاؤ جو کچھ ہوا۔“
”نہیں ہارون مجھے سوچنے دو۔ خدا کے لئے مجھے سوچنے دو مجھے تنہا چھوڑ دو بس مجھے سوچنے دو۔“

”جادواں۔“

”میرے دماغ کی شریانیں پھٹ جائیں گی ہارون براہ کرم مجھے میرے گھر چھوڑ دو۔ اور سنو میں اس وقت تک شادی کے بارے میں نہیں سوچ سکتی جب تک جب تک اس کا پتا نہ لگاؤں۔ آہ ہارون تمہیں ایک بات یاد ہے؟“

”کیا؟“

”کسی نے مجھے فون کیا تھا کہ میں کلب کیوں نہیں جاتی۔“

”ہاں مجھے یاد ہے۔“

”ہارون۔ ہم کچھ دنوں کے لئے ملنا چھوڑ دیتے ہیں میری خاطر ہارون وہی ہو گا جو تم چاہتے ہو بس یہ میری خواہش ہے۔“

”جادواں۔“

”میرے ہارون میرے لئے اتنا اور برداشت کر لو میں تمہاری منت کرتی ہوں۔“ اور ہارون خاموش ہو گیا

دوسرے دن سے ان دونوں نے ملنا ترک کر دیا۔ تین دن گزر گئے جادواں نے اسے فون بھی نہیں کیا تھا۔ ہارون سخت پریشان ہو گیا چونکہ وہ اس نے جادواں کو فون کیا اور جادواں مل گئی۔

”میں کیا تم اس کے بارے میں کچھ معلوم کر سکی ہو؟“ ہارون نے پوچھا۔

”ہاں ہارون میں نے اس چور کو پہچان لیا ہے۔“

”کون ہے؟“ ہارون چونک پڑا۔

”گرین ولا کوٹھی نمبر ایکس۔ وہ ایک دیلا پتلا شخص ہے سیاہ چشمہ لگاتا ہے۔“

”اوہ لیکن؟“

”میری معلومات مستند ہیں اور اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا لیکن ہارون ہمیں اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔“

”میں اسے شوٹ کر دوں گا۔“ ہارون غضبناک آواز میں بولا۔

”سہی بہتر ہے ہارون۔ ورنہ ورنہ میرے دل میں آگ رہ جائے گی میں بھی پرسکون نہ رہ سکوں گی۔ میں نے اس شخص کو اکثر دیکھا ہے ہارون۔ وہ ہمارے پیچھے لگا رہتا ہے لیکن لیکن میں نے ہمیشہ اسے اتفاق سمجھا۔“

”لیکن تمہیں یہ یقین کس طرح ہوا؟“

”اس سے قبل مجھے ایک بات کا جواب دو ہارون۔“

”کیا؟“

”کیا آج بھی اس نے تمہیں کوئی خط لکھا تھا۔“

”کیا مطلب؟“

”میں نے اسے پراسرار انداز میں ہوا محل میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔“

”کس وقت؟“ ہارون نے اضطراب سے پوچھا۔

”آج دن کو ایک بجے یہ اندر داخل ہوا اور پھر تیزی سے واپس آگیا۔ میں اس کا تعاقب کر رہی تھی۔“ جادواں نے کہا۔

”گرین محل کوٹھی نمبر ایکس۔“ ہارون کے منہ سے غراہٹ نکلی اور اس کی آنکھوں میں آگ سلگ اٹھی۔ اس نے بہت کچھ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن اس کے لئے ابھی اسے انتظار کرنا تھا۔

☆

دوسرے دن اس نے اپنی تمام مصروفیات ترک کر دیں وہ صبح ہی صبح گرین ولا کی جانب چل پڑا۔

گرین ولا کی کوٹھی نمبر ایکس خاصی خوبصورت عمارت تھی اس کے سامنی حبیب فاروقی کے نام کی سختی لگی ہوئی تھی۔ ہارون اس شخص کے بارے میں معلومات حاصل

”میں پاگل ہو جاؤں گا جادواں۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

”ہارون۔ اگر میں تمہیں یہ خوشخبری سناؤں کہ میں اس بلیک میلر کی راہ پر لگ گئی ہوں تو؟“

”تک کیا۔ کیا مطلب؟“

”میرے اوپر اعتماد کرو ہارون۔“

”نہیں کر سکتا جادواں تمہاری زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔“ ہارون نے پریشانی سے کہا۔

”ہارون آخری بار کہہ رہی ہوں جو کچھ میں کر رہی ہوں مجھے کرنے دو۔ اس کے بعد زندگی بھر وہی ہو گا جو تم چاہو گے سمجھو ہارون بس کچھ روز اور۔“

☆

بلیک میلر کا تیسرا خط اس بار وقت سے قبل ہی مل گیا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

”مشر ہارون

مجھے افسوس ہے کہ وقت سے پہلے تمہیں تکلیف دے رہا ہوں۔ لیکن تمہارے لئے ایک خوشخبری ہے مزید پانچ لاکھ کی ادائیگی کے بعد تم ہمیشہ کے لئے اس خیال سے نکل جاؤ گے تمہیں ٹیگسٹ مل جائیں گے۔ اس کے بعد میں تمہیں کبھی تکلیف نہیں دوں گا! میں زبان کا پکا آدمی ہوں۔ اگر کل تک تم نے بندوبست کر دیا تو ٹھیک ورنہ۔

تم خود سمجھو ار انسان ہو۔“

ایک لمحے کے لئے ہارون کا دل چاہا کہ خود کشی کر لے کس خیال میں پھنس گیا تھا پندرہ لاکھ کی رقم نکل رہی تھی اور اور وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ جادواں کو فون کیا تو وہ نہیں ملی فلیٹ پر بھی وہ رات کو نہیں آئی تھی۔ ہارون سخت پریشان تھا۔ جادواں نے کہہ دیا تھا کہ اگر رسوائی ہوتی ہے تو ہوتی رہے لیکن خود ہارون کی اپنی بھی حیثیت تھی۔ دوسرے دن بھی جادواں نہ ملی تو اس نے رقم کا بندوبست کیا اور ہوا محل گیا اس کے بعد کچھ بھی ہو جائے میں جادواں کو شادی کے لئے مجبور کر دوں گا اس نے فیصلہ کیا۔ پانچ لاکھ کی یہ رقم بھی اس نے بلیک میلر کو ادا کر دی اس کی کمر لوٹ گئی تھی رات کو جادواں خود اس کی کوٹھی پر آگئی۔ اور ہارون نے جلتی لگا ہوں سے اسے دیکھا۔ ”تم دو دنوں سے کہاں تھیں؟“ ہارون نے پوچھا۔

”ابھی نہیں بتاؤں گی۔ تم اس بلیک میلر سے نمٹ لو پہلے۔“

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆

☆

سونے والا چادر اوڑھے لیٹا تھا اس نے چادر مٹھ بیٹی اور چونک بڑا مسہری پر صرف تکیہ کر رہے ہوئے تھے اس نے متحیرانہ انداز میں چاروں طرف دیکھا اور ہونٹ سکڑ کر رہ گیا۔

کمرہ خالی تھا، وہ چاروں طرف بغور دیکھتا رہا۔ اس کی پشت دروازے کی جانب تھی تب اسے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا وہ ایک دہلا پتلا نوجوان تھا جس کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

”ہوں تو تم یہاں تک پہنچ گئے؟“ اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ہاں کیا حبیب فاروقی تم ہی ہو؟“

”جی ہاں خادم ہی کو حبیب فاروقی کہتے ہیں۔“

”تمہاری رہائش گاہ تو خاصی اچھی ہے۔ کیا اس کے علاوہ تمہارا اور کوئی کاروبار نہیں ہے؟“ ہارون نے پوچھا۔

”کس کے علاوہ؟“ حبیب فاروقی نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”بلک میلنگ، گندگی اور غلاظت۔“

”کچھ اس مت کرو، ورنہ پستول کی چھ گولیاں تمہارے بدن میں اتار دوں گا تم جیسا ذہیل انسان میں نے اس روئے زمین پر کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔ میں نے تمہارے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لی ہیں مسٹر ہارون۔ بظاہر تم ایک نیک اور شریف آدمی ہو لیکن درپردہ تم جو گندہ بزنس کرتے ہو اس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تمہاری ظاہرہ حالت بھی کافور اچھی ہے اور جہاں تک میرے علم میں ہے تمہارا کاروبار بھی خاصا وسیع ہے تمہیں اس کی ضرورت کیوں پیش آگئی مسٹر ہارون۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو کسی ضرورت؟“ ہارون نے خواخوڑا لے کر پوچھا۔

”واہ تم کو کیا تم چالاکی سے کام لے کر جان بچانا چاہتے ہو۔“ حبیب فاروقی نے غرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔ میں کہتا ہوں میری تصاویر اور ان کے سنگیٹو واپس کر دو۔ میں نے تمہارا آخری مطالبہ بھی پورا کر دیا ہے۔“ ہارون نے کہا حبیب فاروقی پاگلوں کے سے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

”واقعی تم مجھ چالاک انسان ہو شاید تم اس فکر میں ہو

کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اسے زیادہ معلومات نہ ہو سکیں پھر جب وہ وہاں سے چلا تو اس کے ذہن میں بہت سی کارروائیاں تھیں۔ وہ انتقام کی آگ میں پھنک رہا تھا۔ شام تک وہ مارا مارا پھرتا رہا اس کے ذہن میں ایک ہی منصوبہ تھا۔ وہ اس شخص کو قتل کر دے جس نے اسے بلک میل کیا ہے۔ اور یہ ذہنی آگ اسے عقل و فراست سے کافی دور لے گئی تھی شام تک وہ آوارہ گردی کرتا رہا اور رات گیارہ بجے پھر اس کی کار گرین ولا کے نزدیک پہنچ گئی اس نے کار کو گرین ولا سے دور ایک درخت کے نیچے پارک کیا اور عمارت کے گیٹ کی جانب چل پڑا۔ دروازے پر چوکیدار موجود تھا۔

”کیا مسٹر حبیب فاروقی تشریف رکھتے ہیں؟“ اس نے پوچھا اور چوکیدار چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”جی ہاں صاحب مگر اس وقت وہ سونے کے لئے جا چکے ہیں۔“ چوکیدار نے جواب دیا۔

”اوہ مجھے ان سے بہت ضروری کام تھا، ان کی اہلیہ موجود ہیں۔“ ہارون نے پوچھا۔

”نہیں صاحب۔ صاحب نے تو ابھی شادی بھی نہیں کی۔“

”اچھا تعجب ہے کون کون رہتا ہے یہاں؟“

”بس صاحب رہتے ہیں اور ہم دو تین ملازم۔“ چوکیدار نے جواب دیا اور اس نے گردن ہلائی۔

”اچھی بات ہے میں کل دن میں ان سے ملاقات کرنے کی کوشش کروں گا وہ واپس پلٹ پڑا اور پیدل چل دیا چوکیدار کی نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں اور جب اسے احساس ہوا کہ چوکیدار اس کی طرف سے بے خبر ہو گیا ہے تو وہ ایک لمبا راستہ کاٹ کر عمارت کی پشتی سمت کی جانب آگیا اور پھر وہ عمارت کی چار دیواری کے اندر داخل ہو گیا تھا۔

خاصی کشادہ اور خوبصورت عمارت تھی۔ اس عمارت میں کسی ایک شخص کو تلاش کر لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا اور پھر وہ شخص جو یہاں ٹہرتا ہو۔

اس نے اس کمرے کو دیکھ لیا جس میں ہلکی نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اس کی جانب چل پڑا پھر وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر عجیب تاثرات تھے۔ اس کی نگاہیں اس مسہری کی طرف اٹھ گئیں جس پر کوئی سورہا تھا اور پھر وہ آہستہ آہستہ مسہری کے نزدیک پہنچ گیا۔

”تمہیں قتل کرنے“
 ”کیوں؟“
 ”اس لئے کہ تم مجھے بلیک میل کر کے پندرہ لاکھ روپے
 ایٹھ چکے ہو۔“
 ”ہوں۔ تم کس طرح بلیک میل ہوئے؟“
 ”اداری مت کرو مسٹر حبیب فاروقی۔“
 ”ہوں ہوں۔ جذباتی مت بنو دوستانہ ماحول میں گفتگو
 کرو ورنہ میرا دماغ بھی خراب ہو سکتا ہے۔“ حبیب فاروقی
 نے تیز لمبے میں کہا۔
 ”آخر تم کیا چاہتے ہو؟“

”پال کی کھال نکالنا۔“ حبیب فاروقی نے مسکرا کر کہا۔
 ”اگر تم مجھ سے واقف نہیں ہو مسٹر ہارون تو میں اتنا
 بتا دوں کہ میں فاروق نیکناس کا مالک حبیب فاروقی
 ہوں۔“

”کیا؟“ ہارون کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ فاروقی
 اینڈ سٹریز کے مالک حبیب فاروقی کا نام بارہا سن چکا تھا۔
 ”ہاں میرے دوست سینکڑوں ثبوت اس وقت پیش
 کر سکتا ہوں مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے ہم دونوں ہی کسی
 سازش کا شکار ہو گئے ہیں ٹھہرو اگر دوستانہ ماحول میں ہی
 گفتگو کرنے کا ارادہ ہے تو پہلے تمہیں ایک چیز دکھا دوں۔“
 حبیب فاروقی نے کہا اور بولا۔ ”مجھے چند لحات کی اجازت دو
 گے۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ ہارون نے کہا۔
 ”ٹھیک ہے آجاؤ۔“ حبیب فاروقی نے کہا اور اس
 کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا یہاں
 اس نے تجوری کھولی اور تجوری میں سے لفافہ نکال لیا۔
 ”بالکل ویسا ہی لفافہ جیسا ہارون کو ملا تھا۔ ہارون اسے
 دیکھ کر چونک پڑا تھا اور پھر اس نے لفافے میں سے تصاویر
 نکال کر دیکھیں۔ یہاں دو صورتیں تھیں وہی ایک بار
 وئی فلیٹ تھا وہی کمرہ اور وہ بستر جس میں وہ ایک بار
 جاوڑاں کے ساتھ لفرش کا شکار ہو گیا تھا لیکن تصویروں میں
 ذرا سی تبدیلی تھی ان تصویروں میں جاوڑاں کے ساتھ
 حبیب فاروقی اسی کیفیت میں نظر آ رہا تھا ہارون کی آنکھیں
 غصے سے سرخ ہو گئیں صورت حال کسی حد تک اس کی سمجھ
 میں آتی جا رہی تھی لیکن حیرت کا شدید جھکا اس کے ذہن
 کو لگا تھا جس نے اس کے حواس معطل کر دیے جب اس
 کی کیفیت کسی قدر درست ہوئی تو اس نے بھرائی ہوئی آواز

کہ میں ذرا بھی غافل ہو جاؤں اور تم حملہ کرو لیکن
 تمہاری بدقسمتی ہے مسٹر ہارون میں اتنا احمق بھی نہیں
 ہوں تم میری جرات سے دھوکا کھا رہے ہو لیکن یہ معلوم
 کر کے شاید تمہیں خوشی ہوگی کہ میں نے ایک طویل وقت
 ایسے لوگوں میں گزارا ہے جو نیک معاش نہیں تھے پھر
 جب میری ماں کا انتقال ہوا تو اس نے مجھے برے کاموں
 سے نکل آنے کی تلقین کی۔ ماں کے علاوہ اس دنیا میں
 میرا کوئی نہیں تھا۔ میں نے اس دن سے برائیاں چھوڑ
 دیں۔ اور انہی نیکیوں کے نتیجے میں، میں پندرہ لاکھ گنوا چکا
 ہوں۔“

”تم؟ تم پندرہ لاکھ گنوا چکے ہو؟“ ہارون نے چکراتے
 ہوئے کہا۔

”لیکن تقدیر یاور ہے بتاؤ میرے نیکیوں کہاں ہیں اگر تم
 خود یہاں تک نہ پہنچتے تو میں آج رات خود ہی تمہیں قتل
 کر دیتا۔“

”تم تم مجھے کیوں قتل کر دیتے؟“
 ”اس لئے کہ تم ہی وہ بلیک میلر ہو جس نے پچھلے چھ ماہ
 سے۔“

”حبیب فاروقی بکواس مت کرو۔ میں۔ میں۔“
 ”پھر تم یہاں کیوں آئے کیا تمہارے خیال میں میں تم
 سے بے خبر تھا۔ سنو تم آج صبح سے میری ناک میں ہو۔
 تم دن میں میری کونٹھی پر آئے تھے اور اس وقت بھی اگر تم
 اس طرح بیہوش نہ آتے تو آج رات میں تمہاری کونٹھی
 پر ہوتا۔“

”میں پاگل ہو جاؤں گا۔“ ہارون اپنے بال نوچنے لگا۔
 اب حبیب فاروقی بھی کسی قدر سنجیدہ نگاہوں سے اسے
 دیکھنے لگا تھا۔ پھر اس نے تمحیرانہ لہجے میں کہا۔
 ”کہیں ہم دونوں کسی تیسرے کے جال میں تو نہیں گرفتار
 ہو گئے۔ لیکن ٹھہرو گفتگو کرنے سے قبل کیا میں تمہاری
 تلاشی لے سکتا ہوں۔“ حبیب فاروقی نے کہا۔
 ”میرے پاس پستول ہے۔“ ہارون نے کہا۔
 ”مجھے اجازت دو کہ میں اسے نکال لوں یوں بھی میرے
 ہاتھ میں پستول ہے مجھے تم سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

ہارون نے چکراتے ہوئے ذہن کے ساتھ گردن ہلا دی
 اور حبیب فاروقی نے آگے بڑھ کر اس کا پستول نکال لیا۔
 اس کے بعد اس نے اپنا پستول بھی جیب میں رکھ لیا تھا۔
 ”ہاں یہ بتاؤ تم پستول لے کر یہاں کیوں آئے تھے؟“

ھیل اسے جاوداں یاد آری تھی کسی خوش گفتار کسی
نغمہ ساز لڑکی تھی۔ لیکن اندر سے۔

”افسوس ہو رہا ہے تمہیں میرے دوست لیکن اس
ناگن نے ہم دونوں کو دوسرا ہے اب تم اپنی کہانی تو سناؤ۔“
”یقین کرو حبیب فاروقی۔“ ہارون نے بھرائی ہوئی آواز
میں کیا۔

”ہاں اب یقین کر لوں گا کیونکہ صورتحال میری نگاہوں
کے سامنے واضح ہو گئی ہے۔“

”تمہاری اور میری کہانی میں سرمو فرق نہیں ہے
میرے پاس بھی تین لفافے موجود ہیں اور جاوداں نے ہی
مجھے تمہاری راہ پر لگایا تھا۔“
”لیکن اب کیا ہو گا؟“

”اس نے بہت برا جرم کیا ہے اس نے اعتماد کا خون کیا
ہے دولت اتنی بڑی چیز نہیں ہے لیکن اعتماد کا خون میں
اسے قتل کر دوں گا۔“

”میں بھی اسے قتل کرنا چاہتا ہوں۔“
”آؤ ہم دونوں اسے قتل کر دیں۔“ ہارون اٹھ کھڑا ہوا۔
”لیکن دوست؟ ہماری رقم؟“

”میں اس پر لعنت بھیجتا ہوں۔“ ہارون نے کہا۔
”ٹھیک ہے تم نے میری رہنمائی بھی کر دی۔“ حبیب
فاروقی نے کہا لیکن اسی وقت چوکیدار نے اندر آنے کی
اجازت طلب کی اور حبیب فاروقی نے اسے بلایا۔
”علاقے کے انسپکٹر صاحب آپ سے ملاقات کرنا
چاہتے ہیں صاحب۔“

”اس وقت۔“ اچھا انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ میں
ابھی آیا۔“ حبیب فاروقی نے کہا۔ اور چوکیدار کے چلے
جانے کے بعد ہارون کی طرف دیکھا۔ پھر وہ دونوں ہی
پر سکون انداز میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے انسپکٹر بے
چینی سے حبیب فاروقی کا انتظار کر رہا تھا۔

”آپ اسی عمارت کے مالک ہیں؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔
”جی ہاں میرا نام حبیب فاروقی ہے، فاروقی انڈسٹریز کے
بارے میں تو آپ نے ضرور سنا ہوگا۔ اور یہ میرے دوست
ہارون ہیں ہارون کنسٹرکشنز۔“

”اوہ“ انسپکٹر حیران رہ گیا۔ آپ دونوں تو بھید مشہور
لوگ ہیں معاف کیجئے گا ہمیں تھوڑی دیر قبل کسی خاتون
نے اطلاع دی تھی کہ اس عمارت کے سامنے سے گزرتے
ہوئے انہوں نے کچھ بھیاںک چیخوں کی آوازیں سنی ہیں
جیسے کسی نے کسی کو قتل کر دیا ہو۔ ان خاتون کی خوف کی

میں کہا۔ ”بالکل ایسی ہی تصویریں میرے پاس بھی موجود
ہیں۔“

”کس کے ساتھ؟“
”جاوداں کے ساتھ۔“ ہارون نے جواب دیا۔
”گویا میرا خیال درست ہے۔“ حبیب فاروقی مسکرایا۔
”نغمہ نگریہ سب کیسے کیسے؟“
”بیٹھ جاؤ ہارون کہنے کو آئے؟“
”چند رہ لاکھ۔“

”جاوداں نے تمہیں کچھ رقم تو نہیں دی؟“ حبیب
فاروقی نے پوچھا۔
”کیا مطلب؟“

”مجھے اس نے چار لاکھ روپے دیئے تھے اور میرا اعتماد
بھی حاصل کر لیا تھا میں نے سوچا تھا کہ وہ کس قدر معصوم
ہے کتنی بھولی ہے کہ اس نے اپنا سب کچھ مجھے دیدیا۔“
”خدا کی قسم اس نے مجھے بھی چار لاکھ روپے دیئے
تھے۔“ ہارون بولا۔

”خوب۔ خوب۔“ اس کا کھیل میری سمجھ میں آتا جا رہا
ہے تو پہلے میری سن لو۔ جاوداں سے میری ملاقات سن بیچ
کلب میں ہوئی تھی اس نے خود کو تنہا بتایا اور پھر ہماری
ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ جاوداں نے مجھے اپنی بھرپور
محبت دی اور ساتھ ہی اپنی ساری پونجی یعنی چار لاکھ روپے
بھی۔ میں نے اس سے شادی کا مطالبہ کیا تو اس نے کہا کہ
وہ مجھ سے کبھی شادی نہیں کرے گی ورنہ لوگ کہیں گے
کہ وہ میری دولت سے متاثر ہوئی ہے اور پھر ایک رات
ہم دونوں لغزش کا شکار ہو گئے۔ جاوداں میری بن گئی لیکن
وہ شادی کرنے کے لئے پھر بھی تیار نہ ہوئی یہاں تک کہ
مجھے ایک لفافہ ملا جس میں میری اور اس کی تصویریں
موجود تھیں ہمیں بلیک میل کیا گیا تھا میں نے جاوداں کی
دعوت سے یہ زخم خود برداشت کر لیا مگر کب تک جب میں
بندہ لاکھ ادا کر چکا تو میں نے جاوداں کو صورتحال سے آگاہ
کیا۔ اور وہ غم و غصہ میں ڈوب گئی اس نے عزم کیا کہ وہ
اس بلیک میل کا پتا چلائے گی اور پھر وہ روپوش ہو گئی کل
اس نے مجھے اطلاع دی کہ اس نے بلیک میل کا پتا چلا لیا
ہے اور اس کے بعد اس نے مجھے تمہارا پتا بتایا میں غم و
غصہ میں تمہارے پیچھے لگ گیا لیکن آج تم میری کو بھی پر
آئے تو میں حیران رہ گیا اس وقت میں بھی تمہارا تعاقب
کرنا ہوا تمہارے پیچھے آیا ہوں۔“ حبیب فاروقی نے کہا
اور ہارون کا دل خون کے آنسو روئے لگا اتنا برا فرائز۔ اتنا برا

”اپنی کوٹھی پر اور اس کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا۔“
حبیب فاروقی نے جواب دیا جاوداں کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔
”لیکن... لیکن پولیس میرا مطلب ہے؟“
”پولیس ہمارے خلاف کوئی ثبوت نہ مہیا کر سکے گی۔“
جاوداں۔ ”دروازے سے ہارون کی آواز آئی اور جاوداں نے وحشت زدہ نگاہوں سے اسے دیکھا پھر اس نے گرنے سے بچنے کے لئے ایک میز کا سہارا لیا تھا۔
”صرف یہ بتا دو کہ تمہارا تیسرا ساتھی کون ہے وہ جس نے ہم دونوں کی تصویریں بنائیں تھیں؟“
”مم۔ مم نہ جانے کیا کہہ رہے ہو؟“
”اٹھ لاکھ خرچ کر کے تیس لاکھ کمایا ہو جاؤ اور اتنا تو بتا ہی دو ورنہ ہمیں پوچھنے کے دوسرے ذہنک بھی آتے ہیں۔“ ہارون نے کہا۔

”جاوداں کی آواز بند ہو کر رہ گئی تھی اس کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا تھا وہ وحشت زدہ نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔
”خیر تمہارے ساتھی کو بھی تلاش کر لیا جائے گا پہلے تو تم جہنم میں جاؤ“ حبیب فاروقی نے لبک کا اس کی گردن دو بچ لی ہارون نے اس کے بال پکڑ لئے تھے وہ اس وقت تک جاوداں کو پکڑے رہا جب تک اس کی آنکھیں اور زبان باہر نہ نکل آئیں۔ اس کے بعد دونوں نے نفرت سے اس کی لاش پر ٹھوک دیا۔
”اس کمینے نے ہم دونوں کے اعتماد کا خون کیا تھا دولت کا کیا ہے وہ تو ہاتھ کا میل ہے۔“ حبیب فاروقی نے کہا۔

”لعنت ہے اس پر۔“ ہارون بولا اور پھر اس نے حبیب فاروقی کی طرف دیکھا اور اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔
”ہم دونوں کا راز بیشہ ہمارے سینوں میں محفوظ رہے گا۔ کیونکہ یہ ہمارا مشترکہ جرم ہے۔“ اور دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے میں پست ہو گئے۔

دونوں باہر نکل آئے اور کار میں بیٹھ کر چل پڑے لیکن جالاک عورت مرتے مرتے بھی ان کی موت کا سامان کر گئی تھی فلیٹ کی دیوار میں تصویر کے پیچھے پوشیدہ کیمرہ اس وقت آن ہو گیا تھا جب اس نے گرنے سے بچنے کے لئے

میز کا سہارا لیا تھا یہی وہ تیسرا ساتھی تھا جو ان تصاویر کو بنانے کا ذمہ دار تھا جو ان لوگوں کو بھیجی گئی تھیں اور اس وقت اس نے اس قتل کی بھی مکمل تصاویر خود میں محفوظ کر لی تھیں۔

وجہ سے اپنا نام بھی نہیں بتایا۔“
”خوب“ حبیب فاروقی نے ہارون کو دیکھا۔ ”پھر ہم آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں انسپکٹر؟“
”معاف کیجئے پولیس کا فرض۔“
”ہمیں معلوم ہے لیکن کیا آپ اسے گرفتار نہیں کر سکتے جس نے پولیس سے یہ مذاق کیا ہے۔ یہاں ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہیں ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہم میں سے کسی نے دوسرے کو قتل نہیں کیا ہے۔“
حبیب فاروقی نے کسی قدر مزاحیہ انداز میں کہا۔ انسپکٹر بھی ہنسنے لگا۔ پھر اس نے درخواست کی۔
”اس کے باوجود اگر آپ مجھے تلاش لینے کی اجازت دیدیں تو میں دلی شکر گزار ہوں گا۔“
”خوشی انسپکٹر لیکن ایک شرط ہے۔“
”جی؟“

”اس کے بعد آپ ہمارے دوست بن جائیں گے۔“
”میری خوش نصیبی ہوگی۔“ انسپکٹر نے کہا اور پھر اس نے پوری عمارت کی تلاشی لی تھی اور شکر یہ ادا کر کے چلا گیا۔
”کیا سمجھے؟“ حبیب فاروقی نے ہارون کو دیکھا۔
”فون اس کتیا کے علاوہ کسی نے نہ کیا ہو گا وہ ہم میں سے ایک کے ہاتھوں دوسرے کو قتل کر کے باقی بچ جانے والے کو پولیس کے سپرد کرنا چاہتی تھی تاکہ ٹھیل ختم ہو جائے۔“
”لیکن کیا ٹھیل ختم ہو گیا؟“
”ہر گز نہیں اس نے ہم دونوں کے اعتماد کا خون کیا ہے ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”تو پھر چلو یہ بھی اچھا ہے کہ پولیس نے ہم دونوں سے ابھی ملاقات کی ہے۔“ حبیب فاروقی نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد ان کی کار جاوداں کے فلیٹ کی جانب جاری تھی کار فلیٹ سے کافی دور روک دی گئی اور پھر وہ دونوں اطراف پر نگاہ رکھتے ہوئے فلیٹ پر پہنچ گئے دونوں بچہ ہوشیاری سے کام لے رہے تھے اور پولیس کے لئے کوئی نشان نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔
جاوداں نے کافی دیر کے بعد دروازہ کھولا حبیب فاروقی کو دیکھ کر ششدر رہ گئی۔

”اوہ ڈارلنگ۔ تم۔ اس وقت؟“
”ہاں جاوداں میں نے اسے قتل کر دیا۔“
”قتل کر دیا کہاں؟“

سکھناؤ

ایم اے راحت

اس کی ماں اس کی دیدہ دلیری پر پہونچکا سی
درا گئی اس کے چہرہ پر ایک رنگ آیا اور چلا گیا۔
نشرہ نے ایسی بات کہی تھی جس سے اس کے ذہن کو
شدید دھچکا لگا۔ وہ بھی اپنی ماں کے بدلتے ہوئے
ناثران سے اس کی اندرونی کیفیات کو بھانپ گئی۔
جلدی سے قبضہ لگاتے ہوئے بولی۔ ”امی! میرا اور مہوش
ہاجی کا خون ایک سا کیسے ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹروں
’کے کہنے کے مطابق یہ ضروری نہیں کہ سگی بہن
’بھائیوں کے خون کا گروپ ایک جیسا ہو۔“

ایک معاشرتی کہانی، عمران ڈائجسٹ کے آخری صفحات کے لیے



کی زندگی میں یکسر ناپید تھا۔

ایک دفعہ وہ انجم کے ساتھ پکنک منانے گئے۔ وہ لمبا ترنگا، صحت مند اور خور و نو جوان تھا۔ شرہ اس کو اپنا بہترین دوست تصور کرتی تھی لیکن اسے اس کی ایک عادت اچھی نہ لگتی۔ وہ زندگی کے بارے میں عموماً متغی پہلو نظر رکھنے کا عادی تھا لیکن فلسفہ اور جمالیات پر اس کی گہری نظر تھی۔ اس کا باپ ایک اعلا افسر تھا۔ مالی پریشانیوں کا اس کی زندگی میں کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اسے خبر تھا کہ اس نے بھی کسی کے لیے نعرہ یا محبت کا جذبہ محسوس نہیں کیا۔ جہاں تک شرہ کا تعلق تھا وہ برا بھلا سمجھتا تھا کہ اس سے اسے محبت نہیں، عشق ہے اور اپنی اس کمزوری پر اسے ملالیت کے بجائے شرمندگی کا احساس ہوتا تھا۔

شرہ اس کی ایسی گفتگو سی جھلکے لگتی تھی۔ جس دن وہ پکنک پر گئے تھے۔ شرہ خلاف توقع زیادہ جاب چپ تھی۔ انجم نے ابتدا میں اس کی اسی کیفیت پر کوئی خاص توجہ نہیں دی، پھر اچانک بے تکلفی سے اس کے کندھے پر جھلکا ہوا شونی سے بولا۔

”خونخواہ آنکھیں دالی لڑکی! آج کون سا شرم نہیں سنا؟“

اس نے اپنے ہونٹ سولے اور سرد مہری سے استہزامیہ لہجے میں بولی۔

”ہاں..... تمہارے نزدیک میری آنکھیں خونخوار ہیں۔“

”اس کا مجھے خود بھی علم نہیں۔“ وہ بڑے مزے سے پائپ کا کش لگا کر بولا۔ کچھ کہنے کے بجائے وہ بحیرہ عرب کی متلاطم لہروں کو دیکھنے لگی۔

انجم نے پوچھا۔ ”میری بات سے تمہیں

نشرہ ان خوش نصیب لڑکیوں میں سے تھی جن کی مثال دی جاسکتی ہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب اس نے نوکری کی کوشش کی تو ہر جگہ سے اس کی پذیرائی ہوئی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کا خوب صورت چہرہ اور دلکش نقوش تھے۔ ان دنوں وہ ٹیلی ویژن کی اناؤنسر تھی۔

اس کا تعلق ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تھا لیکن اس کی زندگی میں بھی ایک داغ تھا۔ اس کے باپ سرفراز بیک کی آثار قدیمہ کے ماہر کے طور پر بڑی شہرت تھی۔ چودہ برس پہلے جب شرہ کی عمر صرف دس سال تھی۔ وہ ایک دن ایک ایسا لاپتا ہو گیا۔ خاندان کے افراد نے پہلے خود اور بعد ازاں پولیس کی مدد سے اس کی تلاش و جستجو کی، لیکن کوئی کوشش بار آور نہ ہوئی، تا چار سب نے روپیٹ کر مبرا کر لیا۔

شرہ کا ایک بڑا بھائی تھا۔ جس کا نام سکندر تھا۔ وہ ان دنوں ایک کامیاب انجینئر تھا اور اپنے بیوی بچوں سمیت کینیڈا میں مقیم تھا۔ اس کے علاوہ اس کی ایک بڑی بہن مہوش تھی۔ جو تین سال پہلے اپنے پیارے چارے سے اپنے گدو کو ختم دے کر اللہ کو پیلا دی ہو چکی تھی۔

شرہ کے دے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن تلی اور ان خاص ایسے تھے جنہیں دیوانگی کی حد تک اس سے عشق تھا۔ ان میں سرفہرست اس کا بہنوئی نظام دوسرا اس کا بوڑھا بروفسر اور تیسرا اس کا کلاس فیلو انجم تھا۔ انجم گزشتہ چار سال میں اپنی محنت اور ریاضت کے بل بوتے پر حقیقی مصور کی حیثیت سے زبردست شہرت حاصل کر چکا تھا۔

شرہ کو ان تینوں کے جذبات کا اچھی طرح علم تھا۔ وہ ایک پڑھی لکھی اور صاف گولڑکی تھی۔ اس نے مخلوط تعلیم حاصل کی تھی۔ اس لیے اسے کبھی مردوں کے ساتھ گھومنے پھرنے میں عار محسوس نہیں ہوا۔ خوف اور گھبراہٹ کا عنصر اس

ہنسی چلی گئی۔ سمندر کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اس کے بالوں کو بری طرح اڑا رہی تھی۔ انجم کو ان لمحوں میں یوں لگا۔ جیسے وقت یکا یک ایک جگہ ٹھہر گیا ہے۔ وہ دیر تک محسوس کن نظروں سے اس کو دیکھتا رہا۔ نشہ اس کی محسوسیت سے بے نیاز سوچوں کو ایک ٹک دیکھے جارہے تھی۔

انجم نے جب دوبارہ اپنا وہ سوال دہرایا تو اس نے اس کی طرف گردن گھمائے بغیر کہا۔

”فرض کرو، تمہارا قیاس درست ہو تو۔“

”وہ جھجلا کر بولا۔“ نشہ بھی تو تم ڈھنگ سے جواب دے دیا کرو۔“

ایک رات ٹیلی ویژن ٹرانسمیشن ختم ہونے کے بعد وہ گھر واپس جانے کا سوچ رہی تھی کہ اس کا بہنوئی نظام اپنے ننھے بیٹے گڈو کے ہمراہ وہاں آ گیا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ نشہ نے لپک کر گڈو کو اپنی گود میں اٹھالیا اور پیار کرتے ہوئے بولی۔

”میں..... میں تمہارے ڈیڈی کو اتنا پیٹوں گی کہ وہ رو دیں گے۔“

”کیوں..... بھی خیریت ہے، ہم سے ایسی کون سی خطا سرزد ہو گئی ہے۔“ نظام نے ہنس کر پوچھا۔

نشہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ ”آپ گڈو کو چھ دن کے بعد لائے ہیں اور اس کے بعد آپ اپنے آپ کو بے خطا تصور کرتے ہیں۔“

اس کا بہنوئی ہنس کر چلایا۔ ”واہ بھی! یہ اچھی دھاندلی ہے، شکوہ مجھے کرنا تھا کہ تم نے اس عرصے میں ایک بار بھی فون کرنا گوارا نہیں کیا“ آخر کیوں۔“

نشہ جواب دینے کے بجائے خاموش گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے نظام سے دریافت نہیں کیا کہ وہ گاڑی کدھر لے جا رہا ہے۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز گڈو

”صدمہ پہنچا ہے۔“
”فرض کرو..... تمہارا قیاس درست ہے“
پھر۔۔۔ اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

وہ ہنستا سا گیا، کہنے لگا۔ ”تمہارا دل رکھنے کے لیے معذرت کر لوں گا۔“

”دل.....“ نشہ طنزیہ طور پر ہنسی۔
”میرے پاس دل ہے کہاں۔“

”کیا مطلب۔“
”مطلب صاف ظاہر ہے انجم اگر میرے پاس دل ہوتا تو وہ ضرور کسی نہ کسی کے لیے دھڑکتا، چلتا، بے قرار ہوتا، تمہیں مجھ سے عشق ہے نا۔“

”ہاں..... عشق تو ہے، وہ بھی دھانسو تم کا۔“

وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہی، پھر آہستگی سے بولی۔ ”ہماری دوستی کو کئی سال بیت گئے ہیں۔ اس دوران میں نے کئی بار چاہا کہ مجھے تم سے کوئی دلچسپی پیدا ہو۔ امی نے مجھے اسکیا کہ میں تم سے شادی کر لوں۔ خود تم نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے، لیکن.....“

”لیکن تمہارے دل میں کوئی نرم گوشہ پیدا نہیں ہو سکا۔“

”رونا تو یہ ہے کہ میرے پاس دل ہے ہی نہیں۔“

انجم کو ایک دھچکا سا لگا، اس نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تم ایک لڑکی ہو اور یہ کیسے ممکن ہے کہ.....“

اس نے فوراً اس کی بات کاٹ دی اور غرائی۔ ”مجھے لڑکی مت کہو۔“

”پھر۔“

انجم نے تملاکر سوال کیا۔ ”کیا تم واقعی اپنے بہنوئی سے شادی کرنے پر تیار ہو گئی ہو۔“

اس نے بے ساختہ زوردار ہتھکڑیاں لگایا اور

ساتھ چھیڑ چھاویں شہزادہ کی بجائے نظام سارے راستے زردیدہ نظروں سے گھورے جارہا تھا۔

وہ اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ کئی سال پہلے نظام کی اس سے بات ہوئی تھی اور پہلی ہی نظر میں وہ اس کی محبت کا اسیر بن چکا تھا۔ لیکن بد قسمتی سے نشرہ نے اسے ٹھکرا دیا۔ نظام دنیا میں تنہا تھا۔ اپنے مرحوم والدین کی طرف سے اس کو درش میں ایک بڑی ٹیکسٹائل مل ملی تھی۔ پیسے اور شان شوکت کی کمی نہیں تھی۔ اس سے پہلے وہ ایک بیوی کو طلاق دے چکا تھا۔

نشرہ کی ماں بڑی بہن اور بھائی سب اس پر متفق تھے کہ نشرہ کو اس سے شادی کر لینی چاہیے۔ ان کے نزدیک یہ ان کی خوش نصیبی کی انتہا تھی کہ اس کا رشتہ ایک ایسے گھرانے کی طرف سے آیا جو مہذب اور باعزت تھا۔ نشرہ کے انکار پر سبھی کو غصہ آیا۔ کئی روز تک اس مسئلے پر بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ بڑے بھائی اور بڑی بہن نے بھی اسے سخت ست باتیں سنائیں لیکن اس نے بالکل برا نہیں مانا، اس نے انہیں بتایا۔

”میرے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس لیے میں آپ لوگوں کو کیونکر مطمئن کروں۔“

یہ قصہ کئی ماہ تک چلتا رہا۔ ایک دن غیر متوقع طور پر نظام نے اس کی بہن مہوش سے شادی کی پیش کش کی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، نشرہ کی ماں اور بڑے بھائی نے سکھ کا سانس لیا۔ نظام نے یہ شادی اس لیے کی تھی تاکہ وہ اپنی ناکام محبت کی تسکین کے لیے کسی نہ کسی طرح نشرہ کی قربتوں کو اپنا سکے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بڑی بہن سے بہت محبت کرتی ہے۔ اس لیے اس نے شادی کے بعد مختلف حیلوں بہانوں سے دعوتیں دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کی ساس پر دعوت میں باقاعدگی سے شرکت کرنی لیکن نشرہ اپنی بڑی بہن کی ڈانٹ ڈپٹ کے

نظام کو اس انکشاف پر پہلے پہل بڑا تعجب ہوا۔ دراصل وہ اس سے اب تک شدید محبت کرتا تھا لیکن اس نے اپنی محبت کو بڑی کامیابی سے اپنے سینے میں چھپا لیا تھا۔ اپنی ساس اور بیوی کی مخالفت کے باوجود ایک دن موقع پاتے ہی اس نے نشرہ سے کہا۔ ”تمہارے ذہن میں کون سی گھٹن ہے۔ میں تمہارا ہمدرد ہوں، تمہیں مجھ سے کوئی بات نہیں چھپانا چاہیے۔“

نشرہ نے ایک زوردار ہتھکڑیاں لگایا اور بولی۔ ”نظام صاحب! آپ بھی مجھے امی اور بہن کی طرح نفسیاتی مریض سمجھنے لگے ہیں۔“

وہ گھبرا کر کہنے لگا۔ ”نہیں نشرہ تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔“

”پھر آپ نے ایسا بے ہودہ سوال مجھ سے کیوں کیا۔“ اس کی تیوری چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ بات بتاتے ہوئے بولا۔ ”ماہرین نفسیات کے نزدیک سوتے میں چلنا ایک بیماری ہے اور اس کا تعلق لاشعور سے ہوتا ہے۔“

اس نے لاپرواہی سے سر کو جھٹکا دیا اور بڑبڑائی۔ ”امی کا کہنا ہے کہ ڈیڈی بھی اس مرض میں مبتلا تھے۔“

”اچھا۔“ نظام نے حیرت سے کہا۔ کیونکہ یہ اس کے لیے ایک نیا انکشاف تھا۔ نشرہ نے اس کے تاثرات کو نظر انداز

بردبار اور ذہنِ خالص کا عشق میری ادھوری شخصیت کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں بڑا معاون ہوگا۔“

ایک دن نشرہ بڑے اچھے موڈ میں تھی۔ اس نے بڑی بے باکی سے پوچھا۔
”پروفیسر صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے اور میرے اسکیڈل کا بڑا جھجکا ہے۔“

”اسکیڈل! کس کا اسکیڈل۔“ اس نے معصومانہ نظروں سے اسے نکلتے ہوئے پوچھا۔
نشرہ نے کہا۔ ”یہی کہ آپ مجھ سے عشق کرتے ہیں۔“

پروفیسر دیر تک ہنستا رہا، پھر بولا۔ ”یہ تو ایک بے ضرر انکشاف ہے، پھول، خوشبو، رنگ اور موسیقی کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ ان سے عشق کیا جائے، عشق دراصل اپنی ذات کو خود تسلیم کرنے کا نام ہے۔ انسانوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ زندگی بھر دوسروں سے اپنی ذات کو منوانے کے درپے رہتے ہیں۔ اس چکر میں اپنے آپ کو کبھی نہیں مل پاتے۔ اس لیے خوف ان کا مقدر بن جاتا ہے۔“

نشرہ نے فوراً کہا۔ ”پھول، خوشبو، رنگ اور موسیقی ان میں سے آپ مجھے کیا تصور کرتے ہیں۔“

پروفیسر نے دوبارہ قہقہہ لگایا اور بولا۔
”اصل چیز پھول ہے، خوشبو، رنگ، موسیقی اس کی جزویات ہیں۔“

وہ طنزیہ طور پر چلائی۔ ”پروفیسر صاحب! آپ نے مجھے پھول قرار دے کر میری زندگی بہت مختصر کر دی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ تیز ہو ایں اور جھلسا دینے والی دھوپ کسی پل بھی میرا صفایا کر سکتی ہے۔“

اس نے پیار سے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا کہنا درست ہے، لیکن یادیں

کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”میرے نزدیک بے خوابی زیادہ خطرناک اور موذی مرض ہے اور خدا کا شکر ہے مجھے یہ روگ نہیں لگا، جبکہ آپ امی دونوں اس کے مریض ہیں اور باجی بھی اس میں مبتلا ہیں اور جب تک آپ لوگوں کے تکیوں کے نیچے خواب آور گولیاں نہ ہوں، آپ کو چین نہیں آتا۔“

نظام اپنی جھینپ مٹاتا ہوا بولا۔ ”تمہاری امی غریب کی نیند تمہارے ڈیڈی اے ساتھ جاتے ہوئے لے گئے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تم جانتی ہوں کہ میری نیند میرے خواب سب تمہارے قبضے میں ہیں۔ رہ گیا تمہاری بہن کا مسئلہ تو وہ بے چاری اسی دکھ میں کڑھ کڑھ کر اپنی آنکھوں کو بے خواب کر بیٹھی ہے کہ اس کا شوہر پھر اس کے بجائے ابھی تک اس کی چھوٹی بہن سے عشق کرتا ہے۔“

اس نے ایک بے ہنگم قہقہہ لگایا لیکن نشرہ چپ چاپ بیٹھی غلاؤں میں گھور رہی تھی۔
دنیا میں صرف پروفیسر ہی ایک ایسا شخص تھا جس کی موجودگی میں اسے خاموش رہنا پسند نہیں تھا۔ اسے اس کے سفید بالوں میں بڑی کشش محسوس ہوتی تھی۔ یونیورسٹی میں وہ سارا عرصہ اس کی شاگرد رہی اور ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ کسی بات پر اشتعال میں آیا ہو۔ وہ عمر رسیدہ شخص تھا اور اس نے شادی نہیں کی تھی۔ پروفیسر یوں تو خاموش طبع اور سنجیدہ انسان تھا لیکن شام کے ساتھ اس کی خاص طور سے بے تکلفی تھی۔ نشرہ کو اس کے ساتھ گھومنا پھرنا اور تنہائی میں بیٹھ کر گفتگوں کا بہت اچھا لگتا تھا۔ شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیوں نے مشہور کر دیا کہ بوڑھا پروفیسر اس آفت لڑکی پر دل و جان سے فریفتہ ہو چکا ہے۔ جب نشرہ کو اس افواہ کا علم ہوا تو اس نے برملا کہا کہ ”اس میں مضائقہ کیا ہے۔ ایسے پڑھے لکھے

پھولوں کو ہمیشہ کے لیے امر بنا دیتی ہیں۔“
عجیب بات یہ تھی کہ اس کی ماں فرخندہ خاتون کو اس کا بوڑھے پردیسر سے زیادہ میل جو پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ ایک بزمی لکھی عورت تھی۔ جوانی میں اس نے چند سال شاعری بھی کی تھی۔ شادی کے بعد فرخندہ خاتون نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شاعری کو خیر باد کہہ دیا۔ اس نے نشرہ پر بلاوجہ روک ٹوک نہیں کی تھی۔ اس کا موقف تھا کہ ہر شخص اس دنیا میں اپنی آزاد خود مختار زندگی لے کر آتا ہے۔ اپنے دکھوں کی اذیت اور مسرتوں کی لذت وہ خود ہی محسوس کر سکتا ہے۔ اس لیے یہ ظلم نہیں ہونا چاہیے کہ بڑے بوڑھے اپنے احساس کمتری یا برتری سے مجبور ہو کر نوجوان نسل کے گلوں میں بھینسوں کی طرح مخصوص روایات کے لیے ڈال دیں۔

ابتدا میں وہ اپنے موقف پر بڑی مضبوطی سے قائم رہی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس پر یہ عقیدہ کھلا کہ اس کے نظریات میں کہیں کوئی ٹھپلا ہو گیا ہے، کیونکہ اس پر پتہ چل گیا کہ اس کی کیفیت تیزی سے طاری ہو رہی تھی۔

اسے سب سے زیادہ افسوس نشرہ پر تھا۔ اس نے اس کی متا کی تمام ضرورتوں کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔ فرخندہ خاتون تنہائی میں اکثر سوچتی۔ ”یہ اپنے ڈیڈی کی طرح ضدی کرخت مزاج اور ظالم ہے۔ وہ شخص ایذا پسند تھا اور ہمیشہ مجھے اذیتیں پہنچا کر خوش ہوتا تھا۔ میں جانتی ہوں کہ وہ مجھے ایک ایسے تنہا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے کیوں غائب ہوا۔ اس کے نزدیک اولاد کے سکھ نے مجھے تھوڑی تھوڑی سی عافیت بخش دی تھی۔ یہ بات اس کی برداشت سے باہر تھی۔ وہ مجھے سکانے کا خواہاں تھا۔ اس لیے اس نے بلاآخر مجھے اتنی بڑی سزا دی۔“

اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے، عین اس وقت نشرہ وہاں آ گئی، ماں گورو تے دیکھ کر اس کی پیشانی پر چند شکنیں نمودار ہوئیں۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنی ماں کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی۔ ”امی کیا تنہائی اور سنائے میں آپ کا دل بہت گھبراتا ہے۔“

فرخندہ خاتون نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔ ”یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں، کیا جنگلوں میں جانور تنہا نہیں رہتے۔“

وہ جمل کر بولی۔ ”تیری نظر میں ماں محض ایک جانور ہے۔“

نشرہ نے جلدی سے کہا۔ ”آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں، میں کہنا چاہتی ہوں کہ ہر جاندار شے ازلی اور فطری طور پر تنہا ہے۔“

”مجھے تیرے قلم سے کوئی دلچسپی نہیں نشرہ۔“ وہ ناراض اور بے زار تھی۔ ”ان بڑھ اور غریب ماں میں مجھ سے ہزار درجے بہتر ہیں کم از کم انہیں اولاد کی طرف سے تو گر مجوسی ملتی ہے۔ میرا شوہر مجھے چھوڑ کر لاپتہ ہو گیا۔ بیٹا بیوی، بچوں سمیت بیرون ملک میں کم ہے اسے یہ توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ سال میں ایک دو بار خط ہی لکھ دیا کرے۔ مہوش میرے دل کو داغ لگا کر اللہ کو پیاری ہو گئی اور تم ہو، تمہیں رتی برابر پرواہ نہیں۔“

نشرہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں ان پر مرکوز کر دیں اور مسلسل اس کو گھورے جا رہی تھی۔ دفعتاً فرخندہ خاتون نے دوسری طرف منہ پھیرتے ہوئے روہانے لہجے میں کہا۔ ”نشرہ تو مجھے اس طرح نہ دیکھا کر تیری آنکھوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”کیوں امی، کیا میں پڑیل ہوں۔“

اس کی ماں چپ چاپ بیٹھی رہی۔ پھر آہستگی سے زیر لب بڑبڑائی۔ ”تیری آنکھیں

اسے سب سے زیادہ افسوس نشرہ پر تھا۔ اس نے اس کی متا کی تمام ضرورتوں کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔ فرخندہ خاتون تنہائی میں اکثر سوچتی۔ ”یہ اپنے ڈیڈی کی طرح ضدی کرخت مزاج اور ظالم ہے۔ وہ شخص ایذا پسند تھا اور ہمیشہ مجھے اذیتیں پہنچا کر خوش ہوتا تھا۔ میں جانتی ہوں کہ وہ مجھے ایک ایسے تنہا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے کیوں غائب ہوا۔ اس کے نزدیک اولاد کے سکھ نے مجھے تھوڑی تھوڑی سی عافیت بخش دی تھی۔ یہ بات اس کی برداشت سے باہر تھی۔ وہ مجھے سکانے کا خواہاں تھا۔ اس لیے اس نے بلاآخر مجھے اتنی بڑی سزا دی۔“

اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے، عین اس وقت نشرہ وہاں آ گئی، ماں گورو تے دیکھ کر اس کی پیشانی پر چند شکنیں نمودار ہوئیں۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنی ماں کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی۔ ”امی کیا تنہائی اور سنائے میں آپ کا دل بہت گھبراتا ہے۔“

فرخندہ خاتون نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔ ”یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں، کیا جنگلوں میں جانور تنہا نہیں رہتے۔“

وہ جمل کر بولی۔ ”تیری نظر میں ماں محض ایک جانور ہے۔“

نشرہ نے جلدی سے کہا۔ ”آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں، میں کہنا چاہتی ہوں کہ ہر جاندار شے ازلی اور فطری طور پر تنہا ہے۔“

”مجھے تیرے قلم سے کوئی دلچسپی نہیں نشرہ۔“ وہ ناراض اور بے زار تھی۔ ”ان بڑھ اور غریب ماں میں مجھ سے ہزار درجے بہتر ہیں کم از کم انہیں اولاد کی طرف سے تو گر مجوسی ملتی ہے۔ میرا شوہر مجھے چھوڑ کر لاپتہ ہو گیا۔ بیٹا بیوی، بچوں سمیت بیرون ملک میں کم ہے اسے یہ توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ سال میں ایک دو بار خط ہی لکھ دیا کرے۔ مہوش میرے دل کو داغ لگا کر اللہ کو پیاری ہو گئی اور تم ہو، تمہیں رتی برابر پرواہ نہیں۔“

نشرہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں ان پر مرکوز کر دیں اور مسلسل اس کو گھورے جا رہی تھی۔ دفعتاً فرخندہ خاتون نے دوسری طرف منہ پھیرتے ہوئے روہانے لہجے میں کہا۔ ”نشرہ تو مجھے اس طرح نہ دیکھا کر تیری آنکھوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”کیوں امی، کیا میں پڑیل ہوں۔“

اس کی ماں چپ چاپ بیٹھی رہی۔ پھر آہستگی سے زیر لب بڑبڑائی۔ ”تیری آنکھیں

جا پہنچی۔ چند لواحقین اس سے ملنے آئے تھے۔ ایسے افراد کا کافی وی سینٹر پر بالعموم جھکھا لگا رہتا ہے۔ ان کی اصل خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے من پسند آرٹسٹوں کو براہ راست دیکھیں۔

سینٹر کارکنوں نے نشرہ کو سمجھایا تھا کہ وہ ایسے فضول قسم کے لوگوں کو..... کوئی اہمیت نہ دے کیونکہ آرٹسٹ کے لیے یہ بات ناگزیر ہوتی ہے کہ وہ اپنی شان بنانے کے لیے عام لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو انتہائی مغرور اور مصروف ظاہر کرے۔

نشرہ کو ان کا یہ مشورہ پسند نہیں آیا تھا۔ وہ اپنے مداحین کے ساتھ نہایت اخلاق سے گفتگو کرتی۔ انہیں چائے پلائی اور پھر ان کا شکریہ ادا کر کے اسٹوڈیو کی طرف واپس لوٹ آئی۔ البتہ اس نے سینٹر آرٹسٹوں کو حقارت سے نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔

ایک روز پروگرام مینیجر نے اسے بلوایا اور کہا۔ ”پروفیسر ہمارے ملک کی بڑی علمی شخصیت ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ہم ان کا انٹرویو نشر کریں“ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر صاحب! اس بات کے لیے رضامند نہیں۔“

اس نے ہونٹ سکڑ کر پوچھا۔ ”اس مسئلہ کا مجھ سے کیا تعلق ہے۔“

پروگرام مینیجر بالعموم اپنے ماتحتوں کو تم اور تو کہنے کا عادی تھا۔ لیکن نشرہ جس کے ساتھ وہ ہمیشہ بڑے مہذب لہجے میں گفتگو کرتا۔ اس نے کہا۔ ”آپ کے متعلق مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ان کی شامگرد خاص رہ چکی ہیں۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ آپ ان کو تیار کریں۔“

نشرہ نے دوبارہ سوال کیا۔ ”انٹرویو کون لے گا۔“

وہ برجستہ بولا۔ ”اس مقصد کے لیے آپ سے زیادہ کوئی موزوں نہیں ہو سکتا۔“

وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی، پھر کہنے لگی۔

ہو بہو تیرے ڈیڈی سے مشابہہ ہیں، وہ بھی مجھے اس طرح نکلنے کے عادی تھے، اور مجھے بھی ان کا یہ ظالمانہ انداز پسند نہیں آیا۔“

نشرہ نے سوال کیا۔ ”لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ دونوں کی محبت کی شادی تھی اور ڈیڈی نے آپ کو ٹوٹ کر چاہا، کہیں آپ ان کی آنکھوں میں چاہت کا چھپا ہوا طوفانی سمندر دیکھ کر تو نہیں ڈرجاتی تھیں۔“

”نشرہ!“ فرخندہ خاتون چلائی، وہ غصہ میں اٹھ کر کمری ہو گئی تھی۔ ”مجھے تمہارا ایسا سمجھو را مذاق بالکل پسند نہیں۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ تم نے جہاں بھر کی کتابیں پڑھ لیں اور ابھی تک اس حقیقت سے لاعلم ہو کہ ماں کا احترام کیسے کیا جاتا ہے۔“

اسی رات فرخندہ خاتون نہایت اداسی سے ٹیلی ویژن اسکرین پر اپنی بیٹی کو مسکراتا دیکھ کر سوچ رہی تھی۔ ”نشرہ اپنی مسکراہٹیں بیکیر کر لاکھوں اداس شائقین کو محظوظ اور محسوس کرتی ہے لیکن میں نے کون سا جرم کیا ہے جو میرے سامنے گھر میں اس طرح نہیں مسکراتی۔ میں اس کی ماں ہوں اور میرا اس پر اولین حق ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میں کس قدر رنجیدہ اور دکھی ہوں۔ پھر یہ میرے زعموں پر مرہم کیوں نہیں رکھتی، میں نے ہمیشہ اسے اپنی بے پناہ محبتوں سے نوازا اور اس پر بھی چلپلائی دھوپ کی ایک آنچ تک نہیں آنے دی۔ شاید ماؤں کی تقدیر یہ ہی ہے کہ وہ سدا دکھوں کا بوجھ اٹھائیں اور اندر ہی اندر جل کر کڑھ کر مر جائیں۔“

اس کی آنکھیں اٹکبار تھیں اور سامنے اسکرین پر خوب صورت نشرہ کھلتے لہجے میں ایک ادا کے ساتھ کسی انگریزی فلم کے آغاز کا انٹرومنٹ کرنے میں مصروف تھی، اس سے فراغت پا کر وہ اپنی ماں کی کرب ناک سوچوں سے بے نیازی وی سینٹر کے ملاقاتی کمرے میں

آپ ان کو انٹرویو کے لیے آمادہ نہ کر سکیں۔“
نشرہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

”پروفیسر صاحب کے دلائل حقائق پر مبنی تھے۔ میں ان کی جگہ ہوتی تو میں بھی یہ ہی کہتی اور پھر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے ہمارا ملک ایلیکچول حضرات سے بھرا پڑا ہے۔ آپ نے محض خانہ پری کرنا ہے کہ تفریق پروگراموں کے ساتھ ساتھ آپ ناظرین کو علم و دانش کا عطیہ بھی دینا چاہتے ہیں۔ کسی کو بھی پکڑیں کام چل جائے گا۔“

پروگرام مینیجر کا خون کھول گیا لیکن اس نے نشرہ سے کچھ نہیں کہا۔

جب نشرہ نے یہ قصہ انجم کو سنایا تو وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔ ”پروفیسر صاحب کو خود نمائی کی عادت ہے۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو۔“ وہ جھلا کر چیخی۔ انجم نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ ”انسان جب زیادہ لکھ پڑھ جاتا ہے تو اس کا احساس کمتری اس کو نت نئے طریقوں سے خود نمائی کے اظہار پر مجبور کرتا ہے۔ جب تک ہمارے ملک میں تعلیم کا تناسب کم تھا۔ لوگوں میں تنقید کی عادت بھی کم تھی۔ آج کل جس شخص کو دیکھو دوسروں پر انگشت نمائی میں مصروف ہے۔ جو نہیں ہوسکا وہ دراصل درست تھا۔ اسی بھڑ میں پروفیسر صاحب بھی شامل ہیں۔ اپنی اہمیت جتانے کے لیے انہوں نے طنزیہ طور پر یہ تجویز پیش کر دی کہ ٹی وی والے ان کے بجائے بابر‘ ندیم‘ شبنم کو بلا لیں۔“

”کینے چپ ہو جاؤ ورنہ میں تھپڑ مار دوں گی۔“ نشرہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

انجم پروفیسر کے نام سے خار کھاتا تھا‘ کیونکہ اسے بخوبی علم تھا کہ نشرہ اس پر دل و جان سے فریفتہ ہے۔ اس کے علاوہ اسے شبہ تھا کہ وہ

ٹیلی ویژن والے بڑے مستعد اور ہوشیار لوگ ہیں۔ انہیں غالباً بنیادی تربیت یہ ملی ہے کہ حوصلہ لیکن حالات میں بھی مایوس نہ ہوں۔“

”کیا مطلب پروفیسر۔“
”تمہارے پروڈیوسر اور پروگرام مینیجر نے ہر طرف کئی چکر لگائے تھے۔ میں نے انہیں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ بھائی اب میں لب گوروں۔ ٹی وی اسکرین پر آ کر مزید جینے کی ہوس میں جلتا نہیں ہونا چاہتا۔ اس کے علاوہ میں اندر سے بالکل خالی ہوں۔ رٹی رٹائی کتابیں مجھ سے لوانے کا کیا فائدہ لوگوں سے کہو کہ بازار سے ی کتابیں خرید کر پڑھ لیں۔“

نشرہ تقری آواز میں بولی۔ ”آپ عالمانہ رکا اظہار کر رہے ہیں۔“

پروفیسر نے جلدی سے کہا۔ ”ایسا مت کہو‘ یہ مشکل سے میں نے اپنے آپ کو راضی کیا ہے کہ تم سے سچ بولوں اور اس کے علاوہ تم خود نہ کرو کہ ٹی وی کے لاکھوں شائقین کو مجھ بڑھے پوسٹ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ میرا حلیہ بھی ایلیکچول حضرات کی مانند نہیں کہ انہیں میرے سرے بال اور سوچ میں ڈوبا چہرہ دیکھ کر ہی مجھ طمانیت ہو جاتی۔ بلاوجہ لوگ ٹیلی ویژن لوگوں کو غالبانہ گالیاں دیں گے کہ انہوں نے کیا۔ تم اپنے پروگرام مینیجر سے کہو کہ وہ میری رائے بابر‘ ندیم یا شبنم کو انٹرویو کے لیے بلا لے۔ اگر کوئی ٹی وی والے اپنے شائقین کو عالمانہ گفتگو ہی سنوانے کے لیے بے چین ہیں تو کچھ لے ان نمائندوں کو ایک اسکرپٹ لکھ کر تھما دیں۔ یہ باتیں زیادہ خوب صورت انداز میں شائقین کے دلنشین کر سکتے ہیں۔“

نشرہ نے زیادہ اصرار نہیں کیا‘ اور فون بند کرنے کے بعد مینیجر کو اپنی ناکامی کی رپورٹ سن کر دی۔ وہ تھلا کر بولا۔ ”آپ ان کی اتنی بیز شاگرد ہیں‘ بڑے افسوس کی بات ہے کہ

ایک خصوصی تعلق ہے اور جہاں کسی قسم کا تعلق ہوتا ہے وہاں انسان چھوٹی موٹی توقع ضرور وابستہ کرتا ہے۔“

”تم مجھ سے عشق کرتے ہو یہ تمہارا مسئلہ ہے، لیکن میں تمہاری دوست نہیں ہوں۔“

”پھر ہم ایک دوسرے سے کیوں ملتے ہیں۔“ اس نے دیکھے ہوئے دل سے سوال کیا۔ اسے خطرہ تھا کہ نشرہ غصے میں آکر کہیں اٹھ کر نہ چلی جائے لیکن ایسا نہیں ہوا اور وہ اپنی جگہ بیٹھی رہی اور بڑے اطمینان سے بولی۔ ”انسان بعض ایسی حرکتیں کرتا ہے جو بے معنی ہوتی ہیں اور جن کے بارے میں اسے خود بھی علم نہیں ہوتا کہ ان کا مقصد کیا ہے۔“

”مثلاً.....“ وہ باقاعدہ بحث پر اتر آیا۔ نشرہ نے جواب دیا۔ ”جیسے میں ٹیلی ویژن اناؤنسر بن گئی ہوں، مجھے پیسوں یا شہرت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں نے ملازمت اختیار کر لی۔ لوگ مجھے دیکھ کر اپنے طور پر خوش ہوتے ہیں۔ حالانکہ میں انہیں بالکل خوش کرنا نہیں چاہتی، جیسے میں بظاہر امی سے محبت کرتی ہوں، بلکہ جبکہ اصل حقیقت اس کے برعکس ہے۔“

”کیا مطلب۔“ اس نے استفسار کیا۔ ”جی یہ ہے کہ میں ان سے محبت کے بجائے نفرت کرنا چاہتی ہوں۔“

”ماں سے کیا، میرا دل چاہتا ہے کہ میں ہر شخص سے نفرت کروں، ایسی بھرپور نفرت کہ جس کی کئی مثال نہ ہو۔“ اس پر اسرار بڑی بڑی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔

انجم اس کی یہ انجانی کیفیت دیکھ کر ڈر گیا۔ اس نے رکتے رکتے کہا۔ ”لیکن کیوں۔ تمہیں کسی نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ تمہاری کوئی حق تلفی بھی نہیں ہوئی۔ نفرت کرنے کے لیے کوئی جواز تو

بھی اس بڑھے میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔ نشرہ عام لڑکیوں کے مقابلے میں ایک غیر معمولی نوعیت کی لڑکی تھی۔ اس لیے اسے یہ خوف رہ رہ کر بتاتا تھا کہ کہیں وہ اس کو سچ مچ نظر انداز کر کے پروفیسر سے شادی نہ رچالے۔

وہ سفاک لہجے میں بڑبڑائی۔ ”تمہاری ذہنیت بورڈ وایا نہ ہے اور تمہارے طبقے کے لوگ یہ بات کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ محلے طبقے کا کوئی شخص تم پر کسی لحاظ سے اپنی برتری قائم کرنے کے قابل ہو۔ جس پروفیسر پر تم لعن طعن کے کوڑے برسار رہے ہو، وہ ایک غریب، جاہل اور پسماندہ خاندان کا فرد تھا۔ اس نے اپنی ذاتی محنت اور جدوجہد کے ذریعے یہ مقام حاصل کیا ہے کہ دو لیتے اور نو دے لیتے اس کا احترام کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کی دو تحقیقی کتابیں دنیا کی مختلف زبانوں میں چھپ چکی ہیں اور یورپ کا ہر اسکالر ہمارے ملک میں آنے کے بعد اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ اس کی ملاقات پروفیسر سے کرائی جائے۔ تمہارے تعصبانہ جذبات دیکھ کر میں بہت مایوس ہوئی ہوں۔“

انجم بے تکلفی سے بولا۔ ”ظاہر ہے رقیب سے کون خوش ہوتا ہے۔“

نشرہ نے نفرت سے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ کچھ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے، دفعتاً اس نے نشرہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”نشرہ کیا تم مجھے سے ناراض ہو گئی ہو۔“ ”ناراض۔“ اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ ”ناراض وہ ہوتا ہے جو کسی سے خوش ہونے کی توقع وابستہ کرتا ہے۔“

”کیا تمہارا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ ”تم کہنا کیا چاہتے ہو۔“

”کم از کم تم میری دوست ہو۔ میں تم سے محبت نہیں عشق کرتا ہوں۔ اس ناتے سے ہمارا

ہونا چاہیے۔“

کمرے کی طرف جانا چاہا لیکن فرخندہ خاتون نے اسے آواز دے کر بلا لیا اور بولی۔ ”مجھے تم سے ایک اہم بات کرنا ہے۔“

”جی امی!“ اس نے سعادت مندی سے کہا۔

ماں نے کہا۔ ”بٹی مجھے لگتا ہے کہ میں اب زیادہ دیر تک نہیں جیوں گی۔“

وہ اپنے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ”یہ ہی بات آپ گزشتہ کئی سال سے دہرا رہی ہیں۔“

فرخندہ خاتون غصے سے بڑبڑائی۔ ”میں پوچھتی ہوں تم میرے ساتھ اس سردمہری سے کیوں پیش آتی ہو؟ کیا میں تمہاری ماں نہیں ہوں۔“

”میں نے آپ کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کی، امی صرف آپ کو یاد دہانی کرائی ہے، خیر آپ کو کیا کہنا ہے؟ میں دراصل بہت سچی ہوئی ہوں۔“

”میں جب بھی تم سے کوئی بات کرنا چاہتی ہوں، تم ہمیشہ یہ ہی بہانہ پیش کر دیتی ہو، ٹیلی ویژن اسکرین پر تم لاکھوں افراد کو خوش کرتی ہو، کیا تھوڑی دیر کے لیے تم اس گھر میں ویسی بااخلاق اور نرس مکھاناؤں نہیں بن سکتیں۔“

نسرہ پر ہنسی کا دورہ پڑا اور وہ دیر تک ہنستی چلی گئی۔ اس کی ماں حیرت سے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے سہم کر اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑا۔

”نسرہ..... نسرہ تمہیں کیا ہو گیا۔“

نسرہ نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی پر قابو پایا اور اس کا چہرہ تھمتانے لگا تھا۔ وہ بولی۔ ”کچھ دیر پہلے امی! انجم نے مجھے ایک لطیفہ سنایا تھا اور اب آپ نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔“

”انجم.....“ فرخندہ خاتون بڑبڑائی۔

”اس سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی۔“

”جی۔“ اور وہ میرے قدم پکڑ کر بولا۔

نسرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے خلاؤں میں گھورتی رہی۔ انجم نے کئی بار اپنا سوال دہرایا۔ اس کو جھنجھوڑا اور یکھنت اس کے قدم پکڑ کر بولا۔ ”نسرہ میں تمہاری منت کرتا ہوں کہ تم مجھ سے شادی کر لو۔“

نسرہ ایک دم جیسے ہوش میں آ گئی۔ بے ساختہ قہقہہ مار کر ہنسی اور کہنے لگی۔ ”واہ..... تم نے اس وقت بہت اچھا لطیفہ سنایا ہے۔“

”لطیفہ.....“ انجم کے جذبات کو بری طرح ٹھیس لگی۔ ”آخر مجھ میں کون سی ایسی برائی ہے کہ تمہیں مجھ سے شادی کرنا پسند نہیں آج میں تم سے اس موضوع پر کھل کر بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”نسرہ نے ملائم لہجے میں کہا۔“ تم بلاشبہ ایک اچھے آدمی ہو اور مجھے اعتراف ہے کہ تمہیں مجھ سے بے پناہ عشق ہے۔ تم نے اپنی پیٹنگز میں کسی نہ کسی طور پر میرا ہی پورٹریٹ بنانے کی کوشش کی ہے، لیکن انجم! جو چیز انسان کو اچھی لگ جاتی ہے۔ وہ اس پر اپنا تسلط جانے کی فکر

میں کیوں لگ جاتا ہے۔ جانتے ہو دنیا کی ساری جنگیں اسی کمزوری کی بنا پر لڑی گئیں۔ ہزاروں بستیاں اجڑیں، کروڑوں انسان قتل ہوئے اور غور سے دیکھیں تو تمہیں زمین کے ہر گوشے پر کسی نہ کسی مظلوم انسان کا لہو دکھائی دے گا۔ جن لوگوں کے ہاتھوں اسے عظیم کارنامے سرانجام

پائے وہ تمہاری طرح اس واہمہ میں مبتلا تھے کہ انہیں اپنی پسند پر غلبہ حاصل ہو جائے۔ میں تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ وجہ مجھے خود بھی معلوم نہیں اور نہ ہی میں اسے جاننے کے لیے فکر مند ہوں، پھر تم کیوں اصرار کر رہے ہو۔“

وہ اٹھ کر چل دی۔ انجم بھیکی آنکھوں سے اس کو جاتا دیکھتا رہا۔

جب وہ گھر پہنچی تو اس کی ماں بھری بیٹھی تھی۔ نسرہ نے اس کو نظر انداز کر کے اپنے

نشرہ سوچ میں پڑ گئی، اس کی کشادہ خوب صورت پیشانی پر شکائیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

ماں نے آہستگی سے کہا۔ ”بیٹی! آخر تمہیں اس رشتہ پر اعتراض کیا ہے۔ نظام اچھا سمجھ دار اور نیک لڑکا ہے۔ اس نے تمہاری بڑی بہن کو جب تک زندہ رہی خوب عیش کرائے۔ اللہ اس کو بخشے۔ مہوش نے بھی ایک بار بھی مجھ سے اس کی شکایت نہیں کی۔ تم مان جاؤ، نشرہ! اپنے لیے نہ سہی، گڈو کا خیال کر لو، وہ بہت کم سن ہے۔ سوتیلی ماں کا ظلم برداشت نہیں کر سگے گا۔“

نشرہ نے سفاکانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”نظام سے شادی کرنے کی صورت میں میں بھی تو اس کی سوتیلی ماں ہی بن جاؤں گی۔“

”بھئی، تو! تو اس کا اپنا خون ہے۔“

”اپنا خون۔ کیا مطلب۔“

فرخندہ خاتون نے غصہ سے اس کو دیکھا اور وہ درشتگی سے بولی۔ ”کیا مہوش تیری بہن نہیں تھی۔“

نشرہ نے سرد مہری سے کہا۔ ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے، اس دنیا میں کئی لڑکیاں ایسی ہیں جو آپس میں سگی بہنیں ہونے کے باوجود سگی بہنیں نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ان کے خون مختلف ہوتے ہیں۔“

اس کی ماں اس کی دیدہ دلیری پر بھونچکا سی رہ گئی، اس کے چہرہ پر ایک رنگ آیا اور چلا گیا۔ نشرہ نے ایسی بات کہی تھی جس سے اس کے ذہن کو شدید دھچکا لگا۔ وہ بھی اپنی ماں کے بدلتے ہوئے تاثرات سے اس کی اندرونی کیفیات کو بھانپ گئی۔ جلدی سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔

”امی! میرا اور مہوش باجی کا خون ایک سا کیسے ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق یہ ضروری نہیں کہ سگے بہن، بھائیوں کے خون کا گروپ ایک جیسا ہو۔“

”نشرہ میں تمہاری منت کرتا ہوں کہ تم مجھ سے شادی کرلو۔“ اس نے انجم کے لہجہ کی نقل اتاری۔

”پھر تم نے کیا جواب دیا۔“

”لطیفہ کا جواب کیسے دیا جاتا ہے۔“ زیادہ ہنسنے کے سبب اس کا چہرہ اب بھی تنک ہوتا تھا۔

اس کی ماں شکایتی لہجے میں کہنے لگی۔ ”بیٹی آج نظام آئے تھے، تم جانتی ہو کہ تمہاری بہن کی موت کے بعد سے وہ میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ تمہاری شادی ان کے ساتھ کر دی جائے۔“

”امی..... آپ کو میرا جواب معلوم ہے۔“

اس کے لہجے میں متانت تھی۔

وہ اس کو دیکھتی رہی اور جب نشرہ اپنے کمرے کی طرف جانے کے لیے اٹھی تو اس نے نرم لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”نشرہ، موجودہ صورت حال پہلے کی نسبت بہت مختلف ہے۔

نظام پہلے بھی تم سے شادی کرنے کے خواہش مند تھے لیکن تمہارے انکار پر وہ خاموش ہو گئے۔

اب ان کے سامنے گڈو کا مسئلہ تھا۔ انہوں نے مجھ سے صاف صاف کہا کہ تمہارے انکار کی صورت میں وہ کسی اور لڑکی کا انتخاب کر لیں گے

لیکن اس صورت میں وہ گڈو کے ساتھ ہونے والے سوتیلی ماں کے سلوک کے بارے میں ذمہ دار نہ ہوں گے۔“

نشرہ اطمینان سے بولی۔ ”گڈو..... کو

آپ اپنے پاس رکھ لیں۔“

”میں نے یہ تجویز نظام کو پیش کی تھی لیکن

انہوں نے اسے تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ بلکہ ڈھکے چھپے الفاظ میں یہ دھمکی دی کہ

دوسری لڑکی سے شادی کرنے کی صورت میں وہ

ہمارے خاندان سے اپنے تعلقات منقطع کر لیں

گے۔“ فرخندہ خاتون نے افسوس ناک شکل

بناتے ہوئے انکشاف کیا۔

بسا رکھا تھا۔ پرانے زمانے میں وحشی انسان دوسروں کے ملک پر قبضہ کر کے بڑا خوش ہوا کرتے تھے۔ عورتوں کو بالجبر تھکانا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اب ہوائی جہاز کا سفر کرنے کا عادی بن چکا ہے۔ لیکن جانے کیا بات ہے کہ زر زن اور زمین کو کسی نہ کسی طرح تھکانے کی اس کی دیرینہ عادت نہیں گئی۔

روایات کے زندان خانے میں اس پر ہونے کے بعد فرخندہ خاتون نے اپنے دل کو چل ڈالا۔ آنکھوں کے آئینے ریزہ ریزہ کر دیے اور اپنے اس حصے کو ہمیشہ کے لیے ماؤف اور بے جان کر دیا، جہاں اس کے محبوب کا نام درج تھا۔

اس نے سرفراز کی خوشنودی کو اپنی خوشنودی دی اور اس کی رضا کو اپنی رضا قرار دیا۔ اس کا شوہر اذیت پسند تھا، اسے لاشعوری طور پر سب سے بڑی کوفت یہ تھی کہ اسے تقدیر نے محبوب کے بجائے دن کا روپ دیا۔ اس نے اپنی ذہانت اور خاندان کے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے فرخندہ خاتون کو ہمیشہ کے لیے اپنالیا۔ اس کا رنگ و روپ، مرمی بدن، طلسمائی آنکھیں، دراز زلفیں، بنگلے کے دیگر فرنیچر کی مانند اس کی ذاتی ملکیت بن چکی تھی۔

اس کے باوجود اسے بھی یوں لگتا کہ فرخندہ خاتون کے محبوب کی دو نادریدہ آنکھیں خلاؤں میں اس کو مضحکہ خیز طریقے سے گھورتے ہوئے کہہ رہی ہیں۔ ”فرخندہ خاتون صرف میری تھی اور اب بھی میری ہے، جس کو تم دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں ساتے یہ فرخندہ کی لاش ہے، بے وقوف تمہارے احساس میں جمالیاتی قدریں موجود ہوتیں تو تمہیں اس کی لاش سے یقیناً کراہیت آتی۔“

سرفراز بوکھلا گیا۔ دوسروں کا دل توڑنے میں نقصان یہ ہے کہ اپنا دل بھی کمزور ہوتا ہے، سرفراز بھی آہستہ آہستہ نفسیاتی مریض بن گیا۔

نشرہ کے جانے کے بعد فرخندہ خاتون بڑی دیر تک تنہائی میں روتی رہی۔ اس کی بیٹی نے نجانے پن میں اس کے ایک ایسے زخم کو چھیڑ دیا تھا، جسے وقت کا مرہم بھی مندرل نہیں کر سکا۔ وہ برسوں سے ایک نادریدہ آگ میں جل رہی تھی۔ اس کے سوا اس ہولناک اذیت کا کوئی احساس نہیں کر سکتا تھا۔

اپنی جوانی میں وہ نشرہ ہی کی طرح خوب صورت اور پرکشش اور باغی قسم کی لڑکی تھی۔ کالج کا ہر لڑکا اس کا دیوانہ تھا۔ اس دیوانوں میں ایک سرفراز بیک تھا۔ جس سے بعد ازاں اس کی شادی ہوئی، لیکن فرخندہ خاتون نے بھی اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا، کیونکہ وہ اپنا دل ایک اور لڑکے کے قدموں میں بچھا کر چکی تھی۔

ایک دن دونوں کا رگین خواب دفعتاً چکنا چور ہو گیا۔ اندھیروں نے دھبک کے حسین رنگ اپنے اندر سمیٹ لیے اور رومانی گیت سناؤں کی زور ہو گئے۔ فرخندہ خاتون محض کالج کی چار یو اری کے اندر ہی باغیانہ اور انقلابی باتیں کر سکتی تھی۔ سماج اور سماج کی قدروں کا سامنا کرتے ہی وہ سکڑ کر جل نکلی بن گئی۔ اس کی نادادی نہایت شان و شوکت سے سرفراز سے کر دی گئی، اور تنہائیوں کی زوردار گونج میں اس کی کمزور چیخوں نے اس کی جھلملائی تمناؤں کی نند ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دم توڑ دیا۔

ایک معزز خاندان کی بہو بننے کے بعد اس نے اپنا سرا اس طرح جھکایا کہ اس کی خالی خالی آنکھیں اپنے شوہر کے قدموں کے سوا کچھ نہ دیکھ سکتی تھیں۔ سرفراز بیک بہت خوش ہوا تھا۔ اس کی اصل مسرت یہ تھی کہ اس نے ایک ایسی خور و لڑکی کو زبردست سماجی قوت کے بل بوتے اپنی بیوی بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ جس نے اپنی نند کے مطابق کسی دوسرے کو اپنی دھڑتوں میں

اس وقت وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ اسے نشرہ پر شدید غصہ تھا کہ اس نے اس کے شوہر کو آنا مانا مار ڈالا۔ اس کی واپسی کی راہیں دیکھتے دیکھتے وہ اپنی نصف بیانی گنوا بیٹھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ زندہ ہے اور ایک نہ ایک دن ضرور واپس لوٹ آئے گا۔

اس ناخوش گوار واقعہ کے بعد پھر کبھی نشرہ نے اپنے ڈیڈی کا ذکر نہیں کیا۔ اگر اس کی موجودگی میں کبھی دوسرے لوگ سرفراز بیک کی باتیں چھیڑتے تو وہ لالچلیق سی بن کر بیٹھی رہتی یا کوئی بہانہ بنا کر چلی جاتی۔

ان ہی دنوں بد نصیب فرخندہ خاتون پر یہ دہشت ناک انکشاف ہوا کہ نشرہ اپنے باپ کی طرح سوتے میں چلنے کی عادی ہو گئی ہے اور وہ دہل کر رہ گئی۔ اس کے علاوہ اسے احساس ہوا کہ نشرہ کی آنکھوں میں بعض اوقات ایسی پراسرار چمک نمودار ہو جاتی ہے جسے دیکھ کر خوف آتا ہے۔ کیونکہ سرفراز نفرت کی حالت میں بالکل اسی طرح اس کو دیکھتا تھا، اس کا سر گھوم گیا، اسے یوں لگا جیسے سرفراز نشرہ کے اندر چھپ کر بیٹھ گیا ہے۔ ابتدا میں وہ زبردستی اس کو ماہر نفسیات کے پاس لے گئی۔

لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین بات کے مترادف تھا۔ ماہر نفسیات نے سر توڑ کوشش کی اور آخر کار تھک تھکا کر اس نے کہا۔ ”میں حیران ہوں کہ نشرہ کو کوئی غم نہیں ہے، اور نہ ہی مجھے اس کی گمراہی کا سراغ ملا ہے۔ بہر حال بہتر یہ ہے کہ فوراً اس کی شادی کر دی جائے۔“

اس واقعہ کے بعد نشرہ کی ملاقات نظام سے ہوئی۔ ایک دن ان کے گھر دو اجنبی مہمان وارد ہوئے، سہیل اور اس کی چھوٹی بہن کنول، کنول بہت خوب صورت ہونے کے باوجود چلنے پھرنے سے معذور تھی۔ وہ گزشتہ کئی سال سے بیرون ملک مقیم تھے۔ سہیل کی نشرہ کے بھائی سے دوستی

ابتدا میں وہ بے خوابی کا شکار ہوا۔ اس نے اس سے بچنے کے لیے خواب آور گولیوں کا سہارا لیا۔ چنانچہ اس کی کھوٹی ہوئی نیند واپس لوٹ آئی لیکن نئی آفت یہ نازل ہوئی کہ اس نے سوتے میں چلنا شروع کر دیا۔ نفسیاتی امراض کے ماہرین بڑی توجہ سے اس کا علاج کرنے لگے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ اس کی گہرائی تک پہنچ نہ سکے۔ سرفراز ہوشیار اور ذہین انسان تھا۔ اس کی ہرگز خواہش نہیں تھی کہ دنیا کا کوئی شخص اس کے اصل کمپلیکس کی تہ تک رسائی حاصل کر سکے۔ کیونکہ اس طرح اپنی سوچ کے مطابق اس کی شخصیت کی ہمیشہ کے لیے توڑ پھوڑ ہو جاتی۔ جھکے سر کے ساتھ اسے زندہ رہنا گوارا نہیں تھا۔

اس وقت تک وہ دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ نشرہ کی پیدائش کے بعد اس کی ذہنی حالت ایک ایسی بگڑ گئی۔ اس کا نام اس نے خود تجویز کیا تھا اور جب سب نے کہا کہ بھلا یہ بھی کوئی نام ہے تو اس نے غم زدہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ اس لڑکی نے مجھے احساس دلایا ہے کہ میری زندگی کے افاق پر شام چھا گئی ہے۔ نشرہ کو اپنے باپ سے بڑی محبت تھی۔ جب سرفراز اچانک لاپتہ ہو گیا تو سب سے زیادہ وہی روئی۔ دوسروں کو آہستہ آہستہ پھر بھی صبر آ گیا۔ لیکن نشرہ کی بے چینی اور اضطراب میں کوئی فرق نہیں آیا۔

جب وہ جوان ہوئی تو ایک دن اچانک اس نے اپنی ماں اور بہن سے کہا۔

”میں بے وقوف ہوں جو پلاوجہ جذباتی طور پر ایک ایسے کے لیے آنسو بہا رہی جو میرا نہیں تھا۔ اب تک ڈیڈی! یقیناً مر چکے ہوں گے۔“ اس کی ماں چیخیں۔

”چپ ہو جاؤ“ نشرہ اپنی زبان سے اور کوئی لفظ مت نکالنا۔“ یہ کہہ کر وہ بے ہوش ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اسے ہوش میں لایا گیا۔

مدد سے اس نے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں گھر بیٹھے اعلا مہارت حاصل کر لی تھی۔ اسے اپنے باپ کی بے رخی اور اپنی معذوری کا غم بہت ستاتا تھا۔ وہ گھنٹوں تہائی میں زار و قطار روتی اور خدا سے اپنے لیے موت مانگتی۔ جو نبی سمیل کو احساس ہوا کہ وہ خود رچی میں جتلا ہو چکی ہے۔ اس نے نہایت مہارت سے ادب فلسفہ اور آرٹ کی کتابوں میں متفرق کر دیا۔

کینیڈا میں قیام کے دوران وہاں کے انگریزی اخبارات و رسائل میں اکثر کنول کے مضامین شائع ہونے لگے تھے۔ یہ ایک ایسی انجانی مسرت تھی۔ جس نے اس کی معذوری اور محرومی کا غم بڑی حد تک کم کر دیا تھا۔

ایک دن سہ پہر لان کے ایک گوشے میں وہیل چیئر پر بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی تھی کہ نشرہ کا ادھر سے گزر ہوا۔ وہ غصے کی اسی وقت کنول کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

”رات میں بھیا کافی دیر تک تمہارے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آج کل تم دونوں بالکل خالی الذہن ہو۔“ اس کے لہجے میں غی تھی۔ کنول بے ساختہ ہنس دی۔ نشرہ پر اس کی ہنسی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ سپاٹ نظروں سے اسے دیکھ کر جا رہی تھی۔

کنول بولی۔ ”بھیا نے ٹی وی اسکرین پر تمہیں دیکھ کر کہا کہ نشرہ ذہین ہونے کے باوجود اندر سے بے حد دکھی لڑکی ہے۔ اس پر میں الجھ گئی۔ میرا موقف تھا کہ نشرہ کو ساری آسودگیاں اور آسائشیں حاصل ہیں۔ اگر شخص اس کے ڈیڑی اس کی زندگی سے نکل گئے یا بڑی بہن مر گئی اور یا اس کا بڑا بھائی کینیڈا میں مقیم ہے۔ تو یہ سب مل کر بھی غم کا وہ کوہ گراں نہیں بن سکتے جو حقیقی معنوں میں انسان کی توڑ پھوڑ کرتا ہے۔“

ہوئی۔ دونوں ہم عمر تھے۔ اس لیے بہت جلد ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ اب انہوں نے اپنے وطن واپس آ کر اپنے ملک ہی میں سیٹل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ نشرہ کے بھائی نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کچھ عرصہ تک ان کی امی کے بنگلہ پر ٹھہریں گے۔“

ابتدا میں نشرہ کو ان مہمانوں سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ رسمی طور پر تھوڑی دیر کے لیے ان کی خیر خیریت پوچھتی اور اس کے بعد غائب ہو جاتی۔ اس کی ماں کو اس کی یہ سرد مہری پسند نہیں آئی۔ ایک دن اس نے اس کو تہائی میں ڈانٹا۔ ”تمہارا یہ رویہ اچھا نہیں ہے۔ انہیں یہ احساس ہو گا کہ شاید وہ ہم پر بوجھ ہیں۔“

نشرہ خشک خاتون اپنا سامنہ لے کر رہ گئی۔ سمیل اور کنول کی امی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کا باپ ایک تاجر تھا لیکن اس نے دوسری شادی کرنے کے بعد نہ صرف ان سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے تھے بلکہ بیوی کی خوشنودی کی خاطر کئی سال پہلے انہیں اپنی جائیداد سے عاق کر چکا تھا۔ سمیل نے اپنی ذاتی جدوجہد سے تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد تک و دو کر کے وہ پیر دن ملک چلا گیا۔ کنول سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔ اس نے ایک ہل کے لیے بھی کبھی اسے بے سہارا یا تنہا نہیں رہنے دیا۔

کینیڈا میں کئی سال ملازمت کرنے کے بعد اس نے اتنا اثاثہ جمع کر لیا تھا کہ اب وہ چھوٹا موٹا اپنا کاروبار کر سکتا تھا۔ دونوں بہن بھائی غیر شادی شدہ تھے۔ سمیل وجیہ اور صحت مند مرد تھا۔ لیکن اسے شادی کے نام سے چڑھتی۔ جبکہ کنول کے بارے میں وہ ہر وقت اسی فکر میں رہتا کہ اس کا کسی شریف انسان کے ساتھ بیاہ ہو جائے۔

کنول باقاعدہ طور پر تعلیم حاصل نہیں کر سکی تھی۔ سمیل اس کا بھائی نہیں استاد بھی تھا۔ اس کی

نشرہ بولی۔ ”مثلاً یہ کہ وہ نیک روح تھا۔ جبکہ میں بدروح ہوں۔“
کنول زوردار قہقہہ لگا کر بڑبڑائی۔
”واہ..... کیسی خوب صورت وضاحت پیش کی ہے نشرہ نے۔“

سہیل نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
”یہ توجہ بالکل صحیح ہے۔“ نیکی اور بدی کا تعلق محض جسم سے ہے، روح سے نہیں۔“

نشرہ نے پہلی بار اس میں دلچسپی لیتے ہوئے تھرا کر کہا۔ ”پڑھے لکھے لوگوں میں برائی یہ ہوتی ہے کہ وہ بچوں کی طرح لفظوں کو اپنے لیے مھلوتا تصور کرتے ہیں، اور زندگی پھر ان مھلونوں سے کھیلنے رہتے ہیں۔“ سہیل بولا۔ ”میں تم سے کسی حد تک متفق ہوں۔ جہاں تک میرے پہلے دعوے کا تعلق ہے تم برقی قوت کے بارے میں غور کرو جو ہر گھر میں استعمال ہوتی ہے برقی قوت سے ایک طرف چولہے گرم ہوتے ہیں اور دوسری طرف ایئر کنڈیشنر سے کمروں کو ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ اگر ہم روح کو نیک اور بد کہنے میں حق بجانب ہیں تو پھر ہمیں برقی قوت کو بھی گرم اور ٹھنڈے خانوں میں تقسیم کر لینا چاہیے جبکہ یہ سراسر مضمحلہ خیز ہے۔“
نشرہ نے غرا کر پوچھا۔ ”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔“

وہ تھوڑی دیر تک سمندر کی موجوں میں دیکھتا رہا۔ سگار کے کش لگاتا رہا، پھر کہنے لگا۔
”برقی قوت کی مانند روح صرف ایک توانائی ہے، اس لیے تم اپنے آپ کو بدروح کہنے میں مبالغہ آرائی سے کام لے رہی ہو۔“

نشرہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ پہلی بار کسی شخص نے اس کو منطقی طور پر جواب کر دیا تھا۔ کنول نے نکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور بھانپ لیا کہ وہ سہیل کی گفتگو سے ناخوش ہے۔ اس نے جلدی سے اپنے بھائی کو مخاطب کرتے ہوئے

یہ پہلا موقع تھا کہ نشرہ کو یہ لڑکی دلچسپ و دلچسپ سی دکھائی دی اور وہ اس کے پاس آکر کہنے لگی۔ ”پھر تمہارے بھائی شرمندہ ہوئے۔“
وہ ہنسی اور اس کی ہنسی بڑی جان لیوا تھی۔
اس نے کہا۔ ”نہیں جی۔ پورے دو گھنٹے مجھے دکھوں اور اذیتوں کا قلفہ سمجھاتے رہے۔ تمہیں انہوں نے گوتم بدھ کے ساتھ ملا دیا۔ میں بھی ان کا خوب خوب مذاق اڑاتی رہی۔ بھلا تم خود فیصلہ کرو کہاں بدھ اور کہاں نشرہ۔“ اور پھر ہنسنے لگی، لیکن اس بار اس کی ہنسی میں نشرہ بھی شامل ہو چکی تھی۔ یہ ان دونوں کی بے تکلف دوستی کا غیر مشروط آغاز تھا۔

ایک رات ٹی وی پر اس کی ڈیوٹی نہیں تھی۔ سہیل اور کنول کی خواہش پر وہ بادل خواستہ ان کے ساتھ سیر کے لیے چلی گئی۔ ایک خاموش اور سنسان گوشے میں وہ پتھروں کے ڈھیر سے ہٹ کر رک گئے۔ کنول وہیل چیئر پر بیٹھی تھی۔ یہاں سمندر بہت سست تھا۔ سمندر کے خشک جموں کوں نے نہایت شرارتی انداز میں ان کا استقبال کیا۔
دفعتاً سہیل بولا۔ ”گوتم جب فروکن کے چکر میں گھوم رہا تھا تو اس کی ملاقات ایک چمچیرے سے ہوئی تھی۔ اس نے اس کو بتایا کہ موجیں بولتی ہیں اور.....“

کنول نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”بھیا! گوتم ہر وقت آپ کے ذہن پر کیوں سایا رہتا ہے۔“

سہیل نے نکھیوں سے نشرہ کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ ”اس لڑکی سے ملنے کے بعد صرف اور صرف گوتم ہی یادوں میں ابھرتا ہے۔“

نشا اپنی دھن میں مگن تھی۔ یکا یک وہ چوکی اور اس نے سفاکانہ نظروں سے اسے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ”گوتم بدھ اور مجھ میں بڑا فرق ہے۔“

”مثلاً.....“ سہیل نے اپنا سگار سلگایا۔

کرتی تو کبھی کبھی نشہ کو یوں لگتا جیسے وہ کھلی فضاؤں کا ایک آزاد چھٹی ہے۔

ایک شام اچانک نشہ پر اداسی کا دورہ پڑا۔ ایسے لمحات میں وہ اکثر پروفیسر کی طرف چلی جاتی تھی۔ اس دن بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ اس کی ٹیکسی ابھی پروفیسر کے بنگلے سے تھوڑی دور تھی کہ ٹیکھت اس نے ایک ایسا منظر دیکھا جو اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ اس کی ماں اپنی گاڑی ڈرائیو کرتی ہوئی پروفیسر کے بنگلے سے باہر آرہی تھی۔ فرخندہ خاتون کی اپنی بیٹی پر نظر نہیں پڑی۔ نشہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مڑ مڑ کر اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی۔ جواب تقریباً اوجھل ہونے کے قریب تھی۔

پہلے اس نے سوچا کہ گھر جا کر ماں سے پوچھے کہ وہ کس لیے پروفیسر سے ملنے گئی تھی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ماں کو اس کا پروفیسر سے ملنا جلنا پسند نہیں۔ ایک مرتبہ اس نے پروفیسر کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کرنا چاہا لیکن فرخندہ خاتون نے اسے نہایت سختی سے ڈانٹ دیا اور کہا۔

”اگر تمہیں بہت شوق ہے تو اپنے پروفیسر کو کسی ہوٹل میں لے جاؤ۔“

نشہ نے ٹیکسی والے کو فارغ کیا اور بوجھل بوجھل قدموں سے ڈولتی ہوئی پروفیسر کے پاس آگئی۔ وہ اسے دیکھ کر ٹھٹکا۔ پھر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ”بہت دنوں بعد یاد آیا کہ دنیا میں ایک ایسا شخص رہتا ہے جسے تم سے بہت محبت ہے۔“

وہ اپنی عادت کے خلاف بالکل نہیں مسکرائی۔

پروفیسر نے سوال کیا۔ ”کیا تم پریشان ہو۔“

اس نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور خونخوار انداز میں اس کو گھورتی ہوئی بولی۔

کہا۔ ”آپ بار بار نشہ کو گوتم سے کیوں مشابہت دیتے ہو۔“

وہ بولا۔ ”میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ نشہ دوسری گوتم ہے، میرا موقف ہے کہ اسے نصف گوتم کہا جاسکتا ہے۔“

”نصف گوتم۔“ نشہ نے ناخوش گواری کے انداز میں دہرایا۔ سہیل کہہ رہا تھا۔ ”مہمل گوتم تو بہت عظیم انسان تھا۔ ابتدا میں اس نے متعدد تنہائی کا دکھ میٹیں سے اس نے نردان کی تلاش میں جلا وطنی اختیار کی اور برہسہا بریس وہ جنگلوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ تب ایک موقع ایسا آیا جب اس نے اپنے دکھ کی وساطت سے دوسرے انسانوں کے دکھوں تک رسائی حاصل کی۔ اس طرح وہ مہمل ہو گیا، لیکن نشہ ادھوری ہے۔“

کنول نے شریر لہجے میں نشہ سے پوچھا۔ ”کیا تمہیں کسی نے دکھ دیا ہے، میرا خیال ہے محبت کے سوا کوئی اور دکھ تمہارے در دل پر دستک نہیں دے سکتا۔“

اس نے نفرت سے ہونٹ سکڑتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے کسی سے محبت نہیں۔ البتہ لوگ مجھ سے دیوانہ وار عشق کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں انسان نہیں پسنا ہوں، سب کا پسنا۔“ یہ کہہ کر اس نے پراسرار طریقے سے ایک قہقہہ لگایا۔

سہیل نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور کافی دیر تک اسی طرح دیکھتا رہا۔

تین ہفتے بعد دونوں بہن بھائی کرائے کے ایک کمرے میں تھکے ہوئے۔ اس دوران نشہ ان میں کافی دلچسپی لینے لگی تھی۔ کنول کی زندہ دلی نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ معذور اور مجبور ہونے کے باوجود جب قہقہہ لگاتی اور زندگی کے روشن پہلوؤں کو اپنی گفتگو میں پوری طرح اجاگر

مزاحیہ

پروفیسر غفار بابر

سر پھرا کوئی دریا یار تک آپہنچا ہے
سر ہتھیلی پہ لیے دار تک آپہنچا ہے

کل میری گرد کو پانا بھی جسے مشکل تھا
آج وہ بھی میرے معیار تک آپہنچا ہے

رند کا کشف کہ ساقی کی کرامت لکھوں
جام خود اپنے ہی میوڑا تک آپہنچا ہے

راز بن کر جو کبھی ”سینہ کیتی“ میں رہا
حرف وہ بھی لب اظہار تک آپہنچا ہے

زاہد خشک! تیرے ہوئے لطف خدا
کس طرح مجھ سے گنگار تک آپہنچا ہے

وہ ملاقات میں پہلا سا ”تسلل“ نہ رہا
حرف اقرار بھی ”انکار“ تک آپہنچا ہے

جس کی خاطر ہے وہ بے نور کئی سالوں سے
نور وہ نرگس بیمار تک آپہنچا ہے

ہے کوئی رشک زلیخا جو خریدے باہر
مال خود اپنے خریدار تک آپہنچا ہے

”فرخندہ خاتون آپ کے پاس کیا کرنے آئی تھیں۔“

”فرخندہ خاتون“ یعنی تمہاری ماں۔“
پروفیسر گھبرا گیا۔

”ہاں..... آپ اسے میری ماں بھی کہہ سکتے ہیں۔“
نثرہ کے چپکے لہجے میں غضب کا طغیر پوشیدہ تھا۔

پروفیسر کچھ دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ دفعتاً اس نے کیمبر لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”اس کی خواہش تھی کہ مجھیں اس کی آپ کا علم نہ ہو لیکن بد قسمتی سے اس کی یہ تمنا بھی پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکی۔ نثرہ وہ بے حد پریشان ہے اور اس کی پریشانی کا سبب تم ہو۔ اس نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں کسی طرح تمہیں نظام سے شادی کرنے پر راضی کر لوں، کیونکہ گڈو کے مستقبل نے اس کو نروس کر دیا ہے۔ ویسے تم مجھے بتاؤ اس میں مضائقہ ہی کیا ہے۔ ہمیں بھی انسان کو دوسروں کے لیے چھوٹی موٹی قربانی دے دینی چاہیے۔ ایسا کرتے ہوئے اپنی آرزوؤں کا خون ضرور ہوتا ہے۔ لیکن انسان کی ذات میں بڑائی آجانی ہے۔“

”جیسے آپ کی ذات میں بڑائی آگئی۔“
وہ سفاکانہ انداز میں بڑبڑائی۔

”کیا مطلب۔“ پروفیسر نے اپنی بھنویں اچکاتے ہوئے اسے غور سے دیکھا۔

نثرہ اپنے بالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہنے لگی۔ ”میری ماں نے یہ بات ہمیشہ مجھ سے چھپائے رکھی کہ آپ اس کے لیے اجنبی نہیں اور یہ کہ وہ میرے سامنے آپ کو جو برا بھلا کہتی تھی شخص ایک نالک ہے، فرخندہ خاتون اگر اداکاری کا پیشہ اپنا لیتیں تو بلاشبہ وہ ایک کامیاب ترین اداکارہ ہوتیں۔“

اپنے سینے سے کبھی باہر نہ آنے دیتا۔“
نشرہ بے نیازی کے عالم میں اٹھی اور باہر کی طرف چل دی۔ معاً پروفیسر نے اسے آواز دی، نشرہ نے مڑ کر دیکھا۔ وہ کرسی کا سہارا لیے نہایت شکستہ حالت میں کھڑا تھا۔ اس کی اجاڑ آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ روتا روتا بولا۔ ”نشرہ اپنی ماں کے ساتھ وہ سلوک نہ کرنا جو تم نے میرے ساتھ کیا، وہ بہت دکھی عورت ہے اور میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اس کو سکون پہنچانے کے لیے تم نظام سے شادی کر لو۔“

نشرہ کچھ دیر تک اس کو بکتی رہی، پھر وہ سنگ دلا نہ انداز میں تہقہہ لگا کر مڑی اور بنگلہ سے باہر نکل گئی۔

ایک ہفتے بعد وہ اور نظام اکٹھے ایک ریستوران میں بیٹھے تھے۔ نظام اس کی ہدایت کے مطابق گڈو کو اپنے ہمراہ نہیں لایا تھا۔ اس دن نشرہ سیاہ ساڑھی اور سیاہ بلاؤز میں ہلا کی خوب صورت لگ رہی تھی۔ نظام مدہوش سا ہو گیا۔

نشرہ مسکرا مسکرا کر کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی، یکنخت وہ رومانی لہجے میں بولی۔ ”نظام کیا سچ مچ تم مجھ سے بہت عشق کرتے ہو۔“

نظام نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس وہ الفاظ نہیں نشرہ! جو میرے جذبے کو انظار کی قوت مہیا کر سکیں۔“
”محبوبوں کے دریا اپنے بہاؤ کے لیے کسی کے محتاج نہیں ہوتے۔ بس ایک تلاطم ہے جدھر مڑ گیا مڑ گیا۔“ وہ بولی۔

وہ خوش ہو کر اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔ نشرہ نے پوچھا۔ ”اگر میں تمہاری بن جاؤں تو تمہارا کیا رد عمل ہوگا۔“

”خوشی سے پاگل ہو جاؤں گا۔“ وہ پہلی

”نشرہ۔“ پروفیسر گر جا۔ ”بند کرو اپنی بکواس اور نکل جاؤ میرے کمرے تمہیں اپنی ماں کے بارے میں ایسی شرمناک گفتگو کرتے محض ہجر کے لیے بھی شرم نہیں آتی۔“ وہ غصے سے قہر قہر کانپ رہا تھا۔

نشرہ پر اس کے رد عمل کا کوئی خاص رد عمل نہیں ہوا وہ اطمینان سے اپنی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھے ہلائی رہی۔ دفعتاً اس نے نرمی سے کہا۔ ”پروفیسر صاحب! غصے میں آنے کی ضرورت نہیں، میں ٹی وی اناؤنسر ضرور ہوں، لیکن اداکارہ نہیں۔ اس لیے میں آپ کو ترکی بہ ترکی تیز و تند ڈائیلاگ نہیں سنا سکتی۔ آپ غصے میں صرف اس لیے گرج رہے ہیں، کیونکہ میں نے ایسی عورت کے خلاف توہین آمیز جملے استعمال کیے جو میری ماں ہونے کے علاوہ جوانی کے دنوں میں آپ کی محبوبہ رہ چکی ہے۔“

اس کے آخری الفاظ پروفیسر پرائیٹم بم کی طرح گرے، وہ ہکا بکا بن کر دیوانوں کی طرح اسے گھور رہا تھا، نشرہ کہہ رہی تھی۔

”میں جانتی ہوں کہ اس ولن نے جو میرا باپ کہلاتا ہے آپ دونوں کی محبت کو پامال کر دیا۔ میں اتنے سال تک آپ کے قریب رہی، لیکن میری ماں کی طرح آپ بھی سادہ لوح تصور کرتے رہے۔ حالانکہ میں اصل صورت حال سے واقف تھی اور کسی کو شبہ تک نہ ہوا کہ میں اپنے ذہن میں کیا کیا اسرار چھپائے ہوئے ہوں اور کس کرب میں مبتلا ہوں۔ ویسے بھی انسان سمندروں کی تہہ تک اتر سکتا ہے، ستاروں کی بھی خبر لے آتا ہے، لیکن قریب بیٹھے انسان تک رسائی حاصل کرنا اس کے لیے ناممکن ہے۔“

پروفیسر نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا اور ہکلاتا ہوا بولا۔ ”میں تمہارا استاد ہوں نشرہ، اس کے باوجود میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں، چلی جاؤ، فوراً چلی جاؤ، اور..... اور اس راز کو

لگے۔ ”میں سچ بچ تمہاری پرستش کرتا ہوں۔“
مجھے تم سے حقیقی معنوں میں عشق ہے۔“

”عشق.....“ وہ قہر آلود لہجے میں
بڑبڑائی۔ ”تمہارے منہ سے یہ لفظ اچھا نہیں
لگتا۔ اگر تم سچے دل سے مجھ سے محبت کرتے تو
میری خواہش پوری کرنے میں بھی قائل نہ
کرتے۔“

نظام کا سرگھوم گیا، اس کی کچھ سمجھ میں نہیں
آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ دفعتاً اس نے اپنا لہجہ
مضبوط کیا اور بیچلی آنکھوں سے اس کی طرف
دیکھ کر بولا۔ ”اگر تمہارے عشق کا تقاضہ یہ ہے کہ
میں اپنے ہاتھوں اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ کر
ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے آپ سے اجنبی بن
جاؤں تو مجھے منظور ہے۔“ اس نے سسکی لی۔
نشرہ نے کہا۔ ”اور وعدہ کرو کہ میری خاطر
ہمیشہ کنول کو خوش رکھو گے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں۔“ وہ بچوں کی طرح
بلک بلک کر رو رہا تھا۔
کنول اور نظام کی شادی ہو گئی۔ سہیل بہت
خوش تھا۔ اس نے ممنونیت بھرے لہجے میں اس
سے کہا۔ ”تم نے میری زندگی کی ایک بڑی
آرزو پوری کی ہے، میری دعا ہے کہ تم ہمیشہ خوش
رہو۔“

”میرے مقدر میں خوشیاں ضرورت سے
زیادہ ہیں، اب مزید ان کی ضرورت نہیں۔“ اس
نے طنزیہ طور پر اپنے دل ہی دل میں کہا۔
فرخندہ خاتون کو نشرہ پر بہت غصہ آیا تھا۔
وہ کچھ عرصے سے تصورات میں اس کو نظام کی
دلہن کی حیثیت سے دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی۔
جب حقیقتوں کی دنیا میں ایک ایسی کنول نے اس کی
جگہ لے لی تو وہ چٹ پڑی۔ انہوں نے اسے جلی
کنی سنا تے ہوئے کہا۔

”قصور میری قسمت کا ہے تمہارے ڈیڑی
نے میرے دل پر گھاؤ لگانے کا کوئی موقع ہاتھ

بارنشرہ کو اس مہربان لہجے میں گفتگو کرتے دیکھ کر
اپنے آپ میں نہیں تھا۔

وہ شکرگانی اور اس کی طرف جھک کر بولی۔
”مجھے یہ کیونکر یقین آئے کہ تمہارا عشق میرے
حسن کا مرہون منت نہیں ہے۔“
اس نے جذباتی لہجے میں سرگوشی کی۔
”نشرہ! میں اپنے دل کی گہرائیوں سے تمہیں
چاہتا ہوں۔“

وہ کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ دفعتاً اس نے
سر اٹھایا اور پراسرار چیمتی نظروں سے اس کو
گھورتی ہوئی بڑبڑائی۔ ”میری خاطر ایک
آزمائش میں پورے اترو گے۔“
”ہاں..... بالکل.....“ وہ اس وقت بچہ بنا
ہوا تھا۔

”تمہیں میری ایک معذور دوست کو سہارا
دینا ہو گا۔“

”سہارا۔ کیا مطلب۔“

”کنول..... بے حد ذہین اور پیاری
پیاری لڑکی ہے، قدرت نے اسے چلنے پھرنے
سے معذور کر دیا ہے، میری خواہش ہے کہ تم اس
سے شادی کر لو۔“
”میں..... میں اس سے شادی کر لوں، کیا
کہہ رہی ہو تم۔“

نشرہ نے طنز کی۔ ”بس تمہارا عشق بھانپ
بن کر اڑ گیا ہوا میں، تم بھی عام لوگوں کی طرح
جھوٹے اور مکار ہو۔ جو اپنی ہوس پر عشق کا ٹائٹل
لگا کر لڑکیوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔“
وہ اٹھ کھڑی ہوئی، نظام نے ہڑبڑا کر اس
کا ہاتھ پکڑا اور بولا۔ ”پلیز مت جاؤ۔“

اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور غرائی۔
”تمہارے پاس اداکاری کے سوا اور کچھ نہیں
کیا کروں گی میں تمہارے پاس رک کر۔“

”نشرہ! حتا کے لیے مجھ پر اتنی بڑی تہمت
نہ لگاؤ۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے

پراسرار قوت کو جنم دیتا ہے، میں ٹوٹ بھوٹ گئی
ذات کی اس شکستی نے مجھے بزدل بنا دیا اور میں
نے اپنے آپ کو موت کے سپرد کرنے کے
 بجائے سوتے میں چلنا شروع کر دیا۔ وہ
 جذباتی رو میں پٹا پٹ بولے جا رہی تھی۔
 اس کی ماں پر سکتے چھایا ہوا تھا، اسے یوں
 لگا جیسے اس کے سامنے۔ نشرہ نہیں، اس کا ڈیڈی
 بیٹھا ہو، وہ اس سے اسی انداز میں گفتگو کرنے کا
 عادی تھا۔

فرخندہ خاتون کے جسم میں جبر جبری
 آ گئی۔ اس نے بے اختیار پوچھا، ”نشرہ کیا تم
 ہوش میں ہو۔ تم نے اس سے پہلے بھی مجھ سے
 ایسی باتیں نہیں کیں۔ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے
 مجھے بتاؤ، تمہارے دل میں کون سا زہر ہے، تم
 مجھ سے کس بات کا انتقام لے رہی ہو۔“

نشرہ نے اپنی پراسرار بڑی بڑی آنکھیں
 اس پر مرکوز کر دیں۔ ایک لمحہ کے لیے فرخندہ بیگم
 کا جی دہل گیا۔ یہ آنکھیں نشرہ کی نہیں بلکہ سرفراز
 کی تھیں۔ نشرہ تمہیں لہجے میں یوں بڑبڑاتی جیسے
 اپنے آپ سے مخاطب ہو۔ ”اگر آپ کو پروفیسر
 سے عشق تھا تو پھر آپ نے ڈیڈی سے شادی
 کیوں کی اور اگر کرتی تھی تو کیا ضرورت تھی
 آپ کو اپنے شوہر کی امانت میں خیانت کرنے
 کی۔“

فرخندہ خاتون چلائیں۔ ”نشرہ..... منہ بند
 کر لو، کہیں ایسا نہ ہو خدائی قہر جوش میں آ جائے
 اور تمہارے ساتھ دوسروں کو بھی بہا کر لے
 جائے۔“

نشرہ پر ایسا ایسا جی چھانی کیفیت طاری ہو گئی
 اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ منہ سے جھاگ
 بہنے لگا تھا اور مٹھیاں پیچھی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا
 جیسے اس پر دورہ پڑا ہے۔ وہ گونج دار آواز میں
 چپچی۔ ”میرا کیا قصور تھا، بد بخت عورت! اگر
 تمہیں ڈیڈی سے نفرت تھی تو اس سے طلاق لے

سے جانے نہیں دیا، اب ان کی جگہ ان کی بیٹی نے
 لے لی ہے۔“

نشرہ کچھ دیر قہر آلود نظروں سے اس کو
 دیکھتی رہی، پھر بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔
 ”کبھی آپ کو یہ خیال آیا کہ ڈیڈی کو آپ نے
 کون کون سے زخم تحفے میں دیے۔“

”نشرہ! اپنی زبان کو لگام دو، تو بہ کیا زمانہ
 آ گیا کہ بیٹی ڈھٹائی کے ساتھ اپنی ماں کو
 مورد الزام ٹھہرا رہی ہے۔“

اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی ہنسی تیر گئی،
 وہ بولی۔ ”آپ میری ماں ضرور ہیں، لیکن مظلوم
 ہرگز نہیں۔“

”ہاں..... تم درست کہتی ہو۔“ فرخندہ
 خاتون فریاد کرنے والے انداز میں بڑبڑاتی۔
 ”مظلوم تمہارے ڈیڈی تھے۔ جیسی مجھے بے سہارا
 چھوڑ کر غائب ہو گئے۔“

نشرہ اپنی پلکیں جھپکاتے ہوئے سرد لہجے
 میں کہنے لگی۔ ”اس کی ذمہ داری بھی آپ ہی
 عائد ہوتی ہے۔“
 ”کیا مطلب۔“

”آپ نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ گھر چھوڑ
 کر غائب ہو جائیں۔“

فرخندہ خاتون پر ایک بجلی سی گری، اور وہ
 پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک ٹک اسے کھوے
 جا رہی تھی۔

نشرہ نے نفرت سے اپنی ناک سکڑتے
 ہوئے دوبارہ کہا۔ ”چند سال پہلے مجھے ان تمام
 دہشتناک واقعات کا علم ہو گیا تھا۔ جنہیں آپ
 سے بڑی کامیابی سے چھپایا اور میرا حوصلہ ہے
 کہ میں نے اپنے لب سی گئے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ
 نفرتوں کا مہیب سمندر میری آنکھوں میں سمٹ
 آیا۔ لوگ کہتے ہیں میری آنکھیں پراسرار ہیں۔
 ان میں کوئی غیر مرئی قوت پنہاں ہے۔ انہیں کیا
 معلوم کہ نفرتوں کا نادیہ الاؤ کسی ہولناک اور

غزل

ناصر زیدی

ذہن میں اپنے بسا تا دل کے اندر دیکھتا
میں تصور میں تیری تصویر اکثر دیکھتا

اور تو کچھ بھی نہیں بس ایک خواہش ہے مری
سامنے تجھ کو بیٹھاتا ، زندگی بھر دیکھتا

جانتا تھا ، لوٹ کر وہ پھر نہ آئے گا کبھی
میں کوئی پاگل تھا جو اس سمت مڑ کر دیکھتا

یہ بھی اچھا تھا کہ ان آنکھوں میں بینائی نہ تھی
کس طرح اُس سے بچھڑ جانے کا منظر دیکھتا

تھا جہاؤں میں بھی اس کی ایک طرزِ اتفاقات
موم ہو جاتا تھا میں جب آنکھ بھر کر دیکھتا

اُس کو ہی ادراک ہو جاتا کہ کیا ہے اشکِ غم
قہقہوں میں جو مچھپا تھا وہ سمندر دیکھتا

زندگی دیتی اگر فرصت تو ناصر ایک دن
جس قدر دیکھا ہے اس کو اس سے بڑھ کر دیکھتا

☆☆

کر پروفیسر سے شادی کر لیتیں۔ ڈیڈی کی
نظروں میں دھول جھونک کر تم نے اور پروفیسر
نے مجھے اپنے گناہوں کی بوٹی نشانی کیوں بنایا
اگر مجھ منحوس نے جنم لے ہی لیا تھا تو تمہیں ڈیڈی
کے سامنے گناہ کا اعتراف کرنے کی کیا ضرورت
تھی۔ تم نے انہیں اس لیے یہ ذہنی صدمہ پہنچایا
تاکہ وہ ندامت و پشیمانی سے گھر چھوڑ کر چلے
جائیں اور تم اپنے محبوب کے ساتھ قانون اور
اخلاق کی نظروں میں دھول جھونک کر عیش کرو۔
مجھے چار سال پہلے سب کچھ معلوم ہو گیا تھا لیکن
میں بزدل تھی نہ تم سے کچھ کہہ سکی نہ اپنا گلا اپنے
ہاتھوں سے گھونٹ سکی ، کاش میں پیدا نہ ہوتی۔
وہ اپنی شعلہ بار آنکھوں پر ہاتھ رکھے زار و
تھار رونے لگی اسے اس کا بھی احساس نہیں تھا
کہ فرخندہ خاتون بے ہوش زمین پر گری پڑی
ہیں۔

تین دن کے بعد فرخندہ خاتون کا اسپتال
میں انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر انہیں ہوش میں نہیں
لا سکے تھے۔ اسی دن نشرہ کو بھی اسپتال میں داخل
کرایا جا چکا تھا۔ اس کی ذہنی حالت نہایت ابتر
تھی وہ بھی بیکسی باتیں کرتی اور اچانک اپنے
قریب جو بھی موجود ہوتا اس کو کاٹنے کے لیے
لپکتی۔ اس حالت میں اس کی آنکھوں کی چمک
اور پراسراریت میں غصہ کا اضافہ ہو گیا تھا۔
سہیل نے ہمہ وقت اپنے آپ کو اس کی تیار
داری کے لیے وقف کر لیا۔ اسے فرخندہ خاتون
کی ناگہانی موت کے علاوہ نشرہ کی بگڑی ہوئی
طاقت دیکھ کر گہرا صدمہ ہوا تھا۔ اس سے بھی
زیادہ اس کے لیے اذیت ناک بات یہ تھی کہ وہ
ماں بیٹی کے درمیان ہونے والی گفتگو کا آخری
حصہ اتفاق سے سن چکا تھا۔ وہ اس وقت نشرہ سے
ملنے کے لیے ان کے بنگلے پر آیا تھا اور دونوں
ماں بیٹی اس حقیقت سے ناواقف تھیں کہ وہ ملحقہ
کمرے میں بیٹھا ہے۔

ایک رات، سہیل اس کو سمندر کے کنارے لے گیا۔ نشہ غیر معمولی طور پر اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ دفعتاً اس نے نشہ کو مخاطب کر کے کہا۔ ”نشہ! تمہیں ٹیلی ویژن اسکرین سے غائب ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ تمہارے مداحین کیا سوچتے ہوں گے۔“

اس نے ایک ادا سے جواب دیا۔ ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے مجھ جیسی بے شمار اناؤنسر لڑکیاں ہیں ٹیلی ویژن کے ناظرین ان میں دلچسپی لے رہے ہوں گے۔“

”لیکن تمہاری انفرادیت مخصوص نوعیت کی ہے۔“ سہیل نے اصرار کیا۔

”کہا واقعی۔“ اس نے قہر آلود نظروں سے اس کو گھورا۔ سہیل گڑبڑا گیا۔ وہ اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے نرمی سے بولا۔ ”نشہ مجھے لگتا ہے کہ میں اور تم دو کنارے ہیں اور ہمارے درمیان ایک وسیع و عریض مہلک سمندر حائل ہے۔“

غیر متوقع طور پر نشہ ہنس دی۔ پھر طنز پر لبہ میں کہنے لگی۔ ”کیا تمہیں بھی مجھ سے عشق ہو گیا ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے اپنا بھسا گار پانی میں پھینک دیا۔

نشہ نے عجیب انداز میں اسے دیکھا اور بولی۔ ”تم پہلے مرد ہو جس نے میرے سامنے نہیں کہنے کی جسارت کی ہے۔“

سہیل کا چہرہ ساٹھا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہنا شروع کیا۔ ”یہ زندگی میسر بے رنگ ہے۔ ہم انسان اپنی اپنی ضرورتوں کے تحت مخصوص رنگ تخلیق کرتے ہیں اور پھر بھند ہوتے ہیں کہ دوسرے ہمارے مخصوص رنگ کو حرف آخر سمجھ لیں۔ محبت، نفرت، رقابت، جرائم جنکیں، سب اسی میٹر فز سوج کا نتیجہ ہیں۔ لوگوں کو یہ یاد نہیں رہتا کہ یہ وسیع و عریض کائنات دو طرفہ

سہیل کے سوا کسی دوسرے کو اصل واقعہ کی خبر نہیں تھی۔ اس لیے سب نے اپنے اپنے طور پر یہ قیاس کیا کہ ماں سے بچھڑنے کے سبب نشہ کی ذہنی حالت بگڑی ہے۔ ٹیلی ویژن کے لاکھوں ناظرین جو نشہ کی دل نواز مسکراہٹ اور آنکھوں کی پراسرار چمک روزانہ دیکھنے کے عادی تھے۔ اس کی اچانک غیر حاضری پر تھلا گئے۔ بعض لوگ ادا اس تھے۔ جبکہ دوسرے نشہ کی جگہ اسکرین پر آنے والی اناؤنسر کے خلاف طنزیہ جملے جست کر رہے تھے اور خوش ہو رہے تھے۔

نشہ کا بڑا بھائی بھی اپنے گھر آ چکا تھا۔ اس کے لیے اپنی ماں کی موت اور چھوٹی بہن کی ذہنی حالت بگڑنے کا مدد نہ ناقابل برداشت تھا لیکن کیا کرتا، نشہ کسی کو نہیں پہچانتی تھی۔ جونہی اس کے بھائی کو اطمینان ہوا کہ اس کا دوست سہیل بڑے خلوص کے ساتھ اس کی بہن کا خیال رکھ رہا ہے وہ چند ہفتوں بعد اپنی بیوی اور بچوں کے پاس واپس چلا گیا۔

اب نشہ اکیلی تھی لیکن اسے اپنے اکیلے پن کا قطعی احساس نہ تھا۔ سہیل کی کوشش تھی کہ ہر وقت اس کے پاس موجود رہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس کے لیے نامونوس کو اجنبی اجنبی سا تھا۔ جب بھی وہ چندھوں کے لیے اچھی ہوتی تو گم صم سے انداز میں بڑبڑاتی۔ ”امی..... امی..... کہاں ہیں اور تم کون ہو۔“

تقریباً سات مہینے کے بعد نشہ قدرے نارمل ہوئی۔ وہ سہیل کو پہچاننے لگی تھی۔ ایک دن نظام اور کنول اس سے ملنے آئے۔ گڈوان کے ساتھ تھا۔ گڈو کو دیکھتے ہی نشہ نے اس کو پکارا اور اگلے لمحے وہ گڈو کو اپنے ساتھ لپٹا کر والہانہ طور پر پیار کر رہی تھی سہیل..... نظام اور کنول نے باری باری ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر سکون اور طمانیت کے آثار تھے۔

ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ میں نے اپنی کھلی ہوئی انا کا انتقام لینے کے لیے اپنی ماں کو قتل کر دیا۔ وہ قدرتی موت نہیں مری، میں نے اسے قتل کیا ہے، جانے کسی جذبہ کے تحت میں نے وقتی اشتعال میں آ کر اسے اپنا اصل سیاہ چہرہ دکھا دیا۔

سہیل! لوگ مجھ سے پیار کرتے ہیں، مجھ میں اپنے سنے تلاش کرتے ہیں لیکن وہ نہیں جانتے کہ میں مجسم سیاہی ہوں۔ پہلے میں بھی اس حقیقت سے بے خبر تھی لیکن چند سال پہلے اچانک مجھے ایک خط ملا، یہ خط میرے ڈیڈی نے لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے یہ ہولناک انکشاف کیا کہ میں ان کی جائز بیٹی نہیں ہوں اور میرا حقیقی باپ پروفیسر ہے۔ میری ماں کالج کے زمانے میں اس سے عشق کرتی تھی لیکن گمراہیوں کے حکم پر اسے میرے ڈیڈی سے شادی کرنا پڑی۔ میری بڑی بہن اور بڑے بھائی کی پیدائش تک وہ ٹھیک ٹھاک رہی، پھر اسے معلوم ہوا کہ پروفیسر بھی اسی شہر میں آ گیا ہے۔ اس دن سے اس کے تیور بدل گئے اور اس کے طرز عمل میں سرد مہری اور رکھائی آ گئی۔ اب وہ دونوں میاں بیوی ہوتے ہوئے بھی میاں بیوی نہیں تھے۔ ایک دن اچانک ای نے ڈیڈی کو بتایا کہ وہ ان سے اپنی محبت کا انتقام لینے کے لیے پروفیسر کے گناہ کی ایک نشانی کو پروان چڑھا رہی ہے۔ ڈیڈی جو اس باختم ہو گئے۔ انہوں نے پہلے اسے اور پروفیسر کو قتل کرنے کے بارے میں سوچا لیکن پھر یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ انہوں نے لکھا کہ میں دس سال تک اپنے آپ سے جنگ کرتا رہا ہوں۔ اس دوران وہ صرف دنیا والوں کے لیے رسی میاں بیوی تھے۔ پھر انہوں نے سب کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔“

نشرہ زار و قطار رونے لگی تھی۔ سہیل اس کے منہ سے یہ دہشتناک انکشاف سن کر سناٹے میں آ گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ نشرہ کو ایک لمبا

نظام پر قائم ہے، جو شے اس اصول سے منحرف ہوتی ہے۔ اس کا وجود نوٹ پھوٹ کی زد میں آ جاتا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ میں دو طرفہ کائناتی اصول سے روگردانی کر رہی ہوں۔“ نشرہ نے اپنے ہونٹ کاٹنے ہوئے لٹی سے سوال کیا۔

”ہاں..... جب ہم اپنے آپ کو کسی وجہ سے الگ تھک کر کے خول میں بند کر لیتے ہیں، تو پھر ہمیں اپنے سوا کسی کی آواز سنانی نہیں دیتی۔ تم ایک بڑی لکھی جرات مند لڑکی ہو، مجھے اس بات پر شدید حیرت ہے کہ تم اپنے آپ سے سبھی سبھی کی کیوں رہتی ہو۔“

وہ تھوڑی دیر تک سفاکانہ نظروں سے اس کو گھورتی رہی۔ پھر آہستگی سے بڑبڑائی۔ ”میرے ذہن میں بہت کچھ ہے، لیکن میں کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔“

سہیل نے منانت سے جواب دیا۔ ”انسان کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس کائنات میں سب سے اہم تصور کر لیتا ہے۔ یہیں سے فتنہ کا آغاز ہوتا ہے لیکن ممکن ہے تمہارے ذہن میں جو کچھ پوشیدہ ہے وہ اہمیت سے یکسر عاری ہو لیکن اس کا فیصلہ کوئی دوسرا کر سکتا ہے۔ تم نہیں، کیونکہ تم خود ایک فریق ہو۔“

نشرہ نے ایک سسکی لی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر سمندر کی بے چین موجوں کی طرف دیکھتے ہوئے یکا یک ناگہانی طور پر اس نے سہیل کو اپنی روداد سنانی شروع کر دی، اس نے کہا۔ ”سہیل، میں اپنے آپ سے تنگ آ چکی ہوں، تقدیر نے کئی سال پہلے مجھے جس عذاب میں مبتلا کر دیا تھا اسے مزید برداشت کرنا میرے بس میں نہیں، تم دیکھ لیتا میں چند دنوں یا ہفتوں کی مہمان ہوں۔ صرف موت مجھے آسودگی دے سکتی ہے، پہلے میرا غم ایک تھا۔ یعنی اپنی نظر میں اپنی اناؤں کی پامالی کا غم اور اب میں دہرے غم میں مبتلا

چوڑا فلسیانہ لیکر دے، لیکن اس کا اپنا ذہن اس کے بس میں نہیں تھا۔

نشرہ دوبارہ ہوئی۔ ”ڈیڑی کے اس ظالمانہ خط کو پڑھ کر میرے ذہن کی جو حالت ہوئی اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میں نے رونا چاہا، لیکن میری آنکھیں اجاڑ قبرستان کی طرح ویران تھیں۔ ایک مرحلے پر میں نے سچ حقیقتوں سے سمجھوتہ کرتے ہوئے طے کیا کہ مجھے پروفیسر کو اپنا حقیقی باپ تصور کر کے اس کے بلکل قریب ہو جانا چاہیے۔ شاید اس طرح میری کچلی ہوئی انا میں ٹھوڑی سی تقویت عود کر آئے۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے باوجود میں اپنے رستے ہوئے زخموں سے ایک بلل کے لیے بھی نجات نہ پاسکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے رویوں میں سراسر نفرت عود کر آئی۔ لیکن میرے ذہن میں پچھل برپا کر دینے والے طوفان سے سبھی بے خبر رہے۔ لوگوں کے نزدیک میں ایک ایسی خوب صورت اور آسودہ حال لڑکی تھی جس کا بھی کسی غم کی پرچھائیں سے تعارف نہیں ہوا تھا۔ میری یہ دو آنکھیں ان کے لیے البتہ پراسرار بن گئیں تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ مجھ میں پینا نا زخم کی قوت آگئی، کسی کا دعوا تھا کہ میں نے نیکیا پیٹھی پر عبور حاصل کر لیا ہے۔

حالانکہ میری آنکھوں میں میری کچلی ہوئی انا کی سزاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں، تم درست کہتے ہو کہ زندگی کا اپنا کوئی رنگ نہیں، ہم خود اپنی ضرورتوں کے مطابق اس کا ایک مخصوص رنگ فرض کر لیتے ہی اور ہماری ضد یہ ہوتی ہے کہ اس تصور کو اصل حقیقت مان لیا جائے۔“ سہیل کچھ دیر تک سر جھکائے سوچتا رہا، پھر بولا۔ ”تم نے جس دلیری سے مجھے اپنے دل کے گھاؤ دکھائے ہیں اس کے لیے میں تمہیں سلام کرتا ہوں۔ میرا ایک مشورہ ہے۔“

”کیسا مشورہ۔“ اس نے بے دلی سے

پوچھا۔

”کیوں نہ ہم پروفیسر سے اس موضوع پر گفتگو کریں۔“

”اس سے کیا فائدہ ہوگا۔“

”وہ اس کہانی کا ایک اہم کردار ہے اس کی تائید حقائق کو باضابطہ شکل دے دے گی۔“

”سہیل! میری ماں کی طرح وہ بھی ایک مجرم ہے۔ جرائم پیشہ افراد کا سچائیوں سے درد کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔“

”اس کے جھوٹ سے جب تم اپنے سچ کا تقابل کرو گی پکی تو تمہاری انا کو بڑی تقویت ملے گی اور یہ ہی تمہارے زخموں کا مرہم ہے۔“

دوسرے دن سہیل اس کو اپنے ساتھ پروفیسر کے ساتھ لے گیا۔ کچھ دیر تک وہ اس سے رسمی سی گفتگو کرتا رہا۔ پھر اس نے اچانک اس کے سامنے سرفراز کا کئی سال پرانا خط رکھ دیا جو نشرہ نے اب تک سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔

پروفیسر کا رنگ یکسر سفید ہو گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس پر بجلی گری ہو۔ نشرہ بالکل چپ چاپ محویت کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ پانی کا ایک گلاس پینے کے بعد پروفیسر نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ ”مجھے یقین نہیں آتا۔ یہ درست ہے کہ میں اور فرخندہ خاتون طالب علی کے زمانے میں ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ لیکن فرخندہ خاتون کو اس سے نفرت تھی۔ پھر خدا کا کرنا یوں ہوا کہ وہ دونوں میاں بیوی بن گئے۔ اس کے بعد میرا تعلق فرخندہ خاتون سے یکسر ٹوٹ گیا۔ محبت محض ملن کا نام نہیں، میں نے بخوشی دور یوں کو اپنا لیا۔ اس طرح مجھے طمانیت کی نئی روشنی مل گئی۔

برسہا برس بعد ایک دن فرخندہ خاتون مجھ سے ملے آئی۔ اس کی حالت بے حد خستہ تھی۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ سرفراز بیک اس کو چھوڑ کر ایک عرصہ سے غائب ہے اور جانے سے پہلے اس نے ایک خط میں اس کو لکھا

غزل

طارق حسن طارق

جو شاعری میں بہت کامیاب ہے پیارے
اُسی کا اِن دنوں خانہ خراب ہے پیارے

وہی زمانے میں عزت مآب ہے پیارے
کہ مال جس کے یہاں بے حساب ہے پیارے

جو تم بنے ہوئے رکھ شباب ہو پیارے
مجھے خبر ہے کہاں کا خضاب ہے پیارے

یہ اور بات کہ کانٹوں سے ہاتھ ہے زخمی
یہ کم نہیں مرے گھر میں گلاب ہے پیارے

ہمارے سارے اکاٹے کی ٹوہ میں ہو تم
ہماری جب سے طبیعت خراب ہے پیارے!

میں اس کے گھر جو چلا جاتا ہوں تو کیا صبح
تلاشِ رزق تو کارِ ثواب ہے پیارے!

ہے دُڑ مجھے ترے والد نہ مسترد کردیں
میں ایک چراغ ہوں تو آفتاب ہے پیارے

سب بتادوں میں دنیا کی بے حجابی کا
تمہارا حُسن ، تمہارا شُباب ہے پیارے

خدا کے واسطے طارق نہ اس سے تھام لے
لگے گا عیب ، زمانہ خراب ہے پیارے

☆☆☆

کہ کیونکہ وہ اس کے ذہن سے میرا نام کھرچنے
میں ناکام رہا ہے اور برسوں کی ازدواجی زندگی
کے دوران وہ اذیت کے سبب ہر ہر پہلے یہ سوچ
کر جلتا رہا کہ تقدیر نے اسے فرخندہ کا محبوب
بنانے کے بجائے دُن بنادیا۔ اس لیے وہ اس
آس پر چھوڑ کر جا رہا ہے کہ شاید ایک دن اس کی
ضرورت اس کو اس سے واقعتاً محبت کرنے پر
مجبور کر دے۔

فرخندہ خاتون نے یہ دردناک قصہ سنا کر
مجھ سے درخواست کی کہ میں اپنے طور پر سرفراز کو
تلاش کر کے اسے کسی طرح سے یقین دلاؤں کہ
اس کے توہمات بے بنیاد ہیں اور فرخندہ خاتون
واقعتاً ایک وفادار بیوی ہونے کے ناتے اس
سے محبت کرتی ہے۔ فرخندہ خاتون کا المیہ یہ تھا
کہ وہ یہ سب باتیں کسی سے کہہ سکتی تھی۔
پروفیسر نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس کی آنکھوں
میں آنسو اُمڈ آئے تھے۔ سمیل اور نشرہ بے سدھ
اس کو تنگ رہے تھے۔ ”اس کے بعد فرخندہ
خاتون سے میری صرف ایک ملاقات اور ہوئی۔
نشرہ نے نظام سے شادی کرنے سے انکار
کر دیا۔ اس پر وہ بے حد پریشان تھی۔ اس کا
خیال تھا کہ نشرہ میری بات پر خصوصی توجہ دیتی
ہے۔ اس لیے مجھے اسے قائل کرنا چاہیے۔“
سمیل نے سوال کیا۔ ”آپ نے سرفراز
بیک صاحب کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔“

پروفیسر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے
جواب دیا۔ ”چند برس پہلے مجھے اس کا سراغ
ملا۔ وہ انہریقہ کے ایک ملک میں مقیم تھا۔ میں نے
اسے ایک تفصیلی خط لکھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ
مجھے جواب دے گا لیکن ایک دن اس کا خط آیا۔
میں نے کئی بار چاہا کہ فرخندہ کو اس کے بارے
میں بتاؤں۔ پھر میں نے یہ سوچتے ہوئے اپنا
ارادہ ملتوی کر دیا کہ وہ بلاوجہ پریشان ہوگی۔
اس غریب کا دل پہلے ہی ٹوٹا ہوا تھا۔“

کر پاگل ہو چکا ہوں لیکن یاد رکھو میں فرخندہ کو کسی قیمت پر معاف نہیں کروں گا۔ میں نے قدرت کے اس فیصلے کو قبول کر لیا ہے کہ میں واقعی رقیب ہوں۔ رقیب فرخندہ خاتون اب میرا اصل روپ دیکھے گی، میں اپنی پیاری پیاری بیٹی نشرہ کے ہاتھوں اسے ایسا گھماؤ لگاؤں گا کہ وہ اس سمیت تم سے شدید نفرت کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ کہنے ذیل انسان کان کھول کر سن لو کہ آج سے میں واقعی ولن ہوں۔ میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ فرخندہ خاتون نشرہ کے پیار کے لیے اسی طرح ترسے کہ جیسے میں اس کے پیار کے لیے ترسا ہوں۔“

تحریر ختم کرتے ہی بے اختیار نشرہ کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکلی اور وہ ہائے امی میں نے تم پر کیا ظلم کیا، کہہ کر بے ہوش ہو گئی۔ قبرستان کے ایک کونے میں کچھ فاصلے پر دو قبریں ہیں ہر شام ایک نوجوان مرد اور عورت ان پر پھول چڑھانے اور فاتحہ پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ ایک قبر پر فرخندہ خاتون اور دوسرے پر ملک کے ممتاز اسکالر پروفیسر منس الدین کی جو نشرہ کو اس کے ڈیڑی کا غلط دکھانے کے بعد حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گیا تھا۔

نشرہ جب بھی ان قبروں پر آتی ہے اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکلتے ہیں سہیل ہمیشہ اس کو تسلیاں دیتا ہے۔ پر اس کی سسکیاں ختم نہیں ہوتیں۔ کنول نظام اور نشرہ کے بڑے بھائی کی شدید خواہش ہے کہ وہ سہیل سے شادی کر لے لیکن نشرہ اس کے لیے تیار نہیں۔ اس نے سہیل سے اقرار کیا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اور اس کے سوا کسی سے شادی نہیں کرے گی مگر وہ ابھی تک طے نہیں کر سکی کہ سہیل کی جھولی میں خوشیاں کب ڈالے گی۔



پروفیسر بھکیاں لے کر رونے لگا۔ چند ٹاپے کے بعد وہ اٹھا اور پیاروں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ سہیل اور نشرہ حیران و پریشان اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ دفعتاً پروفیسر نے آکر ایک خط ان کی طرف بڑھا دیا اور بولا۔ ”اسے پڑھو۔“

نشرہ بے چینی سے خط کی عبارت پر نظر ڈالتے ہوئے بڑبڑائی۔ ”یہ تحریر واقعی ڈیڑی کی ہے۔“

دونوں نے ایک ساتھ ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ سرفراز نے پروفیسر کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔ ”میں نے تم پر لعنت بھیجتا ہوں اور دست بدعا ہو کہ تم مر جاؤ۔ ذلیل شخص کیا تم زندگی بھر بھوت کی طرح میرا پیچھا کرتے رہو گے۔ تم ہزار بن کر فرخندہ کے اندر حلول ہو چکے ہو اور اس سے شادی کرنے کے بعد مجھے پہلی بار پیچھا تاؤ ہوا کہ میں نے اس سے شادی کر کے اسے اپنی بیوی بنا کر بدترین اور سنگین غلطی کی ہے۔ میں نے اس کو تم سے زیادہ ٹوٹ کر چاہا۔ مگر تم ہمیشہ ہم دونوں کے درمیان غائبانہ طور پر حائل رہے۔ وہ میرے تین بچوں کی ماں بن گئی۔ اس کے باوجود میں رقیب کا رقیب رہا اور یہ ہی میرا روگ ہے۔ جس کے سبب مجھے ہمیشہ کی جلا وطنی اختیار کرنا پڑی۔“

میں نے سوچا تھا کہ فرخندہ مختلف اذیتوں سے دوچار ہو کر ایک دن میری اہمیت کو تسلیم کرے گی اور یہ ہی اہمیت اس کو تم سے کاٹ کر صرف اور صرف میرے نزدیک لے آئے گی۔ تمہارا خط مجھے اچانک ملا اور میں ہڑبڑا کر رہ گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ تم نے میری غیر موجودگی کا پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اب مجھے افسوس ہوتا ہے کہ میں نے فرخندہ کو تنہا چھوڑ کر شدید غلطی کی۔ یقیناً تم دونوں آپس میں ملتے ہو گے۔ میں تصورات میں تمہیں خوش و خرم دیکھ

بے بدن

نیاز احمد نے فرمایا کہ یہ فلیٹ ان کے جاننے والے کا ہے اور اس جاننے والے نے اس فلیٹ کو ایک اور شخص کو کرائے پر دیا ہوا ہے اور وہ شخص جس نے فلیٹ کرائے پر لیا ہوا ہے وہ اس بات پر آمادہ ہے کہ اس کا ایک کمرا مزید کرائے پر دے دیا جائے۔

ایم ایے راحت

ایم اے راحت کی پچیس سالہ جشن نمبر کے لیے خصوصی کہانی

ہوا وقتوں کا خواہاں ہر شخص سے پیار کا طلب گار..... ممکن ہے
میری سوچ بہت سے لوگوں سے جدا ہوئے مٹا لوگ تھی اپنی پسند
ہوتے ہیں۔ انہیں ہنگاموں سے وحشت ہوتی ہے۔ میں نے
ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جو اپنے گھر سے صرف اس لیے
بیزار ہوتے ہیں کہ وہاں بچے شور مچاتے ہیں۔ ہنگامے ہوتے۔
اے یہ بھی لوگ ہیں جو تباہ ہیں خوش ہیں لیکن میری نگاہ میں وہ
زندگی بیزار لوگ ہوتے ہیں۔ بچے تو کھن کا نانات ہیں زندگی
کی خرابیے ہیں وہ۔ مجھے بچوں کا شور بہت پسند ہے۔ پھول
سے۔ نازک نازک قلعہ گارباں مارتے ہوئے۔

میں ایک بینک میں ملازمت کرتا ہوں زندگی کا بڑا حصہ لاہور میں گزرا۔ کراچی کا تصور ایک محکمہ کی مانند تھا اور میں نے اس کے بہت سے خواب دیکھے تھے۔ جب بھی فرصت ملتی مری کھانا، لہان، وغیرہ لے جاتا تھا مری جانے کے لیے وقت دوکار تھا۔ لاہور کی فرصت کسی کی نہیں اس کے بعد کراچی نے مجھے آواز دی بینک نے میرا بدلہ کر لیا کرویاور میں خوشی یہاں آ گیا۔ اس کے بعد کراچی سے میرا پھر بھر تعارف ہوا۔ کراچی میں رہائش کا مسئلہ انہیں کے طلم میں ہوگا جو میری طرح نہیں اور کہیں باہر سے آئے ہوں۔ ناواقف حضرات جو کراچی سے باہر رہتے ہیں اور یہاں آنے کا ارادہ رکھتے ہیں

میرا نام ناصر جمال ہے۔ شکر ہے جمال عبدالناصر نہیں ہے
ورنہ بڑی شرمندگی ہوتی کہ ایک تو مصر کا سربراہ تھا اور دوسرا
پینک کا معمولی کلرک۔ ویسے یہ بھی شکر ہے کہ ناموں پر کسی کی
اجارہ داری نہیں۔ کم از کم انسان کو ایک آزادی تو حاصل ہے کہ
جب میں چھوٹی کوڑی نہ ہو لیکن نام مرزا یا قاریوں جیک رکھا
جاسکتا ہے۔ چھپکے سے جان لٹکتی ہو نام سکندر اعظم یا شکر سے
نورا ہمارا لگتی ہو نام حسن آراء وغیرہ۔

خیر زندگی کی اس کہانی میں نام بیا دی حیثیت نہیں رکھتا۔ جو بس تذکرہ نگار آیا کہا جاتا ہے کہ گھوڑے کے بھی دلنا بھرتے ہیں گھوڑا جانتے ہیں آپ...؟ پرانی اصطلاح ہے اس کو کہ کہتے ہیں جہاں کوڑے کے مستقل ذمہ ہوتے ہیں تو کہانی گھوڑے کی بھی نہیں ہے میں تو آپ کو اپنی زندگی کی کہانی اپنی آپ بتاتی ہوں۔

اس کائنات میں تمام کھانا ”خود“ کو ذہن میں رکھ کر کھائے کیونکہ اس خدا کے فضل سے تمہا نہیں ہوں۔ ہاں دوسرے بہت سے رشتوں سے محروم ہوں۔ ماں باپ، بہن بھائی کوئی نہیں ہے، ماں باپ یا دین مگر ایک مٹی مٹی کی تحریر کی طرح جو کسی بوسیدہ کتاب کے اور اوراق کی مانند ہو۔

ویسے کسی تنہا شخص کی زندگی بھی کیا ہوتی ہے۔ محبتوں کو ترسا



بارے میں سن کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ کمر آچا ہے کیا بھی ہوا اگر ہاتھ روم انچ ہے اور صرف میری ملکیت ہے تو باقی سب کچھ قربان ہے۔“

نیاز احمد نے فرمایا کہ یہ فلیٹ ان کے جاننے والے کا ہے اور اس جاننے والے نے اس فلیٹ کو ایک اور شخص کو کرائے پر دیا ہوا ہے۔ اور وہ شخص جس نے فلیٹ کرائے پر لیا، اسے وہ اس بات پر آمادہ ہے کہ اس کا ایک کمرہ مزید کرائے پر دے دیا جائے۔

نیاز احمد نے کہا کہ ظاہر ہے میرے لیے ایک کمرہ کافی ہوگا۔ ”جی میاں نیاز احمد اس کی بنیادی وجہ تو آپ جانتے ہی ہیں کیونکہ میں تنہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”اس صورت میں مناسب یہی ہے برخوردار کہ تم اس کمرے کو فوراً کرائے پر حاصل کر لو تم تنہا بھی ہو کرے کا دروازہ باہر سے ہے تم اپنے کمرے کا باہر سے تالا بھی لگا سکتے ہو اور تنہا ہی ٹھوڑی مشکل مندی سے اس مکان میں رہنے والوں کو کوئی تکلیف بھی نہ ہوگی۔“

بہر صورت ہوئی کی زندگی اس قدر بدنامی کی کہ میں فوراً تیار ہو گیا اور اسی شام بینک سے فارغ ہو کر میں نیاز صاحب کے ساتھ چل پڑا۔

نیاز احمد مجھے لے کر گر گرین اسٹریٹ پہنچ گئے۔ انہوں نے مجھے وہ فلیٹ دکھایا اور دل تو میرا رو دیا تھا کیونکہ بہر صورت میرے پہلے مکان کا وہ عشرِ عمر بھی نہیں تھا۔ حالانکہ وہ ایک چھوٹا سا مکان تھا اور معمولی سے علاقے میں تھا۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ وسیع اور کشادہ تھا۔ تاہم میں نے اس کمرے کو قبول کر لیا۔

میرے ساتھ رہنے والے جناب فرید الدین تھے مارکیٹ میں کاروبار کرتے تھے۔ ذہنی طور پر صرف پینے تھے۔ لیکن ان کی پیغمبرِ تعلیم یافتہ تھیں۔ صورتِ شکل کے اچھے تھے ان کا بچہ بھی بے حد پیارا تھا۔ اس بچے کو وہ پیار سے شیر کی کہتے تھے نام شاید اس کا شہزادہ تھا۔ بہر صورت میں نے اس کمرے کو دل سے قبول کر لیا اور مختصر سا سامان لے کر وہیں سے اس کمرے تک پہنچ گیا۔

فرید الدین بے ضرر سے انسان تھے۔ یوں بھی کاروباری آدمی بے ضرر ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اول تو مجھ سے عموماً سلیک ہی نہیں رہتی تھی۔ بس چھٹی کے وقت مل جاتے تھے اور اچھا وقت گزرتا تھا۔

میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں تنہائیوں سے خوف کھاتا ہوں آدم بے زار قطعی نہیں ہوں۔

فرید صاحب کی بیوی کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پردے

مرے شکر گزار ہوں کہ میں انہیں کراچی میں پیش آنے والی سب سے بڑی مشکل سے آگاہ کر رہا ہوں۔ اگر وہ کراچی میں آباد ہونا چاہتے ہیں تو انہیں سب سے پہلے مکان کی مشکل پیش آنے گی اور اس مشکل کا حل آسان نہیں ہوتا۔

لیکن یہ شہر جہاں بے شمار مسائل رکھتا ہے وہیں اس کا حسن بھی بے مثال ہے۔ زندگی یہاں اس طرح مصروف ہو جاتی ہے کہ مسائل خود بخود دو جاتے ہیں۔

بڑی انگلیں لے کر کراچی آ گیا۔ جس راتچ میں میرا تبادلہ ہوا وہ صدر کے علاقے میں تھی اور صدر انسانوں کے ٹھانسیں مارتے ہوئے سمندر کا نام ہے۔ خیر سب کچھ اچھا تھا لیکن جب رہائش کا مسئلہ سامنے آیا تو بہت کچھ برا ہو گیا۔ اپنی جیب کے مطابق ایک ہوٹل میں قیام کیا جو بس ”ہوٹل“ تھا۔ انتہائی گندہ کمرہ مشترکہ ہاتھ روم جہاں وقت پر ضروریات سے فارغ ہونے کے لیے لائن لگائی پڑتی تھی اور اس سلسلے میں ہر وقت کسی غلطی حادثے کا خطرہ رہتا تھا۔

بینک کے ساتھی اظہار ہمدردی اور مکان کی تلاش کے وعدوں کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ مکان تلاش کر لینا ان کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ کہیں ہوتا تو تلاش کرتے۔ یہاں تو ایک ایک مکان میں بہت سارے لوگ نظر آتے تھے۔ چنانچہ بس مشکلات کا ایک سمندر تھا اور کنارے کا نام نشان نہیں تھا۔

خدا عمر دراز عطا فرمائے نیاز احمد کو ہمارے بینک کی سب سے عمر رسیدہ شخصیت تھے۔ نہایت ہمدرد اور شفیق مجھے دس سا دیے ہوئے بولے ”نہیں عزیزم۔ فکر نہ کرو انشاء اللہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ ہم سب کوشش کر رہے ہیں۔ دوسروں نے تو خیر کوشش کی یا نہیں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن نیاز احمد صاحب نے ایک دن خوش خبری سنائی۔

”مبارک ہو بھی ناصر میاں! تنہا رہائش کا بندوبست ہو گیا ہے۔“

”جی...“ میں حیرت سے اچھل پڑا۔

”ہاں۔ اللہ سب کی مشکل حل کرتا ہے۔“

بات تو اس قدر کہ اب لوگ نیاز احمد صاحب کے گرد جمع ہو کر اس کے لئے واقعے کے بارے میں سوالات کرنے لگے۔ پتا چلا کہ میرا راج محل رچھوڑ لائن کی ایک پرانی بلڈنگ کا ایک چھوٹا سا فلیٹ ہے۔ پورا فلیٹ نہیں بلکہ چار کمروں کے فلیٹ کا ایک کمرہ جس میں اتفاق سے ہاتھ روم انچ ہے۔ یعنی صرف میرا ہاتھ روم بلا مشترک غیرے انچ چاہیے اس ہاتھ روم کے

”تو پھر شادی کب کرو گے بڑھاپے میں؟“
 ”بہر حال ایسی بھی بات نہیں ہے فرید صاحب بس کچھ ایسی
 وجوہات ہیں جن کی وجہ سے میں ابھی شادی نہیں کر سکتا۔
 ”پوچھنے کی بات تو نہیں ہے ناصر صاحب ذاتی سواوال ہے“
 لیکن میرا خیال ہے آپ برا نہیں بنائیں گے۔“
 ”نہیں فرید صاحب آپ بلا جھجک پوچھ سکتے ہیں۔“ میں
 نے جواب دیا۔
 ”وہ کون سی وجوہات ہیں جن کی بنا پر آپ نے شادی نہیں
 کی۔“

”اوہ فرید صاحب بات اتنی گہری نہیں ہے بات صرف یہ ہے
 کہ شاید کے کچھ لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر اس بڑے
 شہر میں جہاں انسان تنہا زندگی ہی گزارنے کے لیے بے پناہ
 مشکلات کا سامنا کرتا ہے اور ان حالات میں اگر کسی دوسرے کو
 اپنی زندگی میں منسلک کر لیا جائے تو میرا خیال ہے دوسرے کے
 ساتھ بھی زیادتی ہوگی۔ اچھے گھر کی خواہش ہر انسان کے دل
 میں ہوتی ہے۔ اور خاص طور سے وہ لڑکی جو بیوی بن کر کسی گھر
 میں آتی ہے اسے پر اسٹس دیکھنا پسند کرتی ہے۔
 ”وہ تو سب ٹھیک ہے مہیاں لیکن جب تمام عورتیں ہی اس
 زیادتی کی عادی ہیں تو پھر تم شادی سے محروم کیوں رہو۔“ فرید
 صاحب ہنس کر کہتے اور میں بھی ہنس پڑتا۔

بہر حال اس مسئلے پر لوگوں نے کبھی تنبیذی سے غور نہیں کیا۔
 بے چارہ شیریں مجھ سے اس قدر رمل گیا تھا کہ وہ اکثر میرے
 پاس آنے کی کوشش کرتا۔ بچے کو تو محبت کے چند الفاظ اور میٹھی
 میٹھی ٹافیاں چاہیے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی مقصد نہیں
 ہوتا۔ چنانچہ شیریں اپنے گھر کی پتلی سی گلی پار کر کے میرے
 دروازے تک آ جاتا اور پھر کچھ ایسا ہوا کہ وہ اکثر میرے گھر
 کے دروازے پر میرا انتظار کرنے لگا۔

بچے کی یہ الفت پاکر میں اس سے اور بھی زیادہ محبت کرنے
 لگا۔ میں خوش بھی رہنے لگا کیونکہ مجھے خدا کے تخلیق کے ہوئے
 بالکل بے ضرر اور معصوم سے انسان کی رفاقت مل گئی تھی
 درحقیقت میں اس سے بے پناہ پیار کرنے لگا تھا۔

کئی بار میں اس کے لیے کھلونے بھی لایا جو میں نے اس کو
 دے دیے۔ حالانکہ ان کھلونوں کو قبول کرنے میں رد و قدح
 ہوتی تھی۔ لیکن براہ راست مجھ تک کوئی بات نہیں پہنچی تھی۔ ہاں
 ایک چھٹی والے دن فرید صاحب میرے کمرے میں آئے اور
 بولے۔

دار خاتون تھیں اور آپ یقین کریں کہ میں کسی پردے دار
 خاتون پر نظر ڈالنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ بہر صورت وقت
 گزرتا رہا۔

چھوٹے شیریں کی منی منی باتیں کبھی کبھی میرے کان میں
 پڑ جاتی تھیں۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اسے پیار کروں۔ لیکن
 بہر صورت میں بینک سے جس وقت فارغ ہو کر گھر پہنچتا تھا تو
 فرید صاحب نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ آٹھ بجے کے بعد اپنی
 دکان بند کر کے آتے تھے۔ اس لیے ان سے ملاقات کم ہوتی
 تھی۔

شیریں یا اس کی امی سے میرا رابطہ کرنا ناممکن تھا۔ البتہ چھٹی
 والے دن فرید صاحب اس معصوم سے بچے کو گود میں لے کر
 میرے کمرے میں آتے تھے اور میں اس ننھے سے معصوم بچے کو
 فوراً گود میں لے لیا کرتا تھا۔

گول منول پیارا سا بچہ بے پناہ خوب صورت پتا نہیں
 دوسروں کو وہ اتنا پیارا دکھائی دیتا ہوگا یا نہیں۔ بہر حال مجھے
 بہت پسند تھا۔ یہاں تک کہ میری لگاؤ اس سے اس قدر بڑھ
 گئی کہ چھٹی والے دن جب مجھے یقین ہوتا کہ فرید صاحب
 اسے لے کر میرے پاس ضرور آئیں گے تو میں ایک دن پہلے
 ہی اس کے لیے ٹافیاں اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں لے
 آیا کرتا تھا۔

فرید الدین صاحب ابتداء میں تو میرے اس خلوص سے
 بہت متاثر ہوئے انہوں نے کئی بار مجھے منع بھی کیا کہ میں ان
 کے بچے کے لیے یہ سب کچھ نہ کیا کروں۔ لیکن میں نے ان
 سے کہہ دیا کہ بچے مجھے بہت پیارے لگتے ہیں۔

”مجھے حیرت ہے ناصر جمال صاحب کہ اگر بچے آپ کو
 اتنے پسند ہیں تو آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی۔“
 ”شادی۔“ میں ہنس کر کہتا۔

”کیوں اس میں ہسنے کی کیا بات ہے بھلا؟“ فرید الدین
 حیران ہو کر پوچھتے اور میں خاموش ہو کر سنجیدہ ہو جاتا۔

”شادی..... کرنی لیں گے فرید الدین صاحب ابھی جلدی
 کیا ہے۔“

”لیکن کب؟“

”جب بھی موقع ملے۔“

”اوہ لیکن آپ کی عمر تو چھٹی خاصی ہے میرا خیال ہے کوئی
 تم سے لگ بھگ ہوگی۔“ وہ کہتے۔

”جی ہاں! آپ کا خیال درست ہے۔“

اور دوسری بار آواز لگانے کا اثر ہوتا تھا کہ ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

”ذرا باہر تشریف لائیے۔“ آواز میری سماعت سے ٹکرائی اور میں چونک پڑا۔

حیرت زدہ سامں باہر پہنچا تو ایک خاتون منہ پھیرے کھڑی ہوئی تھیں میں نے پوچھا۔ ”فرمائیے کیا بات ہے؟“

”میں..... میں آپ کے برابر رہتی ہوں۔ میرا مقصد ہے شیریں۔“ خاتون بری طرح خوس ہو رہی تھیں۔

”اوہو آپ شیریں کی امی ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”فرمائیے کیا بات ہے؟“

”میں نے رخ بدل لیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان خاتون کو کسی قسم کی ذہنی کوفت کا سامنا کرنا پڑے تب خاتون دوبارہ بولیں۔

”وہ..... وہ دراصل شیریں کی طبیعت اچانک شدید خراب ہو گئی ہے اسے شدید الٹیاں ہو رہی ہیں۔“

”ارے اچھا فرید صاحب تو دکان پر ہوں گے؟“ میں نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔

”جی نہیں۔“

”گھر پر؟“ میں نے پھر پوچھا۔

”جی نہیں۔ وہ کام کے سلسلے میں کسی دوسرے شہر گئے ہوئے ہیں۔ فرید صاحب کی بیگم نے جواب دیا۔

”اوہو کب؟“

”آج ہی صبح۔“

”تو پھر کب واپس آئیں گے؟“

”شاید آج نہیں؟“

”کچھ بتایا نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”کل تک آنے کی امید ہے۔“ خاتون نے جواب دیا۔

”اوہ۔ آپ نگر نہ کریں۔ کیا جاہتی ہیں آپ میں اسے ڈاکٹر تک لے جاؤں یا ڈاکٹر کو یہیں بلانا ہے؟“

”جی نہیں میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتی ہوں۔“

”تو پھر جیسا حکم کریں۔ کیا آپ میرے ساتھ چلنا پسند کریں گی یا پھر مجھے بتادیں کہ آپ اسے کس ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتی ہیں۔ میں اسے خود لے جاتا ہوں۔“

”میں بھی چلوں گی۔“ ماں کی متا بھری آواز سنائی دی۔

”تو پھر چلیے۔“ میں نے کہا۔

”ناصر صاحب آپ کا بیڑا زیادتیوں کرنے لگے ہیں۔“

”میں نہیں سمجھا فرید صاحب۔“ میں نے جراتی سے کہا۔

”دیکھو نا اس بچے کو اتنا سر چڑھا رہے ہو کہ یہ سر چڑھتا جا رہا ہے۔ بہت زنج کرنے لگ گیا ہے۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھا فرید صاحب۔ اس بیارے سے بچنے کی کیا ضرورت ہے؟“ میں نے شیریں کے بالوں سے کھیلنے ہوئے کہا۔

”بھئی ہر وقت تمہاری ہی طرف آنے کی رٹ لگاتے رکھتا ہے۔ ہر وقت تمہیں یاد کرتا ہے۔“ فرید صاحب نے کہا۔

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ فرید صاحب شام کو جب میں آتا ہوں تو اسے میرے پاس بھیج دیا کریں۔ میرا بھی دل بہل جاتا ہے تنہائی دور ہو جاتی ہے۔ یقین کریں یہ تمہا سا بچہ شہزاد میرے لیے بڑا غم گسار ہے۔“

فرید صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا البتہ کچھ چپ سے ہو گئے تھے۔ میں نے اس وقت ان کی اس خاموشی پر غور بھی نہیں کیا لیکن اب.....

پھر ہوا یوں کہ ایک شام شیریں کی طبیعت خراب ہو گئی اسے اچانک ہی الٹیاں ہونے لگی تھیں۔ مجھے علم نہیں تھا کہ فرید صاحب گھر پر نہیں ہیں۔

شام کے تقریباً سات بجے ہوں گے کہ میرے کمرے کا دروازہ کھٹکا گیا۔ عام طور سے میں اپنے کمرے کا دروازہ کھلا رکھتا تھا۔ جب گھر میں موجود ہوتا تھا۔ ہاں کہیں جانا ہوا تو مجبوری بھی بہر حال میں نے بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔

”کون ہے؟“

دروازہ کیونکہ کھلا رہتا تھا اس لیے آنے والے اندر ہی آ جاتے تھے۔ ان میں عام طور سے میرے دوست ہوتے تھے۔ وہ بھی شازدہ نادر ہی ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ میں اس معاملے میں غور و احتیاط نہ کرتا تھا۔ نہیں چاہتا تھا کہ میرے دوستوں کی آمد سے کسی کو تکلیف ہو۔ کیونکہ دوسرے کا گھر میرے گھر یا میرے کمرے سے ملتی تھا۔ میں عام طور سے خود ہی دوسرے لوگوں کو نہیں بلاتا تھا۔ کیونکہ دوسرے لوگوں کا معاملہ تھا اور میں مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ اس کمرے میں میرے دوستوں کے بے تکلف قہقہے گونجیں اور دوسروں کو شکایت کا موقع ملے۔

بہر حال میری آواز کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ تب میں نے دوبارہ ہانک لگائی۔

”کون ہے بھائی! اٹھ آ جاؤ۔“

”ہاں میں برقع اوڑھ لوں۔“

”ٹھیک ہے آپ شیر کی کولیں میں نیکیسی لے آتا ہوں۔“

”بہتر میں آپ کو تکلیف دینے پر شرمندہ ہوں۔“

”ارے شرمندگی کیسی۔ کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے تو علم ہی نہیں تھا کہ شیر کی بیمار ہے بلکہ میں تو سوچ رہا تھا کہ وہ ابھی تک میرے پاس آیا کیوں نہیں۔“

”میں ابھی آ رہی ہوں۔“ خاتون نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔

”بہت بہتر آپ نیچے تشریف لائے۔ میں نیچے نیکیسی لیتا ہوں میں نے کہا اور پھر میں نے انتہائی تیزی سے لباس تبدیل کیا۔

لباس تبدیل کرنے کے بعد میں نے دروازہ بند کیا اور نیچے اتر آیا۔ اور نیچے اترنے کے بعد نیکیسی تلاش کرنے لگا۔

خوش بخنتی سے نیکیسی کسی تلاش کے بغیر ہی مل گئی۔ ڈرائیور بھی کوئی شریف آدمی تھا۔ فوراً تیار ہو گیا۔ اور چند ساعت کے بعد خاتون شیر کی کوسنبالے نیکیسی کی چھٹی نشست پر آکر بیٹھ گئیں

میں ڈرائیور کے سات والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ خاتون کے بتانے پر میں انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

ڈاکٹر نے شیر کو اچھی طرح دیکھا اسے انکشن لگائے اور کچھ دوا میں دیں۔

دواؤں کا پرچہ خاتون نے میرے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ جنہیں میں فوری طور پر قریبی کیسٹ سے خرید لایا اور پھر میں ان خاتون کو لے کر واپس گھر پہنچ گیا۔ میں نے ان سے کہا۔

”معاف کیجئے گا بھائی جان اتفاق سے میں آپ سے باقاعدہ متعارف نہیں ہوں لیکن آپ تو مجھے جانتی ہی ہوں گی۔ آپ کسی قسم کی تکلیف نہ کریں۔ بلکہ جو کچھ چاہیے ہو مجھ سے فرما دیں۔ فریڈ صاحب آج صبح تو پھر کوئی بات نہیں ہے لیکن اس

وقت تک جب تک آپ تنہا ہیں براہ کرم کسی بھی قسم کی تکلیف نہ کریں میں ہر طرح سے آپ کے کام آنے کے لیے تیار ہوں۔“ میں نے کہا۔

”نہیں بھائی جان سب ٹھیک ہے آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے بالکل ایسوں کی طرح میری یہ تکلیف دور کی ہے۔“

”اوہ بھائی جان شکریے کی کوئی بات نہیں ہے شیر کی میرے لیے جو حیثیت رکھتا ہے۔ اسے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ شاید آپ اس حیثیت سے واقف نہیں ہیں۔ ورنہ بھی اس مسئلے میں شکریہ ادا نہ کرتیں۔“

”میں سمجھتی ہوں بھائی جان آپ شیر کی سے بے پناہ محبت

کرتے ہیں آپ دعا کریں کہ وہ صبح تک ٹھیک ہو جائے۔“

”میں دعا کروں گا۔“ میں نے خلوص سے کہا اور اپنے کمرے میں آ بیٹھا۔ خاتون اندر چلی گئیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد میں نے خود ہی ان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا

اور اندر سے خاتون کی آواز سنائی دی۔ ”کون ہے؟“

”معاف کیجئے گا بھابی جان میں ناصر جمال ہوں۔ یہ بتا دیجئے کہ شیر کی کیسا ہے اور اس کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی یا.....“

شیر کی سوچا ہے اور بہتر ہے۔ ایک اور تکلیف کریں بھابی جان!“

”جی فرمائیے۔“

”جیو پیسے آپ کے خرچ ہوئے ہیں وہ لے لیں۔“

”اوہ بھابی جان میں آپ کے لیے بلاشبہ جتنی ہوں لیکن شیر کی کے لیے نہیں براہ کرم یہ سب کچھ کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔“

”نہیں بھائی جان یہ خلاف اصول بات ہے آپ ویسے بھی شیر کی کے لیے بہت کچھ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن براہ کرم یہ پیسے لے لیجئے اور اگر آپ نے پیسے نہ لیے تو فریڈ صاحب بھی اس بات کو پسند نہیں کریں گے۔“

”جیسی آپ کی مرضی بھابی جان اگر یہ بات ہے تو آپ پیسے مجھے دے دیں ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ شیر کی میرے لیے اتنی اہمیت رکھتا ہے جتنی کے آپ کے لیے۔ بلاشبہ یہ بات آپ کو متاثر نہیں کر سکے گی اور نہ ہی آپ کو میری بات کا یقین آئے گا کہ میں واقعی شیر کی کے لیے اس قدر پر محبت ہوں لیکن بھابی جان یقین دلانے کا میرے پاس اور کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے۔ آپ بہر حال ماں ہیں اور ماں اپنی محبت کو اپنے بچے کے لیے مکمل سمجھتی ہے۔“

”میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ آپ براہ کرم یہ پیسے لے لیں۔“ اور خاتون نے کچھ نوٹ پکڑ کر ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

میں پھر بھی کہوں گا کہ میرے ذہن میں کوئی ایسی بات پیدا نہیں ہوئی جسے ناپسندیدہ کہا جاسکتا۔ یا پھر کوئی ایسی گھناؤنی یا گندی سوچ میرے ذہن میں بیدار نہیں ہوئی تھی کہ اس خاتون کے بارے میں کوئی بری بات سوچنا خاتون کا ہاتھ آگے بڑھا ہوا تھا اور ان میں کچھ نوٹ دبے ہوئے تھے میں نے وہ نوٹ اٹھا لیے۔

اور میں واپس چلا گیا شیر کی کے لیے میں بہت پریشان تھا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ بار بار اس کی خیریت معلوم کروں لیکن بہر صورت یہ بات مناسب نہیں تھی۔

فرید صاحب ہوتے تو اس میں کوئی ہرج بھی نہیں تھا۔ بہر صورت دوسری صبح مجھے اطلاع ملی کہ شیریں خیریت سے ہے۔ دفتر جانے سے پہلے میں نے شیریں کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور کبھی بخش جواب پا کر مطمئن ہو گیا۔ عجیب سی بات تھی شیریں کی بیماری کی وجہ سے دفتر میں بھی دل نہیں لگا تھا۔ شام کو سیدھا گھر پہنچا اور سب سے پہلے دروازے پر دستک دے کر میں نے شیریں کی خیریت معلوم کی اور جواب میں فرید صاحب نکل آئے۔

”ٹھیک ہے شیریں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ ناصر صاحب آپ نے بڑی مدد کی میں تو اچانک ہی چلا گیا تھا۔ ورنہ آپ کو اطلاع دے کر جاتا۔“ فرید صاحب نے شکرگزاری سے کہا۔

”ارے کوئی بات نہیں فرید صاحب یہ تو میرا فرض تھا اور پھر شیریں..... شیریں کے لیے آپ یقین کریں میں بہت پریشان رہا ہوں۔“

”بہر صورت اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ اسے بہت چاہتے ہیں لیکن اب وہ ٹھیک ہے۔“

غالباً اسی تعاون کا نتیجہ تھا کہ اب اکثر کبھی کبھی کوئی چیز جو گھر میں پکی ہوئی تھی میرے لیے آ جاتی تھی اور شاید اس کا علم فرید صاحب کو بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ان خاتون کی جانب سے میری کوئی پذیرائی نہیں ہوئی تھی۔

اسنے عرصے ساتھ رہنے کے باوجود میں نے ان کا چہرہ کبھی نہیں دیکھا تھا اکثر وہ فرید صاحب کے ساتھ جاتی تھیں لیکن برقع اوڑھ کر اور برقعے کا بیج استعمال کرنے کے بعد یعنی ان کا چہرہ ڈھکا ہوتا تھا۔

چھٹی کا دن تھا۔ فرید صاحب حسب معمول میرے پاس آ گئے اور ہم دونوں چائے پی رہے تھے۔

تب اچانک فرید صاحب نے کچھ برتن دیکھے اور بولے۔

”ارے یہ تو ہمارے گھر کے برتن ہیں۔“

”اوہ ہاں۔ بھائی کو دینا بھول گیا تھا۔ براہ کرم آپ لیتے جائیے گا۔“ میں نے کہا۔

”اچھا..... اچھا کوئی چیز آتی تھی کیا؟“

”جی ہاں۔“ میرے ذہن میں بھی کوئی کسی قسم کی بات نہیں تھی۔

اس لیے صاف دلی سے میں ان کی باتوں کا جواب دیتا رہا۔

”کیا آیا تھا؟“ انہوں نے پھر پوچھا۔

”غالباً بھابی نے کوئی سالن بھیجا تھا۔“

”اچھا..... اچھا۔“ فرید صاحب نے جواب دیا۔ لیکن اب ان کے جان دار ہوٹوں پر بے جان میسرکرا ہٹ تھی۔ جسے میں نے بخوبی محسوس کیا تھا۔

بہر صورت میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن دو تین دن تک کوئی چیز نہیں آئی اور یہ خلاف معمول سا تھا۔

اور پھر چھٹی کا دن آیا تو فرید صاحب صبح سے غائب رہے۔ وہ میرے پاس نہیں آئے تھے۔ حالانکہ کئی بار میں نے ان کی آواز بھی سنی تھی۔

پھر جب میں انتظار کرتے کرتے تھک گیا تو میں نے خود ہی انہیں آواز دے لی۔

”فرید الدین صاحب!“ اور وہ باہر نکل آئے، مصنوعی انداز میں مسکراتے ہوئے شیریں ان کی گود میں نہیں تھا۔ اور وہ میرے کمرے میں آ گئے۔ اور میں نے تھمرا انداز میں انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا بات ہے فرید صاحب؟ آج کچھ زیادہ مصروفیت تھی کیا؟“

”ہاں کچھ ایسے ہی معاملات ہیں۔ بہر حال کوئی خاص بات نہیں ہے آپ کہیں گئے نہیں۔“

”بس سوچ ہی رہا تھا۔! جانے کے لیے آپ جب نہیں آئے تو مجھے تعجب ہوا آپ کی طبیعت وغیرہ ٹھیک ہے۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ فرید صاحب سنجیدہ لہجہ میں بولے۔

میں نے اس وقت بھی ان کے بدلے ہوئے انداز پر غور نہیں کیا تھا۔ لیکن ان کے جانے کے بعد مجھے ہلکا سا احساس ہوا کہ شاید فرید صاحب کسی بات پر پریشان ہیں۔

بہر صورت پڑھتی تھے اور پڑوسیوں کے معاملات میں اتنا گھسنا بھی مناسب نہیں ہے چنانچہ میں نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی اور وقت گزر گیا۔

دوسرے دن میں حسب معمول بینک چلا گیا۔ شام کو واپس آیا تو شیریں بھی میرے دروازے تک نہیں آیا۔

بہت دیر ہو گئی تو میں نے خود ہی دروازے پر دستک دی اور چند ساعت کے بعد اندر سے آواز سنائی دی۔

”فرمائیے؟“

”بھابی میں ناصر جمال ہوں۔“

”جی کیا بات ہے؟“

”شیریں کہاں ہے؟“

البتہ میں نے ایک بات اپنے اندر ضرور محسوس کی تھی۔

میں نے سوچا تھا کہ اس خاتون کو میری وجہ سے بہت پریشانی ہو رہی ہے جب تک میں وہاں رہوں گا۔ فرید صاحب مجھ پر شبہ کرتے رہیں گے۔ چنانچہ بہتر یہی ہوگا کہ کوئی دوسرا مکان تلاش کر کے ان خاتون کو اس زحمت سے نجات دلائی جائے اس سبکی ہوئی عورت کے لیے مصیبت بننا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ چنانچہ بہتر یہی تھا کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔

نیاز صاحب سے اس سلسلے میں کچھ نہ کہا اور اپنے طور پر کوئی مناسب مکان تلاش کرنے لگا۔ لیکن مکان کی تلاش سب سے شدید مسئلہ تھی۔

البتہ اب میرے پاس کچھ پیسے جمع ہو گئے تھے۔ جن سے میں مکان کا ایڈوائس دے سکتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جس علاقے میں میں رہوں جہاں بھی جاؤں لیکن جلد از جلد اس علاقے کو چھوڑ دوں۔ چنانچہ کافی عرصے بعد ایک ایجنٹ نے جس سے میں نے رابطہ قائم کیا ہوا تھا پاپوش نامی ایک علاقے میں قبرستان کے پیچھے مجھے ایک مکان بتایا۔ اس نے کہا ایک مکان خالی ہے چھوٹا سا ہے۔ لیکن کرایہ زیادہ ہے۔

میرے اپنے مسائل بہت زیادہ نہیں ہیں۔ بس گھر سے دفتر تک کا کرایہ ہفتے میں ایک یا زیادہ سے زیادہ دو بار سنبھا، کچھ سگریٹیں، کچھ پان اور کچھ کھانے کا چکر اور بس۔

تختہ مناسب تھی۔ جس میں با آسانی ایک تنہا شخص کی گزر بسر ہو سکتی تھی۔ ہاں میں اپنی تنہائی کو دور کرنے کے لیے ان پیسوں میں کم از کم اس سہارے کے بارے میں نہیں سوچتا تھا جو دائمی ہوتا ہے بہر صورت اسٹیٹ ایجنٹ کے ساتھ مکان دیکھنے گیا۔

دو کمر اور ایک صحن کا صاف ستھرا مکان تھا مجھے پسند آیا اور میں نے فوراً اس کا ایڈوائس ادا کر دیا جو تقریباً چھ ماہ کا تھا۔ میں نہایت خاموشی سے اس مکان میں منتقل ہو گیا۔ مکان میں منتقل ہونے کے بعد میں نے نیاز احمد کو اس بارے میں بتایا تھا اور نیاز صاحب بے چارے حیران رہ گئے۔

”ارے اچھا۔ لیکن یہ کمرہ تم نے کیوں چھوڑا۔ میرا خیال تھا تمہیں وہاں زیادہ آسائیاں ملیں۔ دفتر بھی قریب تھا اور بینک بھی..... موجودہ علاقے میں آنے جانے کے لیے تمہیں خاصی دقتیں ہوا کری گی۔“

”نہیں نیاز صاحب ایسی کوئی بات نہیں ہے بس کچھ صورت حال ایسی ہی تھی۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔“

”گھر میں ہے۔“ جواب ملا۔

”میرے پاس نہیں آیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ناصر جمال صاحب ایک شرم ناک بات عرض کرنا چاہتی ہوں۔“ اندر سے آواز آئی اور میں چونک پڑا۔

”جی۔“ میں حیران سا تھا۔

”ہاں ناصر صاحب! فرید صاحب کو شہری کا آپ کے پاس جانا پسند نہیں ہے اور وہ اس بات کو بہتر نہیں سمجھتے۔“

”ارے لیکن کیوں بھابی؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”بس کیا بتاؤں ناصر جمال صاحب، بہر حال وہ مکان دارِ قسم کے آدمی ہیں۔ چھوٹا سا ذہن چھوٹی سی سوچ رکھتے ہیں۔ آپ براہ کرم محسوس نہ کریں۔ ہمیں ہر قسم کے لوگوں سے رابطہ رکھنا ہوتا ہے۔ فرید صاحب اسی ذہنیت کے انسان ہیں جو ہمارے درمیان پسندیدہ نہیں ہوتی۔“

”اوہ۔“ میں نے سیٹی بجانے کے سے انداز میں ہونٹ سکڑے۔ خاتون نے دوبارہ کہا۔

”ناصر صاحب حالانکہ کوئی ایسی بات نہیں ہے بس میں نے کہا نا کہ زندگی کا اٹھنا سوچ رہے۔ ان کی سوچ کی حد یہی ہے کہ وہ مرد اور عورت کے رشتوں میں سے صرف ایک رشتے پر یقین رکھتے ہیں جو صرف آدم اور عورت کا رشتہ ہے اس روز انہوں نے آپ کے ہاں برتن دیکھ لیے تھے۔ اس سے انہوں نے کچھ محسوس کیا۔ اسی دن سے وہ ناراض ناراض سے ہیں چند مست اور سخت باتیں بھی کہہ چکے ہیں۔ اس لیے میں آپ سے از حد شرمندہ ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں آپ کے خلوص کا کوئی جواب نہ دے سکی۔“

”ارے تعجب ہے۔ فرید صاحب تو ایسے انسان نہیں تھے اور بھابی آپ بھی مجھے اچھی طرح جانتی ہیں۔“

”جی ہاں۔ میں جانتی ہوں۔ لیکن انہوں! وہ تعلیم کے زیور سے نا آشنا ہیں وہ خلوص کی باتوں کو نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک زبان کا عمل بے عمل ہے آپ مجھے معاف فرمائیں میں اپنے شوہر کے بارے میں آپ کو سب کچھ بتا رہی ہوں۔ لیکن اس میں کوئی غلط بات نہیں ہے۔ میں صرف اس تصور سے آپ کو بتا رہی ہوں کہ آپ ایک تعلیم یافتہ انسان ہونے کی حیثیت سے میری مجبور یوں کو سمجھتے ہوئے مجھے بد اخلاقی قرار نہ دیں گے۔“

”جی۔“ میں نے آہستہ سے کہا اور اوپس لوٹ آیا۔

فرید الدین صاحب اس کے بعد چھٹی کے دن بھی نہیں آتے تھے اور اس کے بعد میں نے بھی انہیں کبھی نہیں بلایا۔

لیکن اپنی محبت اور کسی معصوم بچے کی انسیت کی خاطر میں کسی گھریلو خاتون جو سبھی ہوئی تھی کی زندگی پر باندھیں کر سکتا تھا۔ فرید الدین جیسے گندے لوگ گندے کے لوتھرے گندی ذہنیت رکھنے والے بہر بات کو گندگی کے انداز میں سوچتے ہیں ان کے نزدیک اچھائی کا عمل صرف خون کے رشتوں تک محدود ہوتا ہے۔ اس سے آگے کی دنیا وہ خود پر یاد دوسروں پر بالکل ختم سمجھتے ہیں۔ وہ اس انداز میں سوچنے کے عادی نہیں تھے۔ جس میں۔ میں یاد وہ خاتون سوچ سکتی تھی۔

بہر صورت اب وہ میری زندگی سے نکل چکے تھے۔ لیکن تنویر صاحب کا قرب میرے لیے بہت بڑی حیثیت رکھتا تھا۔ تنویر صاحب کی بیگم مجھے اپنے بھائیوں کی طرح چاہتی تھیں اور اکثر میرے مسائل پر غور و فکر کرتی رہتی تھیں۔

ایک دو بار وہ لوگ میرے گھر پر بھی آئے۔ اور ان کی آمد سے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ان کے لیے بھاگ بھاگ کر میں نے کھانے پینے کا انتظام کیا تھا۔ سب کے سب بہت خوش تھے۔ اسی دن تنویر مجھ سے کہنے لگیں۔

”ناصر جمال! تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟“

”اوہ بھائی جان! آپ جانتی ہیں کہ انسان کے مسائل کتنے ہوا کرتے ہیں میں کہاں کسی کی زندگی کا بوجھ اپنے ان کمزوروں کا ندھوں پر لا دے سکتا ہوں۔“

”نہیں بھیا۔ یہ تمہاری بھول ہے، عورت گھر کی زینت ہوتی ہے۔“

”بے شک، لیکن بھائی گھر کی زینت کے لیے بھی بہت سارے لوازمات ہوا کرتے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن پھر بھی۔“

”بھائی آپ ہی بتائیں اتنی چھوٹی سی تنخواہ میں یہ ممکن کاش کہاں ہے؟“

”دیکھو بھیا بہت سارے معاملات ایسے ہیں جیسے کھانا پینے اور اس قسم کے دوسرے مسائل جس میں تمہارے اچھے خاصے پیسے خرچ ہو جایا کرتے ہیں اور یہی پیسے اگر تم اپنے گھر میں خرچ کرو تو میں سمجھتی ہوں کہ تھوڑی سی تکلیف تو ضرور ہوگی۔ لیکن بہر حال گزارہ ضرور ہو جائے گا۔ فی الوقت تم رکشہ نیکی میں سفر کرتے ہو اس کے بعد چھ مہینوں میں سفر کرنا پڑے گا۔“

لیکن یہ بھی تو سوچو کہ گھر میں آنے کے بعد تمہیں جو پرسکون زندگی اور جو رفیق ملے گا وہ کتنا قیمتی ہوگا؟ تم تنہائی کے اس جان لیوا ماحول سے نجات پالو گے۔“

”اچھا بہر صورت اگر تم وہاں خوش ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔ بس ڈرامیج کو جلدی اٹھنا پڑا کرے گا تاکہ بینک وقت پر پہنچ سکوں۔“

”جی ہاں میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ میں پہنچ ہی جایا کروں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

جس علاقے میں یہ مکان واقع تھا۔ وہ زیادہ صاف تھرا نہیں تھا۔ ہاں کچھ فاصلے پر اچھے مکانات موجود تھے۔ کچھ تعمیر ہو رہے تھے۔

جس جگہ میں رہتا تھا وہ جگہ بہت گندی تھی۔ میرے مکان کا دروازہ ایک پتلی سی گلی میں کھلتا تھا۔ سامنے ہی پٹھانوں کے کچھ ہوٹل تھے۔

گلی سے کافی دور پیدل چلنا پڑتا تھا۔ تب گھوم کر بس اسٹاپ تک پہنچنا ہوا کرتا تھا۔ البتہ اگر قبرستان میں سے تھوڑا سا فاصلہ طے کر لیا جاتا تو پھر میں ایک صاف تھرے علاقے کے گیٹ پر نکل آتا تھا۔ لیکن بہر صورت بس کا مسئلہ پھر بھی میزباہی رہتا تھا۔ چنانچہ صبح کو تو میں وہ گلی اسی انداز میں طے کرتا تھا۔ البتہ شام کو رکشہ یا ٹیکسی سے آتا اور قبرستان کے اس حصے پر اترتا جس سے گزر کر میں با آسانی اپنے گھر پہنچ جاتا تھا۔

کافی عرصہ اسی طرح گزر گیا۔ پھر میری ملاقات تنویر صاحب سے ہوئی۔ تنویر صاحب بھی کسی دوسری برانچ سے اس برانچ میں ٹرانسفر ہو کر آئے تھے اور میجر تھے۔

صاف تھری طبیعت کے مالک تھے۔ صاف سترے انسان تھے۔ گلزار کا لونی میں رہتے تھے۔ ان کا مکان بھی کرائے کا تھا۔ لیکن بہر صورت یہاں ان کے عزیز واقارب بھی رہا کرتے تھے۔ جنہوں نے انہیں یہ مکان دلا یا ہوا تھا۔ کافی پرانے کرائے دار تھے۔ اس لیے سکون سے وقت گزار رہے تھے۔

ان کا مکان اس قابل نہیں تھا کہ میں اس میں رہتا جالانکہ انہوں نے مجھے پیش کش کی تھی۔ بڑی ہی خوب صورت فیملی تھی ان کی۔

تنویر صاحب کی بیوی تین بچے اور ایک بہن، یہ افراد تھے تنویر صاحب کے گھر کے لیکن تھے۔ سب کے سب انتہائی خوش اخلاق اپنوں کی طرح ملنے والے ان لوگوں کا مل جانا مجھے بے حد قیمتی محسوس ہوا۔

فرید الدین کی کمینہ فطرت سے میں اس قدر بدول ہو گیا تھا کہ پھر میں پلٹ کر بھی اس طرف نہیں گیا حالانکہ شیری مجھے بہت عرصے تک یہ آتا رہا تھا۔

باقاعدگی سے کچھ یا کر دتا کہ میں کچھ جمع کر کے تمہاری شادی کا بندوبست کروں خواہ مخواہ میرے لیے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ بس ہم جیسے ہیں بہتر ہیں۔

دو ایک بار میں نے برا بھی مانا تو میری چیزیں قبول کر لی گئیں لیکن اس کے جواب میں مجھے اتنا نوازا گیا کہ میں بوکھلا گیا۔

بہر صورت بڑے ہی نفیس لوگ تھے اور میرا معمول تھا کہ میں شام کو پانچ بجے دفتر سے فارغ ہو کر تھوڑی دیر ادھر ادھر گھر پہنچ لگتا اور اس کے بعد ٹھیک ساڑھے چھ بجے تو میرا صاحب کے گھر میں داخل ہو جاتا جہاں میرا انتظار کیا جا رہا ہوتا۔۔۔ اور چائے میرے ساتھ پی جاتی۔ رات کا کھانا مجھے زبردستی کھایا جاتا اور اس کے بعد میری ضروریات کے بارے میں پوچھا جاتا۔ کافی دیر گفتگو کی جاتی اور گیارہ بجے مجھے حکم دیا جاتا کہ میں روف چکر ہو جاؤں کیونکہ اس سے زیادہ رکنانہ تو ان کے لیے مناسب تھا اور نہ ہی میرے لیے کیونکہ کنوئس کی کافی مشکلات تھیں۔

تو میرا صاحب نے مجھے یہ بھی پیش کش کی تھی کہ اگر میں چاہوں تو ان کے مکان کے چھوٹے کمرے میں رہائش اختیار کر لوں اس سلسلے میں وہ پر خلوص تھے اور کافی حد تک مانوس بھی اور جناب تو میرا صاحب کی نیت پر شک کرنا میرے لیے کفر کے برابر تھا۔ پھر بھی کم از کم میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اس خاندان پر اور زیادہ بوجھ بن جاؤں۔ کیونکہ یہ لوگ میرے یہاں رہنے کے بعد اور زیادہ بوجھ سے دب جائیں۔ جس کا بہر صورت مجھے اندازہ تھا۔ کیونکہ ناشہ و دوپہر کا کھانا میرے کپڑے رات کا کھانا اور اس قسم کی بے شمار دوسری چیزیں۔

ہر انسان اپنے مسائل رکھتا ہے ان سے نبٹنا بھی ہے۔ لیکن بعض لوگ صرف خلوص میں لپٹے ہیں۔ حالانکہ ضروریات ان کی بھی کافی ہوتی ہیں لیکن وہ اپنی ضروریات کو دوسروں کی خاطر پس پشت ڈالتے ہیں۔

اس طرح میں اگر ان کے گھر رہائش اختیار کر لیتا تو میری ضروریات کی تمام چیزیں ان کے سر پر آ پڑتیں۔ کیونکہ وہ لوگ تھے ہی اس قسم کے اس لیے میں نے اس مسئلے میں تھوڑی سی بد اخلاقی کا ثبوت دیا اور ان کی بات بے پناہ اصرار کے باوجود قبول نہیں کی تھی۔

شروع میں وہ لوگ میری اس بات پر ناراض بھی ہوئے تھے۔ لیکن بعد میں خاموش ہو گئے بہر صورت دنیا ساز تھے۔ اسی دنیا میں رہتے تھے اور دنیا کے بارے میں جانتے بھی تھے اور یہ بھی تھا کہ میں انجینی ہوں۔

”وہ تو ٹھیک ہے بھائی لیکن.....“

”لیکن وہ کچھ نہیں تم مجھے اجازت دو کہ میں تمہارے لیے کوئی اچھی سی دہن تلاش کروں۔“

”بھائی پلیز ابھی نہیں۔ ابھی تھوڑا سا اور سیٹ ہو جاؤں تو اس کے بعد آپ سے درخواست ضرور بالضرور کروں گا۔“

”کتنا وقت؟“ بھائی نے احسان کرنے والے انداز میں کہا۔

”بس بھائی بہت تھوڑا آپ یقین کریں میں بہت جلد آپ کو بتا دوں گا۔ ابھی تو میں نے اس بارے میں بالکل نہیں سوچا۔“

”ہاں ہاں ابھی تو تم بچے ہو بڑے ہو کر سوچنا کیا جلدی پڑی ہے۔“ بھائی بولیں اور مجھے ہنسی آ گئی۔

”ٹھیک ہے کچھ بھی کہہ لیں۔ یقین کریں آپ میرے لیے ماں بہن نہ جانے کیا کیا ہیں۔“

”اچھا اچھا۔ اگر تم واقعی مجھے یہ سب کچھ سمجھتے ہو تو میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ بہت جلد مجھے اس بات سے آگاہ کرو کہ میں کب تمہاری شادی کروں؟“

”جی بہتر۔“ میں نے کہا۔

اور اس کے بعد میں اکثر شادی کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

تو میرا صاحب بے چارے اس قدر عظیم انسان تھے کہ میں ان کی تعریفیں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ میری شام کی تنہائیاں انہوں نے دور کر دی تھیں اور بہ اصرار مجھے کہا گیا تھا کہ میں رات کا کھانا انہی کے ساتھ کھایا کروں۔

ابتداء میں میں نے کافی معذرت کی لیکن بعد میں تو میرا صاحب نے کافی رقت آمیز انداز میں کہا کہ ان کا ایک چھوٹا بھائی تھا جو رونی سیون کے فسادات میں مارا گیا۔ اس کے بعد وہ تنہا اور بھائی سے محروم ہیں۔ میرے لیے وہ بھائی کے جذبات رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی درخواست کو ایک بھائی کے جذبات سمجھوں اور انکار نہ کروں چنانچہ میں آنکھیں بند کر کے ان کا حکم قبول کر لیا تھا۔

بے پناہ غمور اور خود ار لوگ تھے کہ میری کوئی اعانت انہوں نے قبول نہیں کی تھی۔

بھائی کے لیے میں نے چند چیزیں خریدیں تو انہوں نے اس سخت اعتراض کیا۔ کہا کہ دیکھو یہ سب کچھ تم کر رہے ہو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ یہ اس آنے والی کا حق ہے تم مجھے

اور جب میں لیٹا تو بہت دیر تک اس بات سے شرم سار ہوتا رہا کہ میں نے اتنے نیک لوگوں کے بارے میں ایسا سوچا ہی کیوں۔

اور اب ایک نمایاں تغیر جو مجھ میں ہوا وہ یہ تھا کہ اب وہ لوگ میرے سامنے کچھ اور فرشتہ صفت بن کر آگئے تھے اور زمین پر فرشتوں کے وجود سے کوئی بھی شخص انکار نہیں کر سکتا۔

اور معمول کے مطابق تنویر صاحب کے خاندان سے میرے تعلقات جاری رہے۔ تمام مشاغل حسب معمول تھے۔ پھر سردیاں آ گئیں۔

سردیوں میں رات کے گیارہ بجے ہوں لگتا ہے۔ جیسے آدمی رات گزر چکی ہو اور ان دنوں سردی تو کچھ زیادہ ہی پڑ رہی تھی۔ میں ٹھیک گیارہ بجے اٹھ جاتا تھا حالانکہ تنویر صاحب کو سخت اعتراض تھا۔ اس بات پر کہ میں اس وقت گھر جاتا ہوں کہیں سردی وغیرہ نہ لگ جائے۔ باہر سواری کی دشواریاں بھی تھیں لیکن خود تنویر صاحب بھی بے چارے بینک کے منیجر ضرور تھے لیکن بہر حال ان کے مسائل مجھ سے کچھ زیادہ ہی تھے کیونکہ ان کے ساتھ کچھ دوسرے افراد بھی منسلک تھے ان کے پاس بھی اپنا کوئی کنونشن نہیں تھا جو مجھے وہ گھر تک چھوڑ جاتے۔

بہر صورت وہ لوگ بہت اچھے تھے۔ رات کے گیارہ بجے وہ لوگ مجھے دروازے پر خدا حافظ کہنے کے لیے آتے اور میں سڑک پر آ جاتا۔

ٹیکسی تلاش کرنا اور بیٹھ کر گھر کی طرف چل پڑنا۔ یہ میرا روز کا معمول بن چکا تھا۔

اس دن سردی شاب پر تھی۔ میں نے کوٹ کے کالر کھڑے کیے اوٹی ٹوپی سر پہنی اور دونوں ہاتھ جیب میں ڈالے ٹیکسی کی تلاش میں لگا بیٹھ دوڑا رہا تھا۔ دور سے مجھے روشنیاں نظر آئیں اور میں آنکھیں پھاڑنے لگا کہ شاید ٹیکسی ہی ہو اور بہر حال مجھے میٹر بھی نظر آ ہی گیا اور میں نے اسے روکنے کے لیے ہاتھ اٹھا دیا۔

ٹیکسی میرے نزدیک آ کر رک گئی۔

میں نے ڈرائیور کو اپنی مطلوبہ جگہ کا نام بتایا اور اس نے گردن ہلا دی۔ میں پچھلا دروازہ کھول کر ٹیکسی میں دبک گیا اور ٹیکسی چل پڑی۔

راستے میں مکمل خاموشی رہی۔ ڈرائیور نے بھی کوئی بات نہ کی تھی۔ سردی اتنی کم کہ منہ کھولنے کو بھی دل نہ چاہ رہا تھا۔

بہر صورت چند منٹوں پر میں نے ڈرائیور کو گاڑیڈاکر اور پھر

حالاںکہ خود ان کے جذبات میرے لیے ایسے نہ تھے کہ وہ مجھے اچھی سمجھتے ہوں لیکن بہر حال دنیا کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ بہر صورت اس شکل میں اور میں زیادہ جب کہ بھابی کی جوان بہن بھی اس گھر میں موجود تھی۔

اکثر کبھی میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ بھابی کہیں اس لڑکی کی خاطر ہی تو مجھ پر اتنی عنایتیں نہیں کر رہیں..... لیکن بعد میں..... میں اپنے اس خیال پر خود ہی شرمندہ ہو جاتا تھا۔ یہ تجسس اس دن ختم ہوا۔ جس دن بھابی نے ایک نوجوان سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”ناصر جمال۔“

”جی بھابی۔“ میں نے ادب سے کہا۔

”ان سے ملو یہ عظیم صاحب ہیں۔“

”اوہو بھابی! کوئی عزیز ہیں اپنے۔“ میں نے عظیم سے ہاتھ ملاتے ہوئے بھابی سے پوچھا۔

”ہاں بھی عزیز ہیں۔ عزیز ہی ہیں اور ابھی زیادہ عزیز ہونے والے ہیں۔“ بھابی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں سمجھا بھابی۔“

”اوہو بھئی سلطانہ کے منگیتر ہیں۔ ان کی منگنی چار سال پہلے ہوئی تھی۔ باہر گئے ہوئے تھے اب واپس آئے ہیں اور ہمیں کاروبار کا ارادہ رکھتے ہیں۔“

”اوہو۔ اچھا..... بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر عظیم صاحب!“ میں نے بہت ہی گرم جوشی سے عظیم سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

اور اس رات جب میں گھر واپس آیا تو میرے ذہن میں بہت ساری شرمندگی اور پشیمانی تھی۔ ہم لوگ کتنے برے ہوتے ہیں کتنے اچھے لوگوں کے بارے میں ہماری رائے کتنی بری ہوتی ہے حالانکہ دنیا میں بسنے والا کوئی بھی انسان برائی نہیں ہوتا۔ صرف ہم برے ہوتے ہیں جو دوسروں کے بارے میں اپنے دل میں برے جذبات رکھتے ہیں۔ ان کے معصوم جذبات سے بے خبر۔ میں نے ان نفیس لوگوں کے بارے میں اس برے انداز سے سوچا ہی کیوں تھا کہ وہ سلطانہ کی شادی میرے ساتھ کرنا چاہتے ہیں اور خود تو یہ ہے کہ وہ خاموش خاموش ہی جھگی جھگی لگا ہوں والی لڑکی میرے دل میں ایک بہن کی سی محبت تھی۔ میں نے اس کے بارے میں ہمیشہ بھابی کی بہن سمجھ کر سوچا تھا۔ گویا بھابی کی بہن اپنی بہن کے مترادف۔ چنانچہ مجھے اس خیال سے کافی شرمندگی ہوئی۔

تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی قبرستان کے دروازے پر جا کر روک گئی اور ڈرائیور میری سمت دیکھنے لگا تب میں نیچے اترا اور جیب سے پیسے نکال کر ڈرائیور کو دینے لگا۔

پرس دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ آج اتفاق سے پیسے کچھ کم ہیں چنانچہ میں نے عجیب سے انداز میں جس میں شرمندگی پائی جاتی تھی۔ ڈرائیور سے کہا۔

”معاف کرنا بھائی“ آج میرے پرس میں پیسے کچھ کم رہ گئے ہیں کیا تم تھوڑی سی تکلیف کرو گے اور ڈرائیور چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

”اؤ میرے ساتھ ذرا تھوڑا سا فاصلہ طے کرو۔ میں تمہیں گھر چل کر پیسے دے دیتا ہوں۔ معاف کرنا بھائی۔“ میں نے آگے بڑھ کر اس کا دروازہ کھولا لیکن حیران کی سی بات تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے تیزی سے دروازہ بند کیا اور پھرتی رفتار سے ٹیکسی آگے بڑھائی کہ میں حیران رہ گیا۔

وہ بری طرح ٹیکسی اشارت کر کے بھاگا تھا۔ اتنی تیز رفتاری سے کہ اس نے سڑک بھی نہ دیکھا اور میں سمجھ کر کھڑا رہ گیا تھا۔

لیکن..... پھر تو مجھے جو ٹیکسی آئی..... تو یہ شدید ٹیکسی..... بلاشبہ ڈرائیور کا اس طرح سے بھاگنا جائز بھی تھا رات کے اس مخصوص وقت میں ایک شخص روزانہ اسے سڑک کے کنارے کھڑا ملتا۔ پھر وہ ٹیکسی روکتا۔ اور ایک ہی ایڈریس بتاتا اور قبرستان کے کنارے اتر جاتا۔ خاموش اور پراسرار سا شخص جس کے بارے میں ڈرائیور کو کچھ نہیں معلوم تھا..... اور وہ شخص اگر اسے قبرستان لے جانے کی کوشش کرے تو خود ڈرائیور کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ بھی تھی اور کیا؟ یہ بات سامنے کی تھی یقیناً وہ مجھے کوئی بدروح سمجھتا ہوگا۔ میں نے سوچا اور مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ میرے ذہن میں وہ واقعات آنے لگے جنہیں اخبار والے شرسخیوں سے شائع کرتے ہیں۔ ”رات کے ڈھائی بجے وہ روزانہ لوگوں کو ملتی ہے انہیں کسی ٹوٹے پھوٹے کھنڈر میں لے جاتی ہے اور اگلے دن وہ تمام لوگ جو اس کے ساتھ جاتے ہیں ہسپتال میں پائے جاتے ہیں اور اس کے بعد وہ کوئی بیان دیے بغیر دم توڑ دیتے ہیں۔ واہ صاحب واہ۔“

بے چارہ غریب ٹیکسی ڈرائیور۔ بہر صورت ممکن ہوا تو کل میں اس کی غلط بھی دور کر دوں گا میں نے سوچا۔ شاید اس کا بھی اسی وقت گزرنے کا راستہ ہے جب وہ اچانک مجھ سے مل جاتا ہے اور یقیناً کل بھی وہ مجھے ضرور ملے گا یا شاید نہ بھی ملے۔ قبرستان

قبرستان کے ٹوٹے دروازے کے سامنے میں نے ٹیکسی رکوا دی۔

ڈرائیور نے مجھے چونک کر دیکھا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی قدر ہوشیار ہو گیا ہے بہر صورت میٹر دیکھ کر میں نے بل ادا کیا اور قبرستان کے ٹوٹے دروازے کی جانب چل دیا جہاں سے گزر کر مجھے گھر تک پہنچنا ہوتا تھا۔

ٹیکسی تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئی تھی۔ میں نے کوئی خاص بات محسوس نہیں کی۔ قبرستان کا جانا پہچانا راستہ حسب معمول تھا۔ میں اس راستے سے گزر کر اپنے گھر پہنچ گیا۔ آرام سے لباس وغیرہ تبدیل کیا اور سو گیا۔

دوسرے دن بھی کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی حسب معمول مصروفیات جاری رہیں شام کو بخیر صاحب کے گھر کا کھانا کھایا اور واپس چل دیا۔

قطعی اتفاق تھا کہ زیادہ دیر کھڑے نہیں گزری تھی کہ مجھے ٹیکسی آتی دکھائی دی اور میں نے اسے اشارہ کیا۔

ٹیکسی رکتے ہی میں اس میں بیٹھ گیا اور اپنے علاقے کا نام ڈرائیور کو بتایا تو ڈرائیور نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں نے اسے پہچان لیا وہ ٹیکسی تھی جو پچھلے روز مجھے ملی تھی۔ بہر صورت یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی کیونکہ ایسے اتفاقات عام طور سے ہو جاپا کرتے ہیں۔ یوں میں انجنیوں سے زیادہ بے تکلفی کا عادی نہیں ہوں چنانچہ میں نے اس موضوع پر ٹیکسی ڈرائیور سے کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔ چنانچہ میں نے ٹیکسی کو حسب معمول قبرستان کے گیٹ پر روکوا بل ادا کیا اور گھر کی طرف چل دیا۔

لیکن جناب بعض اوقات اتفاقات بھی خوب ہوتے ہیں۔ تیسرا چوتھا پانچواں چھٹا سا تو اس آٹھواں تو اس..... یہاں تک کہ بارہ دن گزر گئے اور وہ ٹیکسی مجھے روزانہ ملتی رہی یہاں تک کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کافی حد تک مانوس ہو چکے تھے لیکن نجانے کیوں ڈرائیور خاموش ہی رہتا تھا۔

میں نے کافی دفعہ اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ عام طور سے خاموش ہی رہتا تھا۔

اس دن سردی کچھ کم تھی۔ میں نے ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد ڈرائیور کو دیکھا اور مجھے ایڈریس بتانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ڈرائیور نے مجھے دیکھا اور ٹیکسی خاموشی سے راستے پر ڈال دی۔

اس دن اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ ڈرائیور میری منزل سے واقف تھا چنانچہ میں بھی حسب معمول خاموش رہا۔

میں داخل ہو کر میں اس کے بارے میں سوچتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور مجھے اس کی کیفیت پر پٹی آتی رہی۔

”میں تو اس قبرستان سے گزرنے کا عادی ہو چکا تھا لیکن کسی اجنبی شخص کے لیے یہ ذرا عجیب سی ہی بات تھی۔ اب اس بے چارے کو کیا معلوم کہ قبرستان کی دوسری طرف کی دیوار سے کہیں اور جانے کا راستہ بھی نکلتا ہے۔ چنانچہ اس کا خوف بجا تھا۔“

میں ہنستا ہوا آگے بڑھتا رہا مجھے بے اختیار ڈرائیور کی بدحواسی پر پٹی آ رہی تھی لیکن ابھی میں زیادہ دور نہیں پہنچا تھا کہ اچانک قبرستان میں مجھے ایک ہلکی سی روشنی محسوس ہوئی اس سے قبل ایسا کبھی محسوس نہیں ہوا تھا لیکن یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں تھی قبرستان کے دوسری طرف بنے ہوئے مکانات کی کھڑکیاں اگر کبھی کھل جاتیں تو اس سے روشنی ہو سکتی تھی۔ بلکہ بعض اوقات اچھی خاصی روشنی پھیل جاتی تھی۔

لیکن عموماً ان مکانات میں رہنے والے قبرستان کی طرف کے دروازے نہیں کھولتے تھے شاید کسی وہم کی وجہ سے۔

چنانچہ میں نے توجہ نہیں دی لیکن دوسری بار پھر مجھے روشنی کے کچھ جھماکے سے محسوس ہوئی اور اس بار میری نظر اپنے بائیں سمت کی جانب اٹھ گئی۔ یہ قبر ہی تھی اور ایک لمحے کے لیے میرا دل دھک سے ہو گیا۔

میں سن ہو گیا تھا۔

قبر سے چنگاریوں کی پھوار اٹھ رہی تھی۔ میں نے متحیر نگاہوں سے اس منظر کو دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جیسے کوئی برندہ ان چنگاریوں کے درمیان میں سے پرواز کرتا ہوا اوپر چلا گیا ہو یہ حیرت انگیز واقعہ عین میری نگاہوں کے سامنے تھا اور اس سے قبل میں نے ایسا کوئی واقعہ نہیں دیکھا تھا میں ششدر رہ گیا تھا۔

لگھڑ میں پہلی بار اس قبرستان میں آیا ہوتا تو شاید خوف سے میری آنکھیں بندھ گئی ہوتی لیکن میں چونکہ یہاں سے گزرنے کا عادی تھا یہ پلٹنڈی میرے پیروں تلے ٹیکڑوں بار آجی جی اس لیے مجھے زیادہ خوف محسوس نہیں ہوا۔

میں اس سمت دیکھنے لگا جہاں سے چنگاریاں بلند ہوئیں تھیں۔ چنگاریاں وقفے وقفے سے اوپر اٹھ رہی تھیں۔ دفعۃً میں ایک بار پھر سن سارہ گیا۔

چنگاریوں کے پس منظر میں مجھے ایک سایہ سا محسوس ہوا۔ ایک انسانی سایہ۔ اوہ کیا آج میں کسی خاص واقعے سے

روشناس ہونے والا ہوں۔ میں نے سوچا۔

ان حالات کے بارے میں میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ قبرستان سے گزرتے ہوئے بھی میں ان قبروں سے بے نیاز ہی رہتا تھا۔ حالانکہ انسان کی حیثیت سے مجھ پر بھی یہ ساری چیزیں اثر انداز ہونی چاہیے تھیں لیکن وہی بات جو کہ ایک گورنر کی فطرت ہوتی ہے وہ قبرستان میں نہایت سکون سے رہتا ہے۔ زندگی کے تمام مشاغل میں مصروف اور اس کے ذہن میں کبھی یہ بات نہیں آتی کہ وہ زندہ انسانوں سے دور مردہ انسانوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے۔ اسی طرح میں بھی اس قبرستان سے گزرتے گزرتے مردوں کا اور مردوں کی قبروں کا اس طرح عادی ہو گیا تھا کہ کبھی میری توجہ اس سرف نہیں جاتی تھی لیکن آج.....

آج ان دو برسرِ اوقات نے پوری طرح مجھے اس طرف متوجہ کر دیا تھا۔ میں نے اپنی اندرونی کیفیت کو ٹھٹھا۔ کیا میں خوف زدہ ہوں۔

میں نے سوچا۔ احساس ہوا کہ میں اتنا خوف زدہ نہیں ہوں۔ جتنا کہ ایک عام انسان کو ہونا چاہیے تھا۔ پھر یہ سایہ..... کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں خاموشی سے گزر کر اپنے گھر چلا جاتا اور آرام کی نیند سو جاتا لیکن نہ جانے کیوں میرے ذہن میں تجسس سا جاگ اٹھا۔ چند لمحات کے لیے میں نے یہی سوچا کہ زیادہ غڈ رہنے کی کوشش مت کروں لیکن طبیعت نہ مانی۔ ممکن ہے اگر میں خاموشی سے یہاں سے گزر جاؤں تو میرا تجسس مجھے سونے بھی نہ دے۔

سایہ بہ دستور محسوس ہو رہا تھا خاموش خاموش سا کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ ممکن ہے کوئی ایسا شخص ہو جو کسی کی قبر پر فاتحہ وغیرہ پڑھنے کے لیے آیا ہو..... لیکن یہ چنگاریاں میرے لیے بہت تعجب خیز تھیں۔

چند لمحات تک میں اپنے حواس مجتمع کرتا رہا۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ اس سائے کی طرف دیکھوں یہ ہے کیا۔ چنانچہ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ دل ہی دل میں ایک تمورا سا احساس بھی تھا کہ کہیں کوئی گڑبڑ ماحول نہ ہو۔ کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں لیکن بہر صورت اپنے تجسس کی توسیع کرنی ہی تھی۔ یوں بھی زندگی میں بے شمار ایسے واقعات آتے ہیں ایسی صورت میں کسی واقعے کے کسی فوری منظر سے ڈر جانا کیا معنی رکھتا ہے۔ حالانکہ یہ با مقصد بھی ہوتے ہیں لیکن بس! بعض اوقات ان سے خاص مقاصد بھی نکل آتے ہیں۔

مقابل کھڑا تھا وہ اپنی سیاہ آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔
حسرت، تجسم تھی وہ اس کا ٹوٹا انداز اسے اور بھی خوب صورت
بناتا رہا تھا میں نے اس طرح خاموش کھڑے رہنا مناسب نہیں
سمجھا اور آہستہ سے اس سے مخاطب ہوا۔

”میں نہیں جانتا کہ آپ کون ہیں خاتون! لیکن بس ادھر
سے گزرتے ہوئے میں نے آپ کو دیکھا اور میرا جس مجھے
یہاں تک لے آیا..... کیا..... کیا آپ کسی پریشانی میں جلا
ہیں.....؟“

”نہیں..... آپ کا شکریہ..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“
”خاتون آپ کو کدھ کر مجھے بے انتہا حیرت ہوئی ہے میں نہیں
جانتا کہ آپ کون ہیں اور رات کے بارہ بجے اس قبرستان میں تھا
کیوں بیٹھی ہوئی ہیں۔ لیکن آپ کی شکل و صورت دیکھ کر مجھے
رج ہی ہوا ہے اور ایک انسان کی حیثیت سے میں آپ کے
بارے میں جاننے کا خواہش مند ہوں ہاں بعض اوقات حالات
اس قسم کے ہوتے ہیں کہ انسان کسی کو اپنا راز دار بنانا پسند نہیں
کرتا۔ آپ کوئی بھی ہوں اگر کسی سلسلے میں میری خدمات آپ
کے کام آسکیں تو مجھے خوشی ہوگی۔“

لڑکی چند ساعت خاموش رہی قبرستان کے اس وحشت زدہ
ماحول میں کسی کو قریب پا کر حواس کو قابو میں رکھنا ذرا مشکل ہی
ہوتا ہے۔ خاص طور سے سردیوں کی اس سنسان رات میں اس
کی موجودگی جس طرح میرے لیے حیرت انگیز تھی غالباً میری
موجودگی اس کے لیے بھی اتنی ہی حیرت انگیز ہوگی بشرطے کہ
اس کا تعلق اجنبی دنیا سے نہ ہو۔

اجنبی دنیا سے مراد مردوں کی دنیا ہے۔ میں بلاشبہ اپنے آپ کو
ایک نذر انسان کہہ سکتا ہوں اس تصور کے باوجود کہ وہ لڑکی جس
بے تکلفی اور جس انداز سے یہاں بیٹھی تھی وہ زندہ انسانوں میں
نہیں ہو سکتی کیوں کہ بہر حال زندہ انسان ہر ماحول سے تھوڑے
سے محتاط ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن وہ قبرستان کے اس ماحول میں
قطعی غیر محتاط تھی اور اس کے انداز سے قطعی یہ محسوس نہیں ہوتا تھا
کہ وہ کسی سے خوف زدہ ہو یا کوئی ایسی بات ہو جس سے کہ اس
کی زندگی کے آٹا..... لیکن اس کے باوجود میں اس سے ہم
کلام تھا اور ذرا بھی خوف زدہ نہیں تھا۔

”آپ کے لہجے میں جو ہمدردی ہے میں اس کی شکر گزار
ہوں..... لیکن بس اتنی تھی۔ قریب ہی رہتی ہوں اور اکثر
آتی رہتی ہوں دراصل یہاں میرے کچھ اعزاء کی قبریں
ہیں.....“ لڑکی نے متانت سے جواب دیا۔

حالانکہ میرے ذہن میں کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ قبر کے
نزدیک موجود اس سائے کے بارے میں کوئی خاص تفتیش
کروں لیکن بہر صورت ایک مسئلہ ایک شخص اس کی طرف لے
جا رہا تھا.....

میں نے اس قبر سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھتے ہوئے اس
سائے کو دیکھا سائے کے بیٹھے کا انداز کچھ عجیب سا تھا۔ تاروں
کی چھاؤں بس اتنی تھی کہ تھوڑے فاصلے کے مناظر آ سکتے تھے۔
گو اس سمت کوئی خاص روشنی نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی میں اس
سائے کو با آسانی دیکھ سکتا تھا..... اور ایک بار پھر مجھے مزید
چونکنا پڑا میرے حواس ایک لمحے کے لیے پھرن ہو گئے تھے۔
میں نے محسوس کیا کہ وہ کوئی نوجوان نوخیز لڑکی ہے کچھ
قدم اور میں نے آگے بڑھائے تو وہ مجھے بالکل نمایاں نظر آنے
لگی.....

اس کے جسم پر ایک چست قمیص تھی اور شاید چست ہی
پاجامہ پہنے ہوئے تھی بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کی
آنکھیں اس قبر کی جانب نگراں تھیں۔ جس سے چنگاریاں بلند
ہوئی تھیں۔ میں حیران رہ گیا اور اپنی جگہ رک کر اس لڑکی کو
دیکھنے لگا۔

دفعہ میرے کان کے نزدیک ایک چمکاؤ اڑی اور میں
ٹھنک گیا۔ لڑکی نے چہرے میری طرف کر لیا اور اب میں اس کے
خدو خال بھی دیکھ سکتا تھا۔

نہایت پرکشش اور خوب صورت لڑکی تھی۔ بالکل نو عمر حسین
کلیوں کی مانند لکڑی۔ اس کے چہرے پر ایسی دیرانی تھی کہ دل لرز
جاتا تھا۔ خوب صورت آنکھیں روشن اور پیشانی کشادہ تھی۔
لیکن چہرے کی دیرانی..... اف..... ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ
کسی غم ناک واقعے سے دوچار ہوئی ہو..... جس انداز میں وہ
بیٹھی تھی وہ بڑا پچھلکا پچھلکا تھا۔ عجیب ٹوٹا ٹوٹا سا انداز جیسے کوئی
انسان اپنا مناسب کچھ لانے کے بعد لٹے لٹے انداز میں بیٹھا ہو۔
اور کسی لٹی ہوئی چیز کو دیکھ رہا ہو۔

اس نے میری جانب دیکھا اور بے تابی کے انداز میں کئی
ساعت وہ میری طرف دیکھتی رہی پھر ایک گہری سانس لے کر
اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں خاموش اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس نے کسی حد تک خوف زدہ
سے انداز میں مجھے دیکھا اب اس کے چہرے کے تاثرات بدل
گئے تھے۔ اس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ میں نے اس
کی یہ کیفیت دیکھ کر تھوڑی دیر پیش قدمی کی اور اب میں اس کے

”تو کیا آپ روشنی سے خوف زدہ نہیں ہوئیں.....“
 ”نہیں.....“ اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔
 ”تب میں یہی کہوں گا خاتون کہ آپ غیر معمولی طور پر مضبوط اعصاب کی مالک ہیں۔“ میں نے تعریفی انداز میں کہا۔
 ”جی..... شاید.....“ اس نے جواب دیا۔ اور پھر آگے بڑھنے لگی۔

”خاتون کیا آپ مجھ سے کچھ دیر گفتگو کرنا پسند کریں گی۔“
 ”نہیں..... دیکھئے وقت بہت ہو رہا ہے براہ کرم مجھے اجازت دیں۔“ اس نے رکے بغیر کہا اور ایک طرف بڑھ گئی۔
 میں پھر سراسیمہ کی طرف کھڑا رہ گیا۔ وہ سیدھی قبرستان کے دروازے کی جانب جا رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے میرا دل چاہا کہ اس روح کا تعاقب کروں لیکن بہر صورت اب اتنا دلیر بھی نہیں تھا کہ ایک روح کا تعاقب کرتا چنانچہ میں تیزی سے آگے بڑھ گیا اور پھر اپنے گھر پہنچ گیا..... لیکن جناب اس رات کوشش کے باوجود مجھے نیند نہیں آ سکی تھی۔

بار بار میرا ذہن اس لڑکی طرف مائل ہو جاتا تھا۔ ایک عجیب سا احساس تھا۔ کیا اندوہ ناک چہرہ تھا۔ اس کا شدید غم سے بے جان ٹوٹا چھوٹا سانس انداز میں لرز رہا تھا۔ جس کوئے کھوئے سے انداز میں وہ قبرستان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سے ایک عجیب سے دکھ کا احساس ہوتا تھا نہ جانے بے چاری کون تھی اور کس دکھ میں گرفتار تھی۔

دوسرے دن میں نے تصویر صاحب سے بھی اس واقعے کا تذکرہ کیا اور تصویر صاحب گردن ہلانے لگے۔
 ”بھئی قبرستان سے کیوں جاتے ہو ذرا لمبا فاصلہ طے کر لیا کرو۔“ انہوں نے کہا۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے تصویر بھائی.....“
 ”تو تم بہر حال میری بات مان ہی دو دوسرے راستے سے جایا کرو۔ آخر لمبا فاصلہ طے کرنے میں کیا حرج ہے؟ بلاوجہ مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔“

اس کے بعد تصویر بھائی خاموش ہو گئے بات آئی گئی ہو گئی۔
 ہاں رات کو انہوں نے پھر اس بات کا تذکرہ کیا اور گھر والے بھی کسی حد تک خوف زدہ ہو گئے۔ بھائی جان نے بھی مجھے حکم دیا کہ میں قبرستان کے اس حصے سے نہ گزر دوں۔

میں نے صرف ان محبت بھرے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے وعدہ کر لیا تھا۔ لیکن بہر صورت، میرے اپنے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ جسے میں خوف کا نام دے سکوں۔ البتہ اس

”اوہ..... بلاشبہ مرنے والے مر جاتے ہیں اور اپنے پیچھے ایسے حادثے اور سانحے چھوڑ جاتے ہیں کہ ان کی یاد دہانی تک ذہنوں پر چھائی رہتی ہے۔ لیکن خاتون آپ یقین کریں کہ آپ کو دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ آپ کے چہرے کی دشت اور دیرانی میرے لیے صدمہ کا باعث ہے میری دلی خواہش ہے کہ میں آپ سے کچھ دیر باتیں کروں کیا آپ میرے ساتھ کچھ زور تک چلنا پسند کریں گی؟“

”نہیں..... نہیں ہرگز نہیں..... میں جاری ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”آپ شاید مجھ سے خوف زدہ ہیں۔“
 ”نہیں خوف کی کیا بات ہے۔ میں تو بالکل خوف زدہ نہیں ہوں۔“ اس نے جیسے خود کو تسلی دی۔

”سردی بھی ہو رہی ہے اور خاتون آپ نے اپنے بدن پر کوئی ایسا لباس نہیں پہن رکھا جو آپ کو سردی سے محفوظ رکھ سکے۔“
 ”ہاں..... میں ان ساری چیزوں سے بے نیاز ہوں۔“ اس نے جواب دیا اور ایک لمحے کے لیے میرے دل میں سرد لہریں دوڑ گئیں۔

دنیائی باتوں سے دور کا مقصد تو صرف یہ ہو سکتا ہے کہ وہ زندگی ہی سے دور ہے..... گویا کوئی روح.....

میں نے اپنے آپ کو ٹٹولا کہ اندر سے میرا دل کہتا ہے..... میں خوف زدہ ہوں کہ نہیں۔ کیا اس کی کہانی سنوں میں نے سوچا ہاں جواب ملا اور میں اس کی کہانی سننے کے لیے تیار ہو گیا۔ لیکن اس سلسلے میں میں اسے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن بہر صورت اس کا انداز بھی جارحانہ نہیں تھا۔ یعنی ایسا نہیں تھا کہ میں شدت سے خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ نکلنے کا سوچتا۔ چنانچہ میں نے پھر اسے مخاطب کیا۔

”یہ تو درست ہے کہ آج زیادہ سردی نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود..... دراصل میں یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ایک مکان میں رہتا ہوں قبرستان سے گزر کر میرے مکان کا فاصلہ ذرا قریب ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں یہاں سے گزر رہا تھا۔ آپ کتنی دیر سے یہاں بیٹھی ہیں۔“
 ”تقریباً ایک گھنٹہ سے۔“

”اوہ..... تو پھر آپ نے وہ روشنی ضرور دیکھی ہوگی جو قبر سے بلند ہوئی تھی.....“ میں نے پوچھا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی..... ”ہاں..... روشنی میں نے دیکھی تھی۔“

ایک عجیب سا تاثر پیدا ہو گیا۔
اس نے شناسائی کے سے انداز میں گردن ہلائی اور پھر اٹھ کر
آگے بڑھنے لگی۔
”سنو“ میں نے اسے روکا اور وہ رک گئی۔

”کیا بات ہے؟“

”دیکھو میں اس دن سے تمہاری تلاش میں تھا۔ میں روزانہ اس طرف سے گزرتا ہوں میری نگاہیں یہاں سے گزرتے ہوئے ہمیشہ اس قبر کی جانب اٹھتی ہیں میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں کوئی برا انسان نہیں ہوں اور نہ ہی میں تمہیں کوئی تکلیف پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور تم بھی یہ سوچو اگر تم کوئی بھوت وغیرہ ہو تو مجھ میں تم سے خوف زدہ نہیں ہوں بلکہ اگر تم کوئی زندہ ہستی ہو تو میں تمہارے لیے غم زدہ ہوں۔ خاتون ہم سب بڑی کمزور حیثیت رکھتے ہیں اور اسنے کمزور ہونے کے باوجود بے پناہ مسائل ہمارے لیے بوجھ بنادے گئے ہیں حالانکہ ان مسائل کو بعض اوقات انسان اٹھانے کی بھی اہلیت نہیں رکھتا۔

درحقیقت ہر شخص ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہے لیکن بعض اوقات دل کا رورے کر دینے سے ذہن کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ تمہاری اس طرح قبر کے نزدیک موجودگی تمہارا غم ناک چہرہ رات کا وقت یہ سب کچھ میرے لیے بہت حیرت انگیز اور پراسرار ہے۔ یعنی اگر ہے کہ تمہاری زندگی کے مسائل کو میں کم نہیں کر سکتا۔ لیکن خاتون ان مسائل کے بارے میں میں تم سے پوچھ کر میں تمہارے ساتھ اظہارِ ہمدردی تو کر سکتا ہوں۔ کم از کم میرے تعاون سے تمہارے ذہن پر کھلی ہوئی وہ دھند تو ختم ہو سکتی تھی جس کے زیر اثر تم رات کے بارہ بجے اس وحشت ناک ماحول میں موجود ہو تی۔

یوں سمجھو کہ میں اس دن سے آج تک اس کے بارے میں سوچتا رہا ہوں اور خاصا الجھا رہا ہوں۔ بعض اوقات انسان ایسی الجھنیں پال لیتا ہے جو اس کے لیے کوئی بڑی حیثیت نہیں رکھتیں۔ لیکن بہر صورت اس کی زندگی میں ان کا خاصا کردار عمل ہوتا ہے میں روز اس قبرستان سے گزرتا ہوں اور اس راستے کو ترک نہیں کر سکتا اگر ترک کرتا ہوں تو تم اور یہ قبریں یاد آتی ہیں اور اس کے بعد بے شمار الجھنیں میرے ذہن میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں بہت اچھا انسان ہوں اور تمہارا بہترین دوست ہمدرد اور معاون ثابت ہوں گا۔ لیکن میری ایک درخواست ضرور ہے کہ تم کچھ بھی مجھے اسے بارے میں بتاؤ

رات جب میں باہر نکلا تو مجھے وہ نمکی بھی انہیں ملی تھی۔ ڈرائیور نے شاید اپنا راستہ ہی بدل لیا تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر تک انتظار کرنا پڑا تقریباً آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد ایک آنٹن رکشہ ملا اور میں اسے اسی طرف لے آیا۔

بہر صورت بخیر صاحب سے تذکرہ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھا۔ میں نے گزرتے ہوئے پھر قبرستان کے اس حصے کی طرف نگاہ ڈالی جہاں کل میں نے وہ منظر دیکھا تھا لیکن آج وہاں کوئی سایہ نہیں تھا..... نہ ہی قبر سے چنگاریاں اٹھ رہی تھیں۔
میں کھر پنچ گیا۔ کھر پنچ کر کافی دیر تک مجھے وہ سب کچھ یاد آتا رہا۔ ایک عجیب سا احساس ذہن میں تھا۔

لڑکی کافی خوب صورت ہے میں سوچ رہا تھا کہ کاش! وہ کوئی روح نہ ہوتی نہ جانے بے چاری کسی پریشانی میں مبتلا ہوگی۔

دوسرا تیسرا اور چوتھا دن بھی گزر گیا۔ اب وہ میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔ میرا معمول روز کی طرح تھا۔ یعنی میں اسی جگہ پر آ کر کرتا اور وہاں سے گزرتا یا قبرستان سے گزرتے ہوئے میری نگاہ اس قبر کی طرف ضرور جاتی تھی۔

اس رات کافی دیر سے گھر پہنچا تھا۔ کافی دیر مجھے رکشہ یا ٹیکسی کا انتظار کرنا پڑا اس کے بعد میں جا کے مجھے ٹیکسی ڈرائیور سمیت

میں اپنے مخصوص انداز میں اپنی جگہ پر اتر قبرستان میں داخل ہوا اور حسب معمول مجھے وہ قبر یاد آگئی۔ تب اچانک میں اچھل پڑا آج پھر اس قبر سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اور پھر کوئی پندرہ چنگاریوں کے درمیان سے پرواز کرتا ہوا اڑا۔

ممکن ہے یہ چمکا ڈھوس لیکن بہر صورت اندھیرے کی وجہ سے مجھے نظر نہیں آ سکا تھا۔ لیکن میں نے اس سائے کو بہ خوبی دیکھ لیا تھا۔ کیونکہ چاند نکلا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نے اختیار اس کی جانب بڑھ گیا۔

اور اس سے تھوڑے فاصلے پر پہنچ کر رک گیا وہی ویران سا چہرہ، وہی لباس، وہی کمرے پال، عجیب سا غم میں ڈوبا ہوا ویران سراپا۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی جس سے میں محسوس ہوا کہ وہی گرا۔

کافی دیر تک میں اسی طرح کھڑا رہا۔ شاید آج اس نے میرے قدموں کی چاپ بھی نہیں سنی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی اس قبر کی جانب نکلتی رہی اور پھر جب اسے میری موجودگی کا احساس ہوا تو وہ دہشت زدہ ہو کر کھڑی ہو گئی اس نے خوف زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا اور نہ جانے کیوں مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر

ٹھیک ہی تو ہے خواہ کسی کے مسئلے میں الجھ کر کیا کرنا بلا وجہ میں ایک ایسی پر اسرار تہ سے شناسائی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جو کسی بھی طور ممکن نہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ میرے لیے نقصان دہ ہی ثابت ہو خواہ خواہ کسی روح کو زیادہ پریشان کرنا مناسب بھی نہیں ہوتا۔

لیکن جہاں تک مسئلہ راستے کا تھا۔ مجھے اس گندی گلی سے گزرتے ہوئے سخت دشت ہوتی تھی۔ چنانچہ راستہ ترک کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ میں نے سوچ لیا کہ آئندہ اگر وہ مجھے نظر آئی تو میں اس سے کتر اگر گزرنے کی کوشش کروں گا۔ خواہ خواہ کسی پر بار بننے سے فائدہ؟ کیوں الجھا جائے۔

البتہ گھر میں بیٹھ کر میں نے ایک بات اور سوچی تھی۔ وہ یہ کہ پچھلی بار جب وہ مجھے ملتی تھی تو وہ دن بھی آج ہی کا تھا اور آج بھی وہی دن ہے ممکن ہے وہ دھتے میں صرف ایک بار نظر آئی ہو۔ لیکن بہر صورت یہ اسرار ایسا تھا۔ جسے جاننے کے لیے ذہن بے چین تھا۔ اب نہیں جان سکتا تھا۔ تو یہ بات دوسری تھی۔ یوں بھی بہت سارے مسائل ہماری زندگی میں ایسے آتے ہیں جن کی توجہ ہمیں نہیں مل سکتی۔ ہم ان کے لیے پریشان ضرور رہتے ہیں۔ لیکن ہم انہیں حل نہیں کر سکتے اور بعد میں آہستہ آہستہ بھول جاتے ہیں۔

چنانچہ میں بھی بھولنے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے سوچا کہ اس مسئلے کو ہی اپنے ذہن سے نکال دوں گا کوئی معاملہ مجھے اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

یوں مزید دن گزرتے رہے۔ غالباً اس واقعے کے پانچویں دن کی بات ہے کہ تنویر صاحب سے میری ملاقات ہوئی اور تنویر صاحب نے مجھے ایک بہت ہی افسوس ناک خبر سنائی۔

”بھئی ناصر جمال ایک بات سنو۔“

”ہاں تنویر بھائی کہیے۔“ میں نے ادب سے کہا۔

”نہایت ہی غم ناک خبر ہے۔“ تنویر صاحب نے کہا اور میں چونک پڑا تنویر صاحب جس طرح پشمرہ نظر آ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے شدید افسوس ہوا اور میں بولا۔

”کیا بات ہے تنویر صاحب۔“

”میرا تاج دلہ شام نگر کر دیا گیا ہے۔“

”شام نگر؟“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”ہاں اچانک ہی مجھے اطلاع ملی ہے۔“

”لیکن اچانک کیوں؟“

”بس میں نہیں جانتا ناصر میاں اس اطلاع کے دو تین دن

میں روز روز کی الجھن اور تجسس سے نجات چاہتا ہوں۔“ وہ تو ٹھیک ہے لیکن دوسرے کے مسائل سے اس قدر دلچسپی رکھنا بھی اچھی بات نہیں ہے۔“ اس نے کسی قدر خشک لہجے میں کہا۔

”آپ نے بالکل درست کہا۔ مجھے قاعدے سے خاموش ہو کر سنجیدہ ہو جانا چاہیے کیونکہ آپ نے مکمل طور پر مجھے اپنے مسائل سے نکال دیا ہے اور یہ درست بھی ہے اس طرح اگر انسان سب کو دوست بناتا پھرے سب پر بھروسہ کرے تو اسے بہت زیادہ آسانیاں نہیں بلکہ بعض اوقات مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہر صورت میں نے آپ سے اپنی الجھن کا حل مانا تھا۔ اگر آپ مجھے کسی قابل نہیں سمجھتے تو ظاہر ہے میں کسی بھی طور آپ کو پریشان نہیں کر سکتا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”براہ کرم جناب آپ ناراض نہ ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ البتہ آپ خود سوچیں کہ میں آپ کو اپنے بارے میں بتا کر کیا کروں گی۔ یہ میری اپنی الجھن ہے جس کا سو فی صدی میری ذات سے تعلق ہے۔ میں اس میں کسی دوسرے کو کیسے ملوث کروں، کروں بھی تو کس حیثیت سے؟

ہم لوگ تو ایک دوسرے کے نام سے بھی نا آشنا ہیں اتنے اجنبی ہیں کہ ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ بلا وجہ آپ کو میری الجھن میں شامل ہو کر پریشانی و پشیمانی ہی ہوگی۔ کیونکہ میری الجھن کا حل کسی دوسرے کے پاس نہیں ہے میں جو کچھ ہوں اس قدر ہوں کہ اب کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی۔ براہ کرم مجھے جانے دیں یا تو آپ اس طرف کا راستہ ترک کر دیں یا اس بارے میں سوچنا چھوڑ دیں۔“

”میں شرمندہ ہوں کہ آپ کو اپنے مسائل سے آگاہ نہیں کر سکتی۔“ اس نے کہا اور تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی قبرستان کے داغی دروازے سے باہر نکل گئی۔

میں حسب معمول خاموش کھڑا اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر میری جانب نہیں دیکھا تھا۔

نہ جانے وہ کہاں چلی جاتی تھی۔ بہر صورت اتنا اندازہ تو مجھے تھا کہ وہ جس طرف جاتی تھی۔ قبرستان کی اس سمت کسی سواری وغیرہ کا ملنا ناممکن ہی بات تھی۔ وہ کہیں باہر نہ جاتی ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی قبر بھی کہیں قریب ہی موجود ہو اور وہ خاموشی سے اس میں رو پوش ہو جاتی ہے۔

بہر حال میں دل میں ایک افسردگی اور تجسس لیے گھر واپس آ گیا اور اس کے بعد میں نے سوچا۔

ہے۔ یہ ہو سکتا ہے شام نگر جانے کے بعد دوبارہ یہاں آنے کی کوشش کی جائے اور کوئی کام بن جائے۔ لیکن فی الحال تو نوکری کو برقرار رکھنے کے لیے جانا ضروری ہے۔

”آپ چھٹی کی درخواست کیوں نہیں دے دیتے۔ تو یہ بھائی؟“ میں نے اچھے ہوئے انداز میں کہا۔

”دیکھو بھئی یہ افسروں کی خاصیت مول لینے والی بات ہوگی۔ میری زندگی میں اس قسم کے واقعات بہت کم آئے ہیں کہ میں نے کہیں حکم عدولی کی ہو میرا ریکارڈ بالکل صاف ہے چنانچہ میں نہیں چاہتا کہ اب اتنی طویل سروس کے بعد کوئی ایسی راہ اختیار کر لوں جس سے میری نیک نامی پر کوئی حرف آئے چنانچہ مجھے جانا ہوگا۔“

”جی۔“ میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ بہر صورت میرا دل غم و اندوہ میں ڈوب رہا تھا۔ اس رات تو یہ صاحب نے مجھے گھر نہ جانے دیا۔ دوسرے دن میں نے بینک سے بھی چھٹی کی اور تو یہ صاحب کی روانگی کی تیاریاں کرنا رہا۔

بھائی کی بار بار چٹائی تھی۔ بچے بھی مجھ سے بہت مانوس تھے اور سلطانہ بھی۔ سلطانہ کو میری کیفیت کا اندازہ ہو گیا تھا کہ میں ان لوگوں کو کس طرح چاہتا ہوں چنانچہ اس کا انداز میں بھی ایک بہن کی کیفیت شامل ہو گئی تھی اور وہ بھی مجھے ایک بھائی ہی کی طرح چاہتی تھی۔

میں ٹوٹ گیا تھا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں ان لوگوں کے جانے کے بعد تو زندگی بالکل ہی ویران ہو جاتی چنانچہ میں سخت پریشان تھا۔ لیکن بہر حال یہ کڑوی گولی تو لگانا ہی تھی۔

میں ان لوگوں کو اسٹیشن پر چھوڑنے بھی گیا۔ بھائی نے رورو کر مجھے بہت سی ہدایتیں بھی کی تھیں اور یہ بھی کہا تھا کہ چند ماہ کی چھٹی لے کر شام نگر آ جاؤ اور ان کے پاس رہو میں نے وعدہ بھی کر لیا تھا۔

لیکن چھٹی کا مسئلہ ذرا ٹیڑھا ہی تھا۔ بہر صورت ابھی چھٹی ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ یہ لوگ چلے گئے اور میں ویران ہو گیا۔

کئی دن تک دل نہیں لگا تھا۔ سخت پریشان تھا کہ کیا کروں کس سے ملوں دفتر کے دوسرے لوگ تھے۔ لیکن تو یہ صاحب کا بدل کوئی نہیں تھا اور نہ ہی کسی سے میرے ایسے تعلقات تھے۔ بس گھڑی دو گھڑی دل بہلا لیتا تھا۔ سارے معاملات درہم

کے اندر اندر جا کر چارج سنبھالنا ہے۔ یہ آرڈر بھی بینک کی طرف سے دیا گیا ہے۔

”لیکن بالکل غیر متوقع طور پر؟“

”ہاں بھئی کیا کیا جا سکتا ہے۔ سارے ہندوستان بھی کر دیے گئے ہیں۔ یعنی شام نگر جانے اور وہاں میری رہائش کا انتظام بھی ہو گیا ہے۔ وہاں مکمل طور پر مجھے انچارج بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔“

”اوہ تو یہ صاحب! میرے لیے واقعی یہ بہت دردناک خبر ہے۔ اس شہر میں آپ لوگ اتنے اچھے غم گسار ہیں کہ میری زندگی واقعی معمول پر آ گئی ہے۔ اب میں پھر بھٹک جاؤں گا۔“ میں نے پریشانی سے کہا۔

”مجھے بھی افسوس ہے ناصر لیکن تم ہی بتاؤ میں کیا کروں کوئی ترکیب بھی نہیں ہو سکتی اپنے طور پر کوشش کر رہا ہوں۔“

”لیکن اس کی اطلاع آپ کو کب ملے گی۔“

”کل شام کو لیکن میں نے اس لیے تذکرہ نہیں کیا تھا کہ میں کوشش کر لیتا چاہتا تھا کہ کبھی بھی طرح سے تبادلہ رک جائے۔ لیکن آج چیئر مین کے آفس میں مجھے طلب کر لیا گیا اور یہ آخری ہدایت جاری کر دی گئی کہ میں زیادہ سے زیادہ کل تک روانہ ہو جاؤں چونکہ تین دن کے اندر مجھے چارج لینا ہے۔“

میں سخت پریشان ہو گیا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی بھرا پرا گھرا جگہ ہو۔ میرا تو اور کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ تو یہ صاحب کا گھر تو میرا ایسا معمول بن گیا تھا کہ اب ان کے گھر کے بغیر زندگی گزارنا ہی مشکل معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ میں نے نہایت پریشان لہجے میں تو یہ صاحب سے کہا۔

تو یہ بھائی۔ میں خود بھی شام نگر آنے کی کوشش کروں گا۔ آپ لوگوں کے بغیر تو اب میرا دل نہیں بھی نہیں لگ سکتا۔ گویہ ایک بڑا شہر ہے لیکن تو یہ صاحب آپ کو معلوم ہے کہ میں اس وسیع و عریض شہر میں صرف آپ تک محدود ہوں۔

”ہاں ناصر مجھے یقین ہے لیکن میرے بھائی مجھے بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کروں۔ بچوں کو پالنے کے لیے سب کچھ ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں۔“

”ہاں۔“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

اور اس شام گھر کا ماحول بھی بے حد غم ناک رہا تو یہ صاحب نے یہ تفصیل گھر میں بھی بتا دی تھی۔ بھابھی اور گھر میں موجود دوسرے افراد بھی بے حد پریشان ہو گئے تھے۔

بہر صورت تو یہ صاحب نے کہا کہ سامان باندھا جائے اور تیاریاں کی جائیں۔ جانا تو ہے ہی جو کچھ ہوگا۔ اب تو بھگتنا ہی

سے خاصا مختلف بس ایک اجنبی سی دنیا تھی۔ جہاں چروں کے مصنوعی پردے الفاظ کی شکل تو رکھتے تھے۔ لیکن ان پر سے جھانکنا بہت ہی مشکل تھا۔ میک اپ سے تھڑے ہوئے مختلف رنگتہ چہرے۔ چروں کے بارے میں سنا جی تھا کہ ان چروں کے پیچھے بڑی ویرانی ہوتی ہے۔ لیکن آخر وہ ان ویران چروں پر اس قدر شک کیسے سجالیتی ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ مجھے بہر صورت یہ ایک دلچسپ مشغلہ محسوس ہوا پھر تو میں اکثر سراج کی خوشامدیں کرنے لگا۔ سراج خود بھی عادی بجرموں میں سے تھا۔ تقریباً ہر لوگ روزانہ ہی جاتے تھے۔ حالانکہ اس کے گھر والے بھی تھے۔ بیوی بچے بھی تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس کا دل اپنے گھر میں نہیں لگتا تھا۔ اور وہ روزانہ رات کو کسی نہ کسی بالا خانے میں موجود ہوتا تھا۔ گانا سنتا۔ کسی پر خرچ کرتا اور واپس چلا آتا۔

حالانکہ اس کے وسائل اتنے نہیں تھے۔ لیکن مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ کچھ اور بھی اوپر کے کام کرتا تھا۔ جن سے اس کی آمدنی بہت بڑھ جاتی تھی۔ اس نے مجھے بھی اس کا مشورہ دیا۔ لیکن میری سمجھ میں اس کی بات نہ آ سکی۔ بہر حال میں اس کے اخراجات بھی اٹھانے لگا۔ جلد ہی وہ اور میں گہرے دوست بن گئے میری جتنی خواہ تھی اس میں سے خرچ بھی سب کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اب تک خوبرو صاحب نے میرا بہت سا خرچ سنبھالا ہوا تھا اور یوں میں کافی رقم پس انداز کر چکا تھا اور اس پس انداز رقم کا اب ہم صبح استعمال کر رہے تھے۔

سراج نے مجھے جگہ جگہ بلکہ یوں بھنسا چاہیے کہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پلایا تھا۔ بہت سارے لوگوں سے میری شناسائی ہو گئی تھی۔ میری مراد ان لوگوں سے ہے جو رات کو جاگنے والے ہوتے ہیں۔

مشغلہ وہی تھا۔ بارہ بجے بالا خانے پر اور اس کے بعد اپنے گھر۔ لیکن میں اترا ہی جگہ تھا یعنی قبرستان کے ٹوٹے ہوئے دروازے پر جہاں سے ہو کر میں اپنے گھر جاتا تھا۔ اس کے بعد بھی کئی بار میرے ذہن میں اس صبح لڑکی کا خیال آیا۔ لیکن وہ مجھے نظر نہ آ سکی۔ نہ جانے اس نے اپنا مشغلہ ترک کر دیا تھا یا پھر وہ ایسے وقت آتی تھی جب میں وہاں نہ ہوتا تھا۔

خاص طور سے میں اسے اس دن وہاں ضرور تلاش کرتا تھا جس دن وہ پہلی اور دوسری بار مجھے نظر نہ آئی تھی۔ لیکن میری کوششوں کے باوجود بھی ان دنوں قبریں رات بھر خالی رہی تھیں اور وہ مجھے نظر نہیں آتی تھی۔

برہم ہو کر رہ گئے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں میں؟ کبھی کہیں تو کبھی کہیں۔ کبھی پارک میں چلا گیا۔ کبھی سنٹرل کے کنارے چلا گیا۔ بس اسی قسم کی تفریحات میں وقت گزارتا رہا۔ سوچا کہ زندگی میں کوئی ایسی تبدیلی ضرور آنا چاہیے کہ کوئی راستہ نظر آئے لیکن اس سلسلے میں بھی میرا ذہن نا کارہ تھا۔ سخت پریشان ہو گیا تھا۔ یہ تہنایی..... کہاں ڈیوڑوں اس کو میں اکثر سوچتا تھا۔

تو یہ صاحب کے کئی خط آچکے تھے۔ بھابھی نے بھی مجھے کئی بار خط لکھے تھے وہ سب مجھے بے حد یاد کرتے تھے۔ سو میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں شام نگر چلا جاؤں۔ دفتر میں چھٹی کی درخواست دی۔ لیکن خلاف توقع نا منظور ہو گئی۔ تب میں اور زیادہ پریشان ہو گیا۔

ایک دن سراج نے مجھ سے پوچھا "سراج میرا آفس کولیک تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں اتنا پریشان کیوں ہوں بڑا بے تکلف سا آدمی تھا۔ چلا پڑو تو جوان تھا۔ بہر صورت میں تو زندگی سے بے زاری تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کن حالات سے دوچار ہوں کیا کیفیت ہے میری اور وہ تہنہ دار کہنا۔ "ارے واہ۔ تہنایی دور کرنا تو اس سا مشکل کام ہے یار..... اور پھر تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"بس یہی ایک سوال ہے جو دنیا کرتی ہے میرے مسائل سے کسی کو آگاہی نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں شادی کیوں نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔

"وہ خیر شادی کے علاوہ بھی بہت سارے مسئلے ہیں۔ جن سے آدی تہنایی محسوس نہ کرے۔" سراج نے مسکرا کر ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

"مشال؟"

"چلو گے؟" اس نے پوچھا۔

"کہاں۔"

"بس جہاں میں کہوں۔ دل لگے تو ٹھیک ہے ورنہ آگے تہنہاری مرضی جاؤ یا نہ جاؤ۔"

"ٹھیک ہے یار چلو۔" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"اور اس رات سراج مجھے اس جگہ لے گیا جس کے بارے میں میں نے بہت کچھ سنا تھا۔ جہاں دن سو تے ہیں اور راتیں جاگتی ہیں۔

ایک عجیب و غریب ماحول تھا۔ ناچنے گانے والوں کا سا۔ فلموں میں جو کچھ دیکھا تھا یا کہانیوں میں جو کچھ پڑھا تھا۔ اس

اکثر سوچتا رہتا ہوں۔ میں شدید الجھن کا شکار ہوں۔ میں تمہارے بارے میں سب کچھ جانتا چاہتا ہوں۔ سنو اگر تم نے مجھے اپنے بارے میں نہیں بتایا تو میرا مانگ پھٹ جائے گا۔ کیا تم میری الجھن کو ختم نہیں کر سکتی؟“

”دیکھیں جناب میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ دوسروں کے مسائل میں زیادہ دلچسپی کا اظہار بہتر نہیں۔“

”میں جانتا ہوں اگرچہ یہ بات آپ پہلے بھی کہہ چکی ہیں۔ لیکن خاتون میں نے بتایا کہ میں آپ کی طرف سے شدید الجھن کا شکار ہوں ایک انسان ہونے کے ناطے سے آپ میری یہ الجھن دور کر سکتی ہیں۔ میں اکثر آپ کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ سو میں ایک تنہا انسان ہوں بالکل تنہا دنیا سے بیزار اس پوری دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتا چاہتا ہوں۔ میں اتنی سخت الجھن کا شکار ہوں کہ تم سے بیان نہیں کر سکتا اور اگر تم نے اب بھی اسی طرح اہتجاج برتا تو یقین کر دو کہ اس پوری دنیا سے میرا اہتجاج ختم ہو جائے گا تم جو کوئی بھی ہو اگر زندہ ہو تو اور اگر زندہ نہیں ہو تو کم از کم اپنے بارے میں بتا دو۔ تاکہ میرے دل کی یہ خلش لٹ جائے۔“

”عجیب انسان ہیں آپ۔ نجانے آپ میرے بارے میں جاننے کے اس قدر خواہش مند کیوں ہیں؟“

”بس خاتون کہاں اس کا کوئی گہرا مقصد نہیں ہے۔“

”آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟“ اس نے اس لیے لہجے میں کہا۔

”بس میرے ذہن کا تجسس ختم ہو جائے گا۔ براہ کرم اس سلسلے میں آپ میری مدد کیجئے۔“ میں نے کہا۔

”انسان کتنا خود غرض ہے۔ اپنی الجھنوں سے ہلکا کرانے کے لیے دوسرے لوگوں کی ذہنی الجھنوں کو وسیع کر دیتا ہے۔ اپنے ذاتی مفاد کے لیے۔ دوسرے کے کچلے جانے کی پروا نہیں کرتا۔“ اس کا لہجہ بے پناہ سپاٹ اور دیران تھا۔

میں ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ چھوڑوں مجھے کیا پڑی ہے۔ لیکن پھر میں نے ایک اور فیصلہ کر لیا۔

میں نے سوچا کہ ٹھیک ہے اس وقت وہ نہ صرف مجھے خود غرض ثابت کر رہی ہے بلکہ مجھے بہت کچھ کہہ رہی ہے۔ یہ سب باتیں مجھے سنی چاہئیں۔ صرف اور صرف اس کا ماضی جاننے کے لیے۔ اس کا قبرستان میں رات کو اس طرح تنہا آنا کس بات کی نشان دہی کرتا ہے اس کے لیے..... اور جناب

لیکن پھر ایک رات یوں ہوا کہ سراج کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی اور وہ میرے ساتھ بالا خانے کی طرف نہ جا سکا۔ اسے سخت بخار تھا۔ تب اس نے معذرت کر لی اور کہا کہ اگر میرا دل چاہے تو میں اکیلا چلا جاؤں۔“

لیکن میں نے تنہا جانا پسند نہیں کیا۔ ابھی کچھ جھجک باقی تھی۔ سراج کی موجودگی اس جھجک کو کم کر دیتی تھی۔ سو میں نے بالا خانے کا خیال ترک کر دیا اور میں نے گھر واپس چلنے کی سوچی۔ چنانچہ میں گھر کی طرف چل پڑا لیکن اس طرف کا راستہ شاذ و نادر ہی کوئی استعمال کرتا تھا۔ چنانچہ قبرستان کے راستے داخل ہو گیا۔

اور پھر اتفاقاً یہ طور پر میری نگاہ اس طرف اٹھ گئی جس طرف وہ قبر تھی۔ میں نے دیکھا وہ وہاں موجود تھی۔

قبر میں چنگاریاں نہیں تھیں۔ لیکن وہ اسی طرح خاموش اور ویران سا چہرہ لیے بیٹھی تھی۔ نہ جانے کیوں میرے ذہن میں ایک بالکل سی پید ہو گئی۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس سے آج دو دو تھک کر رہی ہوں۔

چنانچہ میں اس کی جانب چل پڑا آج میں جان لینا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے۔ قبرستان کیوں آئی ہے؟ اور خاص طور سے اتنی رات گئے۔ جب کہ کوئی لڑکی جو کسی شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہو اتنی رات گئے نلکے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اس روز چاند بھی ابتدائی دنوں کا تھا اور روشنی پھیل چکی تھی۔ اس کا چہرہ جتنا صاف آج میں نے دیکھا تھا۔ اس سے پہلے میں نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھونچکا سی کھڑی ہو گئی اس کی نگاہیں میری جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

میں اس کے سامنے خاموش کھڑا ہو گیا اور وہ بھی میری جانب خاموشی سے دیکھتی رہی پھر میں نے عجیب سے انداز میں کہا۔

”کیا آج بھی تم مجھے مایوس کر دو گی؟“

”میں نہیں سمجھی۔“

”دیکھو میں روزانہ تمہیں تلاش کرنے یہاں آتا ہوں میرا خیال ہے کہ یا تو تم نے یہاں آنا ہی چھوڑ دیا تھا یا پھر تم نے اپنا وقت بدل لیا ہے۔ آخر کیوں؟“

”دیکھئے ہم دونوں ایک دوسرے سے قطعی طور پر ناواقف ہیں اور ایک دوسرے کے لیے ابھی میں کیا ہی مناسب ہے کہ ہم اتنی بے تکلفی کے ساتھ ایک دوسرے سے گفتگو کریں۔“

”بالا یہ مناسب نہیں ہے لیکن سنو میں تمہارے بارے میں

میری ماں سے ہٹ کر میری جانب اٹھنے لگیں۔ میری ماں مجھے اپنے سایہ عاطفت میں رکھنا چاہتی تھی۔ رہ مجھے بری لگا ہوں سے زور رکھنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرا باپ غیرت اور حیرت کے لفظ سے نا آشنا ہو چکا ہے۔ گھر میں آنے والے مردوں سے اسے کوئی عار نہیں تھی۔ بلکہ وہ اسی کوشش میں رہتا تھا کہ ان میں سے کوئی میری ماں کو پسند کرے اور اس کی جیب گرم ہو جائے۔

میری ماں انتہائی بدبختی کی زندگی گزار رہی تھی۔ حتیٰ کہ وہ سخت بیمار ہو گئی۔ لیکن اس کی بیماری کا بھی میرے باپ کو کوئی خیال نہیں تھا۔ وہ صرف دولت حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ میں بھی ان معاملات کو اچھی طرح سمجھنے لگی تھی۔

ہمارے گھر برسہا برس سے بڑے لوگ آتے تھے۔ ان کی نگاہوں میں کیا کیا تھا۔ ناصر صاحب اس کی تفصیل بتانا بے کار ہے لیکن اب ان سب کی نگاہیں میری ماں کی طرف سے ہٹ کر مجھ پر پڑنے لگیں تھیں۔

گو ابھی میری عمر زیادہ نہیں تھی لیکن میرے باپ کو سوس طرح کے مشورے دیے جانے لگے۔ یہاں تک کہ ایک شخص نے اس سے کہا کہ اگر مجھے اس لڑکی کی طرف ڈال دیا جائے تو ممکن ہے میں فلم انڈسٹری کی طرف نکل جاؤں اور فلم انڈسٹری میں کام کرنے کے بعد سارے دلدور دور ہو سکتے ہیں۔

میرے باپ کو یہ تجویز بہت پسند آئی اور اس نے اس شخص سے درخواست کی کہ مجھے اس سلسلے میں مزید تفصیلات بتائی جائیں۔

چنانچہ پہلی بار مجھے ایک اسٹج ڈرامے میں حصہ لینا پڑا ابتدا میں یہ سب کچھ مجھے بھی برائیں لگا تھا۔ لیکن جب میرا باپ دھڑا دھڑا اسٹج ڈرامے کنٹریکٹ کرنے لگا اور مجھے اسٹج پر آ کر مختلف لوگوں کے ساتھ بار بار مشق و محبت کا ناک کھیلنا پڑا تو اس وقت مجھے احساس ہوا کہ یہ سب لوگ جو مجھے اتنے پر جوش انداز میں دیکھتے ہیں۔ باہر نکل کر میرے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے۔ تب ہی مجھے احساس ہوا کہ میں جن راستوں پر چل رہی ہوں۔ وہ اچھے راستے نہیں ہیں۔

چنانچہ میں سارے اپنی ماں سے اس بات کی شکایت کی کہ طرح طرح کے لوگ میرے قریب آتے ہیں۔ اس قسم کے مذاق کرتے ہیں کہ میں پریشان ہو جاتی ہوں۔ میرا دل یہ کام کرنے کو نہیں چاہتا۔ تب میری ماں سمجھ گئی۔

اس نے میرے باپ سے کہا کہ مجھے اس لڑکی میں کام

میں ڈھیٹ بن گیا اور اس کی کہانی سننے پر اصرار کرنے لگا۔ وہ گردن جھکا کر کچھ سوچ رہی تھی۔ ٹھوڑی دیر بعد اس نے گردن اٹھائی اور بولی۔

”بیٹھ جائیے۔“

اور اس کا یہ انداز مجھے بے پناہ بھلا محسوس ہوا اور میں اس کے سامنے ہی ایک قبر کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی مجھ سے ٹھوڑی فاصلے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ تب وہ میری جانب دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

”آپ کا نام کیا ہے جناب۔“

”میرا نام ناصر جمال ہے۔“

”خوب۔ بہر حال میں آپ کو اپنی کہانی سنارہی ہوں۔“ اور میں ہمت نہ کٹھ گئی۔

”میں ایک ستم رسیدہ لڑکی ہوں۔ نام بتانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ آپ میرا کوئی بھی نام تصور کر لیں۔ درمیانے درجے کے طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ اپنے والدین کی تنہائی تھی۔ میری ماں کا کہنا تھا کہ میرا باپ ایک محنت کش انسان تھا۔ اچھے عزائم بھی رکھتا تھا۔ اس کے دل میں اولاد کی آرزو بھی تھی۔ لیکن میری ماں کے ہاں میرے علاوہ کوئی اولاد پیدا نہ ہوئی۔ اسے بیٹی کی بڑی آرزو تھی۔ لیکن اس کی قسمت میں کوئی بیٹا نہ تھا۔ ان کی قسمت میں صرف میں تھی جو ان دونوں کے لیے معمولی حیثیت رکھتی تھی۔

رفتہ رفتہ میرا باپ حالات سے بد دل ہوتا چلا گیا نہ جانے اس کا پس منظر کیا تھا۔ اس کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتی۔ لیکن مجھ سے اس کی جب بھی اس مسئلہ پر بات ہوئی اس نے یہی کہا کہ چونکہ اس کا کوئی بیٹا نہیں ہے اس لیے اس کا بڑا بھائی بے حد تنگ ہے۔ چنانچہ اس نے میری ماں کے ساتھ بہت برا سلوک کرنا شروع کر دیا۔ اس کے پس پردہ صرف بیٹے کی خواہش تھی۔ میری ماں میرے باپ کو کوئی بیٹا نہ دے سکی۔ اس لیے وہ بری طرح جھنجھلا گیا تھا۔ میرا باپ شراب پیتا تھا، جوا کھیلتا تھا اور اکثر بڑے لوگ ہمارے گھر آتے رہتے تھے۔

حتیٰ کہ میرا باپ شراب اور جوس سے آگے بھی چل نکلا اس نے بہت برا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ وہ میری ماں کو اپنی کمائی کا ذریعہ بنانا چاہتا تھا تا کہ اس کے بڑھاپے کے لیے کچھ پس انداز ہو جائے نہ جانے کیوں اسے اپنے بڑھاپے کی اتنی فکر تھی۔

اس ماحول میں میں جوان ہو گئی اور میرے باپ کی نگاہیں

کرتے نہیں تھے۔ یین اس سے پہلے میرے باپ کے
میری ماں کو اس قدر مارا کہ وہ بے ہوش ہو گئی وہ بالکل درندہ
صفت ہو گیا تھا۔ میرے ذہن میں اس قسم کی بات بھی نہ آ سکتی
تھی کہ ایسے باپ بھی ہوتے ہیں۔ میرا باپ مجھے وحشی درندہ
محسوس ہونے لگا۔ جس کی خوشخوار نگاہیں ہر لمحہ میرا تعاقب کرتی
تھیں۔

اگر اس کے کسی بھی حکم سے ذرا بھی سر تابی کی جاتی تو وہ گھر
میں قیامت برپا کر دیتا تھا۔ ماں تو اب اس قابل ہی نہ رہی
تھی۔ اس نے بہر حال میرے بارے میں بہتر انداز میں
سوچا۔ لیکن وہ بد نصیب میرے لیے کچھ نہ کر سکی۔ کچھ بھی تو اس
کے بس میں نہیں تھا۔ اب تو وہ بول بھی مشکل ہی سے سکتی تھی۔
ہر وقت خون ٹھوکتی رہتی تھی۔

میں اپنے کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد صرف اپنی ماں
کی بیمار داری کرتی تھی۔ ماں اکثر مجھ سے کہتی تھی کہ وہ مجھ سے
از حد شرمندہ ہے کہ مجھے پیدا کرنے کے بعد وہ میری صحیح طرح
تر بیت نہیں کر سکی۔ میں اپنی ماں کو دلاسا دیا کرتی تھی۔ لیکن میرا
دل خود بھی روتا رہتا تھا۔

میں اپنی طرح کی لڑکیوں کو دیکھا کرتی جو اسکول جایا کرتی
تھیں، پڑھتی تھیں، عیش و آرام سے زندگی بسر کیا کرتی تھیں اور
اس کے بعد جب ان کے ماں باپ انہیں بیاہ کر دوسرے دہس
بھیج دیتے تھے تو خوش خوشی گھر کی زندگی گزارتی تھیں۔
میرے دل میں بھی یہی خواہش تھی کہ میں بھی ایسی ہی گھریلو
اور شریف عورت کی سی زندگی بسر کروں اور میری یہ خواہش
شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی۔ لیکن میرے باپ کی خواہش
بھی شدید سے شدید تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

نہ جانے کیسا باپ تھا۔ میں نے تو وہ باپ بھی دیکھے تھے جو
بیٹوں کے سروں کو اپنی پھٹی پرانی چادروں سے ڈھکتے تھے۔
بیٹیوں کی جوانی کے سامنے سینہ پیر ہوتے تھے۔ اور ایک میرا
باپ تھا۔ جس نے خود میرے سر سے چادر اتار دی تھی۔ جس
نے انڈیا پر دنیا کے سامنے ننگے ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس
نے پھرے بازار میں میری چادر اتاری تھی اور اب وہ چاہتا تھا
کہ میں زیادہ سے زیادہ کماؤں تاکہ ایک عمدہ سا گھر لیا جاسکے۔
اس کے بعد کار..... اور اس کے بعد نہ جانے کیا کیا.....؟“

اور اس طرح کمانے کے لیے بہت سارے لوگ مجھے سہارا
دینے کے لیے تیار تھے اور انہوں نے میرے باپ کو اس سلسلے
میں خوش کش بھی کی تھیں۔

وہ میری مجبوریوں کو نبھے۔ مجھے بتائے کہ میں اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں صرف اپنی بیمار ماں کی وجہ سے مجبور تھی۔

لیکن نوید بہت سخت پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے کہا کہ آخر وہ بھی تو انسان ہے اس کے دل میں بھی خواہشات ہیں۔ نہ جانے کب میرے والد مجھے چھوڑیں گے اور نہ جانے ماں کی زندگی مجھے نوید کی زندگی میں آنے بھی دے گی یا نہیں۔ اس لیے وہ شہر چھوڑ رہا ہے۔ کیونکہ میں صرف اپنے لیے سوچتی ہوں نوید کے لیے نہیں۔

نوید کو سمجھانے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی تھی۔ بہر صورت وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ خودکشی کر لے گا۔ لیکن میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات نہیں تھی کہ نوید نے جو کہا ہے وہ کبھی لے گا۔

اور پھر تقریباً تین یا چار روز تک نوید مجھے نڈل سکا میں دیوانی سی ہو گئی تھی۔ باہر نکلنے کی ہر کوشش ناکام تھی میرے والد مجھے اس کا موقع ہی نہ دیتے تھے کہ میں تنہا کہیں باہر جاؤں اور میں نوید کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے بے چین تھی۔ پھر ہوا یوں کہ ایک اسٹج شو ہونے والا تھا اور اس کے لیے مجھے تھوڑی سی آزادی مل گئی..... میں سب کچھ بھلا کر نوید کی تلاش میں نکل گئی۔

پہلی روح فرسا خبر جو مجھے ملی تھی وہ نوید کی خودکشی تھی۔ ہاں نوید نے خودکشی کر لی تھی وہ دیوانہ اس بات پر اس طرح سے اڑ گیا کہ اس نے جو کہا تھا وہ روکھا یا میں نیم دیوانی ہو گئی اور پھر نہ جانے کس طرح سے مجھے گھر پہنچا دیا گیا۔

اب میں کچھ کرنے کے قابل نہ رہی تھی۔ نوید مر چکا تھا میری زندگی میں ایک چراغ روشن ہوا تھا اور وہ چراغ میرے ہی ہاتھوں گل ہو گیا تھا۔ میں سخت پریشان ہو گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ نوید کی یاد ہر وقت میرے دل میں چمکیاں لیتی رہتی تھی۔

مجھے اپنے باپ سے شدید نفرت ہو گئی اور اپنی ماں کی بیماری سے بھی۔ میں اب کسی کا پیٹ نہیں بھرتی تھی۔ اب میرے کسی کی بیمار داری نہیں کرتی تھی۔ میرے والد نے کئی بار اس سلسلے میں باراپنا۔ لیکن اب کسی بھی ڈرائے میں میں کام کرنے کو تیار نہیں تھی، یہاں تک کہ چند لوگ جب ڈرائے کے سلسلے میں ہمارے

لیے لیا گیا تک دور کرتا تھا۔ پھر ایک دفعہ میری نو۔ ملاقات ہوئی اور نوید پھوٹ کر۔ پڑا میں کیا کروں مجھے بتاؤ تم یہاں سے میرے ساتھ نکل چلوں گے میں تم سے شادی کر لوں گا۔ اس نے کہا۔ گو کہ میں یہ کر سکتی تھی بلاشبہ میرا باپ میرے لیے مصیبت بنا ہوا تھا۔

لیکن اس کے باوجود میں اپنی بیمار ماں کو کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ اس بے چاری کا کیا قصور تھا۔ میرا باپ اسے صرف میری وجہ سے زندگی سے دور کر دیتا تھا۔ اس لیے نوید کی بات پر میں آنسو بہانے کے سوا کچھ نہ کر سکی اور میں نے کہا۔

”مجھے بتاؤ نوید میں اپنی بیمار ماں کو کس طرح چھوڑ دوں؟“
”تم ماں کو نہیں چھوڑ سکتیں اور تمہارا باپ تمہیں نہیں چھوڑ سکتا مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟“

”تمہیں میری مجبوریوں کا خیال رکھنا چاہیے نوید۔“
”میں رکھنا چاہتا ہوں لیکن کس طرح مجھے بتاؤ۔ تمہارے باپ کو رومات فراہم کر کے میں یہ سب کچھ بھی کر سکتا ہوں لیکن میں نہیں اس کے چنگل سے بچانا چاہتا ہوں کیا تم پوری زندگی اپنے باپ کے ساتھ گزار سکتی ہو کیا تمہارا باپ قابل اعتبار ہے کہ میں تمہیں اس کے گھر میں چھوڑ دوں وہ کسی بھی وقت غلط سے غلط راستے کی طرف آ سکتا ہے اور اس وقت میری محبت میری غیرت کیا کہے گی۔“

نوید نے پریشان لہجے میں کہا۔ درحقیقت میرے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں شدید کشمکش کا شکار ہو گئی۔ باپ کے مظالم اور ماں کی بیماری میری زندگی عجیب سی ہو کر رہ گئی تھی کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میں شدید ترین اذیتوں کا شکار تھی۔

انہی پریشانیوں میں وقت گزرتا رہا۔ حتیٰ کہ نوید مجھ سے بد دل ہو گیا۔ میں اس سچ ڈراموں میں کام کرتی تو دوسرے لوگ میرے ساتھ کام کرتے اس وقت نوید دہشتی اذیتوں کا شکار ہوتا تھا۔ اس نے کئی بار مجھے منع کیا کہ میں اس سچ ڈراموں میں کام کرنا چھوڑ دوں جو کچھ مجھے وہاں ملتا ہے وہ مجھے فراہم کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ سب کچھ درست تھا۔ لیکن میں اپنے باپ کا کیا کرتی جو ان لوگوں سے فوری طور پر معاہدے کر کے رومات لے لیا کرتا تھا۔ یہاں تک نوید نے مجھے کہہ دیا کہ وہ یہ سہ چھوڑ دے گا۔

میں نے نوید کو سمجھانے کی کوشش کی میں نے اس سے کہا کہ

غضب اور نفرت میں ڈوبا ہوتا ہے میں اس سے پوچھتی ہوں کہ آخر اس نے میری زندگی کا سودا کیوں کیا۔ اسے کیا حق تھا کہ وہ خدا کی بخشی ہوئی روح پر مظالم کرتا اور شاید میری آہوں کا دھواں ہوتا ہے جو اس کی قبر سے چنگاریاں بن کر پھوٹتا ہے۔ اس کی روح چگاڑ کی شکل میں پھڑپھڑاتی ہوئی چاروں طرف دوڑتی ہے وہ اس آگ سے پریشان ہوتا ہے جو اس کے سارے وجود کو سلگاتی ہے۔ میں خوش ہوں کہ مرنے کے بعد اس سے انتقام لیا جا رہا ہے۔ ٹھیک ہے اس دنیا میں انسان بہت کچھ بن جاتا ہے۔ مگر وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ قبر کی گہرائیاں اس کی بے بسی کا انتظار کر رہی ہوتی ہیں آج بھی میں جب اس قبر پر آتی ہوں تو میرے دل میں شکوہ ہوتا ہے۔ فریاد ہوتی ہے..... اور خدا میری اس فریاد کا جواب دیتا ہے اور میرے باپ کی روح پھڑپھڑاتی رہتی ہے۔ اس کی قبر سے چنگاریاں بلند ہوتی ہیں۔

میں غم و اندوہ کا مجسمہ بنا۔ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔

”اور کچھ پوچھنا چاہتے ہو۔“

”نہیں..... اور کیا پوچھوں گا؟“

”تو اب مجھے اجازت ہے۔“

”میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“ میں نے درد سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ اب میں ان منزلوں سے گزر چکی ہوں۔ جب مجھے انسانی ہمدردیوں کی تلاش تھی۔“ اس نے کہا اور پھر وہ آہستہ آہستہ قبرستان کے ٹوٹے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ میں اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا تھا توڑی دیر بعد وہ حسب معمول میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی..... اور میں دل پر بے پناہ بوجھ لیے کھڑا گیا۔

اس رات مجھے نیند نہیں آئی تھی۔ اس کی کہانی عملی شکل میں میرے سامنے تھی۔ ایک بے بس و لاچار لڑکی..... آہ..... کیسی ویرانی بسی ہوئی تھی اس کی نگاہوں میں اور میں اس ویرانی کا راز پاچکا تھا لیکن انفس وہ روح تھی اور اس کے لیے میں کیا کر سکتا تھا۔

دوسری صبح میری طبیعت بھاری تھی۔ تصویر صاحب بھی نہیں تھے میرا کوئی ہمدرد نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے اگر یہ ملازمت چھوڑنا پڑی تو چھوڑ دوں گا..... اور بہاولپور جا کر ملازمت کر لوں گا کم از کم وہاں بھابی تو ہوں گی

ہاں آئے تو میں نے ان پر حملہ کر دیا اور دو ایک کے منہ نوچ ڈالے۔

میرے والد سخت پریشان تھے۔ ماں کی بیماری سخت تر ہوتی جا رہی تھی۔ ذریعہ آمدنی کچھ نہیں تھا اور اب فاتے ہوا کرتے تھے۔ ماں کی دوا کہاں سے آتی۔

میں ہر وقت نوید کو یاد کرتی تھی اور میرے باپ نے آخری بار میری ذات پر شدید ضرب لگائی۔

اس نے مجھے قتل کر دیا۔ ہاں اس نے مجھے قتل کر دیا۔ غیظ و غضب کی شدت سے دیوانہ ہو کر اس نے میرا وجود ہی ستم کر دیا..... اور میں مر گئی۔ ہاں میں مر گئی۔“ اس نے گردن جھکا لی اور اس کی آنکھوں سے آنسو نپٹنے لگے۔

میں شدت غم سے لنگ ہو گیا تھا۔ اس کی کہانی اتنی دلدرد تھی کہ میرے حواس جواب دے گئے۔ میں ساکت کھڑا رہا۔

آہ۔ میں اس مظلوم روح کے لیے کیا کر سکتا تھا۔ جو پوری زندگی..... شدید پریشانیوں کا شکار رہی اور پھر اس نے بے بسی کے عالم میں ہی جان دے دی۔

میرے ذہن میں یہ تصور بھی نہیں رہا تھا کہ وہ ایک بے جان ہستی ہے۔ میں سخت پریشان تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس روح کو سکون کس طرح بخشوں۔ تب کافی دیر ای طرح گزر گئی۔

اور جب اس نے گردن اٹھائی تو میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا وہ تک تک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

”تم بھی میرے لیے غمگین ہو گئے۔“

”ہاں میرا دل شدت سے تمہارے لیے تڑپ رہا ہے۔ کاش..... کاش تمہیں سکون مل سکتا۔“

”ہاں۔ میں ساری زندگی سکون کے لیے تڑپتی رہی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”مجھے کچھ اور باتیں بتاؤں گی۔“

”ہاں پوچھو۔“

”تمہاری ماں کا بھی انتقال ہو گیا۔“

”ہاں اور باپ کا بھی۔“ اس نے جواب دیا۔

”اوہ..... تمہارا باپ بھی مر گیا۔“

”ہاں۔ تم نے وہ قبر دیکھی ہوگی جس سے چنگاریاں بلند ہوتی ہیں۔“

”ہاں۔“

”میں جب بھی اپنے باپ کی قبر پر آتی ہوں تو میرا دل غیظ و

حیرت سے دیوانہ بنا اسے دیکھتا رہا تب اس کی دل دوز آواز ابھری۔

ہوس کو بے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو چینی کا مزہ کیا
اس کے ہونٹوں سے یہ دلدوز نغمہ ابھرتا تھا اور میں ویران
صحراؤں میں بھٹک رہا تھا۔ جہاں خزاں ہی خزاں تھی چاروں
طرف خشک درخت کھڑے ہوئے تھے ریت کے ذرات ہوا
سے اٹھ رہے تھے۔ ویرانہ ہر طرف ویرانہ۔
وہ بیٹھی میرے سامنے جھکی اور بولی۔

”بابو جی۔ آپ دوسروں کے ساتھ نہ جائیے۔“ سراج نے
مسکراتے ہوئے میری ران میں چٹکی لی تھی۔
”لو بھی تمہارے تو عیش ہو گئے۔“ وہ خاص طور سے
کاروباری اور تماش بین ٹانپ کا آدمی تھا۔ نہ جانے کیا سمجھا تھا
لیکن اس کے یہ الفاظ مجھے بہت برے لگے تھے۔ پھر جب
رقص کا وقت ختم ہو گیا تماش بین باہر جانے لگے تو سراج نے مجھ
سے کہا۔

”کیا خیال ہے جناب! آپ تو بس گئے۔“
”سراج تم جاؤ۔ میں آ جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔
”ہاں ہاں بھائی! دعوت مل گئی ہے۔ لیکن سرکار یہ دعوتیں تو
عام طور سے یہاں ملتی رہتی ہیں ان دعوتوں کے چکر میں زیادہ
نہ پھٹنا۔“

”سراج! پلیز تم جاؤ۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا اور وہ ہنستا
ہوا باہر چلا گیا۔ تب ناکہ قسم کی ایک عورت نے میری طرف
دیکھا اور بولی۔
”رکھیں گے بابو جی۔“

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا اور اس نے میرے آگے ہاتھ
پھیلا دیا۔ جو کچھ میری جیب میں تھا میں نے نکال کر اس کے
ہاتھ پر رکھ دیا۔ میں نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ میں نے اسے جو
کچھ دیا ہے وہ کیا ہے۔
بہر حال ناکہ مطمئن ہو گئی تھی چنانچہ اس نے اندر کی کو آواز
دی اور بولی۔

”شاہینہ ان کے ساتھ جائیں گی کمرٹیک کر دو۔“
میں نے پہلی بار اس کا نام جانا تھا۔ شاہینہ..... میں نے
زیر لب دہرایا۔ لیکن وہ کچھ نہ بولی۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی
تھیں پھر ہم ایک بیمار سے کمرے میں پہنچ گئے۔
روٹی تھی لیکن سارا ماحول بیمار بیمار لگ رہا تھا۔ میں شدت

’ہاں دن دفتر نہ جاؤ۔ دوسرے دن بھی میں دفتر نہیں
۔ تیسرے دن دوپہر کو سراج میرے پاس آیا۔ آج ہاف
ہے تھا۔ اس نے تجب سے مجھ سے پوچھا۔
”کیا بات ہے۔ تم دفتر کیوں نہیں آ رہے ہو۔“
”بیمار ہوں یار۔“

”کیا بیماری ہے بھائی۔“ اس نے مضحکہ لہجے میں پوچھا۔
”بس سراج کچھ نہیں۔ ایسے ہی، بس طبیعت پر اداسی ہے۔ دل
ہی نہیں چاہ رہا تھا کہ میں دفتر جاؤں۔“
”نیل فون بھی نہیں کیا۔ میں بڑا پریشان ہو گیا تھا۔ ویسے تو
بڑے اچھے خاصے نظر آ رہے ہو۔ ذرا ہاتھ تو دکھاؤ بخار تو نہیں
ہے؟“ پھر اس نے میرا ہاتھ دیکھا اور بولا۔

”کوئی بخار و خائ نہیں ہے حضرت! کاہلی نہیں چلے گی۔“
”میں یار کاہلی کی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔
”پہلے اٹھئے۔“
”کہاں سراج۔“

”اٹھو یار منہ ہاتھ دھوؤ۔ دیکھو کیا صورت بنا رکھی ہے۔ چلو
شیو بناؤ جلدی کرو۔“ سراج نے کچھ ایسی انداز سے رعب بھاڑا
کہ میں ہنستا ہوا تیار ہو گیا۔ ظاہر ہے۔ اس کی ایک منزل تھی اور
وہ ہی بالا خانہ۔
تھوڑی دیر کے بعد ہم اس بازار میں تھے۔

”آؤ یار! آج ذرا جگہ تبدیل کر لیں۔“ سراج نے کہا اور ہم
بازار کے بالکل آخری سرے پر پہنچ گئے۔ سبز جیوں پر پہنچ کر ہم
اوپر چڑھ گئے اور تماش بینوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔
دفعتاً میری نگاہ ایک دروازے کی جانب اٹھ گئی اور جو کچھ
میں نے دیکھا اسے دیکھ کر میں ششدر رہ گیا تھا۔

زرق برق لباس میں ملیں ہوس و جھم جھم کرتی آرہی تھی۔ ہاں
وہی تھی سوئی صدی وہی تھی ذرہ برابر تبدیلی نہ تھی اس میں۔
لیکن ہونٹ ہاں اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے لیکن یوں لگ
رہا تھا جیسے کوئی مصنوعی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر چپکادی گئی
ہو۔ وہ ہونٹ تو مسکرائی ہی نہ جانتے تھے لیکن۔ لیکن یہ سب کیا
ہے میں پاگل سا ہو گیا اس کی نگاہ بھی اتفاقیہ طور پر ہی میرے
اوپر پڑ گئی اور وہ ایک تک دیکھتی رہ گئی۔ اس کے چہرے پر بہت
سے رنگ آئے تھے۔

پھر اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ تب اس نے جھک کر
آہستہ آہستہ سازندوں سے کچھ کہا اور پھر اس کے بیروں میں
بندھے تھکنکروں کی جھکار فضا میں گونج اٹھی اور میں شدت

بھلا نہیں سکتی۔

”اوہ۔ کیا تم مجھے اپنا پہلا نام نہیں بتاؤ گی۔“
”پہلا نام۔ جب میں زندہ ہی۔“
”ہاں۔“

”مجھے مہرین کے نام سے پکارا جاتا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔ تو مہرین میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“
”کہو۔ لیکن میرے بدن میرے انداز میری اداؤں کے بارے میں ہی کچھ کہنا۔ اس کے سوا کچھ نہ کہنا۔“ اس نے کہا اور میں خاموش ہو گیا۔

وہ پوری رات میں نے اس کے نزدیک گزاری لیکن کچھ اس طرح چھپے کوئی کسی مقدس شے کے نزدیک ہوتا ہے۔

بہر صورت جب میں صبح کو وہاں سے پلٹا تو میرے ذہن میں کچھ عجیب سے خیالات تھے میں سوچ رہا تھا کہ اس کے لیے کچھ کرنا ہوگا اور میں اس شدت سے اس کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔

گھر واپس آ کر جو سب سے پہلا کام میں نے کیا تھا وہ تنویر صاحب کو ایک خط تحریر کرنا تھا۔ جس میں میں نے مہرین کے تمام حالات لکھ دیے تھے اور تنویر صاحب سے درخواست کی تھی کہ کچھ بھی ہو کسی طرح بھی ہو وہ یہاں آئیں۔ میں اس لڑکی کو اپنانا چاہتا ہوں۔

اور آج میری زندگی انتہا، مسرور اور پرسکون ہے۔ مجھے دلی مسرت ہے کہ میں نے ایک روح کو ایک مردہ جسم کو نئی زندگی دے دی ہے۔ اس نئی زندگی کے لیے مجھے کیا پاؤں نیلے پڑے۔ وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔

تنویر صاحب میرے بہترین معاون تھے اور بھالی؟ وہ تو مجھ پر قربان ہو رہی تھیں اس وقت جب میں نے انہیں تفصیل سنائی کہ میں اس لڑکی کو بالبال خانے سے اٹھا کر اپنے گھر کی زینت بنانا چاہتا ہوں۔

آج بھی بھالی میری عظمت کا اعتراف کرتی ہیں اور مہرین میرے گھر میں انتہائی خوش ہے اس نے اپنا ماضی بھلا دیا ہے اور اب وہ ایک وفادار بیوی کی حیثیت سے میرے گھر میں زندگی گزار رہی ہے۔

☆☆☆☆

حیرت سے اب بھی خاموش سا تھا۔ وہی لڑکی جس نے اس نے کہا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔

اندرونِ بچ کر میں کمرے کے درمیان کھڑا ہو گیا اور اس نے دروازہ بند کر لیا پھر اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

”میں لباس بدل لوں۔“

میں نے گردن ہلا دی اور رخ بدل لیا۔
لباس تبدیل کرنے کے بعد پلٹ کر اس نے مجھے دیکھا اور رخ پلٹے دیکھ کر شاید اسے عجیب سا احساس ہوا۔ بہر صورت وہ میرے قریب پہنچ گئی اور بولی۔

”آپ ابھی تک کھڑے ہیں بیٹھ جائیے۔“

”شکریہ۔“ میں اپنے حواس پر قابو پا چکا تھا۔ میں مسہری کے ایک سرے پر بیٹھ گیا اور وہ دوسرے سرے پر بیٹھ گئی۔

”کیا تم مجھے پہچانتی ہو۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے سر دھجے میں کہا۔

”لیکن تم نے تو مجھ سے کہا تھا کہ تم مر چکی ہو۔“ میں نے جذباتی انداز میں کہا اور اس نے میری طرف دیکھا وہی دیران اور اداس آنکھیں میں لرز گیا۔

”تو کیا میں تمہیں زندہ نظر آتی ہوں۔“ اس کے یہ الفاظ میری سماعت پر ایک خوف ناک دھماکا بن گئے اور سارا مضمہم میری سمجھ میں آ گیا۔ پھر میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بولا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”شاہینہ۔“

”نہیں تمہارا اصلی نام؟“

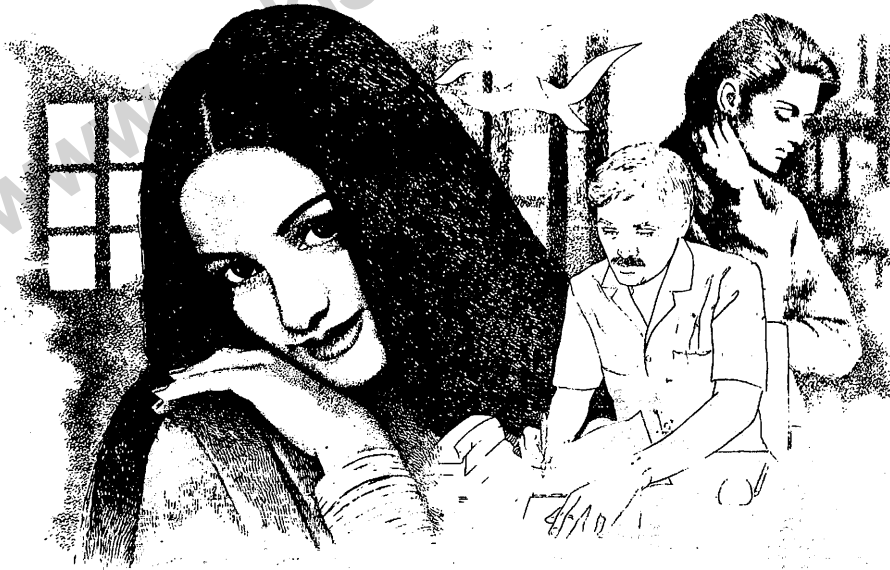
”میں اپنی اصلیت تو کبھی کی کھو چکی۔ میں نے جس کے بارے میں نہیں بتایا تھا وہ اسی دن مر گئی تھی۔ جسے جس کے باپ نے طوائف کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا۔ ہاں میں نے تم سے کہا تھا کہ میرے باپ نے ایک آخری کوشش کی تھی وہ یہ کہ اس نے مجھے قتل کر دیا۔ اس نے مجھے بالاختہ پر پھینک دیا تب کیا میں خود کو زندہ سمجھ سکتی تھی۔ میری قیمت چکا دی گئی تھی۔ میرا باپ میری قیمت لے کر روپوش ہو چکا تھا اور اب ایسا کوئی نہ تھا جو مجھے سہارا دے سکتا تھا۔ چنانچہ میں مجبور ہو گئی۔ یہاں پر میرے ساتھ بڑے بڑے مظالم ہوئے اور مجھے اس بات پر آمادہ کر لیا گیا کہ میں خود کو اسی ماحول کا پروردہ سمجھوں اور جب میں نے مجبوراً اس ماحول میں خود کو ضم کر لیا تو میرے ذہن میں ایک ہی خیال تھا کہ میں مر چکی ہوں۔ میں اپنے اس روپ کو

آخری بازی

ایم اے راحت

ان دو برسوں میں ڈیڈی کو ان کے دوست میرے بارے میں کیا رپورٹیں بھیجتے رہے تھے اس کا مجھے علم نہیں تھا لیکن یہ رپورٹیں میرے خلاف تھیں۔ تب بھی ڈیڈی نے اپنے خطوط میں کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ولا بڑی پابندی سے میرے جملہ اخراجات دوانہ کرتے رہے تھے۔ غالباً ولا اس انتظار میں تھے کہ فائنل نتیجہ سامنے آنے تب کوئی حتمی قدم اٹھائیں۔ مگر قسمت کی مہربانی سے انہیں یہ موقع نہیں مل سکا اور اپنی واپسی پر مجھے یہ ہی بتایا گیا کہ دونوں بہنوں کو تھوڑا سا حصہ دینے کے بعد میں پوری جائیداد و کاروبار کا مالک ہوں۔ مجھے درآمد، برآمد سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ایک معاشرتی کہانی، عمران ڈائجسٹ کے آخری صفحات کے لیے



ہوں۔“
”سرا میں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ اصل میں ہمارے ملک میں کسی صاحب فن کی قدر نہیں ہوتی۔ میں بھی محدود سالا آدی ہوں۔ ریڈیو ٹی وی یا اسٹیج سے اپنی پہچانی نہیں کروا سکتا۔ اس لیے آپ جیسے قدر دانوں کے در دولت پر خود حاضری دے دیتا ہوں۔“
”آپ کیا چاہتے ہیں اور کیا کام کرتے ہیں آپ۔“

”سرا میں تاش کافن جانتا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو اپنا فن دکھاؤں۔“
اب یہ بالکل اتفاق ہے کہ میں امریکہ میں رہ کر بھی وہاں تلاش کے کھیل سے بہت متاثر تھا۔ مجھے اس سے دلچسپی محسوس ہوئی تو میں نے اس سے اپنا فن دکھانے کے لیے کہا۔

جب اس نے تاش کی ایک بالکل نئی گڈی نکال کر نکھولتے ہوئے میرے معائنے کے لیے پیش کی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ کوئی ایسی بات یا خفیہ علامت نظر نہیں آئی۔ جس سے امریکہ کے تمام خانوں میں واسطہ چڑ چکا تھا۔ میں نے اسے گڈی کہا اور بے دی۔ اس نے ماہرانہ چال بیکدیا سے گڈی کو پیسے بار پہناتا اور پھر کئی دلچسپ وحیرت انگیز کرب دکھائے۔ مثلاً دل میں سوچا ہوا پتہ بتانا یا بار بار ایک پتہ کھینچنے پر مجبور کرنا۔ یعنی میں تاش کی پچھلی ہوئی گڈی میں سے کہیں سے کوئی بھی پتہ نکالنا۔ ہر مرتبہ وہ ہی پتہ ہاتھ میں آتا۔ جو میں پہلے کھینچ چکا تھا۔ یا تاش کا کوئی بھی پتہ اپنے ہاتھ سے غائب کر کے میری جیب سے برآمد کرنا پتوں کا سائز چھوٹا یا بڑا کرنا وغیرہ وغیرہ۔

”یہ تاش۔“ میں نے اس کی فن کاری سے متاثر ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہیں کوئی ایسا کرب آتا ہے کہ اگر کوئی کس کھیلے بیٹھے تو ہر بار

میں گزرا رہا تھا۔ بھانت بھانت کے لوگوں سے رابطہ رہا تھا۔ تعلیم کے علاوہ دوسرے مشاغل میں بھی دلچسپی لیتا رہا تھا۔ اصل میں ماضی کے سچ نقوش ذہن پر چسپاں تھے۔ جنہیں میں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ والد صاحب مرحوم نے ماں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا۔ وہ انتہائی تکلیف دہ تھا۔ بس کبھی کبھی کچھ رشتے بالکل بے دست و پا کر دیتے ہیں۔ میرے اور ڈیڈی کے درمیان تعلقات کچھ خوشگوار نہیں تھے اور اس کی وجہ ماں کے ساتھ ڈیڈی کا سلوک تھا۔ میری والدہ مرحومہ جنہیں ڈیڈی نے پندرہ سولہ سال کی رفاقت کے بعد طلاق دے دی تھی۔ ہمیں گھر کے حالات کا بھرپور اندازہ تھا۔

ڈیڈی، ممی سے ہمیشہ لڑتے رہتے تھے اور آخر کار انہوں نے ممی کو طلاق ہی نہیں دی بلکہ ہمیں بھی ان سے چھین لیا۔ ممی ایک غریب گھر کی بیٹی تھیں۔ اس لیے ڈیڈی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں۔ بعد میں ہمیں ممی سے نہیں ملنے دیا گیا اور وہ دو تین سال میں انتقال کر گئیں۔ میری دونوں بہنوں کی شادی کر دی گئی تھی اور مجھے امریکہ بھیج دیا گیا تھا۔

امریکہ میں میں نے اپنی زندگی زندگی گزاری اور پھر اس وقت میری دلچسپی ہوئی جب مجھے ڈیڈی کے انتقال کی خبر ملی۔ وطن واپس آ کر میں نے ڈیڈی کی تمام جائداد اور کاروبار کی صورت حال سنیا لی۔ بہر حال زندگی اسی طرح سادگی سے گزرتی تھی کہ ایک نام نہاد شخص ڈان زان مغل، مجھ سے ملا۔ میرے ملازم نے اسے ڈرائیونگ روم میں بٹھا دیا تھا اور اس کا کارڈ مجھے پیش کیا تھا۔ عجیب سا نام تھا۔ بہر حال میں ڈرائیونگ روم میں پہنچ گیا۔ وہ ایک نوجوان آدی تھا۔ جو اچھے خاصے سوٹ میں لمبوس کافی اسارٹ نظر آ رہا تھا۔

Downloaded from https://paksociety.com

جیت کر ہی اٹھے۔ باوجود اس سے کہ دوسرے باور رکھائی۔ بظاہر اس پر کسی طرح کا کوئی نشان نہیں تھا۔ مگر چشمہ لگا کر دیکھا تو ہر پتے کی پشت پر نیلے رنگ کے مختلف نشانات واضح ہو گئے۔ اس نے مجھے بتایا کہ کس نشان سے کون سا پتہ مراد ہوتا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ حال ہی میں امریکہ سے واپس آیا ہوں اور مجھے فٹس سے خاصی دلچسپی ہے۔ نیز یہ کہ کیا وہ مجھے شہر کے خفیہ کلبوں اور خفیہ اڈوں کا پتا بتا سکتا ہے جہاں یہ کھیل کھیلا جاتا ہو اور اونچی بازیاں لگتی ہوں۔ اور وہ مجھے مختلف شہروں کے اڈوں کے بارے میں بتانے لگا۔

☆☆

میرے مرحوم ڈیڈی احمد شاہ درانی، شہر کے بہت بڑے امپورٹر اور ایکسپورٹر تھے۔ پندرہ سالہ ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد جسے سن شعور کو پہنچنے کے بعد میں نے ہمیشہ تلخ ہی دیکھا، معلوم نہیں وہ اس سے پہلے کیسی تھی۔ ممی کو طلاق دینے کے بعد ڈیڈی نے ہمیں یوں چھین لیا کہ بعد میں ان سے ملنے اور ایک نظر دیکھنے کی بھی اجازت نہیں دی اور پھر ممی کا انتقال ہو گیا اور ہماری تعلیم و تربیت ڈیڈی کی زیر نگرانی ان کی پسند و ناپسند کے مطابق ہونے لگی۔ نازیہ باجی مجھ سے تین سال بڑی تھیں اور سحد یہ چار سال چھوٹی تھی۔ دولت مند گھرانوں میں لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ انہیں عوامی اے یائی ایس سی کے بعد گھر بٹھا جاتا ہے۔ جس کے بعد ان کی شادی کر دی جاتی ہے اور یہ ہی میری دونوں بہنوں کے ساتھ تھی ہوا۔

مجھے بچپن ہی سے فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی اور میری آرزو تھی کہ میں بڑا ہو کر کوئی نامور مصور یا کوئی مشہور اداکار کوئی ہرولڈ عزیز موسیقار بنوں مگر ڈیڈی مجھے پہلے ایم بی اے اور پھر امریکہ پلٹ ماہر سرجن بنانا چاہتے تھے۔ کچھ اس اختلاف اور کچھ انہوں نے ممی سے جو سلوک کیا تھا۔ اس

”ایسے کئی کرتب مجھے آتے ہیں سر۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مگر انہیں صرف بتانے یا دکھانے سے ہی نہیں سیکھا جاسکتا۔ جب تک بار بار کی مشق اور مسلسل ریاضت سے مہارت اور ہاتھ کی صفائی نہ آجائے اور یہ خاصا دیر طلب کام ہے لیکن اس لائن سے پرانی وابستگی اور اس میدان میں تازہ ترین معلومات کی بنا پر میں یہ جانتا ہوں سر! کہ آج کل شہر کی ہائی سوسائٹی کلبوں خفیہ قمار خانوں اور خالص پرائیویٹ نشستوں میں جو طریقہ بہت استعمال کیا جا رہا ہے۔ وہ خفیہ نشانات کا ہے۔ جنہیں بادی النظر میں ہرگز نہیں دیکھا جاسکتا خواہ آپ خود دین سے ہی ایک ایک پتے کا جائزہ کیوں نہیں لیں۔“

”تو پھر پتے باز انہیں کس طرح دیکھتا ہے۔“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”آپ میز سے جیت کر اٹھنا چاہتے ہوں تو ایک چشمہ آپ کی نذر کر سکتا ہوں۔“

”کس قیمت پر۔“

”اس کی قیمت تو کوئی کیا ادا کر سکتا ہے۔ مگر میں صرف اس کے بنانے پر خرچ ہونے والی رقم اور معلومات سامنا فیع لیا کرتا ہوں۔“

”کیا لیتے ہو۔“

”صرف دس ہزار روپے۔“

”چیک یا کیش۔؟“

”برآمدہ نامیں تو صرف کیش۔“

”تم چشمہ نکالو۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”میں ابھی رقم لے کر آتا ہوں۔“

چشمہ دیکھنے میں بہت خوب صورت اور جدید ڈیزائن کا تھا۔ مجھے پسند آیا۔ اس نے مجھے

Downloaded from https://paksociety.com کے باعث میرے دل میں بھی اسی طرح کی محسوس ہو گئی۔

پوزیشن کے ساتھ پاس ہو گیا۔ اب امریکہ جا کر سرجن بننے کا مرحلہ آیا۔ ڈیڈی نے تمام انتظامات مکمل کر لیے وہاں ان کے کچھ دوست تھے۔ انہیں میرا خیال رکھنے کے بارے میں لکھ دیا گیا۔ مجھے بھی ان کے پتے دیتے ہوئے ہدایات کر دی گئی کہ میں ان لوگوں سے برابر ملتا رہوں پھر عین روائی کے دن ڈیڈی نے مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا اور بالکل تنہائی میں سنجیدگی سے بولے۔

”برخوردار! میں تمہارے تمام معمولات اور خیالات کو جانتا ہوں۔ مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے مستقبل کی بہتری کون سی راہ اختیار کرنے میں ہے۔ ابھی تک تم نے صرف ایف ایس سی تک پڑھا ہے۔ میڈیکل کے سال اول سے لے کر فائل تک امتحان میں بلاشبہ تم بیٹھے ہو۔ مگر اسے پاس میں نے کیا ہے۔ تم سے آج تک اس لیے نہیں کہا کہ اس ملک میں سب کچھ ملتا ہے۔ جب یہاں کے لیڈر جو سیاست کی الف بے سے واقف نہیں اور پھر بھی عوام کی جان و مال سے کھیلے ہیں تو ایک ڈاکٹر کا دائرہ کار تو اتنا وسیع بھی نہیں ہوتا لیکن اب تم امریکہ جا رہے ہو۔ اگرچہ وہاں بھی بہت کچھ چلتا ہے۔ مگر وہاں ڈگری بغیر محنت کے نہیں مل سکتی۔ اس لیے اب تمہیں جان تو ڈگر محنت کرنا پڑے گی۔ بشرطیکہ تمہیں میری لاکھوں کی جائداد اور کاروبار سے کوئی دلچسپی ہو۔ کیونکہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر تم وہاں سے ڈگری لے کر واپس نہیں آئے تو میں تمہیں اپنی جملہ وراثت سے عاق کر دوں گا۔ بس مجھے اتنا ہی کہنا تھا۔ اب تم جاسکتے ہو۔“

میں ڈیڈی کی دھمکی سے بہت زیادہ خوف زدہ ہو گیا تھا کہ میں نے امریکہ پہنچنے کے بعد سچ سچ ایمانداری سے پڑھنے کی کوشش کی مگر جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اب تعلیم میں دلچسپی لینا میرے

میں بھی سمجھتا تھا کہ میں جو کچھ بنا چاہتا ہوں اس کے لیے بھی مناسب تعلیم ضروری ہے۔ اس لیے ایف ایس سی تک اس نمکٹش کا اندازہ کچھ ایسا ہی رہا کہ میں ان سے چھپ کر فمیں دیکھتا تھا۔ گانے سنتا اور سیکھتا تھا اور پینٹنگ سے ڈرائیونگ کی کاپیوں پر کاپیاں بھرتا جاتا تھا لیکن اس کے ساتھ تعلیم پر بھی مناسب توجہ دیتا تھا۔ جس کا عملاً جو نتیجہ نکلا وہ یہی تھا کہ ٹھنڈکلاس سے لے کر ایف ایس سی تک میں کلاس میں بھی سیکنڈ اور بھی ٹھنڈ پوزیشن لیتا رہا۔ میٹرک میں نے سیکنڈ ڈویژن میں کیا اور ایف ایس سی میں بھی بدی زلزل رہا۔

اصل نمکٹش بلکہ ایک طرح سے سرد جنگ کا آغاز اس کے بعد ہوا ڈیڈی نے فیصلہ دے دیا کہ مجھے میڈیکل میں داخلہ لینا ہے میں نے کچھ زیادہ مخالفت نہیں کی۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ فرسٹ ڈویژن والوں کو ہی بڑے پاڑ پیلنا پڑتے ہیں۔ سیکنڈ ڈویژن کی باری کہاں آئے گی لیکن مجھے بے حد تعجب بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ جب مجھے نجانے کس طرح میڈیکل میں داخلہ مل گیا۔ غصے کے باوجود انکار کی مجال نہ تھی۔

مگر میں نے بھی سوچ لیا کہ اب آئندہ کسی بھی امتحان میں پاس ہونے والے پر لعنت ہے۔ ڈیڈی نے مجھے ہاسٹل میں داخل کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں پڑھائی کا ماحول ہونے کی وجہ سے بہتر نتائج برآمد ہوں گے اور وہ ہوئے بھی۔ یعنی اس کے باوجود کہ میں سارا سال فلم بنی اور آوارہ گردی کرتا رہتا تھا۔ اکثر کلاس میں غیر حاضر رہتا تھا۔ امتحان میں جوابات کی جگہ فلمی گانے اور کارٹون بنا کر آتا۔ مگر ڈیڈی نجانے کون سی جادو کی چمڑی گھماتے تھے کہ ہر سال کامیاب طلباء کی فہرست میں سب سے نیچے سہی لیکن ہوتا ضرور تھا۔ یہ صورت حال ایم بی بی ایس

بس کی بات نہیں رہی۔ چنانچہ میں نے ڈیڈی کی مقرر کردہ سزا سے بچنے کا کوئی طریقہ سوچنے کی کوشش کی اور آخر کار اسی نتیجے پر پہنچا کہ یہاں مجھے اپنے شوق کو بائیسہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بہترین مواقع حاصل ہیں۔

اس لیے میں نے ڈیڈی کا جملہ برنس مع اس کی گڈول کے ایک پارٹی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس سے بھی ایک وافر رقم ہاتھ لگی اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ اب بظاہر باپ کی کمائی ہوئی دولت سے عیش کرنے کے علاوہ میری کوئی مصروفیت یا کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔

ڈان زان مغل سے میری دلچسپی ملاقات کو تقریباً ایک ہفتہ گزارا تھا۔ ایک شام میں شیر کے ایک معروف کلب میں بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ مجھے اپنے پیچھے ایک قریبی میز سے ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔

میں اس وقت محض حسن اتفاق سے اکیلا تھا۔ بائی سوسائٹی میں یہ خبر پورے زور و شور سے پھیل گئی تھی کہ ایک لکھ پتی کا اکلوتا بیٹا حال ہی میں اس کی جائیداد کا وارث بنا ہے اور خیر سے کنوارہ ہے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کئی خوب صورت لڑکیوں نے یا تو خود میرا گھر دیکھ لیا تھا۔ یا انہیں دکھایا گیا تھا۔

جلد ہی مجھے ان کی گفتگو سے اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی بڑی رقم کے نقصان کا ماتم کر رہے ہیں۔ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے منگیتر ہیں۔ لڑکا غریب ہے۔ لڑکی امیر باپ کی بیٹی ہے۔ دفعتاً میں نے لڑکی کو سکسوں کے ساتھ روتے سنا۔ وہ شام کا ابتدائی وقت تھا کلب کا ریفریشمنٹ ہال تقریباً خالی نظر آ رہا تھا۔ اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ یوں بھی اپنی کافی ختم کر چکا تھا۔ اس لیے اٹھا اور بڑی بے تکلفی سے ان کی میز پر جا کر بیٹھ گیا۔ لڑکی نے جلدی سے اپنے آنسو خشک کر لیے میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ نقش و نگار کے اعتبار سے شاید اتنی خوب صورت نہ ہو مگر چہرے کے مجموعی تاثر بڑا کشش انگیز تھا۔ وہ دونوں میری اس مداخلت پر حیران تھے۔ میں نے

اگر میں ان میں سے کسی ایک شوق، مثلاً اداکاری، میں کامیاب ہو گیا تو پھر مجھے ڈیڈی کی دولت کی بھی پرواہ نہیں ہوگی۔ چنانچہ میں نے ایک طرف تو ہالی وڈ کے چکر لگانا شروع کر دیے اور دوسری طرف قسمت کے سہارے دولت کمانے کے لیے قمار خانوں کا رخ کیا۔ مگر جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ خواب دیکھنا اور چیز ہے اور اس کی تعبیر حاصل کرنا قطعی مختلف شے ہے۔ دو سال ٹھوکریں کھانے کے بعد صرف اتنا ہو سکا کہ قمار خانوں میں اپنے شمار پر دوستوں کی مہربانی سے مختلف نوعیت کی بازیوں کے کچھ خاص خاص گر ہاتھ میں آ گئے اور اسٹوڈیوز کے چکروں نے ایک تجربہ کار میک اپ مین کا ہم نوالہ ہم پیالہ بنا دیا۔ جس نے اترارہ دوست نوازی اس فن کے کئی سربستہ راز مجھے سکھا دیے۔ قریب تھا کہ میں ان دونوں فنون سے ذاتی فائدہ اٹھانے کا آغاز کرتا کہ ڈیڈی کے اچانک انتقال کا کیبل موصول ہوا اور میں بلاتل پاکستان واپس آ گیا۔

ان دو برسوں میں ڈیڈی کو ان کے دوست میرے بارے میں کیا رپورٹیں بھیجتے رہے تھے اس کا مجھے علم نہیں تھا لیکن یہ رپورٹیں میرے خلاف تھیں۔ تب بھی ڈیڈی نے اپنے خطوط میں کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ بڑی پابندی سے میرے جملہ اخراجات روانہ کرتے رہے تھے۔ غالباً وہ اس انتظار میں تھے کہ فائنل نتیجہ سامنے آئے تب کوئی حتمی قدم اٹھائیں۔ مگر قسمت کی مہربانی سے انہیں یہ موقع نہیں مل سکا اور اپنی واپسی پر مجھے یہ ہی بتایا گیا کہ دونوں بہنوں کو تھوڑا سا حصہ دینے کے بعد میں پوری جائیداد کو کاروبار

سے پوچھا۔ پھر میں کیا کروں۔ اس نے کہا۔
 ”اپنے انکل سے اور روپیہ مانگو۔ کم از کم دو
 لاکھ مگر یہ میرے لیے بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا۔
 میں نے اپنے دوست سے کہا۔ کوئی اور ترکیب
 بتاؤ۔ اس نے جواب دیا کہ پھر تو بس ایک ہی
 ترکیب ہے۔ میں ایک ایسی جگہ جانتا ہوں۔
 جہاں بڑے پیمانے پر فلتس ہوتا ہے۔ ہزاروں کی
 تعداد میں بازیاں لگتی ہیں۔ تم ایک رات میں
 کروڑ پتی بھی بن سکتے ہو۔ میں نے کہا مجھے فلتس
 نہیں آتا۔ آج تک کبھی کھیلا ہی نہیں۔ وہ ہنسا کہ
 یہ کوئی مشکل بات نہیں میں تمہیں چند منٹ میں
 سب کچھ سکھا دوں گا۔ میں اس کی باتوں میں
 آ گیا۔

دوسرے دن وہ ایک کار لے کر آ گیا۔ کچھ
 دور جا کر اس نے میری آنکھوں پر پٹی باندھی اور
 کہا۔ ”احتیاط خود تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اگر
 کبھی کوئی پوچھے تو دیانت داری سے کہہ سکتے ہو
 کہ مجھے کچھ نہیں معلوم وہ مجھے نہ معلوم کسی علاقے
 کی ایک شاندار عمارت میں لے گیا۔ جس میں
 بے شمار کمرے تھے اور ہر کمرے میں کچھ نہ کچھ ہو
 رہا تھا۔ اب زیادہ تفصیل میں کیا جاؤں۔ مختصر یہ
 کہ میں نے بازی لگائی شروع میں کافی جیتا۔
 تقریباً پچاس ہزار مگر پھر جو قسمت نے پلٹا کھایا تو
 سب کچھ ہار گیا۔ پورا ایک لاکھ میرا دوست مجھے
 تسلی دینے لگا۔ میں جان سے پزار تھا۔ خودکشی
 کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس نے مجھے ایک بوتل
 دی کہ اسے پی لو۔ طبیعت سنبھل جائے گی۔ معلوم
 نہیں وہ کیا شے تھی۔ اسے پینے کے بعد مجھے ہوش
 نہیں رہا۔ آنکھ کھلی تو اپنے گھر کے قریب ایک
 سنسان کلی میں پڑا ہوا تھا۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ نوشاہہ نے اسے ڈبڈبا کر
 آنکھوں سے دیکھا۔

”تمہیں یہ شبہ تو نہیں ہوا کہ وہ لوگ پتے

قدرے کم ہو گئے۔ پھر جب میں نے انہیں بتایا
 کہ میں قریب کی میز پر بیٹھا۔ نادانستہ ان کی جی
 گفتگو سننے کا مرتکب ہوا ہوں اور محض ہر بنائے
 خلوص و انسانیت یہ جانتا چاہتا ہوں کہ کیا میں کسی
 بھی طرح ان کے کچھ کام آ سکتا ہوں۔ میری ان
 باتوں سے وہ دونوں بہت متاثر ہوئے میرا شکریہ
 ادا کیا اور میرے اصرار پر اپنی کہانی کچھ یوں
 بیان کی۔

”میرا نام جاوید عزیز ہے۔“ نو جوان نے
 کہا۔ وہ بھی خاصا پرکشش لڑکا تھا۔ ”اور یہ میری
 منگیت نوشاہہ ہیں۔ ایک بڑے باپ کی اکلوتی بیٹی
 ان سے کچھ دور کی رشتے داری بھی ہوتی ہے۔
 میرا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا رہا ہے۔ پہلی جماعت
 سے ہی نمایاں پوزیشن لے کر کامیاب ہوتا رہا
 ہوں۔ لی کام میں فرسٹ آیا اس سے آگے تعلیم
 جاری رکھنے کی استطاعت نہیں تھی۔

خیام انکل میرا مطلب ہے۔ نوشاہہ کے ابو
 میری امی سے ملنے آئے دونوں میں کچھ باتیں
 ہوئیں اور پھر ایک ہفتے بعد ہماری منگنی ہو گئی۔
 انکل نے مجھ سے کہا۔

”برخوردار! ملازمت میں کچھ نہیں رکھا۔
 بزنس کرو بزنس وہ خود بھی بہت بڑے بزنس مین
 ہیں۔ پھر انہوں نے مجھے کچھ رقم نقد دی کوئی
 مناسب کاروبار کرنے کے لیے میں بہت خوش
 تھا۔ میرے ذہن میں بے شمار منصوبے خوابوں کی
 مانند آرہے تھے لیکن پھر میرا ایک دوست آ گیا۔
 میں نے اس سے بھی مشورہ کیا کہ کون سا کام
 زیادہ بہتر اور جلد منافع بخش ہو سکتا ہے۔ وہ بولا۔
 ”آج کل تو اتنی رقم میں ان سگریٹ کی
 دکان بھی نہیں کھل سکتی۔ کاروبار کوئی بھی ہو۔
 دکان کے لیے اچھا محل وقوع سب سے زیادہ اہم
 ہے اور ایسی دکان کی صرف پچڑی ہی پچاس ہزار
 سے لے کر ڈیڑھ ہزار تک ہے۔ میرے پاس رقم

غزل

طارق حسن طارق

جو شاعری میں بہت کامیاب ہے پیارے
اُسی کا اِن دنوں خانہ خراب ہے پیارے

وہی زمانے میں عزت مآب ہے پیارے
کہ مال جس کے یہاں بے حساب ہے پیارے

جو تم بنے ہوئے رکھکِ شباب ہو پیارے
مجھے خبر ہے کہاں کا خضاب ہے پیارے

یہ اور بات کہ کانٹوں سے ہاتھ ہے زخمی
یہ کم نہیں مرے گھر میں گلاب ہے پیارے

ہمارے سارے اثاثے کی ٹوہ میں ہو تم
ہماری جب سے طبیعت خراب ہے پیارے!

میں اس کے گھر جو چلا جاتا ہوں تو کیا ناح
طلاشِ رزق تو کارِ ثواب ہے پیارے!

ہے ڈرُ مجھے ترے والد نہ مسترد کر دیں
میں ایک چراغ ہوں تو آفتاب ہے پیارے

سب بتادوں میں دنیا کی بے جا بلی کا
تمہارا حُسن، تمہارا شباب ہے پیارے

خدا کے واسطے طارق نہ اس سے تھما مل
لگے گا عیب، زمانہ خراب ہے پیارے

بازی کر رہے ہیں۔ میں نے جاوید سے پوچھا۔
”شہر نہیں مجھے یقین ہے کہ انہوں نے مجھے
دھوکے سے لوٹا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔
”جو آدمی تمہارے ساتھ کھیل رہے تھے۔“
میں نے سوچتے ہوئے سوال کیا۔ ”ان میں سے
کوئی چشمہ تو نہیں پہنے ہوئے تھا۔“
”ہاں ایک آدمی نے پہن رکھا تھا۔“ جاوید
نے کچھ چونک کر جواب دیا۔

میں نے اسے پتوں پر کچھ خفیہ نشانات کے
بارے میں بتایا۔ اس نے جواب دیا کہ اس نے
فراڈ کی تصدیق کے لیے ایک استیصال شدہ تاش
کی گڈی چھپا کر جیب میں رکھ لی تھی لیکن گھر پہنچ
کر اسے بہت غور سے دیکھنے پر بھی کچھ نظر نہیں
آیا۔ وہ گڈی اتفاق سے اس وقت بھی اس کی
جیب میں تھی۔ اس نے نکال کر مجھے دکھائی۔ میں
نے اسے دیکھے بغیر جیب میں رکھ لیا۔

میں اسے چشمے کے راز کے بارے میں کچھ
بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اس گڈی
پر خفیہ نشانات ضرور موجود ہوں گے۔ میں نے
اسے تسلی دی اور کہا کہ میں ہر ممکن طریقے سے اس
کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ وہ کل مجھ سے نو شاپہ کے
ساتھ اس جگہ ملاقات کرے تو میں اسے اپنی
سوچی ہوئی تجویز سے آگاہ کروں گا اور مجھے
پوری امید ہے کہ میں صرف اس کا نقصان ہی نہیں
بلکہ کچھ منافع بھی دلوانے کی کوشش کروں گا۔

دوسرے دن وہ مجھ سے پہلے ہی کلب میں
میرے منتظر تھے۔ میں نے گھر پہنچ کر پروفیسر زان
مقل کا دیا ہوا چشمہ لگا کر دیکھا تو تصدیق ہو گئی کہ
میرا اندازہ درست تھا۔ تاش کی گڈی کے ہر پتے
پر خفیہ نشانات موجود تھے۔ ایسی صورت میں ظاہر
تھا کہ میرا لائحہ عمل کیا ہو سکتا تھا۔

چنانچہ میں نے کہا۔
”دیکھو میاں جاوید! ہر چند کہ میں کوئی ماہر
کھلاڑی نہیں ہوں۔ مگر فلش کے کچھ خاص گر جانتا

بلکہ ایک اور شکار پھانسنے کے لالچ میں اس آڑے پر مجھے بھی لے جانے کے لیے بخوشی آمادہ ہو جائے گا۔ چاہو تو تم دونوں بھی ساتھ چل سکتے ہو۔“

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ جاوید تین دن کے بعد مجھے ملا اور بتایا کہ اگلی شام کے لیے پروگرام طے پا گیا ہے۔ دوسرے دن شام کو وہ مجھے ایک اور کلب لے گیا۔ جہاں ایک نوجوان سے میرا تعارف کرایا۔ جس کا نام دلاور تھا۔ وہ مجھے شکل ہی سے کوئی جھٹا ہوا بد معاش اور عادی جرائم پیشہ نظر آ رہا تھا لیکن اپنی ناگواری کو چھپاتے ہوئے میں اس سے بڑے پریتاک انداز میں ملا۔ میرے پاس اپنی کار بھی، مگر طے یہ ہی ہوا کہ ہم ان کے معمول کے مطابق اس کار میں چلیں گے۔ جو ہمیں لیجانے کے لیے بھیجی جائے گی۔ اس لیے میں اپنی کار لاک لگا کر کلب ہی میں چھوڑ دوں۔

دوسری شرط یہ بھی تھی کہ کچھ راستہ طے کرنے کے بعد ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ دی جائے گی۔ تقریباً نو بجے تک ہم کلب میں کافی پیتے اور باتیں کرتے رہے۔ پھر دلاور نے کار کے پیچھے کی اطلاع دی۔ میں جاوید اور نوشاہہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ دلاور اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا اور ہم کلب سے روانہ ہوئے۔ پندرہ منٹ کے سفر کے بعد دلاور نے کار رکوا لی۔ اتر کر خود اپنے ہاتھوں سے ہم تینوں کی آنکھوں پر پٹی باندھی۔

کار پھر چلی اور میرے اندازے کے مطابق نصف گھنٹے کے لگ بھگ چلتی رہی۔ معلوم نہیں وہ حقیقت میں کوئی فاصلہ طے کر رہے تھے یا ہمیں طویل فاصلے کا تاثر دے رہے تھے اور سڑکوں پر یونہی گھوم پھر رہے تھے۔

بہر حال تقریباً دس بجے کار ایک عمارت کے سامنے رکی۔ ہماری پٹیاں کھول دی گئیں۔ میں نے دیکھا کہ ایک تین منزلہ کچھ قلعہ نما سی

ہوں مجھے تم دونوں سے ہمدردی ہے اور ظالم سماج یا فلک سچ رفتار کو دو محبت کرنے والوں کے درمیان دیوار بننے نہیں دیکھ سکتا۔ میرے لیے لاکھ دولاکھ کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔ تمہیں یوں بھی دے سکتا ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ محبت کرنے والے بڑے غیرت مند ہوتے ہیں۔ تم لوگ اس انداز میں میرا احساندہ ہونا منظور نہیں کرو گے۔ پھر میں ان لوگوں کو بھی کچھ سبق دینا چاہتا ہوں۔ جو سادہ لوح معصوم لوگوں کو اس سنگدلی سے ٹھٹھکتے ہیں۔

اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے اس دوست سے میرا تعارف کروادو جو تمہیں اس پوشیدہ عمارت میں لے گیا تھا۔ میں خود ان لوگوں کے ساتھ فلش کھیلوں گا اور مجھے یقین ہے کہ چند گھنٹوں میں ایک لاکھ کے تین لاکھ بنا لوں گا۔ اس میں سے ایک لاکھ تمہیں دے دوں گا۔ پھر یہ کوئی احسان نہیں ہوگا۔ کیوں کہ تمہارے ذریعے میں خود بھی ایک رات میں ایک لاکھ کمالوں گا۔ بولو کیا کہتے ہو۔ میری تجویز قبول ہے۔“

نوشاہہ کا چہرہ تو میری بات سنتے ہی چمکنے لگا تھا۔ مگر جاوید نے جواب دینے سے پہلے کچھ دیر سر کو جھکا کر سوچا پھر بولا۔ ”اس میں شک نہیں ہے کہ آپ کی تجویز بہت خوب ہے لیکن پہلی بات تو یہ کہ وہ لوگ آپ کے اندازے سے کہیں زیادہ چالاک ہیں اور چار سو میں ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری خاطر آپ اتنی بڑی رقم داؤ پر لگا دیں۔ دوسری بات یہ کہ میرا دوست! اس دن کے بعد سے پھر نظر نہیں آیا ہے۔“

”تم میری رقم کے لیے فکر مند نہ ہو۔ میں بزنس مین ہوں اور کوئی تجربہ کار بزنس مین سوچے سمجھے بغیر رسک نہیں لیتا۔“ میں نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔ ”رہا تمہارے اس دوست کا معاملہ تو تم اس کے مصروف ٹھکانوں پر اسے تلاش کرو۔ مجھے امید ہے کہ وہ نہ صرف مل جائے گا۔

عمارت ہے جس کا ڈیزائن [Downloaded from https://paksociety.com](https://paksociety.com) میں سے پچاس ہزار کے نوٹ نکالے اور جھک کر بریف کیس نیچے رکھا تھا اور اراداً کرسی کو اس طرح حرکت دی کہ وہ الٹ کر پیچھے گرنے لگی۔ پھر میں نے جیسے کرنے سے بچنے کے لیے ہوا میں ہاتھ لہرائے اور میرا دھنا ہاتھ ٹھک چشمہ والے کے چہرے پر لگا۔ دوسرے ہی لمحے چشمہ اس کی ناک سے اچھل کر تیر کی طرح پھیل دوار سے نکل آیا اور اس کے دونوں شیشے چور چور ہو گئے۔ میں بھی لڑھک کر نیچے گر چکا تھا۔ جاوید نے جلدی سے مجھے اٹھنے میں مدد دی۔ میں نے انتہائی شرمندہ لہجہ میں چشمہ والے سے معذرت چاہی۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ تیز نظروں سے مجھے گھور کر رہ گیا۔ ہم دوبارہ اپنی کرسیوں پر بیٹھے۔ تاش کی ایک قیمتی نئی گڈی کھولی گئی۔ ان تینوں کے انداز سے کچھ ہچکچاہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ مگر ظاہر تھا کہ وہ کوئی معقول بہانہ پیش نہیں کر سکتے تھے۔

چنانچہ کھیل شروع ہوا۔ مجھے اپنے چشمے کی مدد سے تاش کے ہر پتے پر لکھے ہوئے نشانات نظر آرہے تھے۔ انہیں دیکھنا بھی کچھ ایسا مشکل نہ تھا۔ جس وقت پتے فرداً فرداً ہر ایک کو دیے جا رہے تھے۔

اسی وقت تین میں سے دو پتوں کے نشانات تو نظر آ رہے تھے۔ پھر جب کھلاڑی انہیں اٹھاتا تھا تو باقی رہ جانے والا پتہ بھی نگاہ میں آ جاتا تھا۔ مگر ایک دو بازیوں کے بعد ہی مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ پتوں پر جو خفیہ نشانات ڈالے گئے ہیں۔ وہ بالکل غلط ہیں۔ مثلاً اپنے خفیہ نشان کے مطابق اگر کسی پتے کے حکم کا اکا ہونا چاہیے تھا تو حقیقت میں وہ حکم کی دگ ثابت ہوتا تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ یہ ہی ہونا چاہیے تھا کہ میں وہ دونوں بازیاں ہار گیا۔

میں نے سوچا کہ جو نشانات میں دیکھ رہا ہوں ممکن ہے وہ اس لیے دھوکہ دینے کے لیے

ان کے اندر سے مختلف باتیں کرنے ہنسی مذاق اور قہقہے لگانے اور گانے کی ٹلی جلی آوازیں آرہی تھیں۔ ڈرائیور کا رہی میں رہ گیا تھا۔ دلاور ہمیں ساتھ لیے جس کمرے میں داخل ہوا۔ اس میں چھ سات میزوں کے گرد چار یا چار سے زیادہ افراد بیٹھے تھے۔ دو چار میزیں خالی بھی تھیں۔ دلاور نے کمرے کے ٹران کو میرے بارے میں بتایا۔ جس نے ایک خالی میز کی جانب اشارہ کیا اور ابھی ہم وہاں بیٹھے ہی تھے کہ تین آدمی نہ جانے کہاں سے نکل کر ہمارے سامنے آ بیٹھے۔ جن میں سے ایک نے میری طرح چشمہ لگایا ہوا تھا۔

دلاور نے ان کا فرداً فرداً تعارف کرایا۔ ان کے نام اور تعارف کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ نام بھی فرضی تھے اور دلاور نے ان کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا۔ وہ سب کچھ بھی جھوٹ تھا۔ تعارف کے بعد ہم سب اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے۔ میں دانستہ اس چشمہ والے کے قریب بیٹھا۔ اس کے بعد جاوید اور نوشابہ تھے اور ان کے بعد دو اور مد مقابل پچکان کے لیے میں انہیں نمبر ایک اور نمبر دو لکھوں گا۔

یہاں امریکہ کے قمار خانوں کی طرح ٹوکن منی کا رواج نہیں تھا۔ ہر کھلاڑی اصل کرسی نوٹ

میں چال چل رہا تھا تو اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنے دوپٹے تبدیل کر لیے اور ایک دم سے دس ہزار کی چال چلی۔ میں نے فوراً اس کے پتوں پر ہاتھ مارا اور انہیں جھپٹ لیا۔

”یہ کیا حرکت ہے۔“ وہ ہلکے بولا۔

”تم پتے بنا رہے ہو۔“ میں نے سخت لہجے میں جواب دیا اور اس کے پتے میز پر کھول دیے۔ وہ تنہا رکے تھے۔ ”میں مطالبہ کرتا ہوں۔“ میں نے ہدستور سخت لہجے میں کہا۔ ”کہ تاش کی گڈی چیک کی جائے۔ یقیناً چھاکے برآمد ہوں گے۔“

”تم مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔“ چشمے والے نے زور سے میز پر گھونہ مارا۔

نمبر ایک اور نمبر 2 تھے

تہر آلود نظروں سے گھور رہے تھے۔ جاوید خاموش تھا اور نوشابہ بڑی پریشان نظر آ رہی تھی۔ ہنگامے کی آواز سن کر گمران بھی آگیا تھا۔ میں نے اسے صورت حال بتائی۔ اس نے بڑے پرسکون انداز میں میرے اس مطالبے کی تائید کی تاش کی گڈی چیک کی جائے۔ چنانچہ ایک ایک پتہ دیکھا گیا اور جیسا کہ میرا خیال تھا اس میں سے چھاکے برآمد ہوئے۔ چار اس کے اپنے اور دو وہ جو چشمے والے نے شامل کیے تھے۔

چشمے والا خاموش بیٹھا تھا۔ مگر وہ کسی طرح بھی گھبرایا ہوا یا پریشان معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ میرے اصرار پر اس کی بھی تلاشی لی گئی اور مختلف جیبوں میں خاص طور سے آستین کے اندر بنی ہوئی خفیہ جیب میں کئی بڑے پتے موجود پائے گئے۔ گمران نے بڑے مہذب انداز میں مجھ سے معذرت کی۔ اس نے کہا کہ ہماری پوری کوشش ہوئی ہے کہ یہاں ہر مکمل صاف ستھرا اور

جائے۔ تب بھی وہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے اور حقیقت میں پتوں کی پہچان کے لیے کسی اور جگہ نشانات موجود ہوں۔ چنانچہ میں نے پتوں کو بڑے غور سے دیکھنا شروع کیا مگر کسی بھی جگہ کوئی اور نشان تلاش کرنے سے قاصر رہا۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ ان کے آدمی کا چشمہ تو میں توڑ چکا ہوں۔ تب پھر وہ لوگ کیسے جیت رہے ہیں۔

کوئی ایک بازی تو میرے ہاتھ میں آئی۔ یقیناً یہ لوگ یا تو پتے نگار ہے ہیں یا پھر چشمے والے کے پاس اضافی پتے موجود ہیں۔ اب تک ہر بازی وہی جیتا تھا وہ حسب ضرورت انہیں استعمال کر رہا تھا۔

میری مسلسل ہار پر جاوید برابر میری ہمت افزائی کر رہا تھا۔ مگر میں نے نوشابہ کو دیکھا۔ وہ خالی افسردہ نظر آ رہی تھی۔ ایک دوسرے مجھے یہ بھی شبہ ہوا جیسے وہ مجھے مزید کھیلنے سے منع کر رہی ہو۔ مگر واضح طور پر کچھ کہنے سے مجبور ہو۔ اب میں نے اپنے امریکہ کے تجربے کا سہارا لیا۔ اس کے بعد جیسے ٹھیک کا بانسہ پلٹ گیا۔ میں نے لگاتار چار بازیاں جیت کر اپنا تمام نقصان پورا کر لیا۔

نوشابہ کے چہرے پر چمک آگئی۔ باقی لوگ جاوید سمیت اپنی کرسیوں پر پہلو بدلنے لگے۔ اگلی دو بازیاں بھی میرے حق میں آئیں اور اب میں تقریباً چالیس ہزار روپے جیت چکا تھا۔ چشمے کے بیکار ثابت ہونے پر میری تمام تر توجہ اپنے تینوں مخالفوں پر جمی ہوئی تھی۔ میں ان کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہا تھا۔ ایک بازی چل رہی تھی۔ میرے پاس تین بادشاہ تھے اور میں مطمئن تھا کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی اس سے بڑے پتے موجود نہیں ہیں۔

چنانچہ میں ہر چال پانچ ہزار کی چل رہا تھا۔ کچھ چالوں کے بعد نمبر ایک نمبر دو دونوں نے اپنے پتے پھینک دیے۔ اب میں اور وہ چشمے والا

نہیں۔ میں ان لوگوں پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ میں بھی اس فن سے واقف ہوں۔ ایسی صورت حال میں مجھے ایک امریکہ کے بڑے ہی معروف اور ماہر تے باز نے مخالف کی پھینٹی ہوئی گڈی کاٹنے کی ترکیب بتائی تھی۔ جس کا انحصار اس بات پر تھا کہ میں مخالف کی وہ ٹرک پہچان لوں جس سے اس نے اس مرتبہ تے پھینٹے ہیں۔ چنانچہ اگلی بار میں نے امتیاز کو گڈی پھینٹنے کا موقع دیا۔ مگر اس کی ٹرک نہ پکڑ سکا نتیجہ میں یہ بازی مجھے ہارنا پڑی۔ مگر اگلی مرتبہ میں نے اس کی چالاکی پکڑ لی اور اسی کے مطابق گڈی کو ایک خاص مقام سے کاٹا۔ شاید امتیاز اس ہنر سے انجان تھا۔ اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ وہ بازی میں جیتا۔ اس کے بعد امتیاز نے ہی ہر مرتبہ ناش پھینٹے لیکن اس کی کوئی بھی چالاکی بھری باریک بین نظروں سے نہ بچ سکی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک گھنٹے کے کھیل میں میں تقریباً ایک لاکھ روپے جیت چکا تھا۔ امتیاز سپاٹ چہرہ لے لیے بیٹھا تھا۔ مگر میں جانتا تھا کہ اندر سے بری طرح کھول رہا ہے۔

اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ میں نے کھیل ختم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر امتیاز مجھے یوں کب جانے دے سکتا تھا۔ اس نے مزید کھیلنے پر اصرار کیا میں نے اس شرط پر مان لیا کہ بس تین بازیاں اور ہوں گی۔ امتیاز راضی ہو گیا۔ کھیل پھر شروع ہوا اس دوران جاوید عزیز کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ اگرچہ وہ میری مسلسل جیت پر خود کو بہت خوش ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نوشاہہ بھی مطمئن تھی اور ایک ہلکی مسکراہٹ اس کے نرم و نازک ہونٹوں پر رقص کر رہی تھی۔ مگر ساتھ ہی اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں کسی موہوم سے اندیشے کی پرچھائیاں بھی گاہے گاہے۔ ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی تھیں۔

پھر حکم دیا کہ اس شخص کو کلب سے باہر نکال دیا جائے۔ مگر ان نے دو معاون جو کمرے میں ہی موجود تھے چشمے والے کو پکڑ کر باہر لے گئے اس اثناء میں ایک شخص جس نے بڑے قیمتی کپڑے اور بہترین تراش کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ کمرے میں داخل ہوا۔ مگر ان نے بڑی گرجوٹی سے اس کا استقبال کیا اور مجھ سے تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ یہ امتیاز صواب ہیں۔ شہر کی مصروف سیاسی شخصیت جو کبھی کبھی تقریباً کلب آ جاتے ہیں۔ آپ ان کے ساتھ کھیل کے یقیناً لطف اندوز ہوں گے۔

امتیاز بڑے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے خلیقانہ انداز میں ہاتھ ملایا ہم ایک بار پھر میز پر بیٹھ گئے۔ چشمے والے کی کرسی امتیاز نے سنبھال لی۔ وہ ایک وجیہ آدی تھا۔ مگر اس کی بھوری آنکھوں کی چمک سے انتہائی زیرک اور چالاک ظاہر کر رہی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ اپنے دلکش خدو خال کے باوجود وہ مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ معلوم ہوا۔ ناش کی نئی گڈی کھولی گئی تو کھیل ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

اس کے پتے پھینکنے کے انداز سے میں نے جان لیا کہ وہ خاصا تجربے کار شارر ہے۔ میں نے جاوید اور نوشاہہ کی طرف دیکھا۔ جاوید حسب سابق برا غیر متعلق نظر آ رہا تھا۔ مگر نوشاہہ اب بھی مجھے پریشان ہی نہیں کچھ خوفزدہ بھی محسوس ہوئی۔ پتے تقسیم کیے گئے۔ پہلی بار امتیاز نے جیت لی۔ دوسری مرتبہ میں نے گڈی پھینٹی اور یہ بازی میرے ہاتھ رہی۔ اس سے مجھے اندازے کی

ان تین بازوؤں میں ایک ہاتھ تھم رہا تھا۔ اس کا ہاتھ اس کا ہاتھ تھا تو اب بچنے اور دوسرے امتیاز نے مرنے پر ہر بار ایک ہی رہا۔ یعنی میری جیت تیسری بازی کے اختتام پر میں نے اپنے سامنے رکھے ہوئے نوٹ گنے تو تین لاکھ دس ہزار نکلے۔ یعنی میں دو لاکھ دس ہزار جیت چکا تھا۔

”آج کی رات آپ کی خوش بختی کی رات ہے۔ ناصر صاحب۔“ امتیاز نے ایک پھینکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ”میری طرف سے مبارکباد قبول کریں امید ہے کہ آپ آئندہ بھی کلب آتے رہیں گے۔ آپ سے جیتنا میری آرزو بن چکا ہے۔“

”میں کوئی پیشہ ور کھلاڑی نہیں ہوں۔“ میں نے نرم لہجے میں ہی جواب دیا اور جاوید عزیز کی طرف اشارہ کیا۔ ”آج تو صرف ایک شریف نوجوان کی مدد کے خیال سے آ گیا تھا۔ ویسے آپ کی خواہش کا احترام کرنا بھی میرے لیے ضروری ہے۔ اس لیے جلد ہی پھر کسی دن حاضر ہوں گا۔“

یہ کہتے ہوئے میں نے ایک لاکھ کے نوٹ اٹھا کر جاوید کی طرف بڑھا دیے۔

”یہ لو بھائی تمہارا نقصان تو پورا ہو گیا۔“ میں نے کہا۔ ”امید ہے آئندہ بھی ایسی حماقت میں مبتلا نہیں ہو گے۔“

جاوید نے شکریے کے طور پر کچھ کہا اور نوٹ اپنی جیب میں رکھ لیے۔ اس کے انداز سے بالکل یہ محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ میری جیت سے خوش ہے۔ البتہ نوشاہہ کی آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہا۔ مجھے بار بار احساس ہو رہا تھا کہ وہ کسی اندیشے سے فکر مند ہے۔ امتیاز نے میری جیت کی خوشی میں جام کی تجویز پیش کی۔

یہ کوشش میرے مخالف ساتھی اور مگران کھیل کے دوران بھی کرتے رہے تھے۔ مگر میں نے

رہنم پہلے ہی بریف کیس میں رکھ چکا تھا۔ گلاس ٹرے میں واپس رکھتے ہوئے اٹھا۔ امتیاز سے ہاتھ ملایا۔ اس کا شکریہ ادا کیا اور جاوید اور نوشاہہ کو لے کر کمرے سے باہر نکلا لیکن ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ ایک دم چکر اگیا۔ ایک دم سے سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ نظروں کے سامنے تاریکی چھا گئی اور پھر جیسے میں اٹھا گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

مجھے معلوم نہیں کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہا لیکن آنکھ کھلی تو میں ایک کمرے کے فرش پر دست و پا بستہ پڑا ہوا تھا۔ مزید یہ کہ میرے منہ پر شیپ چپکا دیا گیا تھا کہ میں آواز بھی نہ نکال سکوں۔ کمرے میں ایک زیر و کا سبز بلب روشن تھا جس کی ہلکی روشنی میں میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ ایک مختصر سا کمرہ تھا۔ جس کی پینش دس بائی دس سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی اور ہر قسم کے فرنیچر یا کسی بھی چیز کی موجودگی سے یکسر خالی تھا۔ چمت بھی زیادہ بلند نہیں تھی۔

کمرے میں صرف ایک دروازہ اور ایک کھڑکی نظر آ رہی تھی اور دونوں بند تھے۔ میرے ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے تھے۔ جس کے باعث اپنی رست واپس دیکھ کر وقت کا اندازہ لگانا بھی مشکل تھا ہاتھ اور پیروں کی بندشوں کے علاوہ

غزلیں

ڈاکٹر منور ہاشمی

شہرت کے شہر میں ترے سامان ہیں بہت
اپنے لیے تو اس میں بھی نقصان ہیں بہت

اچھا نہیں ہے توڑنا یکسر کسی کا دل
انکار ہو تو اس کے بھی عنوان ہیں بہت

درد و الم ، جفا و ستم، بے قراریاں
ہم پر جمال یار کے احسان ہیں بہت

پھیلا ہے چار سو مرے جنگل حیات کا
مل جائیں ایک دو بھی جو انسان ہیں بہت

غم سے گریز کر کے منور لکھے غزل
کاغذ کے دل میں آج بھی ارمان ہیں بہت

☆

سید جواد حسن جواد

کم گو ہے وہ نہ ضد ہے مری التماس سے
شیریں دہن ہے لب نہیں کھلتے مٹھاس سے

دیکھا ہے لے کے جائزہ ہوش و حواس سے
دلکش وہ چاند دور سے پیارا ہے پاس سے

چہرہ ہے اس کا مظہر رعنائی و مزاج
اندازہ کتاب ہوا اقتباس سے

جواد یوں تو واقعی سادہ سا ہے وہ شخص
چاہت بھری نظر میں ہے کیا کچھ قیاس سے

ان لوگوں نے رسی کو میرے گرد لپیٹ کر مزید
اطمینان کر لیا تھا کہ میں کسی بھی طرح اپنے آپ کو
آزاد نہ کر سکوں۔ بریف کیس جو میں لایا تھا
غائب تھا۔

میں نے اپنی تکلیف وہ پوزیشن کو کم کرنے
کے لیے ذہن کو دوسری طرف متوجہ کر لیا۔ اب
تک کے واقعات کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ
بات سمجھنے کے لیے کسی خاص ذہانت کی ضرورت
نہیں تھی کہ پروفیسر ڈان زان کی آمد سے لے کر
جاوید عزیز اور نوشابہ کی ملاقات اور ان کی فرضی
داستان تک ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا جس کے
ذریعے مجھے لوٹنا مقصود تھا کہ غالباً کسی ذہین اور
چالاک جرائم پیشہ کی سربراہی میں نہ صرف وہ قمار
خانہ بلکہ دوسری غیر قانونی سرگرمیاں ہی اس قلعہ
نما عمارت میں جاری تھیں اور اسحق رئیس زادے
اور سادہ لوح دولت مند لوگوں کو اسی ترکیب سے
پھانس کر لایا جاتا تھا۔ تاکہ غیر ضروری خطرات
مول لیے بغیر انھوں روپے حاصل کر سکیں۔

ظاہر ہے میری جگہ کوئی دوسرا شخص بھی ہوتا
تو وہ ایک حسین دو شیزہ کی مدد اور کچھ خود بھی فائدہ
اٹھانے کے لالچ میں اس قمار خانے میں اپنی لاکھ
دو لاکھ کی رقم سے ہاتھ دھو بیٹھتا اور مایوسی اور
دلگدگی کے عالم میں جاوید اور نوشابہ سے خفت
آمیز آمیز معذرت خوانی کے ساتھ اسی طرح
آنکھوں پر پٹی باندھ کر واپس بھیج دیا جاتا۔ واپسی
کے بعد اس سے کوئی خطرہ بھی نہ تھا۔ اول تو ایسے
سادہ لوح شکار پولیس تک پہنچنے کی ہمت ہی نہیں
رکھتے اور ان میں سے اگر کوئی دل جلا قانون کی
مدد لینے کی کوشش بھی کرتا تو اس کے پاس اپنے
الزامات کو ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت نہ
ہوتا۔ میں بھی اگر ہار چکا ہوتا تو اس وقت اس نیم
تاریک کمرے کے ٹھنڈے فرش پر پڑا ہونے کے
 بجائے اپنے شان دار بیڈروم میں نرم و گداز بستر
پر لیٹا اپنی بدستی کا ماتم کر رہا ہوتا۔

میں کامیاب ہو گئے تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گی۔“

”مگر کیوں۔“ میں نے آہستہ آواز میں پوچھا۔ ”انہیں مجھ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ بے ہوش کرنے کے بعد وہ مجھے شہر میں کسی بھی جگہ ڈال کر اپنا پیچھا چھڑا سکتے تھے۔“

”امتیاز..... وہ آدمی جو بعد میں کھیل میں شامل ہوا وہ اس پورے گروہ کا سرغنہ ہے۔ مگر یہ بات صرف چند افراد ہی جانتے ہیں۔ اس وقت شہر میں اگر کوئی کاروباری حریف اور جانی دشمن ہے تو وہ ظہیر الدین ہے۔ جو خود بھی کئی خفیہ اڈوں کا مالک ہے۔ کچھ دن پہلے ظہیر الدین نے امتیاز کے ایک خاص آدمی کو قتل کر دیا تھا۔ آج رات آپ جس طرح بازی کھیلے ہیں۔ اس سے امتیاز کو شبہ ہو گیا کہ آپ ظہیر الدین کے گروہ کے کارکن ہیں اور ظہیر الدین نے آپ کو امتیاز کے اڈوں کا راز معلوم کرنے یا اسے جان سے مارنے کے لیے بھیجا ہے۔ اس لیے وہ نہ صرف اپنے ساتھی کا انتقام لینے بلکہ ظہیر الدین کو سبق سکھانے کے لیے آپ کو ختم کرنا چاہتا ہے۔“

”تم اگر اس کے گروہ کے ممبر ہو تو تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے۔ یقیناً میں تمہارا پہلا شکار تو نہیں ہو سکتا۔ تم اور جاوید پہلے بھی اجتن ریکس زادوں کو پھانسی کر لاتے رہے ہو گے۔“

”یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔“ نوشابہ کے لمحے میں غلت اور گھبراہٹ نمایاں تھی۔ ”اس کے آدمی کسی بھی لمحے یہاں آ سکتے ہیں۔ ابھی آپ یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں غنیمت ہے کہ انہوں نے آپ کو اتنی لمبی رسی سے باندھنا ضروری سمجھا یہ کہہ عمارت کے عقبی حصے اور تیسری منزل پر واقع ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ کھڑکی سے رسی باندھی جائے تو وہ آپ کو زمین تک پہنچا دے گی۔ اس کے علاوہ یہ رپو اور ہے۔ جو آپ کو اپنی حفاظت میں مدد دے سکتا ہے۔ بس میں اتنا ہی

لیکن قابل غور سوال یہ تھا کہ مجھے بے ہوش کر کے اپنی اور میری رقم پر قبضہ کرنے کے بعد انہوں نے مجھے یہاں بند کرنا کیوں ضروری سمجھا۔ اس کمرے کے بجائے اگر وہ مجھے شہر کے کسی فٹ پاتھ یا کسی پارک وغیرہ میں ڈال دیتے تو میں ان کا کیا بازو لٹکتا تھا۔ ظاہر تھا کہ مجھے نہ اس عمارت کا کوئی پتہ معلوم تھا اور نہ اب تک اس ڈرامے میں حصہ لینے والے کرداروں کے بارے میں کچھ جانتا تھا۔ پھر انہیں میری ذات سے ایسا کیا خطرہ محسوس ہوا کہ مجھے گرفتار کرنا ضروری سمجھا اور یہ کہ اب آئندہ میرے بارے میں ان کے کیا ارادے ہیں۔۔

میں اس مسئلے پر سوچ ہی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور نوشابہ بڑے محتاط انداز میں اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر مجھے کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ دشمن کے کمپ میں اگر کوئی میری مدد کر سکتا ہے تو وہ یہ ہی حسین لڑکی ہے۔ آہٹ سن کر میں آنکھیں بند کرنے اور بدستور بے ہوش ظاہر کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ مگر اسے دیکھ کر یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس نے بھی دروازہ اندر سے بند کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا کہ میں ہوش میں آچکا ہوں۔ وہ دبے پاؤں میرے قریب آئی۔

رسی کھولنے میں کچھ دیر لگی مگر وہ مصلحت جس کے پیش نظر اس نے میری بندشیں کاٹنے کے بجائے کھولنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ اپنے منہ پر لگا ہوا ٹیپ میں نے خود ہی ایک جھٹکے سے الگ کر دیا۔

”وہ لوگ آپ کو ختم کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ اس مصیبت میں گرفتار ہوئے۔ آپ کو رہا کر کے میں خود اپنی زندگی کے لیے خطرہ مول لے رہی ہوں۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اگر وہ لوگ آپ کی جان لینے

کر سکتی تھی۔“

میں کسی معمولی چوٹ کا بھی خطرہ مول لیے بغیر کود سکتا تھا۔

یہ ایک تنگ تاریک گلی تھی۔ نیم تاریک اس لیے کہ گلی کی اپنی کوئی روشنی نہیں تھی۔ صرف عمارت کی کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر آنے والی روشنی نے اندھیرے کو اس حد تک ضرور کم کر دیا تھا کہ ٹھوکر کھائے بغیر گلی پار کی جاسکتی تھی۔ ابھی تک عمارت میں کوئی ہنگامہ اٹھتا معلوم نہیں ہوا تھا۔ اس لیے یہ ہی سوچا جاسکتا تھا کہ وہ لوگ ابھی میرے فرار سے واقف نہیں ہوئے۔ گلی سے نکل کر ایک بڑی لڑکی پر آیا۔ میں نے گہری سانس لی اور شہر کی جانب چل دیا۔

نوشابہ اپنے وعدے پر پوری اتری۔ اگرچہ جب وہ یہ بات کہہ رہی تھی تو مجھے کچھ زیادہ یقین نہیں تھا لیکن وہ ٹھیک دو بجے میرے بنگلے پر پہنچ گئی۔ اس کے خیال میں یہ تاٹم اس لیے محفوظ تھا کہ اس کی اپنی ڈیوٹی پانچ بجے سہ پہر سے شروع ہوئی تھی اور رات کے تین بجے تک جاری رہتی تھی۔ میں اسے ڈیڑی کے اسٹڈی روم میں لے کے گیا اور مولاداد کو ہدایت کر دی کہ خواہ کوئی بھی ملے آئے کہہ دے کہ میں اس وقت گھر میں موجود نہیں ہوں اور نہ یہ معلوم ہے کہ کہاں گیا ہوں۔ یا کب واپس آؤں گا امریکہ سے واپسی کے بعد پہلا موقع تھا کہ کوئی لڑکی بلکہ کوئی خوب صورت لڑکی مجھ سے ملے آئی تھی۔

مگر مولاداد نے کوئی حیرت ظاہر نہیں کی ممکن ہے وہ ڈیڑی سے میرے بارے میں سنتا رہا ہو یا پھر اس نے سوچا ہو کہ امریکہ میں دو برس رہ کر آیا ہے ابھی تک غیر شادی شدہ ہے۔ اس سے اور کیا توقع کی جاسکتی ہے یا شاید اس نے کچھ سمجھ داری سے کام لیا ہو۔ بہر حال اس نے بڑی سنجیدگی سے سر ہلایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

اب میں نوشابہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے پاس وقت کم تھا یا اسے یہ اندیشہ تھا کہ ممکن ہے وہ

اس نے اعشاریہ 38 بور کا ایک کولٹ ریوالور میرے ہاتھ میں دے دیا۔ مگر میں نے اس وقت تک جانے پر آمادگی ظاہر نہ کی جب تک نوشابہ نے دوسرے دن میرے بنگلے پر آ کر بیٹے کا وعدہ نہیں کر لیا۔ وہ میرے بنگلے کا پتہ جانتی تھی اور ظاہر تھا کہ ان حالات میں ہمارا کسی عام کلب یا پبلک مقام پر ملنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ واپس چلی گئی اور جاتے ہوئے باہر سے دروازے کی کڑی لگا دی۔ جیسا کہ اس کے کہنے کے مطابق پہلے گئی ہوئی تھی۔

انتیاز کے آدمیوں نے قفل لگانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ میں نے اس کے جاتے ہی کڑی کھولی اور پچھلی کے ہک میں رسی باندھی خوش قسمتی سے رسی نائیلون کی ہونے کی وجہ سے کافی پتلی مگر بے حد مضبوط تھی ورنہ مجھے کوئی باندھنے کی جگہ تلاش کرنا مشکل ہو جاتا۔ پھر میں نے اپنا کولٹ اتار کر اسے الٹا یعنی پشت کا حصہ آگے کی جانب کر کے اس طرح پہنا کہ آستینیں ہاتھوں سے آگے نکلی رہیں اور نائیلون کی پتلی رسی پکڑ کر نیچے اترنے یا پھسلنے میں میرے ہاتھ زخمی نہ ہوں۔

ابھی تک کوئی ایسا تجربہ تو نہیں ہوا تھا۔ البتہ طالب علمی کے زمانے میں جب میں ڈیڑی سے چھپ کر فلموں کا سینڈشود دیکھنے جاتا تھا تو ایک رسی کی مدد سے اپنے کمرے سے نیچے اترنے اور پھر دوبارہ چڑھنے کی کافی مشق حاصل تھی۔ شاید وہی مشق اس وقت کام آ رہی تھی اور میں کسی خاص دشواری کے بغیر نیچے اترتا بلکہ کہنا چاہیے کہ پھسلتا چلا گیا۔ عمارت میں جتنے بھی کمروں کی کھڑکیاں اس جانب تھیں ان میں سے کوئی بھی کھلی ہوئی نہیں تھی۔ اس لیے کسی نے بھی مجھے اترتے نہیں دیکھا۔ رسی کے بارے میں نوشابہ کا اندازہ قریب قریب درست ہی نکلا وہ زمین تک تو نہیں پہنچی مگر مجھے اتنے فاصلے تک ضرور اتار دیا۔ جہاں سے

مکان فروخت کرنے کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں۔

پھر ایک دن امتیاز اپنے قرض کی وصولی کے لیے قرتی لے کر آ پہنچا اس دوران اس کے والد کی حالت خراب تھی۔ پیسہ پاس نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی خوراک نہیں خرید سکتے تھے۔ وہ نئے بازوؤں کو جب ان کی مطلوبہ خوراک دستیاب نہ ہو یا وہ اسے خریدنے سے قاصر ہوں تو ان کی کیسی بری حالت ہو جاتی ہے۔ یہ کوئی منشیات کا عادی شخص ہی جان سکتا ہے۔ امتیاز قرتی لے کر آیا تھا۔ مگر اسے دیکھ کر وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے پیش کش کی کہ اگر نوشاہہ اس کی مرضی کے مطابق کام کرنا منظور کر لے تو وہ نہ صرف تمام قرض معاف کر سکتا ہے۔ بلکہ اس کے والد کو بھی جس کی ایک خوراک روزانہ فراہم کر سکتا ہے اور اگر نوشاہہ نہ ہو شیاری اور وفاداری سے کام لیا تو اس کی خدمات کا محقول معاوضہ بھی دیا جائے گا۔ جس سے وہ بہ آسانی اپنی گزراوقات کر سکے گی۔ نوشاہہ نے صرف ایک شرط عائد کی کہ اسے جسم فروشی پر آمادہ نہ کیا جائے اور امتیاز نے یہ شرط منظور کر لی۔ تب سے وہ اس کے گروہ میں کام کر رہی ہے اور اب اس حادثے کو تقریباً تین سال گزر چکے ہیں۔ امتیاز نے اس سے مختلف کام لیے۔ کلب کے ریسپشن کاؤنٹر پر بھی بٹھایا اور منشیات گاہکوں کو فراہم کرنے کا ذریعہ بھی بنایا۔ اب لگ بھگ ایک برس سے وہ دولت مند محقوں کو پھانس کر قمار خانے تک لے جاتی ہے۔ نوشاہہ مجھے اس کی پوری تفصیل بتانے لگی تھی۔ مگر میں نے اسے روک دیا اور مسکراتے ہوئے بتایا کہ میں اتنا اندازہ لگا چکا ہوں کہ اس طرح بھانسنے کے پروگرام کا آغاز پروفیسر ڈان زان مغل کی آمد سے شروع ہوتا ہے۔

نوشاہہ نے حیرت اور تعریف کے ملے جلے انداز سے میری طرف دیکھا اور چند لمحے ٹھہر کر

اپنی بات پوری نہ کر سکے کہ اس نے کسی تمہید کے بغیر آغاز کلام کر دیا۔ پہلے اس نے بتایا کہ گزشتہ رات میرے فرار کے دو اثرات مرتب ہوئے۔ پہلا تو یہ کہ امتیاز مجھے غیر معمولی طور پر ذہین اور چالاک خیال کرنے لگا ہے اور اپنے گروہ سے ایک آدمی کو حکم دیا ہے کہ میرے بارے میں جملہ معلومات فراہم کی جائیں۔

دوسرے یہ کہ اسے کچھ شبہ ہو گیا ہے کہ اس کے اپنے گروہ میں ظہیر الدین کا کوئی جاسوس کام کر رہا ہے۔ بہر حال فیصحت ہے کہ اسے کسی بھی طرح نوشاہہ پر شک نہیں ہوا۔ پھر اس نے اپنے متعلق بتایا کہ اس کا تعلق ایک شریف اور عزت دار خاندان سے ہے۔ اس کے والد ایک بڑے بزنس مین تھے۔ انہوں نے اس کی ماں سے اپنے خاندان کی مرضی کے خلاف محبت کی شادی تھی۔

چنانچہ خاندان کے دیگر لوگوں نے ان سے تعلقات ختم کر دیے مزید بد قسمتی یہ ہوئی کہ اس کی والدہ شادی کے دوسرے سال ہی اس کی پیدائش کے وقت کسی چھیدگی اور کیس بگڑ جانے کی وجہ سے انتقال کر گئیں۔ ان کی موت کا والدہ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ غم غلط کرنے کے لیے پہلے شراب اور پھر چرس کے عادی ہو گئے۔ اس کی پرورش، تعلیم و تربیت اس کی بیوہ خالہ نے کی مگر جب تک وہ سن شعور تک پہنچی۔ اس کے والد کا کاروبار تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ اپنی لت پوری کرنے کے لیے انہوں نے ذاتی اور موروثی جائیداد فروخت کرنا شروع کر دی اور ابھی وہ پورے پچیس سال کی بھی نہیں ہوئی تھی اور تھوڑا سا ہی کی طالبہ تھی کہ تمام جائیداد بھی نئے کی سمیٹ چڑھ چکی تھی۔

صرف وہ چھوٹا سا مکان رہ گیا تھا۔ جہاں وہ اور اس کی خالہ سر چھپائے بیٹھی تھیں۔ والد ہزاروں کے نہیں لاکھوں کے مقروض ہو چکے تھے۔ مگر اتنا ہوش ان کو باقی تھا کہ انہوں نے وہ

وہاں شب و روز ہر قسم کے مجرمانہ اور غیر قانونی کام ہوتے رہتے ہیں۔ مختلف قسم کا جوا ہونے کے علاوہ وہاں بڑے بڑے پینے پر فاشی بھی ہوتی ہے۔ ایک حصہ ایسا بھی ہے۔ جہاں اونچی سوسائٹی کے لوگ جو کسی نہ کسی نشے کے عادی ہیں۔ بڑے راز دارانہ طریقے پر آتے ہیں اور شاندار سچے سچے آرام دہ کمروں میں کئی کئی دن نشے کے عالم میں مدھوش پڑے رہتے ہیں۔ وہاں اسمگلنگ کا اڈا بھی ہے۔ جہاں مال بیچتے اور خریدنے والے دونوں خفیہ طریقوں پر ملاقاتیں کرتے ہیں اور روزانہ لاکھوں کا ہیر پھیر ہوتا رہتا ہے۔

میں نے نوشاہہ کو بتایا کہ مجھے خواہ مخواہ خدائی فوجدار بننے کا کوئی شوق نہیں ہے لیکن امتیاز نے مجھ پر ہاتھ ڈال کر اچھا نہیں کیا۔ اب میں نے اس سے انتقام لینے اور نوشاہہ کو اس کی قید سے آزاد کرانے کے لیے کوئی دقیقہ نہیں رکھوں گا۔ خاص طور سے اس حقیقت کے پیش نظر کہ امتیاز کا ارادہ بھی مجھے اکیلا چھوڑ دینے کا نہیں معلوم ہوتا اسی لیے اس نے اپنے آدمیوں کو میرے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا حکم دیا ہے اور عقلمند وہی ہے۔ نیز یہ کہ آنکھ دہ نوشاہہ کا میرے بنگلے پر آنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ ملاقات اگر دن کے اوقات ہی میں ہو سکتی ہے تو ہم گاہے گاہے ضرور ملیں گے۔ یہ دوسری جو بات سے بھی ضروری ہے لیکن ہر مرتبہ کسی نئے اور معروف مقام پر۔

اس کے بعد بھی میں اور نوشاہہ ملتے رہے۔ میں اس سے امتیاز کے بارے میں جو کچھ اسے معلوم تھا پوچھتا رہا لیکن خود اسے اپنے منصوبے کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا۔ پندرہ بیس دن تک میں اسے اپنے پلان کے بارے میں سوچتا اور اس کی ہر چھوٹی بڑی تفصیل پر غور اور اسی مناسبت سے اس کی تیاری کرتا رہا۔ یہ ظاہر تھا کہ اگر میں واقعی امتیاز اور اس کے گردہ کو تباہ و برباد

دوبارہ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ وہ اب تک بے شمار احمق دولت مندوں کو جن میں نوجوان اور ادا میٹر عمر دونوں ہی شامل ہیں ممتاز خانے لے جا چکی ہے۔ اس کا میسر شروع سے ہی اسے امتیاز کا آلہ کار بننے پر ملامت کرتا رہا ہے لیکن اپنے والد کی نشے کی عادت اور پھر گزر اوقات کے لیے ایک ذریعہ آمدنی کی مجبوری کے باعث وہ امتیاز کے اشاروں پر جلتی رہی ہے۔ ویسے امتیاز نے بھی اپنے کیے ہوئے وعدے کا پوری طرح لحاظ رکھا ہے۔ آج تک کبھی اسے اسکی مرضی کے خلاف کسی بات پر مجبور نہیں کیا گیا۔ اتنا ہی نہیں۔ وہ خود اور اس کے گردہ کا ہر آدمی اس کے ساتھ بڑی شرافت سے پیش آتا رہا ہے۔ نیز یہ کہ اب امتیاز اسے پانچ ہزار ماہانہ معاوضہ بھی ادا کرتا ہے۔ جو اس کی بوڑھے والد اور بیوہ خالہ کی گزر بسر کے لیے کافی سے زیادہ ہے۔

جب مجھے پھانسنے کے لیے جال بچھایا گیا تو وہ جاوید عزیز کے ساتھ پہلی مرتبہ کلب میں مجھ سے ملاقات کے بعد ہی سے میری شخصیت سے کافی متاثر ہوئی تھی۔ اس کا دل مجھے دھوکہ دیتے ہوئے کچھ زیادہ ہی ملامت کر رہا تھا لیکن پھر بھی وہ میرے لیے شاید اپنے آپ کو خطرے میں نہ ڈالتی لیکن شاید کلب میں جو کچھ ہوا اور اس کے بعد جب امتیاز اور اس کے آدمیوں نے مجھے قتل کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کا میسر تڑپ اٹھا اور اس نے میری مدد کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ مجھے معلوم ہی تھا۔ میں نے نوشاہہ سے اس عمارت کے بارے میں سوالات کیے۔ جو شہر کی ایک ماڈرن سوسائٹی کے علاقے میں واقع تھی۔ اس نے بتایا کہ بظاہر وہ عمارت ایک جدید طرز کا بورڈنگ اور لاجنگ ہاؤس ہے۔ جہاں صرف لوگوں کو دکھانے اور قانون کو دھوکہ دینے کے لیے امتیاز کے ساتھی شریف اور معزز کرائے داروں کے ہمیں میں رہتے ہیں لیکن حقیقت میں

کچھ دیر کے بعد ایک اور لمبی داڑھی والے صاحب اندر سے نمودار ہوئے میں انہیں ایس پی صاحب سمجھ کر سلام کرنے ہی لگا تھا کہ چوکیدار نے بتایا کہ یہ صاحب کا خانساں ہے۔ میں اس کے ذریعے آپ کے آنے کی اطلاع کرائے دیتا ہوں۔ خانساں چوکیدار سے کچھ گفتگو کرنے کے بعد اندر واپس گیا تو میرے سوال کے جواب میں چوکیدار نے کہا کہ اس کا نام کریم بخش ہے۔ بھی فرید کالونی کے تھانے میں کاشیبل ہوا کرتا تھا۔ کسی چکر میں پھنس کر ملازمت سے نکالا گیا تو صاحب نے ملازم رکھا۔

نقریادس منٹ کے بعد اندر سے میری طلبی ہوئی۔ کریم بخش مجھے اپنے ساتھ جس کمرے میں لے گیا وہاں ایک سفید باریش بزرگ جائے نماز پر بیٹھے۔ ایک دوسرے باریش کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انداز گفتگو سے ظاہر ہوا کہ ان میں سے ایک بزرگ سابقہ ایس پی شیر جنگ ہیں اور دوسرے مولانا ان کے سیکرٹری ہیں۔ جنہیں ایس پی صاحب اپنی وسیع دہکی اراضی کے متعلق کچھ ضروری احکامات دے رہے تھے۔ سیکرٹری صاحب سر ہلاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ تو میں نے ایس پی صاحب سے اپنا تعارف کرایا۔ وہ میرے والد مرحوم کا نام سننے ہی اتنے جوش میں آئے کہ مٹلے سے اٹھ کر بغل گیر ہوئے اور کافی دیر تک ہوتے رہے۔

خیر و عافیت کے موضوع پر باتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو میں نے اپنی آمد کا مدعا عرض کیا۔ ایس پی صاحب بڑی خجندی اور خاموشی کے ساتھ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے رہے اور گاہے گاہے سر ہلاتے ہوئے میری گزارشات سننے رہے۔ پھر اٹھے۔ میز کی دراز سے ایک رائیٹنگ پیڈ نکال کر اس پر کچھ لکھتے رہے۔ پھر وہ کاغذ پیڈ سے پھاڑ کر بڑی ہی احتیاط و نفاست سے تہہ کر کے ایک سادہ لفافے میں رکھا۔ لفافے پر کسی انسپکٹر جمال بیک کا

کرنا چاہتا ہوں۔ کہ اس کے بغیر نوشاہہ کو ہر خطرے سے آزادی نہیں مل سکتی تھی تو اس کے لیے مجھے لازماً قانون کی مدد لینا ہوگی مجھے یاد تھا کہ ڈیڑی کے دوستوں میں کئی اعلیٰ پولیس افسران بھی شامل تھے۔ ان میں سے ایک ایس پی شیر جنگ صاحب کا نام ابھی تک میری یادداشت میں موجود تھا۔ مگر اس بات کو خاصا عرصہ گزر چکا تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ شیر جنگ صاحب اب بھی پولیس کے محکمے میں موجود ہوں گے۔ ان کا ریٹائرمنٹ ہی نہیں بلکہ خود ان کا مرحوم ہونا بھی غیر متوقع نہیں تھا۔ پھر بھی دریافت حال میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ چنانچہ ایک دن میں پولیس ہیڈ کوارٹر جا پہنچا کتنے ہی کمرے جھانکنے کے اور کافی سے زیادہ سرخ فیتے کی پیکائش کے بعد مجھے بتایا گیا کہ ایس پی شیر جنگ ریٹائر ہو چکے ہیں اور میں ضرور ہی ان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں تو میر ہلاک میں فلاں نمبر کی کوشی پر پہنچ جاؤں۔ ایس پی صاحب کا موڈ ہوا تو شرف ملاقات حاصل ہو جائے گی۔

میں تلاش کرتے کرتے منزل مقصود پر پہنچا تو عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت تھا گیٹ پر ایک باریش چوکیدار سے دعا سلام ہوئی میں نے بتایا کہ میں ایس پی صاحب کے مرحوم دوست سیٹھ احمد شاہ درانی کا بیٹا ہوں اور ایک ضروری کام کے سلسلے میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ چوکیدار نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سیج کے دانے شمار کرتے ہوئے بتایا کہ صاحب عصر کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ جس سے ٹھیک چھ بجے فارغ ہوں گے میں چاہوں تو انتظار کر سکتا ہوں۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ چھ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ چنانچہ میں وہیں چوکیدار کے پاس ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ وقت گزاری کے لیے باتیں کرنے لگا۔ تو انکشاف ہوا کہ موصوف ریٹائرڈ ہیڈ کاشیبل ہیں۔

غزلیں

اعتبار ساجد

ہر اک رہو، ہر اک وہ گیر کو ذخیر کیا کرنا
اتنا کے نام پر ہر شخص کو تغیر کیا کرنا

خبر اُس گھر کی بھی لیتی ہے جس کی جہت شکست ہے
فقط خوابوں میں اک قصر حسین تغیر کیا کرنا

بہت کافی ہے سن لیتی ہیں دیواریں مرے ڈکڑے
سنا کر حال دل ہر شخص کو دلگیر کیا کرنا

ہمیشہ جس کو عزت دی سر آنکھوں پر بٹھایا ہے
ذرا سی بات پر اب اُس کو بے وقور کیا کرنا

اسی کنیا میں رہتا ہے ابھی کھل جائیں گی آنکھیں
تو پھر لے کر تمہارے خواب کی جاگیر کیا کرنا

وہی رکھتی ہے آشفۂ سری جو اُن کا شیوہ تھی
وقا میں کام کوئی بھی خلاف میر کیا کرنا

غالب عرفان

قسم ہے اس پہلی کی جب تجھے میں نے دیکھا دیوانہ دیکھا
وجود سے ماورا بھی تجھ کو خیال کے آر پار دیکھا

نظر پڑی ہے جہاں بھی تم پر تو صرف ذلّوں کا ذکر ہی کیا
تمہارے ملیں پر بھی میں نے ہواؤں کا اختیار دیکھا

سحر سے پہلے مہکنے والی وہ شب کہیں لوٹ کر نہ جائے
تسک ہوئی شام نے جو میرا کبھی در انتظار دیکھا

نام لکھا اور لفظ مجھے دیتے ہوئے ہدایت کی کہ
میں مکتوبہ الیہ سے کل ہی ملاقات کروں۔ وہ جو
کچھ بھی کر سکے گا ضرور کرے گا کیونکہ عنقریب وہ
ان کا داماد بننے والا ہے میں نے شکر یہ ادا کیا اور
رخصتی کی اجازت چاہی چلتے چلتے ایک یوں ہی
خیال سا آیا اور میں نے ایس پی صاحب سے ان
کے سیکرٹری کے بارے میں پوچھ ہی لیا۔ میرا
اندازہ درست تھا۔ وہ ایک سابقہ ایس ایچ او
تھے۔

☆☆☆

پولیس ہیڈ کوارٹر میں انسپٹر جمال بیک نے
شیر جنگ صاحب کا نام سنتے ہی بڑی گرجوٹی سے
میرا استقبال کیا۔ مگر لفافے کے اندر رکھا ہوا خط
پڑھ کر ان کا چہرہ اتر گیا۔ مسکراہٹ جاڑوں کی
دھوپ کی طرح چمکی پڑ گئی۔

”کیا بات ہے۔ جمال بیک صاحب!“
میں نے پوچھا۔ ”آپ کس سوچ میں ڈوب
گئے۔“

”کیا عرض کروں ناصر شاہ صاحب!“ وہ
ایک گہری سانس لے کر بولے۔ ”آج کل میں
ایک انتہائی پیچیدہ کیس میں الجھا ہوا ہوں۔ نوشاد
راہی نامی ایک بہت بڑے اسمگلر کی تلاش کی
ذمے داری مجھ پر ڈال دی گئی ہے۔ یہ ایک
انتہائی خطرناک بین الاقوامی اسمگلر ہے جو ناجائز
غنیات خاص طور سے ہیروئن کی بڑے پیمانے پر
اسمگلنگ کرتا ہے۔ انٹر پول تک اسے پکڑنے میں
نا کام رہی ہے۔ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے
کہ اس کا ہیڈ کوارٹر ایک بڑے شہر میں کہیں واقع
ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ اپنے خفیہ تجربوں کی
اطلاعات پر پولیس نے مختلف افراد اور مقامات پر
چھاپے مار کر گزشتہ ایک سال میں ہیروئن کی جتنی
بڑی مقدار پکڑی ہے۔ اس نے تمام گزشتہ ریکارڈ
توڑ دیے۔“

مگر ان تمام کامیاب چھاپوں کے باوجود

اونچی سوسائٹی میں اٹھنا بیٹھنا ہے۔ اونچے کلبوں اور ایک دو خفیہ قمار بازی کے اڈوں پر ان کی آمد و رفت ممکن ہو سکتی ہے۔ مگر ابھی تک ان کے خلاف پولیس کے پاس جرائم پیشہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے کا کوئی ریکارڈ یا کوئی اطلاع نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کسی غلطی میں مبتلا ہو کر ایک مقتدر شخصیت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کریں اور بعد میں کف افسوس ملنا پڑے۔ کسی غلطی کی صورت میں آپ کا جو حشر ہوگا۔ وہ تو ہوگا ہی مگر آپ سے تعاون کی پاداش میں، میں بلاوجہ مشکل میں پھنس جاؤں گا۔“

”آپ اطمینان رکھیں۔“ میں بولا۔ ”میں بلاشبہ کوئی تجربہ کار پولیس آفیسر نہیں لیکن میں نے دو سال تک امریکہ میں وہاں جرائم پیشہ افراد اور ان کی سرگرمیوں کو کافی قریب سے دیکھا ہے میں ہرگز کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے آپ پر کوئی آج آئے۔ اس کے علاوہ مجھے اپنی موجودہ زندگی اور اس کے مفادات بھی بے حد عزیز ہیں میں اس قاضی کے قبیلے سے بھی نہیں ہوں جو شہر کے اندیشے میں دبلا ہوا کرتا ہے۔ آپ یقین رکھیں آپ تک تو بات بعد میں پہنچے گی۔ اس سے پہلے اگر مجھے اپنے لیے کوئی حقیقی خطرہ محسوس ہوا تو بغیر شرمندہ ہوئے بھاگ کھڑا ہوں گا۔“

انسپکٹر جمال بیک مسکرانے لگے۔ غالباً اب انہیں کچھ اطمینان ہو گیا تھا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ اگر میں نے اسی محتاط سوچ اور طرز عمل سے کام لیا تو ضرورت پڑنے پر وہ ہر ممکن تعاون کے لیے آمادہ ہیں۔ میں ان سے رابطہ قائم رکھوں اور اپنی کارگزاری کی رپورٹ دیتا رہوں گا۔ اس کے لیے انہوں نے مجھے دونوں بھی دیے جس پر ہنگامی حالات یا آفس میں ان کی عدم موجودگی کے بالواسطہ یا بلاواسطہ رابطہ قائم کیا جاسکتا تھا اور اس ملاقات کے تیسرے دن میں اپنے بنگلے سے غائب ہو گیا۔

ہمیں شبہ ہے کہ مجرم اب بھی نا معلوم ذرائع اور وسائل سے ہیر و من بھاری مقدار میں دوطرفہ طور پر اسمگل کر رہے ہیں۔ نوٹشادر ایسی کا فٹو اگرچہ پولیس ریکارڈ میں موجود ہے۔ مگر اس کے علاوہ اس کے بارے میں کوئی اور بنیادی معلومات حاصل نہیں ہیں۔ اس کی گرفتاری کے لیے گزشتہ دو سال میں چار ہوشیار اور ذہین آفیسر مقرر کیے گئے مگر وہ تمام جدوجہد کے باوجود کامیاب نہ ہو سکے اور اس کی پاداش میں نہ صرف ان کا کمپیوٹر ریکارڈ خراب ہوا۔ بلکہ کہیں کہیں پر جزوی معطلی اور تبادلہ وغیرہ کی مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑا۔

اب اس مہم کا قرعہ فال میرے نام پڑا ہے۔ بس خدا ہی ہے جو عزت و آبرو کے ساتھ مجھے سرخرو کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کیس میرے لیے انتہائی اہم ہے اور میں اس میں اس قدر مصروف ہوں کہ کسی اور معمولی مجرم کی طرف توجہ نہیں دے سکتا میں آپ سے صاف انکار کر دیتا۔ مگر آپ سفارش ایسی زبردست لائے ہیں کہ میں کشمکش میں پڑ گیا ہوں کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔“

”آپ بلاوجہ پریشان نہ ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں نے جو منصوبہ بنایا ہے۔ اس میں بنیادی کردار میرا ہی ہوگا۔ آپ کو صرف اس قدر زحمت دوں گا کہ جب میں کافی ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو آپ میرے بتائے ہوئے مقررہ وقت پر چھاپا مار کر مجرموں کو گرفتار کر لیں۔“

میں نے انہیں امتیاز کے بارے میں کچھ تفصیلات بتائیں انسپکٹر جمال بیک کچھ فکر مند ہو گئے۔

”آپ کے بیان نے مجھے الجھا دیا ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”امتیاز صاحب کوئی بڑے سیاسی لیڈر نہیں لیکن مقامی اور صوبائی سطح پر ان کی کافی اہمیت ہے۔ دولت مند ہونے کی وجہ سے ان کا



انہوں نے وہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ جس پر پہلے بھی عمل پیرا ہو چکے تھے۔ مگر آٹے سائے ہونے کے باوجود مجھے اعتماد تھا کہ وہ مجھے ہرگز نہیں پہچان سکیں گے۔ سیٹھ رحیم خان کی اس حیثیت سے میں نے میک اپ ہی ایسا کیا تھا کہ مجھے نہ صرف ان کے بلکہ نو شاہ کے بھی شناخت کرنے سے قاصر رہنے کا مکمل یقین تھا۔ چھوٹی سی فرنیچر کٹ داڑھی، ناک پر سنہری فریم کا چشمہ جس کے بغیر پاور کے نیلگویشوں کے پیچھے آنکھوں میں سبزی مائل کنٹیکٹ لینس چہرے ہاتھوں، بازوؤں، پیروں اور جہاں تک جسم کے کھلنے کا امکان تھا۔ قدرے سانولا رنگ، گالوں کی ہڈیوں پر معمولی سی پڈنگ، یہ سب ایسی چیزیں تھیں جنہیں نے میرا حلیہ کچھ سے کچھ کر دیا تھا۔

ڈان زان مغل نے حسب معمول اپنے کچھ کرب دکھائے پھر میرے شوق اور مشغلوں کے بارے میں سوال کیا میں نے محض انہیں تھوڑا سا پریشان کرنے کے لیے موسیقی، مصوری، گھر سواری اور ایسی ہی کچھ اور چیزوں کا ذکر کیا۔ انہوں نے بار بار پہلو بدلنے کے بعد آخر پوچھ ہی لیا کہ کیا آپ کولش، پوک، رمی یا ایسے کھیلوں سے کوئی لگاؤ نہیں میں اچھل پڑا جھٹ سے جواب دیا کہ فلش پر تو میری جان جاتی ہے لیکن میں بڑی بازیاں کھیلتا ہوں۔ انہوں نے گہری سانس لی اور یوں چشمہ بھی ان کے بریف کیس سے باہر آ گیا۔ میں نے کوئی خاص دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ کہا کہ میں ایسی چیزوں کا قائل نہیں۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر ناز ہے کیسا ہی شار پر ہو میرے مقابلے پر آ کر اس کی ساری ترکی تمام ہو جاتی ہے اور بالآخر جیت میری ہی ہوتی ہے۔ مغل صاحب نے چشمے کی افادیت پر مزید کچھ فرمایا اور میں یوں جیسے ان پر کوئی احسان کر رہا ہوں اسے خریدنے پر آمادہ ہو گیا۔ ڈان زان نے سمجھ لیا تھا کہ اس گاہک سے زیادہ ملنے کی امید نہیں اس لیے انہوں نے دور

سوسائٹی کے جس چھوٹے مگر خوب صورت اور ویل فرنشڈ بنگلے کو میں نے سیٹھ رحیم خان کے نام سے کرائے پر لیا تھا۔ اس میں پہلی ہی شام کو میں نے علاقے کے تمام عزیزین کو ایک تعارفی دعوت پر مدعو کیا اور اپنی افتتاحی تقریر میں بتایا کہ میرے آباؤ اجداد ایک بہت بڑے سیٹھ تھے اور ہندوستان سے ہجرت کر کے افریقہ چلے گئے تھے۔ خدا نے اپنا فضل و کرم کیا اور ہم جو یہاں سے خالی ہاتھ گئے تھے۔ ایک نسل کے بعد ہی آسودہ چالی کے دور میں داخل ہو گئے۔ ہم نے وہاں ہاتھی دانت کی تجارت اور اس کی مصنوعات کو اپنا ذریعہ معاش بنایا اور اب تین چار نسلوں کے بعد ایک مرتبہ پھر پرانی شان و شوکت کے حامل بن گئے۔ ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کی آزاد اسلامی مملکت کے قیام کے بعد ہم لوگ پھر اپنے وطن واپس آنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے میں یہاں حالات کے جائزے اور ابتدائی ضروری انتظامات کے لیے آیا ہوں۔

رفتہ رفتہ باقی اعزاز آتے جائیں گے۔ سردست میں نے رہائش کے لیے آپ کے مہذب تعلیم یافتہ اور معروف کاروباری علاقے کا انتخاب کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ لوگ مجھے ایک اچھا بڑوسی پائیں گے اور جو اب خود بھی اچھے بڑوسیوں کی طرح حقوق ہمسائیگی کا پاس رکھیں گے۔ اس کے بعد میں نے فردا فردا ہر مہمان سے تعارف حاصل کیا۔ بعد ازاں لذیذ اور خوش ذائقہ کھانوں اور ایک مختصر سے تفریحی پروگرام کے بعد یہ دعوت اختتام پذیر ہو گئی۔

اس تعارفی تقریب کے بعد میں کسی بھی دن پروفیسر ڈان زان مغل کی آمد کا منتظر تھا۔

اور مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پانچویں دن صبح دس بجے ڈان زان موصوف میرے ڈرائیونگ روم میں موجود تھے۔ ملاقات کے لیے

ہو۔ اپنے کھلونا اور اس وقت میرے ساتھ ڈرائیونگ روم میں جو بھی بیٹھا ہو۔ اپنے کھلونا پستول سے اسے پنڈز اپ کھے اور لیلیٰ دبا دے یہ کھلونا پستول ایسا تھا جس میں پانی بھرا جاتا تھا اور لیلیٰ دبانے پر ایک پتلی سی دھار سامنے والے پر پڑتی تھی۔

میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ جب میں بلاؤں تو وہ پستول میں پانی نہیں بلکہ روشنائی بھر کر لائے۔ بس تھوڑی سی چٹا چٹا عین اسی وقت جب کہ ڈان زان مغل صاحب اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ وہ شوخ لڑکا آیا۔ زان صاحب سے بڑے بارعب لہجے میں پنڈز اپ کیا اور پچکاری چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اب یہ اس کی نشانہ بازی کی مہارت تھی یا حسن اتفاق کہ روشنائی ڈان زان صاحب کے روئے مبارک پر پڑی جس نے انہیں رویہ کر دیا اور انہیں منہ دھونے کے لیے ہاتھ روم جانا پڑا۔ ان کے جاتے ہی میں نے ان کا بریف کیس غولاً اس میں مٹی چھتے رکھے ہوئے تھے۔ جن میں سے ایک چشمہ بالکل ویسا ہی معلوم ہوا جیسا اس رات چشمے والے نے لگا رکھا تھا اور جسے میں نے توڑ دیا تھا۔ میں نے وہ چشمہ نکال کر محفوظ کر لیا اور اطمینان سے ڈان زان صاحب کے ہاتھ روم سے واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ معذرت وغیرہ میں پہلے ہی کر چکا تھا کہ پڑوس کا یہ بچہ بہت شریر ہے اور میرے معزز مہمانوں کے ساتھ پہلے بھی اس طرح کی شرارت کر چکا ہے۔ پہلے میں نے اسے صرف ڈانٹا کافی سمجھا تھا۔ مگر اب میں یقیناً اس کے باپ سے شکایت کروں گا کہ وہ اسے مناسب سرزنش کریں۔ کیونکہ آئندہ ایسی کوئی حرکت ناقابل برداشت ہوگی۔

مغل صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد میں نے تاش کی گڈی نکالی۔ وہ چشمہ لگا جو مغل صاحب فروخت کر گئے تھے۔ حسب سابق پتوں پر نیلے رنگ کے نشانات نظر آنے لگے اس

اندیشی سے کام لیا اور یوں وہ چشمے جو پہلے میں نے اپنے شوق اور انجانے پن میں ایک بڑی رقم دے کر خریدا تھا۔ پانچ سو میں لے لیا۔

اس کے بعد جاوید اور نوسابہ سے بھی ملاقات لازمی تھی۔ مگر یہ ملاقات سابقہ کلب میں نہیں ایک دوسرے کلب میں ہوئی۔ مجھے کم و بیش پہلی ہی داستان سننے کو ملی۔ صرف اس جزوی تبدیلی کے ساتھ اس مرتبہ ان دونوں کی شادی ہو چکی تھی اور مالدار سر نے داماد کو ایک لاکھ نہیں دو لاکھ روپے دے دیے تھے۔ جیسی کہ توقع تھی۔ نوسابہ مجھے نہیں پہچان سکی اگرچہ کسی نامعلوم وجہ سے وہ گپا گپا ہے مجھے بڑی گہری نگاہوں سے دیکھنے لگتی تھی۔ جیسے اسے کسی چیز کی تلاش ہو۔ میں نے بڑے پر جوش انداز میں ان کی مدد کا وعدہ کیا اور اس ملاقات کے تیسرے دن رات کے دس بج کر پانچ منٹ پر ایک مرتبہ پھر اسی عمارت میں موجود تھا۔ مگر ایک دوسرے کمرے میں یہ قدرے حیرت کی بات تھی کہ امتیاز نے میرے فرار کے بعد بھی اس اڈے کو بند یا تبدیل نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ کسی نہ کسی وجہ سے اسے یہ اعتماد ہے کہ اول تو یہاں چھاپہ نہیں پڑ سکتا اور پڑ بھی جائے تو وہ اس سے بچ نکلے گا۔ نئے شکار کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر غالباً صرف اس لیے لایا جاتا تھا کہ وہ غیر ضروری طور پر آئے دن کی دردسری مول لینا نہیں چاہتے تھے۔

اس بار میں نے چشمے کے سلسلے میں ایک دوسرا طریقہ کار اختیار کیا تھا۔ جس کا ذکر کرنا میں ڈان زان سے ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے بھول گیا۔ پڑوس کے ایک شریر بچے کو جو ہر وقت گلی میں مٹھیارتہتا تھا اور جس کی عمر آٹھ دس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ میں نے بیل کم کے ایک پورے پیکٹ کا لالچ دے کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ جب بھی اسے بلاؤں وہ آجائے اور اس وقت میرے ساتھ ڈرائیونگ روم میں جو بھی بیٹھا

غزلیں

ناصر زیدی

ذہن میں اپنے بسا، دل کے اندر دیکھتا
میں تصور میں تیری تصویر اکثر دیکھتا

اور تو کچھ بھی نہیں بس ایک خواہش ہے مری
سانے تجھ کو بھٹاتا ' زندگی بھر دیکھتا

یہ بھی اچھا تھا کہ ان آنکھوں میں بیٹائی نہ تھی
کس طرح اُس سے مجھڑ جانے کا منظر دیکھتا

اُس کو ہی ادراک ہو جاتا کہ کیا ہے اہلکِ غم
تہتہوں میں جو مچھپا تھا وہ سمندر دیکھتا

زندگی دیتی اگر فرصت تو تاثر ایک دن
جس قدر دیکھا ہے اس کو اس سے بڑھ کر دیکھتا

ڈاکٹر پرویز احمد

بند بنجرے سے ڈر گیا ہدہ
سج سے ایسے مگر گیا ہدہ

دیکھ کر پرکے پرندوں کو
اپنے ہونے سے ڈر گیا ہدہ

کاش رکھتا نہ سر پہ تو کلفی
دیکھ تیرا بھی سر گیا ہدہ

چوچ لمبی ہے اس لیے یارو
بات لمبی سی کر گیا ہدہ

☆☆

کے بعد میں نے وہ چشمہ ناک پر رکھا جو خود اڑایا
تھا۔ اب جو پتوں پر نظر ڈالی تو چودہ طبق روشن
ہو گئے۔ اسی گڈی کے ہر پتے پر دوسرے خفیہ
نشانات بھی تھے جو غلط نہیں، سرخی نائل تھے اور ان
سے ہر پتے کی بالکل صحیح قدر و قیمت کا اظہار ہو رہا
تھا۔ دونوں بلکہ تینوں چشموں کے فریم کا ڈیزائن
یکساں تھا۔ رنگ مختلف تھے۔ وہ جو خریدے
تھے۔ کتنی رنگ کے تھے اور جو اڑایا تھا اس کا
فریم کالے رنگ کا تھا۔ ایک اور نازک سا فرق
بھی تھا۔ میرے چشموں کے شیشوں کا رنگ ہلکا
قرمزی تھا۔ جبکہ کالے فریم کے شیشے نیلگوں تھے۔
دونوں رنگ اتنے یکساں تھے کہ دن میں تو آسانی
سے نظر آ جاتے تھے۔ مگر رات کے وقت بجلی کی
روشنی میں انہیں دیکھنا تقریباً ناممکن تھا۔ میں
دوسرے دن ایک سینک سازی دکان پر گیا اور
کالے فریم والے چشمے کے شیشے نکلا کر اپنے
خریدے ہوئے چشمے میں لگوا لیے۔

یہ داستان ابھی یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک
بار پھر اسی عمارت میں لے جایا گیا۔ جہاں پہلے جا
چکا تھا لیکن کمرہ وہ نہیں تھا۔ دوسرا تھا۔ کام یہاں
بھی وہی ہو رہا تھا۔ چار پانچ میزوں پر بازیاں
جبی ہوئی تھیں اور یہ شاید اتفاق تھا کہ ایک میز پر
امتیاز بھی چشمہ لگائے تھیل میں مصروف تھا۔
یہاں بھی ایک نگران میز کرسی ڈالے سب سے
الگ بیٹھا تھا۔ مگر اس کا انداز سابقہ نگران سے
زیادہ براعتا تھا۔ مجھ سے اس کا تعارف شوکت
خان کے نام سے کرایا گیا۔

کمرے کے ایک گوشے میں دو میزیں خالی
تھیں شوکت خان نے ان کی جانب اشارہ کرتے
ہوئے بیٹھنے کی دعوت دی۔ مگر میں امتیاز کی میز کی
طرف بڑھ گیا۔ قریب پہنچ کر متوجہ کیا اور کہا کہ
آپ شہر کی معروف شخصیت ہیں میں حال ہی
یورپ سے آیا ہوں۔ اس کے باوجود آپ سے
عائبانہ متعارف ہو چکا ہوں۔ کیا آپ مجھے ٹھیلنے کا

لاکھ ہارے اور پھر اپنی لائی ہوئی رقم میں سے بھی تقریباً پچھتر ہزار امتیاز کے سامنے بڑے ہوئے ڈھیر میں شامل کر دے۔ اس موقع پر میں نے پہلی مرتبہ جیب سے سگریٹ کیس اور لائٹر نکالا۔ گویا اپنے اعصاب کو تباہی کے نشے سے تسکین دینے کی متوجہ کوشش کی لیکن میری یہ حرکت اس سے کہیں زیادہ اہم تھی جتنی بظاہر نظر آ رہی تھی۔

چند منٹ ہی گزرے تھے کہ نگران شوکت خان کی میز پر رکھے ہوئے فون کی کھنٹی بجی اس نے ریسیور کان سے لگایا کچھ سنا اور چند الفاظ میں کچھ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔ اٹھ کر امتیاز کے پاس آیا۔ اس کے دائیں کان میں سرگوشی کی امتیاز نے سر ہلایا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔

شوکت خان نے بلند آواز میں کمرے میں موجود افراد کو اپنی جانب متوجہ کیا اور بتایا کہ حضرات پولیس نے عمارت پر چھاپہ مارا ہے۔ مگر گھبرانے کی اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ سب شہر کے معززین ہیں۔ ہم آپ پر کوئی آج نہیں آنے دیں گے۔ ایسی ہنگامی صورت حال کا مکمل تذکرہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ آپ صرف اتنا کریں کہ اپنے اپنے بریف کیس ہمارے حوالے کر دیں۔

سب نے بریف کیس دے دیے شوکت خان نے انہیں کمرے میں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی آہنی الماری میں رکھا۔ وہیں بجلی کے سوچ بورڈ پر لگے ہوئے ایک بٹن کو دبایا دیوار کا ایک حصہ الماری سمیت دوسری جانب گھوم گیا اور پہلی الماری کی جگہ ایک دوسری اسی طرح کی الماری سامنے آگئی۔ اسی کے ساتھ میز پر بیٹھا ہوا اسی کا ایک آدمی اٹھامیز کو کچھ کہا پھر اسے دبایا۔ اس کے پائے چھوٹے ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ جو میز تین فٹ اونچی تھی۔ اس کی اونچائی انچوں میں باقی رہ گئی۔

شوکت خان نے سوچ بورڈ میں لگا ہوا دوسرا

موقع دے کر عزت افزائی کریں گے۔ امتیاز نے مجھے غور سے دیکھا۔ اٹھ کر ہاتھ ملایا اور مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ آپ دوسری میز پر تشریف رکھیں میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

میں جاوید عزیز اور نوشاہہ خالی میز پر بیٹھ گئے۔ چند منٹ بعد امتیاز بھی آ گیا۔ دو افراد اور بھی نمودار ہوئے اور خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنے بریف کیس سے بائبل نئی کرنسی نوٹوں کی گڈیاں نکال کر سامنے رکھیں۔ بیل پیک تاش کی گڈی کھولی گئی اور کھیل شروع ہو گیا۔ مجھے ہر پتے کے سرخ نشانات بالکل صاف نظر آ رہے تھے اور وہ پتوں سے پوری مطابقت رکھتے تھے۔ ایک دو بازیاں مجھے دانستہ جیتے کا موقع دیا گیا۔

پھر امتیاز نے سنبھالا لیا اور اچھے پتوں پر بڑی بڑی رقموں کی چالیں چلنے لگا مگر ظاہر تھا کہ میں بھی اس کے پتے پڑھ رہا تھا۔ اس لیے جب بھی اس کے ہاتھ میں بڑے پتے آتے تھے۔ میں مقابلے سے دستبردار ہو جاتا تھا اور جب میرے پاس اچھے اور اس کے پاس کمزور پتے ہوتے تھے تو اس کے بلف کھیلنے کے باوجود بھی شو نہیں کراتا تھا اور چال پر چال چلتا رہتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میں بعد کی زیادہ تر بازیاں بھی جیت کر مجموعی اعتبار سے اپنی رقم میں ایک لاکھ سے اوپر کا اضافہ کر چکا تھا۔ یہ صورت حال امتیاز کے لیے ناقابل قبول تھی۔ وہ قدرے حیرت زدہ سا نظر آ رہا تھا۔ گاہے گاہے غور سے مجھے اور پھر میرے جیسے کو دیکھنے لگا تھا۔

بالآخر اس نے شارپنگ اور پتے بازی شروع کر دی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ متواتر جیتنا میرے پلان میں شامل نہیں تھا۔ ہارنا اس لیے ضروری تھا کہ میرے تمام نوٹ نشان زدہ تھے جنہیں بعد میں برآمد کر کے بطور ثبوت استعمال کیا جانا تھا۔ چنانچہ میں نے ان کی چالوں کا کوئی توڑ نہیں کیا اور ہارنے لگا پہلے وہ جیتے ہوئے لاکھ سوا

کے محاصرے میں ہے اور میں ہر کمرے کی تلاشی لیتا چاہتا ہوں۔“

”کس نے آپ کو غلط رپورٹ دی ہے۔“ شوکت خان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہاں صرف شریف کرائے دار رہتے ہیں۔ جو زندگی کے مختلف شعبوں سے منسلک ہیں۔ رہی تلاشی کی بات تو آپ جس طرح چاہیں اپنا اطمینان کر سکتے ہیں۔“

”یہ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔“ شوکت خان نے ریوالور سے ہم سب کی طرف اشارہ کیا۔

”ان میں سے کچھ بورڈنگ ہاؤس کے کرائے دار ہیں اور کچھ میرے ذاتی دوست۔“ شوکت خان نے مطمئن انداز میں کہا۔ ”میں نے آج انہیں ایک چھوٹی سی تقریب کے سلسلے میں مدعو کیا تھا۔“

شوکت خان نے پلٹ کر ایک کاشییل کی طرف دیکھا۔

”نور محمد جاؤ۔ سب انسپکٹر فرید سے کہو کہ وہ مختلف کمروں کی تلاشی لے۔ ہر منزل کا ہر کمرہ دیکھنا سردست ضروری نہیں ہے۔ بشرطیکہ کوئی مشکوک بات یا چیز نظر نہ آئے۔ ابتدائی کارروائی کے نتیجے سے مجھے پندرہ منٹ کے اندر مطلع کیا جائے۔“

کاشییل نے اٹیشن ہو کر سلیوٹ کیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ اب جمال بیک پھر شوکت خان کی طرف متوجہ ہوا۔

”کیا یہاں فلش نہیں ہو رہا تھا۔“ اس نے پوچھا۔

”آپ کو میز پر تاش کے پتے اور نوٹ نظر آ رہے ہیں۔“ منیجر نے پہلی مرتبہ ناگواری کا اظہار کیا۔

”ظفر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ جمال نے ڈانٹا۔ ”جو پوچھا جائے اس کا جواب دو۔“

بٹن دبایا اور میزوں کی لمبائی چوڑائی کے برابر فرش کا حصہ گھوم گیا اور جو پچھلا حصہ اوپر ہماری نظروں کے سامنے آیا اس پر صرف ایک بڑی سی میز فرش کے ساتھ چمکی ہوئی تھی۔ جلد ہی اسے سچ کر بلند کر دیا گیا اور اب اس کے فولڈنگ پاؤں کی اونچائی کم و بیش تین فٹ ہو گئی۔ کمرے کے تمام حاضرین اپنی اپنی کرسیاں تھکیٹ کر میز کے گرد آ بیٹھے۔ الماری کھولی گئی۔ اس کے نچلے خانوں میں پھولوں، میوؤں، کریم، کیک، پیسٹریوں کی شستریاں بھری رکھی تھیں۔ انہیں میز پر چن دیا گیا۔

کمرے میں پہلے سے موجود لمبے چوڑے فرنیچ سے ٹھنڈے سرد ہات کی بوتلیں ہمارے سامنے رکھ دی گئیں۔ سارا کام پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں انجام پا گیا۔ ہم تیسری منزل پر تھے اور پولیس کو وہاں تک پہنچنے میں اتنا وقت تو لگ ہی سکتا تھا۔

ہم بیٹھے ہی تھے کہ دروازہ پر شور آواز کے ساتھ کھلا اور انسپکٹر جمال بیک دو رخ کاشییلوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور اور کاشییلوں کے ہاتھ میں رائفلیں تھیں۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اس مرتبہ مجھے جس کمرے میں لایا گیا تھا۔ وہ عمارت کے گران اور ذاتی کمرہ اور آفس تھا اور یہ کہ شوکت خان ہی منیجر کا ردول ادا کرتا ہے۔

”اس بورڈنگ ہاؤس کا منیجر کون ہے۔“ جمال بیک نے پوچھا۔

شوکت خان جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ ”میں ہوں جناب۔ فرمائیے۔“

”ہمیں رپورٹ ملی ہے کہ بورڈنگ ہاؤس کی آڑ میں یہاں ہر قسم کی غیر قانونی سرگرمیاں ہوتی ہیں۔“ جمال بیک نے سخت لہجے میں کہا۔ ”مثلاً قمار بازی، جسم فروشی، منشیات کی تجارت اور اسمگلنگ وغیرہ۔ یہ بلڈنگ اس وقت پولیس

دیدنی تھی۔

”سیٹھ صاحب! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں۔“ شوکت خان جلدی سے میری طرف بڑھا اور شانہ دبا کر بولا۔ ”بات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔“

”مجھے جو کچھ سمجھنا تھا۔ وہ میں اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔“ میں نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”اب آپ ذرا آنکھیں اور کان کھول کر حالات کو جاننے کی کوشش کریں۔“

میں نے اس طرح جیسے انسپٹر جمال میرے لیے بالکل اجنبی ہو اور میں پہلی مرتبہ اسے بتا رہا ہوں۔ ڈان زان مغل کی ملاقات سے لے کر آج تک کی داستان بیان کی اور کہا کہ میں نے ایک دنیا دیسی ہے۔ اس طرح کے ہتھکنڈے میری لیے نئے نہیں ہیں۔ میں کلب میں پہلے جاوید اور نوشاہی کی ملاقات کے بعد ہی سمجھ گیا تھا کہ میرے لیے جمال بچپنا جا رہا ہے۔ چنانچہ اپنی پوری تیاری کر کے آیا تھا۔

”میری جیب میں ایک مائیکرو کیسٹ ریکارڈ موجود ہے۔ جس میں وہ سب کچھ ریکارڈ ہو چکا ہے جو یہاں ہوتا رہا ہے۔ میں نے مسٹر امتیاز کے ساتھ کھیلنے کی خواہش اسی لیے ظاہر کی تھی کہ کسی اور کی آواز پہچانی جائے یا نہ پہچانی جائے لیکن وہ سیاسی لیڈر ہیں۔ ہزاروں کان ان کی مخصوص آواز اور لب لہجے سے آشنا ہیں کوئی اسے شناخت کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ ویسے ان لوگوں کی ہوشیاری اور چالاکی کا جواب نہیں۔ پولیس کے چھاپے کی اطلاع ملتے ہی انہوں نے جس طرح کمرے کا حلیہ بدلا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ پھر میں نے جمال بیک کو اس سیمینکل نظام اور سورج بورڈ کے ان بنٹوں کے بارے میں بتایا جس کے ذریعے پانچ منٹ میں جوئے کا اڈا بورڈنگ ہاؤس کے میجر کے آفس میں تبدیل ہو گیا تھا۔“

”جی نہیں۔ یہاں ایسا کوئی کام نہیں ہو رہا تھا۔ آپ ان معززین سے دریافت کر سکتے ہیں۔“

جمال نے اب پورے غور اور توجہ سے ہماری طرف دیکھا امتیاز اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔

”عالم! ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔“ وہ نرمی سے بولا۔

”درست ہے۔ میں آپ کو جانتا ہوں امتیاز صاحب!“ جمال نے جواب دیا۔ ”اور آپ کی شہرت سے بھی واقف ہوں۔“

”تو پھر میری بات کا یقین کیجیے۔ یہاں سچ سچ ایک دعوت ہی جاری تھی۔“

اب میں اپنی کرسی سے کھڑا ہوا ظاہر ہے کہ یہ پوری پلاننگ میری تھی۔ میں انسپٹر جمال بیک کو برابر رپورٹیں دیتا رہا تھا اور ہونے والے اقدامات سے آگاہ کرتا رہا تھا۔ آج چھاپے کے لیے بھی ہمارے درمیان طویل گفتگو ہو چکی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ پولیس کی کئی نفری بلڈنگ کے باہر محاصرہ کیے ہوئے ہیں اور نئی تعداد عمارت کے اندر مختلف منزلوں پر تلاشی لے رہی ہے۔ چھاپے کا سگنل اس وقت دیا گیا تھا۔ جب میں نے جیب سے لائسنس نکالا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا ٹراسمیٹر تھا۔ جو کئی مخصوص سگنل نشر کر سکتا تھا۔ یہ اشارہ پا کر ہی جمال عمارت میں داخل ہوا تھا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ میں بھی اپنی زبان کھولوں لیکن پہلے سے طے شدہ فیصلے کے مطابق مجھے ظاہر یہ ہی کرنا تھا جیسے میرا اور انسپٹر جمال کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

”یہ جھوٹ ہے۔ انسپٹر صاحب!“ میں نے بلند آواز میں کہا۔ ”باقی عمارت کے بارے میں تو میں نہیں جانتا مگر یہاں واقعی جو ہو رہا تھا۔“

امتیاز اور شوکت خان نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ جاوید عزیز اور نوشاہی کی حیرت بھی

پر کاری دکھائی ہو۔ آپ یہ مایہ و نیست ریکارڈ
سنجھال لیں۔ جس میں یہاں ہونے والی تمام
گفتگور ریکارڈ ہے۔“

”ان شریف آدمیوں کو آپنی زیور پہنائیں
اور پھر میرے ساتھ چلیں۔ میں بھی ذرا بورڈنگ
ہاؤس کے معزز کرائے داروں سے ملنا چاہتا
ہوں۔ اس کمرے میں جو کاریگری کی گئی ہے۔
اس کا مظاہرہ کسی بھی وقت دیکھا جاسکتا ہے۔“

میں نے جیب سے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر
نکال کر جمال کے ہاتھ میں دے دیا۔ امتیاز مجھے
کینہ تو نظروں سے گزرا ہوا تھا۔

”سیٹھ صاحب! آخر آپ کو ان شریف
آدمیوں سے کیا دشمنی ہے۔ کیا ہم آپس میں اس
معاہدے کو طے نہیں کر سکتے۔“ وہ بولا۔

”محترم شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔“
میں نے نرمی سے کہا اور دو قدم اس کی طرف
بڑھا۔ بڑے اطمینان سے اپنی فریج داڑھی اتار
کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ چشمہ اتارا۔ گالوں
کی پیڈنگ اور آنکھوں کے کنٹیکٹ لینس علیحدہ
کیے۔ ”اب آپ کہیں تو منہ بھی دھو آؤں۔
میرے خیال میں اس کی ضرورت تو نہیں ہوتا
چاہیے کہ آپ اتنے بھی گدھے نہیں ہیں۔“

”اوہ تم!“ بے اختیار امتیاز کے منہ سے

نکلا۔
”جناب والا!“ میں نے سر کو خم کرتے
ہوئے جواب دیا۔

◆.....◆

شوکت خان کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔ کوئی سا بے
حیرت سے آنکھیں پھاڑے مجھے گھور رہی تھی۔
شہر کے ان پانچ چھ شرفاء کے چہروں پر ہوائیاں
اڑ رہی تھیں جو آسان دولت کمانے کے لالچ میں
ان جلسہ سازوں کا شکار بنے تھے۔ مگر امتیاز انتہائی
سنجیدہ اور خاموش تھا۔ اسی وقت سب انسپکٹر
کمرے میں داخل ہوا اور اس نے جمال کو بتایا کہ
تینوں منزلوں پر تقریباً تیس کمروں کی تلاشی لی جا
چکی ہے مگر کہیں سے کوئی قابل اعتراض چیز برآمد
نہیں ہوئی۔

”ہر کمرے میں ایک کرائے دار مقیم ہے۔
جس کے پاس شناختی کاغذات موجود ہیں۔“
جمال بیگ نے فکر مند انداز میں میری طرف
دیکھا۔

”انسپکٹر جمال!“ امتیاز بھاری آواز میں
بولا۔ ”اس نو جوان نے ابھی جو دلچسپ کہانی
سنائی ہے۔ اس میں کتنی حقیقت ہے اور کتنی اس کی
ذہنی اختراع یہ میں نہیں جانتا مگر تم زیادہ سے
زیادہ جو بات ثابت کر سکتے ہو۔ وہ صرف اتنی
ہے کہ سوسائٹی کے کچھ معزز افراد اپنا دل بھلانے
کے لیے شوکت صاحب کے آفس میں تاش کھیل
رہے تھے جو ہم سب کے مشترکہ دوست ہیں۔
بلاشبہ اس سے ہماری کچھ ذلت و رسوائی ہوگی مگر
یہ سوچو کہ تمہارے ہاتھ کیا آئے گا۔ اس بااثر طبقہ
کی دشمنی۔ جس کے ایک اشارے سے تمہاری یہ
وردی بھی اتر سکتی ہے۔ جس میں اس وقت تم
اتنے اسرار نظر آ رہے ہو۔“

”انسپکٹر صاحب!“ میں نے جلدی سے
کہا۔ ”ایک عظیم کارنامہ آپ کی دسترس میں
ہے۔ دشمن کی باتوں میں آگئے تو ساری زندگی
کف افسوس ملتے رہیں گے۔ آپ یہ کیوں نہیں
سوچتے کہ جو شخص چند منٹ میں قمار خانے کو آفس
میں بدل سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی بعید نہیں کہ
بورڈنگ ہاؤس کے دوسرے کمروں میں بھی یہ ہی

اُدھو کی سگائیش

ایم اے راحت

”یہ بات تم کس طرح کہہ رہے ہو۔“ فیاض خان نے جواب دیا۔ ”کیا معلوم کہ اس کی تحقیقات کا دائرہ بورڈنگ ہائوس کے اندر تھا یا باہر اور جہاں تک تحقیقات کی بات ہے تو محمود کا تعلق سوائے آفندی صاحب کے جن کے کمرے میں وہ ٹھہرا ہوا تھا یا فرحت کے اور کسی سے نہ تھا۔ آفندی صاحب آج کل کہیں باہر گئے ہوئے ہیں اور پولیس کے جانے پہچانے افراد میں سے ہیں۔ ان پر کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ رہی فرحت تو ایک اندھی لڑکی کا منشیات کی ناجائز خرید و فروخت سے کیا واسطہ ہوسکتا ہے۔ نہیں یہ محمود کا خاص نجی معاملہ ہوتا ہے۔ وہ غالباً فرحت سے محبت کرنے لگا تھا۔“

ایک معاشرتی کہانی، عمران ڈائجسٹ کے آخری صفحات کے لیے





کے زور سے تم ایسے مسائل حل کرنے کی ذمہ داری قبول کر سکتے ہو۔ جن میں پولیس کو اعتراض نہ ہو۔ تم اپنے کلائٹ سے فیس بھی قبول کر سکتے ہو۔ پولیس اگر تمہارے راستے میں آئے تو یہ اجازت نامہ تمہاری مدد کر سکتا ہے۔“

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور آخر کار محکمہ پولیس کے بڑے بڑے افسران کا تعاون اسے حاصل ہو گیا۔ شاسائیاں بھی بڑھیں اور اس کا بخوبی گزارا ہونے لگا۔ اس وقت بھی وہ ناشتا کر رہا تھا کہ اس کے موبائل فون پر کال آئی اور ایک اجنبی آواز ابھری۔

”ہیلو زابر صاحب۔“

”کون صاحب۔“

”میں آپ کو اپنے بارے میں تفصیل نہیں بتا سکتا، لیکن میں آپ سے ایک اہم کام لینا چاہتا ہوں۔“

”جی فرمائیے۔“

”آپ نے آج کا اخبار دیکھا۔“

”ابھی تک نہیں۔“

”تھیک میں آپ کو اس خبر کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں جو ایک لڑکی کی خیر ہے۔ قاتل ایک لڑکی فرحت ہے۔ جو نامہ پنا ہے اور جس شخص کو قتل کیا گیا ہے اس کا نام محمود ہے۔ لڑکی کا ایک بھائی ہے جس کا نام فرید احمد ہے۔ بڑی اچھی ہوئی سی بات ہے، مسٹر زابر ایک ایسی بے نور آنکھوں والی لڑکی جس سے ریوالور کی کوئی واقفیت نہ ہو۔ کسی کو کسی قتل کر سکتی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ کسی نے اس لڑکی کو قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ سمجھ گئے ہوں کہ میں آپ سے کیا چاہتا ہوں۔“

”جی۔“

”میں آپ کو پچاس ہزار روپے دے سکتا ہوں۔ شاید اس سے زیادہ نہیں۔“

”لیکن آپ کا اس لڑکی سے کیا تعلق ہے۔“

”براہ کرم اتنی تفصیل میں نہ جائیں۔ آپ

لوگ اسے خدائی فوجدار کہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ وہ اسے معاملات میں جن کا تعلق اس سے ہو یا نہ ہو ٹانگ اڑا دیتا تھا۔ ابتدا میں تو پولیس کے سرکردہ افراد کو اس سے بڑی چڑ ہوئی کہ وہ پولیس کے معاملات میں بھی ٹانگ اڑا کر ان کی توہین کرتا ہے۔ انہوں نے کئی بار اسے اپنے گلے میں بھی جکڑا لیکن اس کے خلاف کوئی جرم ثابت نہ کر سکے۔ پھر ایک بار وزیر داخلہ کے ایک ذاتی معاملے میں اس نے کام کیا اور وزیر داخلہ اس کے بہت احسان مند ہوئے۔ انہوں نے اس سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو اس نے بتایا کہ اس کے والد و جاہت حسین صاحب نوجوانی میں لندن مستقل ہو گئے تھے اور وہ وہیں پیدا ہوا، لیکن چونکہ اس کا پورا خاندان پاکستان میں ہی تھا۔ اس لیے اس کی پرورش میں پاکستان سے محبت کا عنصر بھی شامل رہا اور وہ مکمل طور پر پاکستان سے منسلک رہا۔

اسکاٹ لینڈ یارڈ کے مائیکل ہوپ سے اس کی دوستی ہوئی جو ایک شان دار روایات کا مالک پولیس آفیسر تھا۔ مائیکل ہوپ کے ساتھ اس نے بہترین کارنامے سرانجام دیے اور باقاعدہ اس کی شاگردی اختیار کی۔ اپنے طرز پر وہ ایک بہترین سرخ رسا بن چکا تھا لیکن پھر کچھ تبدیلیاں ہوئیں۔ اس کے والدین کا انتقال ہو گیا۔ کوئی بہن، بھائی نہیں تھا۔ چنانچہ واپس پاکستان آ گیا۔ کوئی دولت یا جائیداد نہیں تھی، گزارے کے لیے سوچا اور خاصا پریشان رہا۔ پاکستان میں برائوٹ جاسوسی کے لائسنس نہیں دیے جاتے لیکن وہ کیا کرتا۔ اس نے اس کے علاوہ کچھ نہیں سوچا تھا۔ پھر جب وزیر داخلہ نے اس سے پوچھا کہ وہ اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں تو اس نے اپنے بارے میں تفصیل بتادی۔

”میں تمہیں محکمہ داخلہ کی طرف سے ایک خصوصی اجازت نامہ جاری کیے دیتا ہوں۔ جس

نے اس کی شدید بے عزتی کر دی۔ اس کے بعد اسی بورڈنگ ہاؤس میں ایک اور نوجوان کا اضافہ ہوا۔ جس کا نام محمود تھا۔ فرحت کا دوسرا محبوب محمود بن گیا لیکن بہت جلد فرحت کو پتا چل گیا کہ وہ اسے بے وقوف بنا رہا ہے اور ایک لڑکی شہناز سے پیکیں بڑھا رہا ہے۔ اس نے محمود کو بری طرح ڈانٹا پھینکا لیکن محمود باز نہ آیا۔ اس نے طرح طرح سے فرحت کو سمجھانے کی کوشش کی، لیکن فرحت نہ مانی، البتہ آہستہ آہستہ اس کا غصہ اترنے لگا اور الگ جدا ہو گیا تھا۔ محمود نے بھی اسے شادی کے خواب دکھائے تھے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اسی طرح بوزھسی ہو جائے۔ وہ بے چین رہنے لگی تھی۔ اس رات بھی اچانک اس کی آنکھ کھل گئی، ایک عجیب سا خوف اس کے بدن میں لرزشیں پیدا کر رہا تھا۔ بینائی سے محروم ہونے کے باوجود اسے احساس ہوا کہ کمرے میں کوئی موجود ہے۔ رات کے سنائے میں کسی کی سانسوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ آواز تیز ہوتی گئی۔ کوئی اس کے قریب آ رہا تھا۔ فرحت کا خوف انتہا کو پہنچ گیا۔ اس کا ہاتھ ٹیکے کے نیچے پہنچا جہاں ریو اور موجود تھا۔ یہ ریو اور سجاد کا تھا جو عام طور سے اسی کے پاس ہوتا تھا۔

”کون..... کون.....“ فرحت نے شدید دہشت کے عالم میں پوچھا۔ پھر بالکل ہی غیر اختیاری طور پر اس کی انگلی ٹرانسپیرڈنٹی چلی گئی۔ دہائیں، دہائیں کی آوازیں اور چیخ اس کے بعد خاموشی، لیکن کچھ ہی لمحوں کے بعد پڑوسیوں نے دروازہ ہچکایا۔ پھر نہ جانے کس طرح سب کے سب اندر گھس آئے۔ پھر فرحت نے صرف ایک آواز سنی تھی۔

”ارے یہ تو محمود ہے۔“ اس کے بعد فرحت کے ہوش و حواس جواب دے گئے تھے۔

☆☆

فیاض خان نے زاہر کو آفس میں داخل

اس کیس کی تحقیقات کریں گے تو شاید میں بھی منظر عام پر آ جاؤں۔“
”لیکن.....“ زاہر نے کہنا چاہا لیکن اس شخص نے بات کاٹ دی۔

”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا ان معاملات سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اگر شدید ضرورت ہوئی تو میں آپ کے سامنے آ سکتی ہوں۔ آپ کی فیس آپ کی پسند کے مطابق آپ کو ایڈوائس ادا کی جاسکتی ہے۔“

”بہتر ہے میں آپ سے رابطہ کروں گا۔“

”یہ میرا فون نمبر نوٹ کر لیجئے۔“

”ٹھیک ہے..... شکریہ.....“ زاہر نے کہا۔

☆☆

بہن، بھائیوں کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ تین چار برس کی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ماں محنت مزدوری کر کے بچوں کو پروان چڑھانے لگی۔ پھر بیٹا سجاد سب کچھ چھوڑ کر گھر سے نکل گیا۔ ماں پہلے ہی دکھوں کی باری تھی زندہ نہ رہ سکی اور فرحت دنیا میں اکیلی رہ گئی۔ قدرت نے اسے من کی دولت سے نوازا تھا۔ ماں کی موت کے بعد وہ دنیا کی طرف پیاسی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ سات برس کے بعد بھائی سجاد واپس گیا اور بہن کو لے کر ایک دوسرے شہر پہنچ گیا۔ سجاد کو دولت مند بننے کی بڑی خواہش تھی اور وہ دن رات منصوبہ بندیاں کرتا رہتا تھا۔ گھر فروخت کر کے وہ ایک طویل و عریض بورڈنگ ہاؤس میں آ گئے۔ فرحت بڑی مشکل حالات میں بسر کر رہی تھی، ایک صبح سو کر اٹھی تو اس کے سر میں ہلکا ہلکا درد تھا جو بڑھتا ہی چلا گیا۔ ٹوٹا پھوٹا علاج ہوا، لیکن تقدیر نے ایک دن اس سے ایک اور مذاق کیا۔ اس کی بینائی ختم ہو گئی۔ شاید وہ موت ہی کو گلے لگا لیتی کہ داور نامی نوجوان نے اس کے اندر جننے کی امنگ پیدا کر دی لیکن یہ بھی بات آگے نہ بڑھ سکی۔

داور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا، لیکن سجاد

اس کے کمرے میں گھسا۔ فرحت نے اسے چور سمجھ کر گولی چلا دی۔ وہ مر گیا۔ اب کسی کو نقشہ کشی کے لیے بھیجا جائے۔ کال کے جواب میں سب انسپکٹر داور جو اس وقت ڈیوٹی پر موجود تھا ضروری عملہ اور پولیس سرجن کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس پہنچا۔ وہاں کمرہ نمبر تین کے اندرونی کمرے میں محمود مقتول پڑا تھا۔ اس کے سینے پر گولیوں کے دوزخ تھے۔ سرجن نے اس کا معائنہ کیا۔ ایک گولی سیدھی دل پہ لگی تھی۔ دوسری ذرا سی ہٹ کر دہنی جانب پھیپھڑے میں اتر گئی تھی یہ کہنا مشکل تھا کہ کون سی گولی پہلے لگی۔ معائنہ کی رپورٹ کے مطابق محمود کی موت فوری طور پر واقع ہوئی تھی اور اسے ساڑھے گیارہ سے لے کر ایک بجے کے درمیان کسی بھی قتل کیا گیا تھا۔ فرحت کا بیان ہے کہ وہ سو رہی تھی۔ آہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے یوں لگا کہ کمرے میں کوئی موجود ہے، کسی کے گھر سے گھر سے سانس لینے کی آوازیں آرہی تھیں اور چلنے سے جوتوں کی چرچرانے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے بار بار پوچھا کہ کون ہے۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو اس نے خوف زدہ ہو کر ریوالور نکال لیا۔ جسے وہ روزانہ تکیے کے نیچے رکھ کر سونے کی عمارت پر اور وہ جو کوئی بھی تھا اسے ڈرانے کے لیے گولی چلا دی۔ دھماکوں کی آوازیں سن کر پڑوسی اندر پہنچے تو وہاں محمود پڑا ہوا تھا۔ تحقیقات اور گواہوں کے بیانات سے معلوم ہوا کہ محمود اور فرحت کے تعلقات بہت قریبی تھے۔ مگر اسی پہر کسی بات پر ان کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ نسرين کے بھائی کا کہنا ہے کہ محمود کو بہت شریف نوجوان خیال کرتا تھا اور اس کا ادب تھا کہ اگر محمود نے فرحت سے شادی کی خواہش ظاہر کی تو وہ دونوں کی شادی کر دے گا۔ بس یہ ہیں مکمل واقعات۔“

”ان سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو کچھ ہوا ہے وہ ایک اتفاقی حادثہ تھا۔“ زاہر نے کہا۔

ہوتے دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ”آئیے آئیے تشریف لائیے۔“ اس نے کہا۔ ”آپ یقیناً بورڈنگ ہاؤس کی واردات کے سلسلہ میں آئے ہوں گے اور اب تو یہ پوچھنا بھی بے کار ہے کہ جناب کا موکل کون ہے۔ کیونکہ کوئی موکل ہو یا نہ ہو آپ اپنی عادت سے مجبور ہیں۔ پولیس کے معاملات میں ٹانگ اڑائے بغیر آپ کا ٹھکانا ہضم نہیں ہوتا۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ اس مرتبہ آپ کے بنائے کچھ نہ بن سکے گا۔ کس دو اور دو چار کی طرح واضح ہے میں ڈی ایس پی صاحب کے لیے اپنی فاضل رپورٹ لکھ رہا ہوں۔“

”یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔“ زاہر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ”اب سیک کو پولیس کی سست رفتاری کی شکایت نہیں رہے گی۔ رات کو مل ہوا اور صبح تک کیس حل ہو جائے۔ اس سے زیادہ برق رفتاری اور کیا ہو سکتی ہے۔ کوئی اعتراض نہ ہو تو مجھے بھی ان دو اور دو چار کا حال بتادیں، جن کے ذریعے آپ نے یہ کیس حل کیا ہے۔“

”کیوں نہیں ضرور؟ آخر پولیس آپ کی خادم ہے۔ اسے تنخواہ اسی بات کی ملتی ہے کہ آپ کو ہر قسم کی معلومات مفت فراہم کرتی رہے پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو۔“

”سوالات میں بعد میں کروں گا، پہلے تم سارے حالات بیان کرو۔“

”کل رات تقریباً ایک بج کر چندر منٹ پر ہیڈ کوارٹر میں ایک فون کال ریسیو ہوئی۔ فون کرنے والے نے بتایا کہ سرائے روڈ پر واقع بورڈنگ ہاؤس میں قتل کی ایک واردات ہو گئی ہے۔ اس کا نام سجاد ہے۔ وہ اپنی بہن کے ساتھ کمرہ

3 میں

رہتا ہے۔ اس کی بہن آنکھوں سے محروم ہے۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے اس بورڈنگ ہاؤس میں رہنے والا ایک نوجوان محمود معلوم نہیں کیوں

اس طرح کبھی وہ محمود کو قتل کر ہی نہیں سکتی۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ محمود کو اس طرح گولی نہیں ماری گئی کہ وہ کمرے میں کسی جگہ کھڑا ہوا اور فرحت کی طرف بڑھ رہا ہو۔“ فیاض خان نے جواب دیا۔ ”جبکہ وہ اپنے بقول پلنگ پہ بیٹھی ہو۔ دونوں زخموں پر نہ صرف یہ کہ بارود کے ذرات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ گولی بہت قریب سے چلائی گئی۔ بلکہ گولی کے جسم میں داخل ہونے کا زاویہ بھی بالکل سیدھا ہے۔ جبکہ فرحت پلنگ پر سے گولی چلائی اور محمود کھڑا ہوتا تو گولی ترجیحے انداز سے آ کر لگتی۔ اس سے ثابت ہوا کہ جس وقت گولی چلائی گئی۔ اس وقت محمود پلنگ پر اس کے قریب بیٹھا تھا۔ گویا وہ طعنی جھوٹ بول رہی ہے اور جھوٹ کوئی اس وقت بولتا ہے جب اپنا جرم چھپانا چاہے۔ مجھے یقین ہے کہ محمود اس کے پاس بیٹھا تھا۔ فرحت نے رقابت کے اندھے جوش میں اسے قتل کیا اور پھر خود کو سزا سے بچانے کے لیے اسے اٹھا کر پلنگ سے کچھ فاصلہ پر فرش پر ڈال دیا۔“

”خوب۔“ زاہر نے سوچتے ہوئے کہا۔
”کوئی اور ثبوت۔“

”فرحت کو معلوم تھا کہ محمود کے پاس کمرے کی چابی موجود ہے۔“ فیاض خان نے کہا۔ ”وہ یہ بھی جانتی تھی کہ دوسری چابی اس کے بھائی سجاد کے پاس ہے۔ گویا رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے کوئی اس کے کمرے میں آ سکتا ہے۔ تو وہ صرف محمود ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ سجاد میڈیکل اسٹور میں نائٹ ڈیوٹی پر تھا۔ اس لیے اس کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ وہ کمرے میں کسی کی موجودگی محسوس کر کے خوف زدہ ہو گئی۔ یہ اس کے بیان کی ایک اور خامی ہے۔“

”اس کے علاوہ۔“

”محمود کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد

”جی نہیں اتفاقی حادثہ ہر گز نہیں یہ۔ دانستہ قتل کی واردات ہے۔“
”وہ کس طرح۔“

”فرحت ایک خوب صورت مگر اندھی لڑکی ہے۔ اسے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ اگر ایک چاہنے والا ہاتھ سے گیا تو کوئی دوسرا مل جائے گا۔ یوں بھی انسانی فطرت ایسے معاملات میں کوئی شریک برداشت نہیں کرتی۔ سہ پہر کو اسے کسی لڑکی نے بتایا کہ محمود کسی اور سے محبت کرتا ہے۔ اسی بات پر دونوں کا جھگڑا ہوا تھا۔ فرحت نے مکینوں کی نظروں سے چھپ چھپ کر جب چاہے اس سے ملنے آ سکے۔ محمود رات کو گیارہ بجے کے قریب اس سے ملنے گیا۔ فرحت اس وقت بھی غصہ میں تھی۔ ممکن ہے محمود نے اسے سمجھانے یا منانے کی کوشش کی ہو یا ممکن ہے کہ اس نے غصہ میں آ کر خود بھی کہہ دیا ہو فرحت محسوس کر کے کہ محمود اس سے بے وفائی کر رہا ہے ریوالور نکال کر اسے شوٹ کر دیا۔“

”تاکہ وہ محمود کی مردہ لاش سے شادی کر سکے اور اسے یہ اطمینان ہو جائے کہ محمود اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتا۔“ زاہر نے طنز کیا۔

”کیا احقانہ باتیں کر رہے ہو۔“ فیاض خان بولا۔ ”عورت غصہ میں دلیل اور منطق پر غور کب کرتی ہے۔ اس وقت تو اسے یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنے محبوب کو حاصل نہیں کر سکتی تو پھر کوئی اور بھی اسے حاصل نہیں کر سکے گا۔“

”آخر فرحت نے رقابت کے جوش میں محمود کو دانستہ قتل کر دیا۔“

”یقیناً۔“

”اس نظر یہ کی تائید میں کوئی ثبوت۔“

”ایک نہیں بے شمار۔“

”مثلاً؟“

”مثلاً یہ کہ وہ

اندھی ہے اور جس انداز میں وہ بیان کر رہی ہے۔

اندھی ہونے کی وجہ سے یہ..... نہیں دیکھ سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے بیان کو موثر بنانے کے لیے جوتوں کی آواز کو شامل کر لیا لیکن یہی بات اس کے جھوٹ کا بول کھول گئی۔ ظاہر ہو گیا اس کا بیان اول تا آخر بالکل غلط اور من گھڑت ہے اور یہ جھوٹ بولنے کی ضرورت اسے اس لیے پڑی کہ اس نے دانستہ یہ جانتے ہوئے کہ وہ کسے شوٹ کر رہی ہے۔ محمود کو قتل کیا ہے۔“

”اب تم کہو گے کہ میں پھر بے تکی بات کر رہا ہوں۔“ زاہر نے کہا۔ ”لیکن یہ دوسرا نکتہ ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ اندر آنے والا محمود کے علاوہ بھی کوئی ہو سکتا تھا، کوئی ایسا فرد جس کا جوتا چلنے میں بول رہا تھا۔“

”اور میں پھر یہ بتاؤں گا کہ لاش محمود کی ملی ہے کسی اور کی نہیں۔“ فیاض خان بولا۔

”تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے۔“

”سردست کوئی نہیں۔“ زاہر نے سر ہلایا۔

”ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محمود نے یا کسی اور نے فرحت کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہو کہ آنے والا محمود نہیں کوئی اور ہے۔“

”اور یہ تاثر کس طرح دیا ہوگا۔“

”ابھی یہ بھی سوچنا ہے۔“

”اور کس مقصد سے دیا ہوگا۔“

”فی الحال اس سوال کا بھی کوئی جواب میرے پاس نہیں ہے۔“

”تھو گویا تم حسب عادت میرے ذہن کو الجھانے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”نہیں بلکہ حسب معمول سلجھانے کی۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہیں محمود کے پاس کوئی چابی ملی۔ میرا مطلب ہے اس کمرے کی۔“

”نہیں۔“

”یا کمرے کے قفل میں۔“

”نہیں۔“ فیاض خان نے نفی میں سر ہلایا۔

”اور یہ بات کچھ مجھے بھی کھٹک رہی ہے۔ کمرے

فرحت کے پلنگ سے دور گھڑے ہونے یا خاموش رہنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے یہ جواز بھی باقی نہیں رہتا کہ فرحت نے کوئی جواب نہ ملنے کے بعد دہشت زدہ ہو کر گولی چلا دی ہو۔“

”ایک سوال۔“ زاہر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”جب لوگ گولیوں کی آواز سن کر دوڑے تو انہیں کمرہ نمبر تین کا دروازہ بند ملایا کھلا ہوا۔“

”کھلا ہوا۔“

”سوال یہ پیدا ہوتا ہے اسے محمود نے بند کیوں نہیں کیا جبکہ فطری طور پر اسے بند کرنا چاہیے تھا۔“

”ممکن ہے اس نے بند کر دیا ہو اور بعد میں فرحت نے کھول دیا ہو۔“ فیاض خان نے کہا۔

”لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”ذہن میں ایک خیال آیا تھا۔“ زاہر بولا۔

”اگر وہ دروازہ کھلا ہوا تھا تو محمود کے علاوہ کوئی اور بھی ہو سکتا تھا اور یوں اس کے خاموش رہنے کی وجہ سے بھی سمجھ میں آ سکتی ہے اور فرحت کے خوف زدہ ہونے کی بھی۔“

”لیکن قتل محمود ہوا ہے۔ کوئی اور نہیں۔ تم ابھی کبھی بہت بے تکی باتیں کرنے لگتے ہو۔“

”ممکن ہے۔ اچھا آگے چلو کوئی اور ثبوت ہے۔“

”ہے اور بہت اہم ثبوت ہے۔“ فیاض خان نے مسکراتے ہوئے فاتحانہ انداز سے کہا۔

”فرحت کا کہنا ہے کہ اس نے گہری گہری سانسوں اور جوتے کے چرچانے کی آوازیں سنیں۔ گہری سانسوں کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتا، ممکن ہے اس وقت محمود بہت زیادہ جذباتی ہو رہا ہو، لیکن جہاں تک جوتوں کے چرچانے کا تعلق ہے تو یہ بات قطعی ناممکن ہے۔“

”کیوں۔“ زاہر نے پوچھا۔

”اس لیے محمود نے کیونٹس شوز پہن رکھے تھے۔ جو بالکل بے آواز ہوتے ہیں۔ فرحت

زاہر ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر دلچسپی کے تاثرات ظاہر ہوئے۔

”اور کیا وہ کسی کی تحقیقات کر رہا تھا۔“

”ہاں.....“ فیاض خان نے برا سامنہ بنایا۔

”بالکل تمہاری طرح میں نے اس کے اعلا آفیسر

انچارج سے بات کی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ کسی

کیس کی تحقیقات کرتے ہوئے بھی اپنے خیالات

و نظریات کسی کو نہیں بتاتا تھا۔ کبھی روزانہ رپورٹیں

پیش نہیں کرتا تھا۔ کیا کرتا ہے کہاں جاتا ہے کیا

ثبوت اس نے حاصل کر لیے ہیں۔ اس بارے

میں اس کا انچارج بھی لاعلم رہتا تھا۔ یہاں تک کہ

جب وہ مجرم پکڑ لیا کرتا تھا یا پکڑنے کے قریب ہوتا

تھا تب بتاتا تھا کہ اس نے کیا کیا ہے اور کس

طرح کیا ہے اور بہت خراب عادت ہے۔ اب

اس معاملہ میں دیکھ لو انچارج کے کہنے کے مطابق

اسے دولت آباد میں ناجائز منشیات کی حالیہ بڑھتی

ہوئی فروخت کا سراغ لگانے پر مامور کیا گیا تھا۔

وہ تقریباً ایک ماہ سے اس کیس پر کام کر رہا تھا۔ مگر

اس کے انچارج کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کرتا پھر

رہا ہے اور اب تک اس نے اس سلسلہ میں کوئی

کامیابی حاصل کی ہے یا نہیں۔ یہ بات بھی اب

اس کے قتل کے بعد معلوم ہوئی کہ وہ جیس بدل کر

بورڈنگ ہاؤس میں مقیم تھا۔ اب مجھے بتاؤ کہ اگر

اس طرح کوئی ذمہ دار آفیسر کسی حادثہ کا شکار

ہو جائے تو کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ جس کیس پہ

کام کر رہا تھا اس سلسلے میں اس کی تحقیقات کس

منزل پر پہنچی تھی۔ ہے نا یہ رازداری کی عادت سو

فصدی حماقت۔“

”اگر محمود کسی کیس کی تحقیقات کے سلسلے میں

بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا۔“

زاہر نے فیاض خان کا لیکچر نظر انداز کرتے

ہوئے کہا۔ ”تو یہ سوچا جاسکتا ہے کہ وہاں اس کے

جس جس سے تعلقات تھے۔ وہ لوگ اس کے

تحقیقاتی دائرے میں آئے ہوں گے۔“

کا قفل ہنسی ہے۔ اگر محمود اسے کھول آیا تھا تو چابی

یا تو قفل میں ہونا چاہیے تھی۔ جسے میں نے لے لیا

ہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ فرحت اگر اس بارے

میں جھوٹ بول رہی ہے اور اس کے پاس سے جو

چابی ملی ہے وہ محمود کی ہے تو اس کی چابی کہاں گئی۔

ہم نے سارا کمرہ تلاش کر لیا تھا۔ اگر وہ چابی اس کی

ہے تو محمود کس چابی سے دروازہ کھول کر اندر آیا

اور وہ کہاں گئی۔ یہ کہا جائے کہ فرحت نے دروازہ

کھولا چھوڑ دیا تھا تو اس کی بھی کوئی تک نہیں اور

محمود کی چابی تو بہر حال اس کے پاس ہونا چاہیے

تھی یا اس کے پاس۔ مگر دونوں جگہ نہیں تھی۔

فرحت کی چابی ملی وہ محمود کی ہے۔ تو اس کے پاس

تھی۔ جسے میں نے لے لیا ہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ

فرحت اگر اس بارے میں جھوٹ بول رہی ہے

اور اس کے پاس جو چابی ملی وہ محمود کی ہے تو اس کی

اپنی چابی کہاں گئی۔ ہم نے سارا کمرہ تلاش کر لیا

تھا۔ اگر وہ چابی اس کی ہے تو محمود کس چابی سے

دروازہ کھول کر آیا اور وہ کہاں گئی۔ ہم نے سارا

کمرہ تلاش کر لیا تھا۔ یہ کہا جائے کہ فرحت نے

دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا تو اس کی بھی کوئی تک نہیں

اور محمود کی چابی تو بہر حال اس کے پاس ہونا چاہیے

تھی۔“

”گو یا تمہیں بھی اعتراض ہے کہ ابھی کیس

پوری طرح حل نہیں ہوا۔“

”پوری طرح جہاں تک حل ہونے کا تعلق

ہے تو اس میں ایک اور نکتہ بھی الجھا ہوا ہے۔“

”وہ کیا۔؟“

”تمہیں معلوم ہے محمود کون تھا۔“

”نہیں۔ میں نے ابھی کام شروع نہیں کیا۔

پہلے تمہارے پاس آیا ہوں۔ مجھے کیا معلوم ہو سکتا

ہے۔“ زاہر نے کہا۔ ”کون تھا وہ۔“

”ایک بہت ذہین اور ہوشیار سی آئی ڈی

انسپیکٹر جو بھیس بدل کر بورڈنگ ہاؤس میں رہ رہا

تھا۔“

”ممکن ہے ایسا ہی ہو۔“ زاہر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”فرحت تو ہیڈ کوارٹر کی حوالات میں ہوگی۔“

”کیوں، کیا تم اس سے ملنے جا رہے ہو۔“

”تمہیں کوئی اعتراض ہے۔“

”بالکل نہیں۔“ فیاض خان مسکرایا۔ ”خاص

طور پر اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ تم خواہ کتنی ہی کوشش کرو کم سے کم اس میس میں کوئی الجھن پیدا نہیں کر سکتے۔“

”تمہاری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئے گی کہ میں الجھن پیدا کرنے کی نہیں، نہیں ختم کرنے کی کرتا ہوں۔“ زاہر نے کہا اور آفس سے باہر نکل گیا۔

☆☆

فرحت نے کمرہ ملاقات میں داخل ہوتے ہی اس انداز سے گردن ہلائی جسے وہ کمرے میں کسی کی موجودگی کا جائزہ لے رہی ہو۔ زاہر نے کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی بڑی آنکھیں اتنی صاف اور روشن تھیں کہ کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ نور بصارت سے محروم بھی ہو سکتی ہیں۔ ایک خاتون کا فنیبل جو اسے سہارا دے کر لا رہی تھیں اسے زاہر کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بٹھا دیا اور یہ کہہ کر باہر چلی گئی کہ وہ دروازے کے پاس ہی موجود ہے جب ضرورت ہو تو آواز دے دی جائے۔

”آپ کا نام زاہر ہے۔“ فرحت نے پوچھا۔ اس کا رخ زاہر کی طرف ہی تھا۔ جیسے وہ اس سے پہلے ہی اس کی موجودگی کا احساس کر چکی ہو۔

”جی ہاں۔ آپ کے ایک خیر خواہ نے مجھ سے کہا ہے آپ کی مدد کروں اسے یقین ہے آپ پر جھوٹا الزام لگایا جا رہا ہے۔“

”میرا ایسا ہمدرد کون ہو سکتا ہے۔“

”اس نے اپنا نام نہیں بتایا۔ بلکہ میں نے

”یہ بات تم کس طرح کہہ رہے ہو۔“ فیاض خان نے جواب دیا۔ ”کیا معلوم کہ اس کی تحقیقات کا دائرہ بورڈنگ ہاؤس کے اندر تھا یا باہر اور جہاں تک تحقیقات کی بات ہے تو محمود کا تعلق سوائے آفندی صاحب کے جن کے کمرے میں وہ ٹھہرا ہوا تھا یا فرحت کے اور کسی سے نہ تھا۔ آفندی صاحب آج کل کہیں باہر گئے ہوئے ہیں اور پولیس کے جانے پچانے افراد میں سے ہیں۔ ان پر کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ رہی فرحت تو ایک انڈی لڑکی کا منشیات کی ناجائز خرید و فروخت سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔ نہیں یہ محمود کا خاص نجی معاملہ ہوتا ہے۔ وہ غالباً فرحت سے محبت کرنے لگا تھا۔“

”اچھا خیر اسے جانے دو۔“ زاہر بولا۔ ”تم نے بتایا کہ فرحت تکیہ کے نیچے ریوا اور رکھ کر سوئی۔ یہ ریوا اور اس کے پاس کہاں سے آیا۔“

”اس کے بھائی سجاد نے اسے خرید کر دیا تھا۔ اس کا باقاعدہ لائسنس موجود ہے۔“ فیاض نے بتایا۔ ”گزشتہ دنوں اس علاقہ میں چوری کی کئی وارداتیں ہوئی تھیں۔ خود بورڈنگ ہاؤس میں بھی کئی چوریاں ہو چکی تھیں۔ سجاد کا کہنا ہے کہ اس نے بہن کی حفاظت کے خیال سے اسے ریوا اور لا کر دیا تھا۔“

”محمود کے جسم پر گولیوں کے کتنے زخم تھے۔“

”تمہیں بتایا تو ہے کہ صرف دو تھے۔“

”اور فرحت کے ریوا اور سے گولیاں بھی صرف دو ہی چلائی گئی تھیں۔“

”ہاں۔“ فیاض خان نے کہا۔ ”چنانچہ تم دیکھ سکتے ہو کہ اس میس میں کوئی الجھن نہیں ہے۔ حالات سے یہ بات ثابت ہو جاتا ہے کہ فرحت نے رقابت کے غصے میں محمود کو قتل کیا اور اپنے آپ کو سزا سے بچانے کے لیے یہ بیان سوچا، جس سے ظاہر ہو کہ یہ قتل ایک اتفاقی حادثہ کے طور پر ہوا ہے۔“

بار پھر بیان کر دی۔

”آپ نے کہا کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی پہلا خیال جو آپ کے ذہن میں آیا وہ محمود کے بارے میں تھا۔“ زاہر نے پوچھا۔
”تو کیا وہ اتنی رات گئے آپ سے ملنے آتا تھا۔“
”ممکن ہے آپ اسے نامناسب کہیں۔“

فرحت نے پھینکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔
”لیکن بورڈنگ ہاؤس میں ایسے لوگ ہیں جو بات کا بنگلہ بنانے میں ماہر ہیں۔ میں ایک سچ تجربے سے گزر چکی تھی۔ ہمارے لیے دنیا کی نظروں سے چھپ کر ملنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا اور میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ ہماری یہ ملاقاتیں ہر اعتبار سے دائرہ اخلاق میں ہوتی تھیں۔ بلاشبہ محمود کبھی کبھی رات گئے بھی آئے تھے، بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ اچانک میری آنکھ کھلی تو انہیں میں نے کمرے میں موجود پایا اور انہوں نے کہا کہ وہ بہت دیر سے میرے بلیک کے پاس بیٹھے تھے۔ مگر مجھے اٹھانے کی ہمت نہ کر سکے اور اگر میں خود سے بیدار نہ ہوتی تو وہ اسی طرح خاموشی سے رخصت ہو جاتے۔“

”خوب۔“ زاہر نے اس طرح سر ہلایا جیسے فرحت نے اس کے کسی خیال کی تائید کی ہو۔ ”کیا آپ کو یاد ہے کہ آپ نے تنہی گولیاں چلائی تھیں۔“

”جی ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے تین فار کیے تھے۔“

”تین۔“ زاہر نے دلچسپی سے دہرایا۔
”لیکن محمود کو تو دوزخم آئے ہیں۔“

”ظاہر ہے ایک گولی خالی نکل گئی ہوگی۔“

”جی نہیں۔ آپ کے ریوالور میں صرف دو گولیاں چلی ہوئی پائی گئی ہیں۔“

”ناممکن ہے۔ میں نے تین مرتبہ ٹرائیگر دیا تھا۔“

”تب ممکن ہے، ایک گولی چلی ہی نہ ہو۔“

اسے دیکھا تک نہیں۔ صرف فون پر اس کی آواز سنی ہے۔ آپ بتا سکتی ہیں کہ وہ کون ہوگا۔“
”اگر یہ کام سجاد بھائی کا نہیں تو پھر میں نہیں بتا سکتی کہ وہ کون ہوگا۔“
”کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں۔“

”اگر داور صاحب سے ترک تعلق نہ ہو چکا ہوتا تو میں سوچتی کہ شاید وہ ہوں کہ انہیں گناہ منیایا کرنے کی بہت عادت ہے۔“
”یہ داور صاحب کون ہیں۔“ زاہر نے دلچسپی سے پوچھا۔

”اسی بورڈنگ ہاؤس کے ایک کرائے دار ہیں۔ گراؤنڈ فلور پر رہتے ہیں اور سجاد بھائی کے میڈیکل اسٹور میں ملازم ہیں۔“ فرحت نے جواب دیا۔ ”لیکن میں درخواست کروں گی۔ آپ ان کے بارے میں مجھ سے مزید سوالات نہ کریں۔“

”بہت بہتر، تو جیسا کہ میں نے بتایا، میں آپ کی مدد کرنے کے خیال سے حاضر ہوا ہوں۔“
”آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں۔“

”اگر حالات اسی طرح پیش آتے ہیں جس طرح آپ بیان کرتی ہیں تو میں یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کر سکتا کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا یا کہ یہ حقیقت میں محمود کا قاتل کوئی اور ہے۔“

”قاتل تو میں ہوں زاہر صاحب۔“ فرحت نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”وہ میرے ہی ریوالور کی گولی سے مرے ہیں۔ ویسے خدا جانتا ہے مجھے بالکل نہیں معلوم تھا کہ کمرے میں کون ہے۔ میں نے انتہائی خوف کی حالت میں اپنی حفاظت کے خیال سے فار کیا تھا اور یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر وہ محمود تھے تو وہ خاموش کیوں رہے۔“

”کیا آپ یہ بتائیں گی کہ یہ حادثہ کس طرح پیش آیا۔“ زاہر نے پوچھا۔

اور جواب میں فرحت نے پوری تفصیل ایک

چیزوں میں فرق محسوس کر سکتی ہوں۔ میں نے ایک ثانیہ کے لیے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ کوئی دوسرا ریوالور ہے۔ مگر بعد میں پھر حالت کے زیر اثر یہ بات میرے ذہن سے محو ہو گئی۔ اب آپ نے ذہن پر زور دینے کے لیے کہا تو یاد آیا۔“

”یہ کوئی اہم بات بھی ہو سکتی ہے۔“ زاہر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”آپ فکر مند نہ ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بے گناہ ہیں۔“

”فکر مند ہونے کے لیے اب میری زندگی میں کچھ باقی نہیں رہا۔“ زاہر صاحب۔“ فرحت کی آواز بھرا گئی۔ ”آپ مجھے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جبکہ مجھے اس بات سے زیادہ خوشی ہوگی، مجھے محمود کے قتل کے جرم میں پھانسی دے دی جائے۔ ہر روز تھوڑا تھوڑا مرنے سے بہتر ہے کہ ایک ہی بار موت آجائے۔“

”آدمی کو زندگی سے اس قدر مایوس نہیں ہونا چاہیے۔“ زاہر نے اس کا ہاتھ تھام کر تھپتھپایا۔ ”آنے والے کل کے بارے میں کوئی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آپ اس وقت کل سے ناامید ہیں، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ وہ آپ کے لیے خوشیوں کا پیا مبرن کر نہیں آ رہا ہے۔“

☆☆

بورڈنگ ہاؤس پہنچ کر زاہر نے پہلے داور کے بارے میں پوچھا۔ پتا چلا کہ وہ اپنی ڈیوٹی پر گیا ہے۔ اس کے بارے میں تمام لوگوں کی رائے کم و بیش ایک تھی کہ بہت شریف بلند اخلاق اور پر خلوص نوجوان ہے۔ زاہر نے باری باری عمر خان صاحب، طاہر صاحب، اسلام صاحب، ارشد صاحب سے ملاقات کی، سب کا بیان کم و بیش ایک تھا۔ وہ فائرنگ کی آواز سن کر سجاد کے کمرے پر پہنچے تو دروازہ کھلا ملا۔ وہ اندر داخل ہوئے تو محمود کی لاش نظر آئی۔ وہ منہ کے بل گرا ہوا تھا۔ جی ہاں۔ اس کا پورا سیدہ بولہ بان ہو رہا تھا۔ فرش پر بھی خون گرا ہوا تھا لیکن وہ کچھ کم معلوم ہوتا تھا۔ (یہ

”یہ بھی ہو سکتا۔ میں اندکی ضرور ہوں۔“ میں نے اپنے کانوں سے تین دھماکے سنے تھے۔“

”آپ کو مکمل یقین ہے۔“

”سو فیصدی۔ آپ بورڈنگ ہاؤس کے دوسرے لوگوں سے پوچھ سکتے ہیں۔“

”ضرور پوچھوں گا۔ کیونکہ یہ ایک اہم سراغ ہو سکتا ہے۔“ زاہر نے کہا۔ ”اب ذرا ذہن پر اچھی طرح زور ڈال کر یہ سوچے کہ ریوالور اور فائرنگ ہی کے سلسلے میں کوئی غیر معمولی بات آپ نے محسوس کی۔ کوئی ایسی بات جو آپ کو عجیب لگی ہو۔“

”پہلی بات مجھے یہ ہی عجیب لگی تھی کہ میرے پوچھنے پر بھی محمود نے یہ کیوں نہیں بتایا کہ وہ کون ہیں۔ یہ ان کی عادت کے بالکل برخلاف بات تھی۔“

”کوئی اور بات۔“ زاہر نے پوچھا۔ فرحت چند لمحے خاموش رہی۔

”یاد آیا۔“ اس نے کہا۔ ”مجھے اس پہ بھی حیرت ہوئی تھی کہ گولی چلائے جانے کے بعد وہ جو کوئی بھی تھا۔ چیخا کیوں نہیں۔ نہ ہی کسی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ میں پہلے ہی یہ بھی تھی میری گولیاں خطا لگیں۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ جب سب لوگ کمرے میں آئے اور انہوں نے مجھے محمود کے بارے میں بتایا تو مجھے کتنی حیرت اور دکھ ہوا تھا۔“

”ہوں۔“ زاہر نے سر ہلایا۔ ”کوئی اور بات۔“ اس مرتبہ فرحت کافی دیر تک سوچتی رہی۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔“ آخر وہ بولی۔

”لیکن جب میں نے نیپکے کے نیچے ہاتھ ڈال کر ریوالور نکالا تو وہ مجھے اجنبی اجنبی سا لگا۔

جیسے وہ میرا نہ ہو۔ میں اسے بارہا ہاتھوں میں لے کر دیکھ چکی تھی۔ آنکھوں سے محروم ہونے کے بعد

میری چھونے کی حس کافی تیز ہو گئی ہے۔ میں

صرف چھو کر بھی پہچان سکتی ہوں۔ ایک جیسی

تعارف کرایا کہ وہ پولیس کے ساتھ مل کر اس واردات کی تحقیقات کر رہا ہے اور انسپکٹر فیاض خان کی اجازت سے چند سوالات پوچھنے آیا ہے۔
”مگر مجھے تو جو کچھ معلوم تھا انسپکٹر صاحب کو بتا چکی ہوں۔“

”میں جانتا ہوں۔“ زاہر نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”لیکن ایسے معاملات میں اکثر ذرا سی بات بھی بہت اہم ثابت ہوتی ہے اور یہ طے ہے کہ ان حالات کے پیش نظر جن سے آپ کو بعد میں یاد آئے۔ یا میرے سوالات سے آپ کے ذہن میں کوئی ایسی بات آجائے جس کے بارے میں آپ کو پہلے ہی کوئی خیال نہ تھا۔ اس لیے ہو تو بار بار سوالات کرتے رہتے ہیں۔ اچھا یہ بتائیے کہ آپ نے کتنی گولیاں چلنے کی آواز سنی تھی۔“
”میرے خیال میں تین دھماکے سنائی دیے تھے لگاتار۔“

”خیال سے آپ کو یقین نہیں۔“
”جی نہیں۔ مجھے یقین ہے۔ تین ہی آوازیں سنی تھیں۔“
”بہت خوب اب یہ بتائیں کہ آپ سے کس نے کہا تھا کہ آپ پہلے سجاد کو فون کرنے کا مشورہ دیں۔“
”مجھ سے..... مجھ سے کون کہتا؟“ بشری کچھ چونکی۔

”پھر یہ مشورہ کیا آپ نے خود ہی دیا تھا۔“
”جی ہاں۔“
”کیوں۔“
”کیوں..... کیوں کا کیا سوال ہے۔“ بشری قدرے گھبرائی۔

”ظاہر ہے کہ کمرہ سجاد صاحب کا تھا۔ ہم ان کی مرضی کے بغیر خود سے پولیس کو کیسے فون کر دیتے اور پولیس کو تو..... دیکھے برا ماننے کی بات نہیں۔ اس وقت میری امی گھر پر نہیں ہیں۔ کیا آپ ان کی موجودگی میں نہیں آسکتے؟“

خیال عرفان صاحب نے ظاہر کیا تھا) فرحت اپنے پلیٹک پر ریوالور ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔ اس نے ریوالور لے کر میز پر رکھ دیا۔ جی نہیں۔ انہوں نے ریوالور کو غور سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ بعد میں پولیس نے جو ریوالور اپنے قبضہ میں لیا وہ ہی تھا یا کوئی دوسرا، مگر ظاہر ہے دوسرا کیوں ہوگا، جی نہیں کرے میں کوئی وارنٹیں تھا اور نہ ہی انہوں نے کسی کو کمرے میں جاتے باہر نکلتے دیکھا۔ جی ہاں، یہ درست ہے۔ انہوں نے تین فائروں کی آوازیں سنی تھیں۔

اس بارے میں کسی کا بیان بھی دوسرے سے مختلف نہیں تھا۔ محمود کے متعلق ان سب کی رائے اچھی تھی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ فرحت سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اس سے ملتا بھی ہے۔ مگر ان کے خیال میں یہ کوئی ایسی بات نہ تھی کیونکہ انہیں محمود نے خود بتایا تھا کہ وہ فرحت سے شادی کرنا چاہتا ہے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ فرحت بیٹائی سے محروم ہے۔ وہ محمود کے خلوص کی قدر کرتے تھے۔ اب سب کو یہ یقین بھی تھا کہ جو کچھ ہوا وہ ایک اتفاقی حادثہ ہی تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں آسکتے کہ فرحت نے محمود کو دانستہ قتل کیا ہوگا اور وہ جھگڑا۔ ارے صاحب محبت کرنے والوں میں ایسی نوک جھونک تو ہوتی ہی رہتی ہے اور پھر جھگڑا ابھی غلط فہمی پر مبنی تھا۔ محمود ہرگز ایسا نوجوان نہیں تھا۔ جو عادات لڑکیوں میں دلچسپی لیتا ہو۔ انہیں یقین تھا کہ فرحت کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔ جی ہاں پہلے سجاد کو فون کیا گیا تھا۔ اس کی رائے بشری نے دی تھی۔ اس کی منگنی عنقریب سجاد سے ہونے والی ہے۔ اسے ایک طرح سے یہ رائے دینے کا حق تھا اور یہ بات بھی ٹھیک تھی۔ پولیس کو تو آپ جانتے ہیں۔ کون بلاوجہ مصیبت میں پھنسا پسند کرتا ہے۔

ان سب سے ملاقات کرنے کے بعد زاہر چند منٹ کے لیے بشری کے کمرے میں بھی گیا۔ بشری کی ماں گھر پر نہیں تھی۔ زاہر نے یہ کہہ کر اپنا

”ٹھیک ہے میں پھر آ جاؤں گا۔“ زاہر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ وہ جو کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا معلوم کر چکا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کمرہ نمبر تین پر دستک دی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اس وقت سجاد گھر پہ ہے۔ چند لمحوں کے بعد ایک طویل قامت نوجوان نے دروازہ کھولا۔

وہ دیکھنے میں کافی خوب صورت ہوشیار اور ذہین معلوم ہوتا تھا۔

”فرمائیے،“ اس نے پوچھا۔
”آپ سجاد صاحب ہیں۔“
”جی ہاں۔“

”میں انسپکٹر فیض خان کے ساتھ مل کر اس افسوسناک حادثے کی تحقیقات کر رہا ہوں، جو کل رات آپ کے کمرے میں پیش آیا۔“ زاہر نے کہا۔

”اس سلسلہ میں آپ سے کچھ مزید سوالات پوچھنا ضروری ہیں۔“

”آئیے اندر آ جائیے۔“ سجاد نے ایک جانب ہٹتے ہوئے کہا۔

زاہر نے کمرے میں قدم رکھا جو اپنے فرنیچر کے اعتبار سے ایک وقت ڈرائنگ روم اور بیڈ روم نظر آ رہا تھا۔ ایک صوفہ سیٹ کے بالمقابل ریوالور کے ساتھ پلنگ تیسری جانب ایک میز جس کے سامنے ایک دو درسیاں بھی پڑی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ سجاد ایسی میز پر بیٹھا کچھ گرہا تھا۔ الیش ٹرے میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ ایک چایوں کا گچھا بھی نظر آ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سجاد میز پر بیٹھا۔ سامنے کچھ کتابیں، ایک رجسٹر، ایک قلم بھی رکھا تھا۔ ”بیٹھے۔“ سجاد نے صوفہ کی طرف اشارہ کیا۔

”اعتراض نہ ہو تو میں پہلے فرحت صاحبہ کے کمرے کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔“ زاہر نے کہا۔

”ضرور۔“ سجاد نے جواب دیا اور پارٹیشن کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ فرحت کا کمرہ تقریباً بیرونی کمرے کی طرح تھا۔ سوائے اس فرق کے کچھ چھوٹا تھا اور یہاں کوئی صوفہ سیٹ نہیں تھا۔ ایک جانب لوہے کی الماری اور دوسری جانب میز کے ساتھ دو ایک لگے تھے۔ ایک پر کتابوں کے ساتھ ٹوان ون یعنی ریڈیو اور کیسٹ ریکارڈ بھی رکھا تھا۔ پلنگ دروازے کے بالکل سامنے بچھا تھا۔ فرش پر چاک کے نشانات سے ظاہر تھا کہ محمود کی لاش وہاں پڑی پائی گئی تھی۔ زاہر نے پلنگ سے اس جگہ کے فاصلہ کا اندازہ کیا۔ یہ کیا کم و بیش سات فٹ تھا۔ ذہن میں گزشتہ رات کا تصور لاتے ہوئے اس نے ریوالور سے چلنے والی گولیوں کی سمت کا ایک اندازہ قائم کیا اور پھر اس سمت فرش، الماری، دیواروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ احتیاط مافی کمرے پر بھی نگاہ ڈالی، مگر ایسے مایوسی ہوئی۔ اگر فرحت نے تین گولیاں چلائی تھیں اور ان میں سے دو نے محمود کے سینہ کو ہدف بنایا تھا۔ تیسری گولی کو لازماً کمرے میں کسی جگہ ہونا چاہیے تھا۔ مگر وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی اور یہ بڑی اہم بات تھی۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ کوئی اور گولی موجود نہیں ہے تو وہ صوفہ پر آ کر بیٹھ گیا۔

”آپ کیا دیکھ رہے تھے۔“ سجاد نے پوچھا۔
”کچھ نشانات ہونا چاہیے تھا، مگر نہیں ہیں۔“ زاہر نے سرسری لہجے میں جواب دیا اور پھر پوچھا۔ ”بہر حال آپ یہ بتائیں کہ آپ کے خیال میں یہ کوئی اتفاقی حادثہ ہے یا آپ کی بہن دانستہ محمود کو گولی ماری تھی۔“

”آپ اسے دانستہ کس طرح کہہ سکتے ہیں جبکہ فرحت کے بار بار پوچھتے پر بھی محمود خاموش رہا۔“

”کیسے معلوم کہ وہ خاموش رہا۔“
”فرحت کہتی تھی.....“ سجاد بولتے بولتے رک

گیا۔ ”آپ کا مطلب ہے کہ اس نے دانستہ غلط بیانی کی ہے۔“

”امکان بہر حال مہجود ہے۔“ زاہر نے کہا۔ ”خیر آپ یہ بتائیں کہ محمود کے بارے میں آپ کی رائے کیا تھی۔“

”میں اسے ایک شریف نوجوان سمجھتا تھا۔“ سجاد نے جواب دیا۔ ”مجھے معلوم تھا کہ وہ اور فرحت ایک دوسرے میں دلچسپی لیتے ہیں اور مجھے اس پر کوئی اعتراض بھی نہ تھا۔ مجھے فرحت کی شادی کی فکرتھی اور ایک آنکھوں سے معذور لڑکی کو محمود جیسا شوہر مل جائے تو اس سے زیادہ مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ البتہ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ فرحت نے اسے کمرے کی چابی دے رکھی ہے اور وہ یوں راتوں کو بھی ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ یہ ایک معیوب بات تھی اور مجھے پتا ہوتا تو میں یقیناً دونوں کو سرزنس کرتا۔“

”آپ فرحت کی شادی کے لیے فکر مند تھے۔ تو آپ نے داور کا پیام کیوں مسترد کر دیا۔ وہ بھی ایک اچھا اور شریف لڑکا ہے۔ کم سے کم یہاں کے لوگ اس کے بارے میں اچھی رائے ہی رکھتے ہیں۔“

”داور کے متعلق کوئی مجھ سے زیادہ نہیں جانتا۔“ سجاد نے ناگواری سے کہا۔ ”وہ اسی میڈیکل اسٹور میں کام کرتا ہے جہاں میں ملازم ہوں۔ آپ اسے شریف کہتے ہیں۔ مگر وہ بہت چار سو بیس آدمی ہے۔ اس نے اپنے عیب پھپھانے کے لیے شرافت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کی دوستی جرائم پیشہ افراد سے ہے۔ یقین سے نہیں کہہ سکتا، کیونکہ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ لیکن مجھے شبہ ہے کہ وہ ناجائز منشیات کی خرید و فروخت کرتا ہے اور یہ کام ملازمت کی آڑ میں کر رہا ہے۔ مگر اتنی ہوشیار کے ساتھ کہ مجھے ابھی تک اس پر ہاتھ ڈالنے کا موقع نہیں ملا۔ البتہ میں نے دکان کے

گفتگو کر رہے ہیں۔“ زاہر نے کچھ مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تو میں بھی تکلف برقرار رکھنا مناسب نہیں سمجھتا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ میں عموماً پولیس کی مدد کے خیال سے تحقیقات کرتا ہوں۔ لیکن میرا پولیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انسپکٹر فیاض خان میرا اچھا دوست ہے۔ ہم ایک دوسرے سے تعاون کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اس وقت جو میں تحقیق کر رہا ہوں وہ صرف اپنے ایک موکل کے لیے کر رہا ہوں۔ اس کا پولیس سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں نے اسی لیے شاید ابھی تک اپنا نام بھی نہیں اتارنا۔“

”میرا نام ڈاکٹر جاسٹ“

جنوری 2013

”دیکھئے آپ پکڑے گئے۔“ زاہر مسکرایا۔
”آپ کو کیسے معلوم ہے کہ مجھے اب تک کوئی فیس ادا نہیں کی گئی ہے۔“

سجاد عجیب سے انداز میں خاموش ہو گیا۔
جیسے سوچ رہا ہو کہ اس سوال کا جواب کس طرح دے اور کیا دے۔ ”میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں۔“
زاہر نے پوچھا۔

”اب میں کیا بتاؤں۔“ سجاد نے گہری سانس لی۔ ”آپ نے انکار کرنے کی گنجائش بھی نہیں چھوڑی۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”لیکن یہ رازداری کیوں۔“ زاہر نے سوال کیا۔

”فرحت کے خیال سے مجھے ایسا کرنا پڑا۔“
سجاد نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”میں نہیں سمجھ سکا۔“
”مجھے شبہ ہے کہ وہ کسی کو بچانے کی کوشش کر رہی ہے۔“

”آپ مجھے کند ذہن کہہ لیں لیکن میں اب بھی نہیں سمجھا۔“ زاہر کے لہجے سے ابھنن نمایاں تھی۔

”زاہر صاحب آپ اس بات پر یقین کریں یا نہ کریں۔“ سجاد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔
”لیکن میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ کوئی عورت اپنی پہلی محبت کو فراموش نہیں کر سکتی اور اگر کبھی حالات کے زیر اثر اس کے دل کا وہ چوٹ کھایا ہوا حصہ چھوڑ دیا جائے تو وہ اپنے سابقہ محبوب کے لیے اپنی جان کی قربانی بھی دے سکتی ہے۔ داور لڑکیاں بھانپنے میں بہت ہوشیار ہے۔ فرحت سے اپنے تعلق میں وہ سنجیدہ تھا یا نہیں، یہ میں نہیں جانتا، لیکن فرحت اپنی دانستی میں بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ داور کا کرکٹر میرے سامنے نہ ہوتا تو میں کبھی ہرگز ان کے درمیان آنے کی کوشش نہ کرتا۔ لیکن میں اپنی اکلوتی بہن کو کسی دوسرے کا کھلونا بننے نہیں دیکھ سکتا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی یقین

کہتے ہیں۔“
”مجھے معلوم ہے۔“ سجاد نے بھی ہنسنے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کو پہلی نظر میں ہی پہچان گیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ پولیس کے ساتھ یا اس سے الگ اپنے طور پر بھی تحقیقات کرتے ہیں۔ مگر میں نے سوچا کہ پولیس کی تحقیقات ہو یا آپ کی۔ جب مقصد دونوں کا ایک ہے تو میں کوئی اعتراض کیوں کروں۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ آپ کی کوشش نسرین کے لیے مفید ثابت ہو۔ کیونکہ انسپٹر فیاض خان تو اسے قتل عہد کا مرتکب خیال کر رہے ہیں۔“

”بہت خوب۔“ زاہر نے قہقہہ لگایا۔ ”اچھا یہ لطیفہ رہا۔ دراصل مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ آپ جیسے ذہین اور ہوشیار نوجوان سے اپنے آپ کو چھپانا مشکل ہوگا لیکن سجاد صاحب اس کیس میں میرے لیے ایک بات ابھی تک ابھنن کا باعث بنی ہوئی ہے۔“

”وہ کیا۔؟“ سجاد نے پوچھا۔
”آپ جانتے ہیں کہ عام طور پر کوئی نہ کوئی پارٹی تحقیقات کے لیے میری خدمات حاصل کر لیتی ہے اور وہ چاہے دوسروں سے پوشیدہ ہو، مگر اسے میرے سامنے تو آنا پڑتا ہی ہے۔ اس کیس میں عجیب بات یہ ہوئی کہ جس فرد نے مجھ سے تحقیقات کی درخواست کی، وہ میرے سامنے نہیں بلکہ اس سے ساری گفتگو فون پر ہوئی۔ پہلے میرا اندازہ تھا کہ شاید وہ داور ہو۔ مگر اب حیران ہوں کہ کیا سمجھوں، کیونکہ حالات تو ایسے نظر نہیں آتے کہ داور کو آپ سے یا فرحت سے کوئی دلچسپی ہمدردی کے انداز میں ہو سکتی ہے۔“

”تو آخر آپ یہ کیوں جانتا چاہتے ہیں کہ آپ کا موکل کون ہے۔“ سجاد نے مجھے کچھ ٹالنے کے انداز میں کہا۔ ”آپ اپنا کام کریں، مجھے امید ہے کہ وہ جو کوئی بھی ہوگا خواہ سامنے آئے یا نہ آئے۔ آپ کی فیس ادا کر دے گا۔“

جھپکتے فیصلہ کیا۔ داور تو ختم ہو چکا۔ وہ اسے واپس تو نہیں لاسکتی تھی، لیکن داور..... اس کی پہلی محبت اس کی مدد کا ضرورت مند تھا۔ محمود کی جان لینے کے لیے اسے معاف کرے یا نہ کرے۔ لیکن اسے پھانسی کے تختہ پر بھی نہیں پہنچا سکتی تھی۔ اس نے داور سے کہا کہ وہ چپ چاپ نکل جائے۔ اپنی زبان بند رکھے۔ باقی وہ خود سنبھال لے گی اور یوں اس نے داور کو بچانے کے لیے خود قتل کا اعتراف کر لیا۔

”بات تو آپ کی سمجھ میں آتی ہے۔“ زاہر نے سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ ”بہت ممکن ہے حالات اسی طرح پیش آئے ہوں۔ لیکن گواہوں کا بیان ہے کہ انہوں نے کسی کمرے سے باہر نکلنے نہیں دیکھا اور میرا خیال ہے کہ گولیاں چلنے اور لوگوں کے یہاں پہنچنے میں اس قدر کم وقفہ تھا کہ داور کے فرحت کو اپنی مدد پر آمادہ کرنا اور فرار ہونا۔ یہ دونوں کام کرنا ناممکن نہ تھے۔“

”تو ضروری نہیں کہ وہ کمرے سے نکل گیا ہو۔“ سجاد نے جواب دیا۔ ”عارضی طور پر کہیں جھپ کر بعد میں آنے والوں کی بھیڑ میں شامل ہو سکتا تھا۔“

”ممکن ہے..... مگر میں حوالات میں فرحت سے مل کر آیا ہوں۔ اسے معلوم ہے کہ اس کی مدد کے لیے اسے سزا سے بچانے کے لیے کام کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو وہ مجھے بھی اپنے اعتماد میں لینے کی کوشش کرتی۔ کچھ نہ کچھ ضرور بتاتی۔“

”جی نہیں، اس کا مطلب ہے کہ آپ عورت کی فطرت کو بالکل نہیں جانتے۔“ سجاد نے کہا۔ ”فرحت پھانسی کا پھندہ گٹے میں پہن لے گی، مگر یہ اعتراف ہرگز نہیں کرے گی کہ داور کو بچانا چاہتی ہے۔“ قل اس نے نہیں داور نے کیا ہے۔

”ابھی میں اس نظریے سے مطمئن تو نہیں ہوں، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کافی وزنی اور

تھا کہ فرحت کی طبیعت اور مزاج کی لڑکی ہے کہ وہ کبھی بھی داور کے ساتھ خوشگوار زندگی نہیں گزار سکتی۔ اس کی بہتری کے خیال سے مجھے یہ پختہ فیصلہ کرنا پڑا۔ میں نے داور کو گھر سے نکال دیا اور اسے سمجھا دیا کہ آئندہ فرحت سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔ بظاہر نسرین نے اس حادثہ کو بڑے صبر اور حوصلے سے برداشت کیا، لیکن مجھے شک ہے کہ محمود سے دلچسپی پیدا ہونے کے باوجود داور کو قطعی طور پر فراموش نہیں کر سکی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ داور اس بورڈنگ ہاؤس میں گراؤنڈ فلور پر رہتا ہے اور یہاں ماحول ایسا ہے کہ کسی فرد کے بارے میں کوئی بات چھپی نہیں رہتی۔ یقیناً داور بھی محمود اور فرحت کی باہمی پسندیدگی سے واقف ہوگا اور کوئی مرد آسانی سے یہ پسند نہیں کرتا کہ جس لڑکی کو کبھی وہ اپنی ملکیت خیال کرتا تھا کوئی دوسرا مرد خواہ جائزہ طور پر ہی سمجھے اس پر قبضہ جمانے کی کوشش کرے۔ پھر داور جیسے مرد اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات اتنی آسانی سے برداشت بھی نہیں کیا کرتے۔ وہ غنڈہ اور بد معاش ٹائپ کا نوجوان ہے۔ ان لوگوں میں سے جو اس سے کم تر درجہ کی بات کے لیے تشدد پر اتر آتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے محمود کو دھمکیاں بھی دی ہوں گی۔ بہت ممکن ہے کہ فرحت کو بھی خوف زدہ کرنے کی کوشش کی ہو۔ مگر محمود نے غالباً اس کی ہرزہ سرائیوں کو توجہ کے قابل نہیں سمجھا۔ داور جاوید کی تاک میں رہتا ہوگا۔ کل رات اس نے محمود کو نسرین سے ملنے کے لیے آتے دیکھا۔ خود بھی پہنچ گیا۔ فرحت نے شاید اسے دھمکانے کے لیے ریوالتور نکال لیا اور داور نے اس سے ریوالتور چھین کر محمود کو ختم کر دیا۔ یہ سب کچھ حالت اشتعال میں ہوا۔ محمود کے گزرنے کے بعد اسے ہوش آیا کہ وہ کیا کر بیٹھا ہے۔ اس نے فرحت سے کہا کہ وہ اسے بچائے۔ پڑوسی فائر کی آواز سن کر آنے ہی والے ہوں گے اور اب وقت فرحت نے بلیک

لال معلوم ہوتا ہے۔ میں اپنی حقیقات میں اسے ضرور پیش نظر رکھوں گا۔“ زاہر نے کہا۔ ”لیکن یہ بات پھر بھی واضح نہ ہوئی کہ آپ نے یہ راز داری کیوں برتی۔“

”میں نے کہا نا کہ فرحت کے خیال سے میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے یہ بات معلوم ہو کہ میں اسے نہیں داور کو قاتل سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اگر آخر کار یہ ہی سچ ثابت ہوا اور داور کے قتل کے جرم میں سزا یاب ہو گیا تو فرحت مجھے اس کے لیے بھی معاف نہیں کرے گی۔ میں چاہتا تھا کہ واقعات کی صحیح تحقیقات بھی ہو جائے اور فرحت کو یہ بھی پتا نہ چلے کہ ایسا میری خواہش سے کیا گیا ہے۔ پھر بہر حال یہ بھی امکان تھا کہ میرا اندازہ غلط ہوا اور میں بلا وجہ فرحت کے دل میں اپنے لیے ایک کدورت پیدا کرنے کا موجب بن جاؤں۔“

”درست ہے۔“ زاہر نے سر ہلایا۔
”اور اب جبکہ آپ کو یہ علم ہو چکا ہے میں آپ سے وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ آپ فرحت سے کچھ نہیں کہیں گے۔“

”آپ مطمئن رہیں میری جانب سے کوئی ایسی بات نہ ہوگی جو اسے تکلیف پہنچانے کی موجب ہو۔“ زاہر نے کہا۔ پھر کچھ رک کر بولا۔
”آپ کس میڈیکل اسٹور میں کام کرتے ہیں۔“
”حمزہ میڈیکل اسٹور۔ یہ سول اسپتال کے سامنے ایک بہت بڑی دواؤں کی دکان ہے اور چوبیس گھنٹے کھلی رہتی ہے۔ میں آج کل رات کی ڈیوٹی دے رہا ہوں اور داور۔“

”وہ دن میں کام کرتا ہے۔“
”کل کتنے سبز مین ہیں۔“
”چھ چار دن اور دورات میں موجود ہوتے ہیں۔“

”آپ کی ڈیوٹی کس وقت سے شروع ہوتی ہے۔“

”رات کے دس بجے صبح آٹھ بجے تک۔“

”اچھا تو پھر اب میں چلتا ہوں۔ امید ہے جلد ہی

دوبارہ ملاقات ہوئی۔

”میرا تعلق پولیس ہیڈ کوارٹر سے ہے۔“ اس نے کلرک کو مخاطب کیا۔ ”میں ایک ضروری معاملے میں مسٹر داور سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ یہاں سیلز مین کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔“

”داور کلرک نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ ”جی ہاں وہ کام تو کرتے ہیں، مگر اس وقت آپ کو نہیں مل سکیں گے۔“

”کیوں؟“

”ابھی کچھ دیر قبل ان کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی اور اب وہ اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں ہیں۔“

زاہر تیزی سے گھوما۔ دکان سے باہر نکلا۔ تقریباً بھاگتے ہوئے سڑک پار کی اسپتال میں داخل ہوا۔ ایمرجنسی وارڈ میں ڈاکٹر عمر سے ملاقات ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے سے واقف تھے۔

”خیریت تو ہے زاہر صاحب۔“ ڈاکٹر عمر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”تقریباً۔“ زاہر نے جواب دیا۔ ”ابھی آپ کے وارڈ میں ایک ایمرجنسی کیس آیا ہے۔ نام ہے داور اور وہ سامنے حمزہ میڈیکل اسٹور میں کام کرتا ہے۔“

”جی ہاں۔ میں ابھی وہیں سے آرہا ہوں۔“ ڈاکٹر عمر نے جواب دیا۔ ”آرسنک پوائزنگ کا کیس ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ اسے فوراً اسپتال پہنچا دیا گیا اور اس کی علامتیں بھی فوراً پہچان لی گئیں۔ ورنہ اس کا پتہ مشکل تھا۔“

”آرسنک.....“ زاہر نے خیال انگیز لہجے میں کہا۔ ”یہ پتا چلا کہ یہ زاہر اسے کس طرح دیا گیا۔“

”ابھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا، لیکن زاہر نے جس تیزی سے جسم میں پھیل رہا تھا اس سے شبہ ہوتا ہے کہ اسے کسی نہ کسی طرح انجیکٹ کیا گیا۔“

”ضرور..... آپ جب چاہیں تشریف لاسکتے ہیں۔“ سجاد نے بھی کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔ زاہر دروازے کی طرف گھومنے لگا تھا کہ اچانک رک گیا اور یوں جیسے اس کی نگاہ پہلی مرتبہ کسی چیز پر پڑی ہو۔ میز کی طرف بڑھا اور چابیوں کا گچھا اٹھا لیا۔ اس میں نو عدد چابیاں پڑی ہوئی تھیں جو ان میں سے دو ایک جیسی تھیں۔

”یہ غالباً کمرے کے بیرونی دروازے کی ہیں۔“ زاہر نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”اور اس میں سے ایک آپ کی ہوئی اور دوسری غالباً وہ جو فرحت کے پاس رہتی تھی۔“

”جی ہاں۔ کوئی خاص بات ہے کیا۔“

”نہیں، کوئی ایسی خاص بات نہیں۔“ زاہر نے چابیوں کا گچھا دوبارہ میز پر رکھ دیا۔ ”اچھا تو اجازت چاہوں گا۔“

وہ سبک قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆

سول اسپتال کا فاصلہ سرائے روڈ سے تقریباً دس میل تھا۔ پھر شہر کے اس حصے میں سڑکوں پر ٹریفک کا بہت ہجوم رہتا تھا۔

زاہر تقریباً پینتالیس منٹ کے بعد حمزہ میڈیکل اسٹور پہنچ سکا۔ بورڈنگ ہاؤس سے روانہ ہونے سے قبل اس نے ایک بار پھر بشری کے کمرے پر دستک دی تھی۔ مگر چونکہ بشری کی ماں ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اس لیے اس نے بشری سے مزید سوالات اگلے دین پر ملتوی کر دیے تھے۔ حمزہ کی میڈیکل اسٹور واقعی بہت بڑی دکان تھی۔ خریداروں کا کافی رش تھا۔ وہ اس کلرک کی طرف بڑھا۔ جو کہ کاؤنٹر کے ایک جانب کھڑا ہوا گا بہوں کے کیش میمو لکھ رہا تھا۔

چہرے سے یقین اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت ظاہر تھی۔ زاہر خاموش ہوا۔ تو وہ بول اٹھا۔
 ”حال تو تم نے اس طرح بیان کیا ہے جیسے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ لیکن تم اتنے ہوشیار ہو تو یقیناً یہ بھی جانتے ہو گے کہ قاتل کون ہے۔“

”بلاشبہ جانتا ہوں۔“ زاہر مسکرایا۔

”تو انتظار کس بات کا ہے۔ بتاتے کیوں نہیں کہ قاتل کون ہے۔“

”قاتل سجاد ہے۔“ زاہر نے ایک دم سجاد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جواب میں سجاد کے چہرے پر پھٹکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”تمہارے ذہن رسا کی داد نہیں دی جاسکتی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ہجرتموں کے ساتھ دن رات کے تعلق کے سوچنے کے معاملہ میں تمہاری عقل کو خاصا تیز کر دیا ہے، لیکن تم یہ بھول گئے۔ فرحت میری بہن ہے اور شاید کوئی قاتل بھی یہ گوارا نہیں کرے گا کہ اپنا جرم اپنی حقیقی بہن کے سر منڈھ دے۔“

”تم اسے دفاع میں ایک طاقت ور عنصر خیال کرتے ہو۔“ زاہر نے کہا۔ ”مگر یہ اتنا اہم نہیں رہتا۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تمہاری بہن آنکھوں سے معذرت ہے، تم نے بھی یہی سوچا تھا کہ اول تو اسے اتفاق حادثہ سمجھ لیا جائے گا اور بالفرض ایسا نہ بھی ہوا تب بھی کوئی عدالت اسے موت کی سزا نہیں دے سکتی۔ وہ ابھی نوجوان ہے۔ دو چار برس کی جیل سے اس کی زندگی کو پھانسی کے پھندے سے بچا لو گے تمہارا خیال تھا کہ ایک بھائی کی زندگی کے لیے بہن کی قربانی کچھ زیادہ نہیں ہے۔“

”بہت خوب اور میں نے محمود کو قتل کیوں کیا۔“

”اس کا جواب تو شروع سے ہی واضح ہے۔“

”تم اور تمہارے ساتھ ایک دو آدمی مشیت الہی

درجہ حرارت کوئی شبہ پیدا نہ کر سکے۔ فانسک کی آواز سن کر جو لوگ کمرے میں آئے۔ اگر ان میں کوئی ڈاکٹر ہوتا اور وہ لاش کا معائنہ کرتا تو یہ بات اس وقت ظاہر ہو جاتی کہ محمود کچھ دیر پہلے قتل کیا گیا تھا۔ قاتل نے یہ نینوں مقاصد بشری کے ذریعے پورے کیے۔ ممکن ہے بشری کو اس نے مکمل بات نہ بتائی ہو لیکن اتنی ہدایت ضرور کر دی تھی کہ وہ لاش کی دریافت کے بعد پہلے پولیس کو نہیں بلکہ سجاد کو فون کرے اور اگر کوئی پولیس کو اطلاع کرنا چاہے تو اسے نہ کرنے دے۔ ایسا ہی ہوا کم و بیش ایک گھنٹے کے بعد مقام واردات پر پہنچی۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر قاتل نے ریوالور بھی تبدیل کر دیا جو بشری نے اسی کی ہدایت کے مطابق کمرے میں آتے ہی فرحت کے ہاتھ سے لے کر میز پر رکھ دیا تھا۔ پھر اس نے ریکارڈ سے کیسٹ نکال لیا اور اب اسٹیج پولیس کی آمد کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ چنانچہ پولیس آئی اور پولیس سرجن کے لیے معلوم کرنا مشکل ہو گیا کہ محمود کو ایک گھنٹہ قتل نہیں بلکہ ڈیڑھ گھنٹہ قتل کیا گیا تھا لیکن قاتل بس ایک بات کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ وہ یہ بھی کہ فرحت نے تین فار کیے۔ قاتل کو بات فوراً معلوم ہو گئی ہوگی لیکن اسے امید تھی کہ پولیس اتنا سپدھا سادائیس پانے کے بعد اس بار کی پر غور نہیں کرے گی کہ فرحت نے تین فار کیے تھے۔ جبکہ محمود کے جسم پر گولیوں کے صرف دو جرح تھے اور یہ کہ اگر تیسری گولی اسے نہیں لگی تھی تو اس کا کمرے میں کہیں ناکہیں ہونا ضروری ہے۔ قاتل کا اندازہ صحیح نکلا۔ پولیس کے ذہن میں تحقیقاتی آفیسر نے اس معمولی سی بات کے بارے میں تحقیقات کرنا تو درکنار کوئی سوال پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی لیکن افسوس کہ فرحت کے ایک مخلص ہمدرد نے مجھے اس کیس میں گھسٹ لیا اور قاتل کی پوری سازش ناکام ہو گئی۔“

فناض خان زاہر کو گھوڑا تھا۔ اس کے

اندازِ فکر

○ ہر ہاتھ ملانے والے کو
دوست مت سمجھو۔
○ آدمی کی قابلیت زبان

کے نیچے پوشیدہ ہوتی ہے۔

○ جسے ہمارے کا خوف ہو وہ ضرور ہارتا ہے۔

○ زندگی نہ جانے کس کس کا انتظار کرتی ہے لیکن موت
نہیں۔

○ انسان بھول تو سکتا ہے معاف نہیں کر سکتا۔

○ زندگی ایک ایسا ہیرا ہے جس کو تراشا انسان کا کام
ہے۔

○ گرنا چاہتے ہو تو سجدہ میں کرو۔

○ جو میانہ روی اختیار نہیں کرتا وہ کبھی مفلس نہیں ہوتا۔

○ تم میں سے بہتر شخص وہ ہے جو دوسروں کی ضرورت پر
اپنی ضرورت قربان کرے۔

○ اگر خوش رہنا چاہتے ہو تو ماں کی دعا حاصل کرو۔

○ شک ایسا کاٹنا ہے جس کا خمز دل پر لگتا ہے۔

○ کسی کا دل نہ دکھاؤ ہو سکتا ہے اس کے آنسو تمہارے
لئے سزا بن جائیں۔

○ ادب کے بغیر کوئی چیز نہیں سیکھی جاسکتی۔

ہو جاتا ہوگا۔ مگر اب ایسا بھی نہیں ہے کہ میں یہ نہ
پہچان سکوں کہ جس نے مجھ سے فون پر بات کی
تھی۔ وہ یہ نہیں تھا۔ اس کی کوشش سے مجھے تقریباً
یقین ہو گیا کہ قاتل یہی ہے۔ یہی بشری کو.....
جو کہ اس سے محبت کرتی ہے۔ مجبور کر سکتا تھا کہ وہ
پولیس کی اطلاع دینے سے قبل اسے فون کرے
تاکہ اسے رویا اور تبدیلی کرنے اور کیسٹ نکالنے کا
موقع مل جائے، لیکن اگر یہ سب کچھ بھی تمہارے
نزدیک ٹھوس ثبوت نہ ہو تب اس سے پوچھو کہ اس
کے پاس جو چابیوں کا گچھا ہے اس میں اس کے
اپنے کمرے کی تین چابیاں تھیں۔ ایک اس کے
پاس رہتی تھی۔ دوسری فرحت کے پاس اور تیسری

نا جائز خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ مجھے یقین
ہے کہ یہ کام تم انفرادی حیثیت میں نہیں کر رہے ہو
بلکہ تمہارا رابطہ بڑے اسمگلروں سے ہے اور تم پہلے
پورے دارالحکومت اور پھر پورے ملک میں
میڈیکل سٹورز کو نشیات کے اڈوں میں تبدیل کرنا
چاہتے ہو۔ محمود نے غالباً تمہارے خلاف کوئی
ٹھوس ثبوت حاصل کر لیا تھا۔ اس لیے تم نے اس
قتل کر دیا۔ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ فرحت کو پسند
کرنے لگا تھا شروع میں ممکن ہے۔ اس نے
فرحت سے صرف اسی لیے تعلق پیدا کیا ہو کہ اسے
تم تک پہنچنے کا ذریعہ بنائے، مگر پھر خود بھی اس کی
ذات میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس نے کمرے کی
چابی اسی لیے حاصل کی تھی کہ وہ راتوں کو تمہارے
کمرے کی تلاشی لے کر تمہارے خلاف کوئی ٹھوس
ثبوت حاصل کر سکے۔ اس کا خیال تھا کہ شاید تم
اس کی اصل حقیقت سے واقف نہیں ہو۔ اسی لیے
کل رات جب تم نے اس سے فرحت کے سلسلے
میں گفتگو کرنے کا بہانہ کیا تو اس نے تمہیں اپنے
کمرے میں بلالیا۔ جہاں تم نے اس کی غفلت سے
فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے قتل کر دیا۔“

”باتیں بنانے میں تمہارا کوئی جواب
نہیں۔“ سجاد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”لیکن ابھی
تک تمہاری گفتگو محض اندازوں پر مبنی ہے۔ تم کوئی
ثبوت پیش نہیں کر سکتے۔“

”جس قسم کا ثبوت چاہو پیش کر دوں۔“
زاہر نے جواب دیا اور فیاض خان کی طرف
دیکھا۔ ”میں نے اسے آزمانے کے لیے ایک
جال پھینکا تھا۔ مجھے کسی کے فون پر اپنا نام بتائے
بغیر فرحت کی مدد کرنے کی درخواست کی تھی۔ میں
نے خیال ظاہر کیا کہ وہ داور ہو سکتا ہے۔ مگر یہ نہیں
چاہتا تھا کہ میں داور تک پہنچوں۔ شاید اسے بھی
اس کی مجرمانہ حرکتوں کے بارے میں کوئی شبہ یا
کوئی علم ہو کہ اس نے فوراً یہ ظاہر کیا کہ فون کرنے
والا یہ خود تھا۔ فون پر آواز میں ٹھوڑا فرق پیدا

محمود کے پاس رہتی تھی۔ فرحت کی چابی تم نے اپنے پاس کر لی تھی۔ اب اگر اس کے پاس دو چابیاں موجود ہیں تو دوسری چابی اس نے لازماً محمود کو مل کرنے کے بعد اس کی جیب سے نکالی ہے اور اگر یہ ثبوت بھی ناکافی ہو تب میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں۔ اگر کبھی اس وقت تم اس کے بریف کیس کی تلاشی لو تو اس نے فرحت کو دھوکا دینے کی غرض سے استعمال کیا تھا۔“

سجاد ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ زرد اور آنکھوں سے خوف و دہشت کا اظہار ہوا تھا۔

”تو کوئی انسان نہیں ہو سکتا۔“ وہ چیخ کر زاہر سے بولا۔ ”تیرے جسم میں یقیناً شیطان کی روح میں حلول کر گئی ہے۔“

اس نے دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر فیاض پہلے ہی رو اور نکال کر اس کے فرار کی راہ مسدود کر چکا تھا۔

”اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دو سجاد۔“ اس نے کہا۔ ”تم کہیں بھاگ نہیں سکتے۔ باہر چاروں طرف پولیس موجود ہے۔“

”نہیں، نہیں۔“ سجاد چیخا۔ وہ گھبرا کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ فیاض خان نے اسے گھورتے ہوئے قدم اٹگے بڑھایا۔ سجاد پیچھا ہٹا۔ یکبارگی پلٹ کر کمرے کی کھلی کھڑکی کی طرف بھاگا اور جب تک زاہر اور فیاض خان اسے اس حرکت سے روکتے، وہ کھڑکی پہ چڑھا اور بریف کیس سمیت نیچے کود گیا۔

☆☆

کھڑکی صرف پہلی منزل کی تھی، وہ مرا نہیں تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں۔ اسے گرفتار کر کے پولیس کو دے دیا گیا۔ بشری اس کے کمرے سے برآمد کر لی گئی تھی۔ فرحت کو اسی رات حوالات سے رہا کر دیا گیا۔ ہفتہ کے بعد داور بھی اسپتال سے صحت یاب ہو کر واپس آ گیا۔

اور یہ بات جی طاہر ہوئی کہ زاہر کو فون اس نے کیا تھا اور اس کے ذہر انجکشن کے ذریعے دیا گیا تھا۔ سجاد نے زاہر کے رخصت ہوتے ہی اپنے ساتھی لیاقت کو فون کیا اور بتایا کہ زاہر داور سے ملنے آ رہا ہے۔ اس کے آنے سے پہلے ہی داور کو ختم کر دو اور لیاقت کے دکان پر آنے والے ایک شخص کو انجکشن لگانے کے بہانے سرخ میں زاہر بھرا اور وٹامن انجکشن کے بہانے سوئی اس کے جسم میں چھو دی۔ لیاقت بھاگنے سے پہلے ہی پکڑا گیا۔ فرحت کو ساری صورت حال سے بڑا صدمہ ہوا تھا۔ اسے امید تھی کہ اس کا غم باٹنے والا داور جیسا شریف اور خلص انسان موجود ہے۔ بشری کو سجاد کے خلاف سلطانی گواہ بنا کر آمادہ کر لیا اور یوں یہ کیس کامیاب رہا۔

”ٹھیک کہہ رہے ہو، میں ایک ضروری بات بھول گیا تھا۔“

”وہ کیا۔“

”یہ کہ اگر تم نے ہوتے تو شاید میں اپنی جدوجہد میں اتنا کامیاب نہ ہوتا۔ مانتے ہو نا کہ بہر حال میں بھی کچھ ہوں۔“ فیاض خوش ہو گیا۔

”بالکل مانتا ہوں۔“ زاہر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”کسی نے ایک فلسفی سے پوچھا کہ اسے اتنا عقل مند کس نے بنایا تو اس نے جواب دیا کہ دوسروں کی حماقتوں نے۔ تو میں نے بھی تمہاری غلطیوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ دوست اور میں اس کے لیے تمہارا ممنون ہوں۔“ انسپکٹر فیاض خان کے جانے کے بعد بھی اس وقت تک خوش ہوتا رہا۔ جب تک اس کی سمجھ میں اس فقرے کا مفہوم نہیں آیا۔

❖.....❖

وصف حال

ایم اے راحت

وہ چیختے ہوئے بھاگنے لگی لیکن غلط سمت جا رہی تھی۔ ادھر کوئی دروازہ نہیں تھا جب تک وہ پلٹ کر دروازے کی طرف جاتی نقاب پوش اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے پیچھے سے اس کی چوٹی پکڑ لی اگر وہ سامنے کے رخ ہوتی تو دوسری بار اس پر تیزاب پھینکا جا سکتا تھا لیکن چہرہ دوسری طرف تھا۔ اس نے چہرے کو اپنی طرف کرنے کے لیے ماہ نور کی چوٹی پکڑ کر ایک جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا تو ماہ نور نے خود کو بچانے کے لیے اپنے آپ کو سنبھالا چہرہ سامنے آیا تو بوتل والا ہاتھ بلند ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی بوتل ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑی نقاب پوش مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا نجانے کیا ہوا تھا اس کی گردن میں ایک زنجیر آکر پھنس گئی تھی وہ زنجیر جو دونوں ہاتھوں کے درمیان ہتھکڑیوں سے رابطہ کئے ہوئے تھی۔

ایک معاشرتی کہانی، عمران ڈائجسٹ کے آخری صفحات کے لیے



یہ سب کچھ سن کر وہ سوچا کہ وہی لڑکی جو ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ ماہ نور سے اسے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ لیکن۔

آخر کار اس نے ماہ نور سے شادی پر آمادگی ظاہر کر دی۔ بھرپور خاندان تھا ان کا باپ بے شک دونوں میں سے کسی کے نہیں تھے لیکن رشتے داروں کی بھرمار تھی۔ جلد عروسی میں البتہ ایک ڈرائے کا آغاز ہو گیا۔

”تم جانتی ہو ماہ نور..... میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔“

”مجھے معلوم ہے۔“

”پھر تم نے شادی کا اقرار کیوں کیا۔“

”کیا کرتی۔ میرا کوئی ہے۔“

”اب کیا ہوگا۔“

”میں یہ بھی نہیں جانتی۔“

”میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔“

”کیا۔“

”ہم دونوں دنیا کی نظر میں میاں بیوی رہیں لیکن ایسا کوئی رابطہ ہمارے درمیان نہ ہو۔ بعد میں اگر تم جاہو گی تو میں تمہیں طلاق دیدوں گا اور اتنا کچھ دوں گا کہ تم اپنی مرضی کی پرسکون زندگی گزار سکو گی۔“

”وہ تو میں نہیں چاہوں گی لیکن میں آپ کے راستے میں کبھی نہیں آؤں گی۔“ ماہ نور نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اسے علم تھا کہ عامر نے صرف باپ کی دولت کے لیے اس سے شادی کی ہے لیکن عامر یہ انداز اختیار کرے گا اسے یہ امید نہیں تھی لیکن عامر کے گریز نے اس کی اتنا کوٹھیں پہنچائی تھی اس لیے اس نے عامر کی شرط قبول کر لی اور دونوں کے درمیان یہ سمجھوتہ ہو گیا۔

اس دن کے بعد سے وہ اپنے وعدے پر قائم رہی لیکن انسان تھی۔ تعلیم یافتہ تھی۔ عامر کا سلوک اس کے ساتھ بہت اچھا تھا لیکن ایک تحریر کا اشتعال اس سے دور رہتا۔ وہ

شامد علی کی جدت گیر فکر عامر جانتا تھا، لیکن وہ ایسا کوئی عمل کریں گے اسے امید نہیں تھی۔ بہت بڑا کاروبار تھا ان کا کروڑوں کی جائداد تھی، سب کچھ عامر ہی کا تھا لیکن، اچانک یہ سب کچھ اس کے ہاتھ سے نکلنا جا رہا تھا۔ امجد حسین ایڈوکیٹ نے شاہد علی کا وصیت نامہ اسے دکھایا تھا اور اس کے ہوش اڑ گئے تھے۔ وصیت نامے کی رو سے اگر عامر ماہ نور سے شادی نہیں کرتا تو اسے تمام دولت سے ہاتھ دھونے پڑتے اور ایک معمولی وظیفے پر گزارا کرنا پڑتا۔

ماہ نور شاہد علی کے غیر اختیار حسین کی بیٹی تھی۔ اختیار حسین شاہد علی کے غیر کے علاوہ گہرے دوست بھی تھے۔ ماہ نور کی ماں اس کی پیدائش کے وقت مر گئی تھی اور شاہد علی نے اس کی لاش پر کھڑے ہو کر اس سے وعدہ کیا تھا۔

”آپ سکون سے عدم کی راہ اختیار کریں بھابھی۔ یہ بچی اب میری ہے۔ میں اسے اپنی اولاد کی طرح پرورش کروں گا اور اسے اپنے عامر کی بہو بناؤں گا۔“

دونوں جوان ہو گئے تھے۔ تعلیم مکمل کر چکے تھے۔ عامر نے سرکشی کرتے ہوئے باپ سے کہہ دیا تھا کہ وہ ماہ نور سے شادی نہیں کرے گا۔ لیکن شاہد علی نے اسے جواب دیا تھا کہ اگر اس نے ماہ نور سے شادی نہ کی تو اسے سنگین نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ انہوں نے اپنے مرحوم دوست اور بہن جیسی بھابھی کو بیوی کی موت کے بعد زبان دی ہے۔ اختیار حسین بھی اس دنیا سے جا چکے تھے۔

عامر حتی الامکان گریز کرتا رہا اور پھر اچانک شاہد علی کا انتقال ہو گیا۔ باپ کی موت نے اسے متاثر کیا تھا، لیکن اس نے سوچا تھا کہ اب اسے ماہ نور سے شادی نہیں کرنی پڑے گی لیکن باپ کے چالیسویں کے بعد امجد حسین نے وصیت نامہ لکھ کر اپنے تمام اثاثے

اس کھوج میں لگ گئی کہ آخر عامر کے اس کریم زنی وجہ کیا ہے۔
ایک دن عامر نے کہا۔ ”تیار رہ کر لو ماہ نور ہم شمالی علاقوں میں چل رہے ہیں۔“
”کیوں.....“ ماہ نور کی آواز میں خود بخود طعنے پیدا ہو گیا۔

اس وقت تک عامر کی نگاہوں میں ایک عجیب سا احساس پیدا ہو گیا، حسن و شباب کا چیتا جاگتا مجسمہ اس کے سامنے تھا۔ نجانے کیوں اس کے انداز میں ایک حسرت سی پیدا ہو گئی، اس نے سر جھکا کر کہا۔
”میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں، جب تم سو جاتی ہو تو میں تمہیں گھنٹوں حسرت سے دیکھتا ہوں، تم ہنسی بولتی ہو تو دل میں اترتی چلی جاتی ہو۔“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی تو ماہ نور نے کہا۔

”آپ مجھے میرے سوال کا جواب دیجئے۔“
”بس ہماری عزت اسی میں ہے کہ ہم اس رشتے کو دنیا والوں کے سامنے قائم رکھیں اس وصیت کے مطابق تمام دولت جائیداد ہماری ہے اور اس میں ہم دونوں کا بھلا ہے۔“
”کمال کرتے ہو عامر، کیا دولت ہی تمام عمر کی زندگی ہوتی ہے۔“
”تم مجھے چھوڑنا چاہتی ہو کیا۔“ عامر انتہائی نرم لہجے میں بولا۔

”ابھی فیصلہ نہیں کیا ہے، لیکن کہہ نہیں سکتی کہ آنے والے وقت میں کیا ہو گا۔“
”ایسا نہ کرنا، میری بدنامی ہو گی۔“
”آپ دولت کے بل پر بدنامی کا جواب دے سکتے ہیں، کسی ایسی عورت سے شادی کر سکتے ہیں جو صرف دولت چاہتی ہے۔“
”نہیں، میں کسی اور عورت کو اپنے قریب تک آنے نہیں دینا چاہتا، وہ قابل اعتبار نہیں ہو گی، مگر تم، تم قابل اعتبار ہو۔“
”نہیں عامر، ماحول انسان کو کچھ سے کچھ بنا

”آئی کبہ رہی تھیں کہ ہمیں ہنی مون منانے کے لیے کہیں باہر جانا چاہیے، آؤٹ آف کنسٹی تو خیر ممکن ہی نہیں ہے، بس کچھ دنوں کے لیے یہیں کہیں پہاڑی علاقوں میں چلے جاتے ہیں، کبھی یہ بات کہہ رہے ہیں۔“
”ان سب کا ہماری زندگی سے کیا تعلق ہے۔“ وہ پزیری سے بولی۔
”مگر تمہیں کیا اعتراض ہے۔“

”کمال کی بات کرتے ہو لوگوں کو دکھانے کے لیے ہمیں ہینٹا بولنا پڑتا ہے، ایک بیوی کی ایکٹنگ کرنی پڑتی ہے، میں کوئی اداکارہ تو نہیں ہوں۔“
”تمہیں بھی ذرا سا ذہنی سکون ملے گا۔ ہم خاصے عرصے باہر رہیں گے۔“

وہ خاموش ہو گئی اور عامر اسے ایک خوب صورت پہاڑی علاقے میں لے آیا، رشتے داروں سے پیچھا چھوٹ گیا تھا۔ اب اسے اداکاری کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن یہاں آ کر تو وہ بالکل ہی تنہا ہو گئی تھی، وہاں کم از کم یہ تو تھا کہ دل ٹھہراتا تو اپنی ہم عمر لڑکیوں میں جا کر بیٹھ جاتی، کبھی کسی بچے کو گود میں کھلانے لگتی، لیکن یہاں کوئی بھی نہیں تھا، ایک اجنبی شخص جو نہ شوہر تھا نہ ساسھی، رفتہ رفتہ اس کے اندر بغاوت جنم لینے لگی، پہلے تو اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اپنے آپ کو سنبھالے گی اور حالات سے سمجھوتہ کرے گی، لیکن کب تک، ایک دن، ایک سال، دو سال، دس سال، کیا کوئی اتنا بڑا سمجھوتہ کر سکتا ہے، اس نے کہا۔

اس کی بیوی ہے جہاں وہ خوش ہے وہاں عامر بھی خوش ہے، اس کے بعد دوسرے مسائل شروع ہوئے۔ خاندان کی بوڑھی عورتوں نے تقاضے شروع کر دیے کہ آخر اولاد کیوں نہیں ہو رہی لیکن عامر نے اس کا جواب بھی خود ہی دیا۔
”اولاد بھی جو جائے گی کوئی مصیبت آگئی ہے، مجھے خود اولاد کی خواہش نہیں ہے، جب ضروری ہوگا باپ بن جاؤں گا۔“

رفتہ رفتہ ماہ تور کا مزاج بالکل ہی بدلتا چلا گیا، وہ ہر وقت چڑچڑی سی رہنے لگی، بات بات پر جھنجھلا جاتی عامر سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھی، رہ رہ کر تقاضہ کرتی تھی کہ مجھے آزاد کر دو، میں اس طرح کی زندگی نہیں چاہتی، کوٹھی کار بینک بینکس کی کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے، صرف ایک زندگی کا سا سہی چاہیے، عامر اسے سمجھانے کی کوشش کرتا۔

”میرے ساتھ تعاون کرو، اگر تم نے مجھ سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا تو میں اپنی زندگی ختم کر دوں گا یا پھر تمہیں ختم کر دوں گا۔“

”مرنے سے ڈرتی نہیں ہوں میں، اس زندگی سے موت بہتر ہے، سنیں مجھے ماریں ورنہ میں کہیں بھاگ جاؤں گی۔“

یہ آخری فقرہ عامر کے دماغ میں پھر کی طرح لگا وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ کسی دن وہ مجبور ہو کر بھاگ سکتی ہے کجنت بلا کی حسین تھی، کوئی بھی اس اپنانے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ کیا کروں اور کیا نہ کروں، کیا ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ جائیں اور کسی کے ساتھ نہ جاسکے۔ ٹانگیں ٹوٹ جانے سے کیا ہوتا ہے اس کا حسن تو سلامت رہے گا، اس میں کشش تو باقی رہے گی، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کا چہرہ بگاڑ دیا جائے، اب دن دن رات یہی فیصلہ کرتا رہتا اس کی

دیتا ہے آخر کب تک میں اپنے آپ سے لڑتی رہوں گی۔“

”دیکھو میری بات سنجیدگی سے سنو، اگر تم نے کوئی غلط فیصلہ کر لیا تو میں تباہ ہو جاؤں گا، میں دولت کے بغیر نہیں جی سکتا۔“

”مگر میں کب تک یہ اداکاری کرتی رہوں گی، واپس جاؤں گی تو پھر انہی رشتے داروں کا سامنا ہوگا۔“

”ہم کسی سے نہیں ملیں گے، صرف نوکر چاکر ہوں گے۔“

”میں نوکروں کے بغیر گزارہ کر سکتی ہوں، خود پکاؤں گی کھاؤں گی، کھلاؤں گی۔ آپ کی خدمت کروں گی، مگر میں نہیں چاہتی کہ ہمارے درمیان کوئی تیسرا آجائے، سمجھ رہے ہوتا۔“

”میری بات سنو، تمہیں اس بات کا تو اندازہ ہوگا کہ کوٹھی میں دوست احباب آتے رہتے ہیں، بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ممبران بھی آتے ہیں، ملازموں کی موجودگی بھی ضروری ہوتی ہے۔“

”آپ اس کوٹھی میں رہا کریں، شہر سے باہر ہمارا شاندار کالج ہے، میں وہاں تیار ہوں گی، آپ دن میں اپنے تمام کاروبار میں مصروف رہا کریں، شام کو کالج آ جایا کریں۔“

”میں تمہاری یہ بات مان لیتا ہوں۔“

عامر نے گردن جھکا کر کہا۔
وہ جانتا تھا کہ عورت اگر پھر جائے تو کیا سے کیا بن جاتی ہے، ماہ نور کو اپنا بنائے رکھنے کا یہی ایک راستہ تھا کہ اس کی ہر بات تسلیم کر لی جائے چنانچہ اس نے اسے کالج میں منتقل کر دیا، رشتے دار تو ہوتے ہی طرح طرح کی باتیں بنانے کے لیے ہیں، جتنے منہ اتنی باتیں، کسی نے کہا کہ باپ تو ایک ملازم تھا بی بی مالک بن گئی۔ دولت ہاتھ آنے سے مزاج بدل گئے، لیکن عامر نے سب کی باتیں سرور کریں اس کے کہا کہ وہ

☆ تم اپنی جگہ عمل کئے
جاؤ اور میں اپنی جگہ عمل
کر رہا ہوں۔

اندازِ فکر

☆ جنہوں نے لوگوں پر ظلم کئے ہیں۔ ان کو مرنے پر عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ کس جگہ ان کو لوٹ کر جانا ہے۔

☆ جو بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہے تو ان کو مقامِ عزت میں جگہ دیں گے۔

☆ جلدی سے توبہ کر لو جبکہ کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو تمہاری توبہ قبول ہوگی۔

☆ جب تمہیں سلام کے ذریعے سے دعادی جائے تو تم اس کے جواب میں بہتر عادیو۔ یا وہی کلمہ کہہ دو۔

☆ جب جہاد فرض کر دیا گیا ہے تو ایک فریق انسانوں سے ایسے ڈرنے لگا جیسے اللہ سے ڈرنا ہوتا ہے۔

☆ جہنم ان کے لئے ہے جو نافرمان بردار ہیں۔

☆ سچ کو جھوٹ کے ساتھ قلو ط نہ کرو، اور جان بوجھ کر حق بات کو نہ چھپاؤ۔

☆ بڑا اہم برکت والا ہے۔ وہ اللہ جس نے آسمانوں پر برج اور اس میں ایک چراغ روشن کیا۔

☆ جو چوری کرے بلاشبہ اس کے ہاتھ کاٹ دوتا کہ اور دل کو بھی عبرت ہو۔

☆ جس دن کافروں کے چہرے آگ میں اٹیں، پلٹیں گے، وہ کہیں گے کہ اے کاش! ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی۔

☆ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

☆ شاید کہ تم برا مانو کسی چیز کو حالانکہ وہ تمہارے لئے اچھی ہو اور شاید کہ تم محبت کرو کسی چیز سے حالانکہ وہ تمہارے لئے مبصر ہو تم نہیں جانتے اور اللہ جانتا ہے۔

☆ ہماری چیزوں کی ناشکری نہ کرو اور شکر ادا کرتے رہو۔

☆ جب تک خدا کی راہ میں وہ چیزیں خرچ نہیں کرو گے۔ جو تم کو عزیز اور پیاری ہیں نیکی نہ پاؤ گے۔

اس نے باپ کی وصیت کے مطابق شادی کر لی تھی، وصیت میں لکھا تھا کہ جب تک وہ شادی نہ کرے اسے دولت اور جائیداد نہیں ملے گی، شادی کے سلسلے میں یہ شرائط تھیں کہ وہ صرف دولت اور جائیداد حاصل کرنے کے لیے عارضی طور پر شادی نہیں کرے گا اور شادی کے بعد کبھی ماہ نور کو طلاق نہیں دے گا۔ ہاں ماہ نور اگر خود سے علیحدہ ہونا چاہے تو اسے صرف مہر کی رقم ملے گی۔ یہ باتیں عامر کے خلاف بھی جانی تھیں اور ماہ نور کے خلاف بھی۔ ماہ نور کا کچھ نہ بگڑتا، وہ حسین و جمیل تھی اس کا کچھ نہ بگڑتا، وصیت میں یہ نہیں لکھا تھا کہ اگر ماہ نور میر جائے یا کسی حادثے کا شکار ہو جائے یا کہیں گم ہو جائے تو ایسی صورت میں عامر جائیداد سے محروم ہو جائے گا یا نہیں، یہ بات نہیں لکھی ہوئی تھی اس لیے ایسی صورت میں عامر کا کوئی قصور نہ ہوتا اور وہ بدستور اپنی جائیداد کا مالک ہوتا، لیکن اس کے سوچنے سے ماہ نور مر تو نہیں سکتی تھی نہ کسی حادثے کا شکار ہو جاتی اور نہ کوئی اسے بھگا کر لے جاتا وہ تو خود اپنی مرضی سے طلاق لے کر شادی کرتی۔

تب دوست احباب اور خاندان والے اس بات کے منتظر رہتے کہ وہ دوسری شادی کرے گا، نہیں کرے گا تو اولاد کہاں سے ہوگی اور اس کے بعد اتنی جائیداد کا وارث کون ہوگا۔ دنیاوی جھیلے ایسے تھے کہ وہ ہر طرح سے گرفت میں آتا، مطمئن کرنے کی بس یہی ایک صورت رہ جاتی، نور اس سے تعاون کرے اور اس کی شریک حیات رہے اسے اپنے ساتھ باندھے رکھنے کی یہی صورت نظر آئی کہ اس کی صورت کہ کوئی اس کی طرف مائل نہ ہو وہ کسی اور کو اپنے حسن سے بھانہ سکے لوگ اسے دیکھ کر حقارت سے منہ پھیر لیں، وہ لگتی تھی اور اس نے فیصلہ کیا کہ جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا، جس طرح بھی ممکن

ہو ماہ نور کا چہرہ میرا اب کے در سے بگاڑ دیا۔ اس کی گاہیں پکن کی مہر کی باہر بہت دور جانے اور جو کام کل ہونا ہے آج ہو جائے تو بہتر ہے۔ رات کی تاریکی پھیل چکی تھی، ماہ نور کا بیج کے پردے میں کھڑی تاریکی میں نگاہیں دوڑا رہی تھی، عام طور سے یہ ہوتا تھا کہ تاریکی ہونے سے پہلے عام واپس آ جاتا تھا۔

یہ کالج ایک انتہائی خوب صورت لیکن دور دراز علاقے میں تھا، یہ علاقہ شہر سے دور بے شک تھا، لیکن حسن و جمال میں اپنی مثال آپ تھا۔ بہت بڑے بڑے لوگوں نے یہاں پر کالج بنا لیے تھے، ایک خوب صورت جنگل جیسا علاقہ تھا، کافی دور کچے کچے مکانات تھے، کالج ان مکانات سے کافی فاصلے پر تھا اور ماہ نور اس کالج میں تنہا رہتی تھی، وہ غڑ اور بہادر لڑکی تھی اور پھر حالات نے اسے جو بیزاری کا انداز بخشا تھا وہ اسے اور بہادر بنائے ہوئے تھا، وہاں تنہا رہ کر وہ اپنا کھانا وغیرہ خود ہی پکاتی تھی، بہر حال اب آٹھ بجنے والے تھے، لیکن عامر ابھی تک نہیں پہنچا تھا، اس کی نگاہیں دور دور تک عامر کی کار کی روشنی کا انتظار کر رہی تھیں، لیکن روشنی دور دور تک نہیں تھی۔

”کک..... کک..... کون..... کون۔“ لیکن

اس کی بات ختم ہوتے ہی کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا وہ لڑکھائی اور پیچھے کی طرف گرتے گرتے پچی، پیچھے دیوار تھی اس لیے وہ رک گئی، موٹے سخت اور کھردرے ہاتھ منہ کو اس طرح دبوچے ہوئے تھے کہ سانس رک گئی تھی، کوئی قد آور شخص تھا جو اسے دبوچے ہوئے تھا، ماہ نور کے پورے بدن میں تھر تھری دوڑ گئی، ابھی ایک غرائی ہوئی آواز ابھری۔

”خبردار آواز نہ نکلے ورنہ گلا گھونٹ کر مار ڈالوں گا۔“

وہ اس چوڑی کلائی کو اپنے منہ پر سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگی اور اسے ایک عجیب سا اندازہ ہوا، چوڑے ہاتھ میں لوہے کی جھکڑی پڑی ہوئی تھی، کوئی مجرم جو جیل سے بھاگا ہوا ہے۔ آواز دوبارہ ابھری۔

”اور کون ہے تمہارے ساتھ یہاں۔“ اس کے منہ سے آواز نہیں نکل پائی، بمشکل تمام وہ روہا سی آواز میں بولی۔ ”م..... میں میں یہاں تنہا ہوں، میرا شوہر آنے والا ہے۔“ ”تمہارے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ ہے۔“ ”نہیں کوئی ہتھیار نہیں ہے۔“ ”کواس کرتی ہو اتنے تنہا گھر میں بغیر

وہ واپس اندر آ گئی اور پکن میں پہنچ گئی، گھر کے کام کاج ہی اس کی زندگی کا مقصد بن چکے تھے، کھانا پکانا برتن دھونا، کپڑے دھونا، گھر کی صفائی کرنا، چھوٹے سے باغیچے کی دیکھ بھال کرنا اس نے اپنے آپ کو بہت زیادہ مصروف کر رکھا تھا، سائلن کی ہانڈی اتار کے اس نے چولہے پر توتا چڑھا دیا اور پھر روٹیاں تیار کرنے لگی، اس کی آنکھیں عامر کا انتظار کر رہی تھیں، کچھ بھی تھا شوہر تو تھا، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کبھی اس کا دکن بن کر اندر آ سکتا ہے، روٹیاں بھی تیار ہو گئیں اور اس نے چولہے کو بجھا دیا۔

اب کیا کروں، اسی وقت پورے کالج میں اندھیرا چھا گیا، دھندلکا چلا، لیکن کالج میں

☆ جس چیز کی حقیقت
حال تم کو معلوم نہیں
ہے اس کی درخواست
نہ کرو۔

اندازِ فکر

☆ بے شک! اللہ ہر چیز کا میاب کرنے والا ہے اور ہر
چیز پر اس کا ضابطہ ہے۔

☆ اللہ کی راہ میں اپنی عمدہ چیزوں میں سے خرچ کرو۔
☆ لوگوں کو دنیا کی مرغوب چیزوں کے ساتھ دل بستگی
بھی معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ یہ تو دنیا کی زندگی کے چند
روزہ فائدے ہیں۔ ہمیشہ کا ٹھکانہ تو اللہ کے ہاں۔

☆ صریح گھانا اسی میں ہے کہ اللہ کے سوائے ان
چیزوں کو اپنی حاجت روائی کے لئے بلاتا ہے جو ان کو
نقصان ہی پہنچا سکتی ہیں اور نہ نفع۔ ایسا کارساز بھی برا
ہے اور ایسا رفتی بھی برا۔

☆ اللہ کے سوائے ان چیزوں کو اپنی حاجت روائی کے
لئے کیوں بلاتا ہے جو نہ تم کو نقصان ہی پہنچا سکتی ہیں اور
نہ ہی فائدہ۔ ایسا کارساز بھی برا ہے ایسا رفتی بھی برا۔
☆ جو تمہاری حاجت سے زائد ہو اللہ کی راہ میں اتنا ہی
خرچ کرو۔

☆ اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی
حالت نہ بدلیں۔

☆ ہم موت کے وقت آدمی کو بتادیں گے کہ یہی وہ
حالت ہے جس سے تو بھاگتا تھا۔

☆ زانی کے حال پر کسی طرح کا ترس و امن گیر نہ ہونا
چاہئے اور نیز ان کو مزادیتے وقت۔

☆ جو خوشحالی اور رنگ دہی دونوں حالات میں غصہ کو
روکتے اور لوگوں کے قصوروں سے درگزر کرتے ہیں وہ
متقی ہیں۔ جو ان حالتوں میں اللہ کی راہ میں خرچ بھی
کرتے ہوں۔

☆ اور کوئی بھی چیز خرچ کرو۔ اللہ کے پاس اس کا
حساب ہے۔

☆☆☆

”آپ آپ یقین کریں میرے پاس
تھیاری نہیں ہے۔“
”تمہارے شوہر کے پاس ریو اور ہوگا۔“
”نہیں، ہم لوگ یہاں کچھ بھی نہیں رکھتے،
ہماری کوٹھی شہر میں ہے، کچھ بھی نہیں ہے یہاں
پر۔“

”سنو! میں تمہیں ایک بات بتاؤں، میں چور
نہیں ہوں، تمہیں نقل نہیں کروں گا، بس تھوڑی دیر
کے لیے یہاں پناہ چاہتا ہوں، بھوکا بھی ہوں،
سمجھ رہی ہو تا تم۔“

”ہاں ہاں میں تمہیں کھانا کھلاؤں گی۔“
”بکو اس مت کرو، تمہارا شوہر آنے والا
ہے۔ میں یہاں نہیں رکوں گا، میرے ساتھ بچن
میں چلو، کھانے کا سامان لے کر چلا جاؤں گا۔“
”میں کمرے سے موم بتی لے آؤں۔“

”نہیں میں نے مین سوچ آف کر دیا ہے،
لیکن روشنی ہونے کے بعد اگر تم شور مچاؤ گی تو
تمہاری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی، یہ میں
تمہیں بتائے دیتا ہوں۔“

”میں وعدہ کرتی ہوں، تم جیسا کہو گے میں
ویسا ہی کروں گی۔“

وہ اس کا بازو پکڑ کر اندھیرے میں کھینچتا ہوا
ادھر لے گیا اور تھوڑی دیر کے بعد روشنی ہو گئی۔
روشنی ہوتے ہی وہ ماہ نور کو کھینچتا ہوا کمرے کے
اندر آیا اور دروازے کو بند کر دیا، کھڑکیاں اندر
سے بندھیں، ماہ نور نے اب پہلی بار اسے دیکھا،
اس کے دونوں ہاتھوں کی کلائیوں میں جھکڑی تھی
اور تقریباً ڈیڑھ فٹ کی زنجیر سے دونوں ہاتھ
بندھے ہوئے تھے، پہلے تو ماہ نور کا یہ خیال تھا کہ وہ
کوئی بھیانک چہرے والا مجرم ہوگا، لیکن وہ اس
کے خیال سے بالکل مختلف تھا، بہت ہی شاندار
جسم کا مالک، لمبا ترنگا قد، حسین تو نہیں تھا لیکن
چہرے پر مردانگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ماہ
نور نے اسے حیرت سے دیکھا تو وہ بولا

”چلو، چلو، چلو جلدی“ مجھے شدید بھول

”ہے۔“
وہ پلٹ کر جانے لگی تو وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا، ماہ نور نے روٹیوں کا برتن اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔
”وہ سالن کی ہانڈی ہے، مگر سالن کیسے لے جاؤ گے۔“
اس نے ایک نگاہ ماہ نور پر ڈالی پھر روٹیاں جھپٹ لیں، ہانڈی کا ڈھکن کھول کر ایک طرف پھینکتے ہوئے اسی ہانڈی میں سے روٹیاں ڈبو ڈبو کر بڑے بڑے لقمے منہ میں بھرنے لگا، سالن گرم تھا اور لقمے کافی بڑے بڑے تھے، مگر پھر بھی وہ اسے کھا رہا تھا جیسے واقعی کئی دن کو بھوکا ہو اور ماہ نور ایک ٹک اسے دیکھے جارہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار کسی مرد کو دیکھا ہے، مرد انسان لیکن درندہ کتنا پیارا لگ رہا ہے وہ اس مردانگی سے کھانا کھاتے ہوئے، وہ جلدی جلدی کھانا کھائے جا رہا تھا اور اسی وقت دروازے پر دستک سنا دی تو ماہ نور سرگوشی کے انداز میں بولی۔

”اتنی دیر کیوں لگا دی آپ نے عامر اور آپ نے گاڑی کا ہارن بھی نہیں بجایا۔“ دروازہ کھلتے ہی وہ ایک دم سے گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ ایک شخص سیاہ نقاب میں تھا، جسم پر بھی سیاہ لباس تھا، اس کے ایک ہاتھ میں بوتل دبی ہوئی تھی، وہ کمرے کے اندر آ گیا، ماہ نور نے سب سے پہلے انداز میں کہا۔

”کون ہو تم کیا چاہتے ہو۔“

آنے والا جیسے گونگا تھا، اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا، تب ماہ نور نے بوتل کی طرف دیکھا، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے، اس خیال کے تحت وہ اچھک کر ایک طرف چلی گئی لیکن شاید یہ اس کی تقدیر ہی تھی کہ وہ عین وقت پر اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی، بوتل سے کوئی سیال مادہ اس پر پھینکنے کی کوشش کی گئی تھی، سیال مادہ کھڑکی کے پردے پر آگرا اور پردے کا اتنا حصہ جلتا چلا گیا۔ جیسی طور پر بوتل میں تیزاب تھا۔ ماہ نور نے چیخ کر کہا۔

”سنسنی“
”شاید میرا شوہر آ گیا ہے۔“

اس نے چونک کر بچن کے دروازے کی طرف دیکھا، پھر پلٹ کر پچھلے دروازے کی طرف گیا، اسے کھولا روٹیوں کو ایک ہاتھ میں لیا اور دوسرے ہاتھ سے سالن کی ہانڈی اٹھالی، ماہ نور نے کہا۔

”شاید تم بھاگنا چاہتے ہو، مجھ پر بھروسہ کرو، کالج میں کئی کمرے ہیں، میں تمہیں چھپا دوں گی اپنے شوہر کو تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔“ لیکن وہ بھروسہ کرنا نہیں جانتا تھا، سالن کی ہانڈی اور روٹیاں اٹھائے ہوئے وہ پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا، ماہ نور اس کے پیچھے پیچھے دروازے تک آئی اس نے آواز دی۔

اس کی گرفت میں تڑپ رہا تھا، پگل رہا تھا، اپنی مردانگی کا زور نکال کر نجات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دفعتاً اس کے حلق سے آواز نکلی۔

”ماہ نور! ماہ نور مجھے بچاؤ۔ میں مر جاؤں گا ماہ نور مجھے بچاؤ۔“

یہ آواز سن کر وہ حیرت زدہ رہ گئی، اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، اس کا شوہر اس کا محافظ نقاب پہن کر اسے مارنے آیا تھا، اس کی آواز دوبارہ ابھری۔

”چھوڑ دو اسے چھوڑ دو یہ میرے شوہر ہیں۔“

اس بار جھکڑی والے نے حیرت زدہ ہو کر ماہ نور کو دیکھا اور پھر نقاب پوش کو پھر وہ ہنس کر بولا۔ ”واہ تمہارا شوہر مرد ہے کہ عورت؟ نقاب پہن کر گھر میں داخل ہوتا ہے۔“ مفور نے زنجیر کا پھندہ اس کی گردن سے نکال دیا اور عامر بڑھال سا ہو کر صوفے پر گر پڑا، اسی وقت مفور نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیا تم مجھے بتاؤ گی نہیں یہ کون ہے، تم اسے شوہر کہہ رہی ہو، مگر یہ تو تمہاری جان لینا چاہتا تھا۔“

ماہ نور کے دل میں نفرت کا طوفان اٹھ آیا، وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”تم نے اپنے بدنما چہرے پر نقاب چڑھائی ہوئی ہے عامر! یہ نقاب تو اتار دو اور ذرا یہ بتاؤ کہ تم یہ کیا کھیل کھیلے کیوں آتے تھے؟ تیزاب سے میرا چہرہ کیوں بگاڑنا چاہتے تھے۔“

عامر نے کوئی جواب نہیں دیا، لیکن اسی وقت مفور کی غرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”نقاب اتارو۔“ عامر نے خوفزدہ ہو کر جلدی سے نقاب اتار دی اور ماہ نور نفرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”ماہ نور! تمہارا چہرہ کتنا نکال کے مجھے

یہ مجھے مار ڈالے گا۔“ وہ چیختے ہوئے بھاگنے لگی، لیکن غلط سمت جا رہی تھی۔ ادھر کوئی دروازہ نہیں تھا، جب تک وہ پلیٹ کر دروازے کی طرف جانی نقاب پوش اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے پیچھے سے اس کی چوٹی پکڑ لی اگر وہ سامنے کے رخ ہوتی تو دوسری بار اس پر تیزاب پھینکا جاسکتا تھا، لیکن چہرہ دوسری طرف تھا۔ اس نے چہرے کو اپنی طرف کرنے کے لیے ماہ نور کی چوٹی پکڑ کر ایک جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا تو ماہ نور نے خود کو بچانے کے لیے اپنے آپ کو سنبھالا، چہرہ سامنے آیا تو بوتل والا ہاتھ بلند ہوا لیکن اس کے ساتھ ہی بوتل ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑی، نقاب پوش مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا، نجانے کیا ہوا تھا اس کی گردن میں ایک زنجیر آکر پھنس گئی تھی، وہ زنجیر جو دونوں ہاتھوں کے درمیان جھکڑیوں سے رابطہ کئے ہوئے تھی۔

ماہ نور نے آنے والے کو دیکھا تو ساری دہشت بھول کر خوشی سے کھل گئی، مفور شخص نے پیچھے سے آکر نقاب پوش کے گلے میں اپنے ہاتھوں کی زنجیر پھنسا دی تھی اور نقاب پوش آہنی پھندے سے نکلنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا مفور کے حلق سے غرائی ہوئی آواز نکلی۔

”کتے! بزدل! اکیلی عورت پر حملہ کرتا ہے، مرد ہے تو میرے ہاتھ سے نکل کر دکھا۔“

ادھر نقاب پوش دونوں ہاتھوں کا زور لگا کر اپنی گردن کو زنجیر سے نجات دلانے کی کوشش کر رہا تھا، ساتھ ہی اسے پیچھے کی طرف ڈھکیل رہا تھا۔ دونوں زور آزمائی میں مصروف تھے، تو مفور نے کہا۔

”میں جیل کی آہنی سلاخیں توڑ کر آیا ہوں، تیری گردن توڑنے میں دیر نہیں لگے گی۔“

ماہ نور تو ایک عجیب نشے کی کیفیت میں تھی، لمبا چوڑا شخص والا، دستہ دار نقاب پوش،

امید نہیں تھی کہ تم کو بہت ہی بزدل مجرم ہو۔“
 ”مجرم بھی بزدل نہیں ہوتا جس کی مثال میں ہوں“ میں نے جو جرم کیا ڈنکے کی چوٹ پر کیا۔“ ماہ نور نے ایک بار پھر نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا، اب اس کی نظروں کا زاویہ بدل چکا تھا، وہ مفرو راس کا محسن اور عامر اس کا دشمن، اس نے حقارت سے عامر کو دیکھا پھر بولی۔

”تم میری زندگی بھر کے ساتھی ہونا عامر۔ میرے قانونی محافظ ہو۔ تم نے قرآنی آیات کے زیر سایہ مجھ سے زندگی بھر کا ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائی تھیں۔ مجھ سے نکاح کیا ہے تم نے عامر، مجھے نہ چھوڑنے کے لیے گڑ گڑاتے رہے ہو اور اس کے بعد تمہاری یہ حرکت۔ اس کی وجہ مجھے بتاؤ گے عامر۔“

”تم جانتی ہو۔ تم میری بہت بڑی کمزوری ہو۔ مجھے ہر وقت خدشہ رہتا ہے کہ تم مجھے چھوڑ دو گی میں تمہیں بد صورت کر کے اس قابل نہیں چھوڑنا چاہتا تھا کہ کوئی دوسرا تم پر توجہ دے سکے۔“

”خوب“ تم بے حد قابل نفرت ہو عامر تم نے دولت کے حصول کے لیے مجھ سے شادی کی اور اپنا غلام بنائے رکھنے کے لیے میرا چہرہ بگاڑنا چاہتے تھے۔ زیادہ ہو گیا عامر..... مجھے طلاق دے دو۔ مجھے اب تمہارے سائے سے بھی نفرت ہے۔“

”نہیں ماہ نور میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ تم میرے لیے زندگی ہو۔ میں بے کسی کی موت نہیں مرنے چاہتا۔“

”مجھے تمہاری زندگی موت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اب۔“ ماہ نور نے کہا۔ اس دوران مفرو خاموشی سے کھڑا دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

”بھول جاؤ اس بات کو ماہ نور، میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکے گا۔“

یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے اچانک ہی عامر کی نگاہیں مفرو راجہ کی جانب اٹھیں، ایسا لگا جیسے اس نے اسے پہلی بار دیکھا ہو وہ چونک کر بولا۔

”یہ کون ہے اور اور..... اور۔“

”خادم کو جملہ مقررہ کہتے ہیں، اگر اجازت ہو تو چلا جاؤں۔“ اس کے الفاظ سے یوں لگا جیسے وہ اچھا خاصا پڑھا لکھا آدمی ہو، لیکن ماہ نور کو بخانے گیا ہوا اس نے آگے بڑھ کر اجنبی کا بازو پکڑ لیا اور بولی۔

”میں تمہیں نہیں جانے دوں گی، کیا تم مجھے اس شخص کے رحم و کرم پر چھوڑ جاؤ گے جس سے اگر ذرا سی بھول نہ ہوئی تو اس وقت بخانے میرا کیا حال ہوتا“ میں آج تمہاری وجہ سے بچ گئی، ورنہ میرا زندہ رہنا مشکل تھا، اس کے بعد میں ساری دنیا میں کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتی تمہارے سوا، سمجھ رہے ہوں، مجھے تمہاری ضرورت ہے اور تم عامر، تم یہ سمجھ لو کہ میں اس چھت کے نیچے اس وقت تک ہوں جب تک یہ اجنبی محافظ میرے پاس ہے۔ اگر یہ چلا گیا تو میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔“

عامر کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمودار ہو گئے، وہ اس اجنبی کے ساتھ یہاں رہنا چاہتی ہے، یہ بات عامر کے لیے ناقابل برداشت تھی اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کی بیوی نے کسی اور کا اعتماد حاصل کر لیا ہے، ایک لمحے کے اندر اس نے فیصلہ کیا کہ اس وقت ماہ نور کی بات مان لی جائے، کوئی اور ترکیب سوچتی ہو گی کہ یہ کائنات ان کے درمیان سے نکل جائے، پھر اس نے اس مفرو پر غور کیا صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ یہ جیل سے بھاگا ہوا کوئی قیدی ہے، اس قیدی کو دوبارہ جیل میں پہنچایا جاسکتا ہے، سمجھی اس نے سوال کیا۔

”تم مجھ سے اپنا تعارف نہیں کراؤ گے“

اندازہ ہوتا ہے کہ تم بیل سے فرار ہو کر آئے ہو۔“

اندازِ فکر

☆ بے شک اللہ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے۔
☆ جو پرہیز گار ہیں

ان کا حساب اللہ کے پاس ہے۔

☆ اسے بھی نیک کام کا حساب ملے گا جس نے دوسروں کو نیکی کا راستہ بتایا ہو۔

☆ قیامت کے دن اس نیک کام کے اجر میں سے اس کو بھی حصہ ملے گا جو نیک بات کی سفارش کرے گا۔

☆ جان بوجھ کر حق بات کو نہ چھپاؤ اور تم اس بات کو اچھی طرح جانتے ہو۔

☆ آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق خرد برد نہ کرو اور جان بوجھ کر ناحق ہضم نہ کرو۔

☆ لوگو! اب بھی ہم نے تم کو پیدا کیا ہے اور تم قیامت کے دن دوبارہ پیدا کرنے کو حق کیوں نہیں سمجھتے جس کا کہ ہم نے وعدہ کیا ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں کوئی سزا نازل نہیں کی جن کو تم پکارتے ہو۔

☆ تمہارے حق میں یہ بہتر ہے کہ تنگ دست کو اصل قرضہ ہی بخش دو۔

☆ لوگوں سے ڈرنے کی بے نسبت اللہ کا زیادہ حق ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔

☆ احکام اللہ کو اپنی کھیل نہ سمجھو۔ اور منظور یہ ہے کہ تم ان احکام سے فصاحت حاصل کرو۔

☆ اللہ اور رسول کا حکم مانو، عجب نہیں کہ تم پر رحم کیا جائے۔

☆ اور میں حکم دیا گیا ہوں کہ قرآن پڑھ کر سناؤں۔ پس جو ہدایت پا گیا اس کا فائدہ اس کے نفس کو ہی پہنچے گا۔

☆ اگر روزِ آخرت کا یقین رکھتے ہو تو اللہ کے حکم کی تعمیل کرو۔

☆ پس چاہئے کہ ہمارے حکم بھی مانیں اور ہم پر ایمان لائیں تاکہ سیدھے راستے پر لگ جائیں۔

”ہاں میں پچھلی رات سے مفروز ہوں“
سلاخیں توڑ کر جیل سے نکلا ہوں اور دن بھر پریشان رہا ہوں“ صبح سویرے ایک دھوئی گھاٹ کی طرف نکل گیا تھا جہاں سے میں نے یہ کپڑے چرا کر پہنے لیکن جیل کی یہ فیص نہیں اتار سکتا تھا کیونکہ دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے بہت مشکل کا شکار رہا ہوں میں کل دن بھر اور جب بھوک اور پیاس سے حالت خراب ہو گئی تو مجھے یہ کانچ نظر آیا اور میں یہاں آ گیا۔“

”کیا جرم کیا ہے تم نے۔“
”اتنا بڑا جرم کہ مجھے پھانسی کی سزا ہو سکتی ہے۔“

”آرام سے بیٹھو اور مجھے اپنے متعلق بتاؤ۔“

”کیوں تم میرے لیے کیا حیثیت رکھتے ہو۔“

”سنو۔“ ماہ نور نے اس گفتگو میں مداخلت کی۔

”میں تمہارے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ کیونکہ اس وقت تم نے میری زندگی میرا چہرہ بچایا ہے۔“

”مجھ پر اگر مہربانی کرنا چاہتی ہو تو میرے لیے وہ کام کرو“ مجھے اس جھکڑی سے نجات دلا دو اور کچھ رقم ادھار دے دو میں تمہیں بتاؤں کہ میں چور یا بد معاش نہیں ہوں میں شریف آدمی ہوں اور وعدے کا پابند ہوں جو رقم لے جاؤں گا اپنے حالات درست ہوتے ہی واپس کر دوں گا۔“

”ہونیہ شریف آدمی جیلوں میں نہیں جاتے اور اگر وہ واقعی شریف ہوتے ہیں تو ان کے اندر جیل سے فرار کی ہمت نہیں ہوتی۔“

”میری بات سنو“ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر توجہ نہ دو میں تمہیں جان بھی دے دوں تو کبھی واپس نہیں مانگوں گی۔“

”میری بات سنو“ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر توجہ نہ دو میں تمہیں جان بھی دے دوں تو کبھی واپس نہیں مانگوں گی۔“

”میری بات سنو“ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر توجہ نہ دو میں تمہیں جان بھی دے دوں تو کبھی واپس نہیں مانگوں گی۔“

”میری بات سنو“ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر توجہ نہ دو میں تمہیں جان بھی دے دوں تو کبھی واپس نہیں مانگوں گی۔“

”میری بات سنو“ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر توجہ نہ دو میں تمہیں جان بھی دے دوں تو کبھی واپس نہیں مانگوں گی۔“

”میری بات سنو“ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر توجہ نہ دو میں تمہیں جان بھی دے دوں تو کبھی واپس نہیں مانگوں گی۔“

”میری بات سنو“ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر توجہ نہ دو میں تمہیں جان بھی دے دوں تو کبھی واپس نہیں مانگوں گی۔“

”میری بات سنو“ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر توجہ نہ دو میں تمہیں جان بھی دے دوں تو کبھی واپس نہیں مانگوں گی۔“

کو لین لگی اور میں فالوون کی طرفت میں پھنس کر عدالت تک پہنچ گیا، میری ماں مجھے بچانے کے لیے وکیلوں اور بیرسٹروں کی دہلیز پر سر پٹخنے لگی، میرے دشمن کے جوان بیٹوں نے میرے خلاف مقدمے کو بہت ہی مضبوط کر دیا، جھوٹے گواہ پیدا کر دیے اور یہ ثابت کر دیا کہ وہ چاچا بہت شریف اور نیک دل انسان تھا وہ میری ماں کی مالی امداد کرتا تھا۔ کبھی اس نے میری ماں کو بری نیت سے نہیں دیکھا، انہوں نے مجھ پر الزام لگایا کہ اب چچا میری ماں کے لیے پیسے لے کر آیا تو میں نے اس کی جیب سے وہ رقم حاصل کرنے کے لیے جان بوجھ کر اسے قتل کر دیا اور میری ماں مجھے بچانے کے لیے چچا پر الزام لگا رہی ہے۔“

شاہ میر خاموش ہو گیا اس نے گہری گہری سانس لینا شروع کر دیں جیسے سخت اذیت سے گزر رہا ہو تو ماہ نور نے ہمدردی سے کہا۔

”آؤ تم جیل سے فرار ہو کر اپنی ماں کے پاس جانا چاہتے ہو۔“

”نہیں۔“ وہ بڑے کرب سے بولا۔

”میری ماں اب اس دنیا میں نہیں ہیں، میرے وکیل سے بات کرتے ہوئے جب انہیں یہ علم ہوا کہ مجھے صرف سزائے موت ہوگی تو ان کے دل کی حرکت بند ہوگئی۔“

”آہ میرے ہمدرد میرے محسن، میرے محسن، مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے تمہارے غم کو تازہ کر دیا ہے۔“

”خدا کرے میرا یہ غم ہمیشہ تازہ کرے اور کوئی بھی تنہائی میں کسی عورت پر حملہ کرنے آئے تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا اور آج بھی یہ شخص اسی قابل ہے کہ میں اسے اس کے ہم منصب یعنی اس بد بخت چچا کے پاس بھیج دوں اور میں اس کے لیے تمہاری اجازت چاہتا ہوں۔“

عامر کے دل پر ایک ٹھونسہ سا لگا اسے احساس ہوا کہ اس کی بیوی کس بے حیائی سے یہ باتیں کر رہی ہے۔ ”تم کیا کہہ رہی ہو میرے سامنے جانتی ہو۔“ عامر بولا۔

”جانے دو جانے دو عامر، یہ مہربان میرے لیے کیا ہے یہ تم نہیں سمجھو گے، مجھے بتاؤ اپنا نام بتاؤ مجھے۔“

تب مفرور نے آگے بڑھ کر ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”انسان کو کہانیاں سننے اور سنانے کا کتنا شوق ہوتا ہے۔ چلو ٹھیک ہے تمہاری کہانی مجھے کسی حد تک معلوم ہوگئی اب میری کہانی سنو، میرا نام شاہ میر ہے، میں ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں، چھوٹا سا تھا تو میرے باپ کا انتقال ہو گیا، ماں کہیں بھی ہو ماں ہوتی ہے، دنیا کی ہر ماں کی طرح اپنی اولاد کو چاہتی ہے، میری ماں بھی ماں تھی، بڑی قربانیاں دیں اس نے میرے لیے، جوانی میں بیوہ ہوئی لیکن دوسری شادی نہیں کی میری وجہ سے، محنت مزدوری کر کے مجھے پڑھایا لکھایا، میرے والد کا ایک دوست تھا جسے میں چچا کہتا تھا، چچانے میری والدہ کی مالی طور پر مدد کرنا چاہی، لیکن والدہ نے انکار کر دیا۔ وہ بہت غیرت مند تھی کسی کا احسان نہیں لینا چاہتی تھی۔ ساتھ ہی وہ بہت دور اندیش بھی تھی، اس نے اچھا ہی کیا کہ چاچا کی مدد قبول نہیں کی کیونکہ بعد میں اس نے شادی کا پیغام بھیجا تھا اور جب میری ماں نے یہ پیغام ٹھکرا لیا تو وہ ہمارا دشمن بن گیا، میرا میٹرک کا رزلٹ نکلا اور میں فرسٹ ڈویژن پاس ہوا تو یہ خوشخبری سنانے میں اپنے گھر کی جانب دوڑا وہاں میں نے اپنی والدہ کی چیخ پکار سنی، میرا وہ چاچا اس کی خواب گاہ میں گھس آیا تھا اور میری ماں سے دست درازی کر رہا تھا، تب میں نے وہی کیا جو ایک غیرت مند ماں کے غیرت مند بیٹے کو کرنا چاہیے تھا، میں نے اسے مار دیا، جان سے

☆ تو حکمت کے ساتھ ان سے ایسی تدابیر سے بحث کر جو خوبی سے بھری ہوں۔

اندازِ فکر

☆ قادر مطلق زبردست حکمت والا ہے۔

☆ خاموشی لازم پکڑ، مگر حق بات کہہ۔

☆ کوئی چیز بھی خرچ کرو اللہ اس کو جانتا ہے۔

☆ جب تک اللہ کی راہ میں وہ چیزیں خرچ نہیں کرو گے جو تمہیں عزیز و پیاری ہیں ہرگز نیکی کے درجہ کو نہ پہنچو گے۔

☆ نیک کام میں خرچ کئے ہوئے روپے کو احسان جتا جتا کر ضائع نہ کرو۔

☆ اللہ کی راہ میں اس قدر خرچ کرو جو تمہاری حاجت سے زائد نہ ہو۔

☆ ہم نے جو مال تم کو دے رکھا ہے اس میں سے راہ اللہ میں بھی خرچ کرتے رہو تا کہ برکت پاؤ۔

☆ جو راہ اللہ میں نہ خرچ کر کے نعمت کی ناشکری کرتے ہیں وہ ظالم ہیں اور اپنا ہی نقصان کرتے ہیں، پس اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں وہ متقی اور پرہیزگار ہیں۔

☆ ہم نے نفس اور مال جنت کے بدلے میں خرید لئے ہیں۔

☆ انسان اپنی بری خصلتوں کی بنا پر ہی دوزخ میں جلا یا جائے گا۔

☆ جو اپنی خطاؤں سے باز نہ آئیں وہی ظالم ہیں۔

☆ اگر دشمن صلح کر لینے کی خواہش ظاہر کرے تو تم بھی صلح کر لو۔

☆ متقی وہ لوگ ہیں جو خوش حالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

☆ جو اللہ کو خوشی قرضہ دے اللہ اس کے قرض کو اس کے لئے کئی گنا بڑا ہادے گا۔

عامر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”عامر اس کی تھکڑی کھول دو۔“
”یہ کھل نہیں سکتی کانی جاسکتی ہے“ لیکن یہ ایک مفور قیدی ہے، ہمیں قانون کا احترام کرنا چاہیے۔“ عامر ذلالت سے بولا۔
”تو کیا تم اسے قانون کے حوالے کرنا چاہتے ہو۔“

”مم..... میری بات سن لو۔“ چالاک عامر نے چپتر ابدلتے ہوئے کہا۔ ”ہم اسے قانون کے ذریعے رہائی دلائیں گے اور کسی اچھے سے بیرسٹر کے ذریعے اسے بے گناہ ثابت کریں گے۔“

”سمجھتی ہوں عامر، سمجھتی ہوں تمہیں، سمجھ رہے ہوتا، میں جانتی ہوں تم کیا کرو گے“ یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔“
”سنو مجھ پر بھروسہ کرو“ تم جو چاہو گی میں وہی کروں گا۔“

”اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں چھوڑ کر نہ جاؤں تو اس کی تھکڑی کاٹ دو۔“

”میں..... میں کوشش کرتا ہوں، کہیں سے آری لانی ہوگی مجھے۔“ عامر کھڑا ہو کر بولا لیکن اس سے پہلے شاہ میر کھڑا ہو گیا۔

”بیوقوف آدمی، کیا تم مجھے اتنا احمق سمجھتے ہو کہ تم باہر جاؤ اور تمہارے پیچھے پولیس والوں کے انتظار میں بیٹھا رہو۔“

ماہ نور نے بھی کہا۔ ”میں بھی اب اس شخص پر بھروسہ نہیں کر سکتی شاہ میر۔“

”نہیں ایسا نہیں ہوگا“ میں جو کچھ کر چکا ہوں اس کے بعد ایسا اور کوئی عمل نہیں کرنا چاہتا جس کی بناء پر تم مجھ سے دور ہو جاؤ۔“

ماہ نور ایک لمحے کے لیے سوچ میں ڈوب گئی، اس نے شاہ میر کی طرف دیکھا اور اچانک اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر شاہ میر تھکڑی سے آزاد ہو گیا تو یہاں سے چلا جائے گا

اور اس کے بعد یہ شخص کی طرف سے "Downloaded from https://paksociety.com" شیطان کی طرح قابض ہو گیا تھا، پوری طرح آزاد ہو جائے گا چنانچہ اس نے کہا۔
 ”تم یہاں بیٹھو، میں باہر جا کر ایسی چیز تلاش کر سکتی ہوں جس سے ہتھکڑی کٹ جائے۔“

”مگر اس وقت تم ایسی کوئی چیز کہاں سے لاؤ گی اور پھر میں تمہیں تنہا اتنی رات کو باہر جاتے نہیں دیکھنا چاہتا۔“ شاہ میر نے کہا اور نجانے کیوں ماہ نور کے دل کو ایک ٹھنڈک کا سا احساس ہوا وہ بولی۔

”لیکن م ساری رات ہتھکڑی میں بندھے بیٹھے رہو گے۔“
 ”مجبوری ہے، میں تمہارے لیے یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔“

”تب ٹھیک ہے، اس نامہربان شخص کو اس کمرے میں بند کر دیتے ہیں تاکہ یہ یہاں سے باہر نہ نکل سکے۔“

”کک..... کیا کیا کہہ رہی ہو تم کیا کہہ رہی ہو۔“ عامر اچھل کر بولا۔

”مجبوری ہے عامر، مجبوری ہے، تمہیں یہاں قیدی رہنا پڑے گا۔“ ماہ نور نے غرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”عورت ہو نا آخر، ایک سیدھی سادی گائے کی مانند نہیں، کتنے احسان کیے ہیں میرے باپ نے تم پر اور تمہارے باپ پر اور آج تم میرے ساتھ ایسا سلوک کر رہی ہو۔“

”ہاں عامر، کسی کو بھی اتنا بے بس مت سمجھ لینا کہ وہ سر اٹھانے پر مجبور ہو جائے اور پھر میں آپ پر کوئی ظلم نہیں کروں گی، آپ کی بھوک پیاس کا خیال رکھا جائے گا۔“

”یعنی تم سچ مچ مجھے یہاں قید کر دو گی اور وہاں ایک جرائم پیشہ شخص کے ساتھ کھاؤ گی پیو گی۔“

”تم اپنی بیوی کے اتنے محتاج کیوں ہو؟ کس بات سے ڈرتے ہو۔“
 ”بکو اس مت کرو یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔“

”اور تیزاب سے بیوی کا حسین چہرہ بگاڑنے والا چہرہ بھی ذاتی معاملہ ہو گا کیوں۔“
 ”تمہیں اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں میں تمہاری بیوی سے پوچھ لوں گا۔“ شاہ میر عامر کی کمزوری کو سمجھتا جا رہا تھا۔
 ”ہمارے معاملات میں نہ پڑنا، ہتھکڑی سے آزاد ہوتے ہی یہاں سے چلے جانا۔“ عامر نے نفرت سے کہا۔

”نہیں میرے دوست، ایسی بات نہیں ہے مجھے چھپنے کے لیے کوئی ایسی جگہ چاہیے جہاں چھپانے والے میرے سامنے مجبور ہوں، اگر تمہاری کمزوریاں میرے ہاتھ میں آئیں تو میں ایک نامعلوم مدت کے لیے یہاں پناہ لے لوں گا۔“

عامر پریشانی سے اسے دیکھنے لگا، یہ نیا نازیانہ تھا اس کا خیال تھا کہ ہتھکڑی سے آزاد ہوتے ہی یہ شخص یہاں سے چلا جائے گا، لیکن وہ تو پکڑا گیا تھا، اسی وقت ماہ نور کھانے کی ٹرے لے کر آ گئی، اسے دیکھتے ہی عامر نے غرا کر کہا۔

”تم میری بیوی ہو ماہ نور اور ایک دوسرے شخص کے لیے یہ سب کچھ کر رہی ہو وہ کہتا ہے کہ ہماری کوئی کمزوری اس کے ہاتھ آ جائے تو وہ ہمیں رہ جائے گا۔“

Downloaded from https://paksociety.com

کر سکتے تھے۔ لیکن ساتھ والی خواب گاہ میں گہری خاموشی تھی، اس نے کئی بار ماہ نور کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہ ملا، پتا نہیں وہ کہاں ہے۔

اس نے دروازے کے پاس سے ہٹ کر اوپر روشندان کی طرف دیکھا، اس دیوار سے ایک میز لگی ہوئی تھی، اس نے ایک کرسی اٹھا لی اسے میز کے اوپر رکھا اور پھر وہ اس کرسی پر چڑھ کر ماہ نور کی خواب گاہ میں جھانکنے لگا۔ ادھر گہری خاموشی تھی، اس نے ایک دوبار آواز بھی دی، لیکن کوئی جواب نہیں ملا، کیا مزے کی بات تھی، اسے تقدیر کا کھیل کہتے ہیں۔ جو ایک مفرور قیدی تھا جھکڑی میں تھا وہ آزاد تھا اور جسے آزاد ہونا چاہیے وہ کمرے میں قید ہو کر رہ گیا تھا، اچانک ڈرائنگ روم سے گانے کی آواز سنائی دی۔ ریکارڈ پلیئر سے ایک پرسرور نغمہ ابھر رہا تھا اور اس نغمے کی دھن ذرا دوسری ہی تھی، عامر پر شدید جنون طاری ہونے لگا، پھر تھوڑی دیر کے بعد اسے ماہ نور کے قہقہے کی آواز سنائی دی اور وہ چونک گیا۔

اس نے کتنے ہی عرصے کے بعد ماہ نور کے قہقہے کی آواز سن لی۔ وہ لپک کر دروازے کے پاس آیا اور پیٹنے لگا۔

”دروازہ کھولو، دروازہ کھولو۔“ وہ چیخا۔
”ہنسی تھم گئی، گانے کی آواز بھی رک گئی، پھر دروازے کی دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔“

”کیا بات ہے، کیوں شور مچا رہے ہو۔“
”دروازہ کھولو، میری بات سنو۔“
”ابھی دروازہ نہیں کھلے گا، تم کھانا کھا چکے ہو تو آرام سے سو جاؤ۔“

”کیا بکواس کر رہی ہو، تم میری بیوی ہو۔“

”بکواس تم کر رہے ہو عامر، جس عورت پر بھروسہ نہیں کر سکتے اسے بیوی بنا کر کیوں رکھا ہوا

”کیا۔“ ماہ نور کوئی سے پتی اس کے اندر جوجھ چھا ہوا تھا وہ بے اختیار زبان پر آ گیا، وہ سنبھل کر بولی۔
”میں بھی نہیں۔“

”یہ شخص چاہتا ہے کہ ہم پولیس والوں کو اس کے بارے میں اطلاع نہ دیں، اسے قانون کے حوالے نہ کریں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم اس کے آگے مجبور ہوں اور ہمیشہ اس کے دباؤ میں رہیں۔“ تب ماہ نور ایک دم ہنس پڑی پھر بولی۔

”تم نے دیکھا شاہ میر میں نے اپنے شوہر کو پرانا رکھا ہوا سالن دیا ہے، تم میری پتی ہوئی ہانڈی لے گئے تھے نا، کچھ اور کھاؤ گے یا پیٹ بھر چکے ہو۔“

شاہ میر نے چونک کر کہا۔ ”ارے میں تو بھول ہی گیا وہ ہانڈی میں نے کالج کے باہر ہی چھوڑ دی ہے، بس خوفزدہ ہو کر واپس آ گیا تھا، میں وہ ہانڈی لاتا ہوں۔“ وہ باہر جانے لگا تو ماہ نور نے کہا۔

”میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی اور اس نے کمرے کے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔

عامر غصے سے پاگل ہو رہا تھا، لیکن پھر اس نے دوبارہ اپنی مصلحت پسند فطرت کو آواز دی، اگر بیوی ہاتھ سے نکل گئی تو بہت کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا، لیکن وہ کھانے کو ہاتھ نہ لگا سکا اور بہت دیر تک انتظار کرتا رہا، اس کے بارے میں سوچتا رہا، بڑی بے چینی تھی اس کے اندر جیسے جیسے دیر ہو رہی تھی وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں وہ شاہ میر کو اپنی آپ بیتی نہ سنارہی ہو اگر ایسا کر رہی ہے تو بہت حماقت کر رہی ہے، کسی کو راز دار نہیں بنایا جاسکتا، اس نے دروازے کی طرف دیکھا جس کی دوسری طرف ماہ نور کا بیڈ روم تھا، وہ اس دروازے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اگر کان لگا

جو کچھ بتایا ہے اس کے پیش نظر کوئی بھی عورت کہیں بھی بہک سکتی تھی، لیکن تم عظیم ہو، میں تمہاری قدر کرتا ہوں۔“

عامر غصے سے بولا۔ ”اس کے کمرے سے باہر نکل آؤ، کمینے وہاں کھڑے باتیں کیوں بنا رہے ہو۔“ پھر اس نے شاہ میر کو دیکھا جو ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں سے روشندان نظر آ رہا تھا، اس نے کہا۔

”ظالم آدمی تم نے اس بیچاری کو شادی کے نام پر قید کر رکھا ہے، اوپر سے اس کا چہرہ بگاڑ رہے تھے، میرا دل چاہتا ہے کہ میں ایک جرم اور کر لوں اور تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔“

”ایسا نہ کہو شاہ میر، کیا تم دونوں کے لڑنے سے میری تقدیر بدل جائے گی۔“

”ہاں بدل سکتی ہے۔ تم اس سے طلاق لے لو۔“

”تو بکواس کر رہا ہے کتے، میری بیوی کو بہکا رہا ہے۔“ عامر غصے سے دھاڑا تو ماہ نور بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور غرا کر بولی۔

”میں ضرور طلاق لوں گی، تم میرا تماشا دیکھ رہے ہونا، اگر میں بہک گئی تو نجانے کیا سے کیا ہو سکتا ہے۔“

”اگر اس شخص نے تمہیں سبز باغ دکھائے ہیں ماہ نور تو بھول جاؤ، یہ قاتل ہے اور ایک دن اسے ضرور پھانسی کی سزا ہو جائے گی۔“

”میں تو کچھ اور ہی سوچ رہی ہوں عامر۔ اگر تم مجھے اپنی بیوی بنائے رکھنا چاہتے ہو تو اسے میرا مطلب ہے شاہ میر کو قانون کی نظروں سے چھپا کر رکھنا ہوگا ہمیں۔“

”کب تک آخر کب تک۔“

”اب تم آرام کرو اس کا فیصلہ ہم صبح کریں گے۔“ ماہ نور نے کہا اور اس کے بعد وہ خاموش ہو گئی۔

”سو جاؤ اور اگر نہیں سو سکتے تو جاگتے رہو۔“

”میری بات تو سن لو، میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں جواب میں ماہ نور کی کوئی آواز نہیں سنائی دی۔ چنانچہ اس نے دروازہ پھینکا شروع کر دیا اور کچھ لمحوں کے بعد ماہ نور کی آواز سنائی دی۔“

”میں آخری بار کہہ رہی ہوں، اگر تم نے کوئی گڑبڑ کی تو میں شاہ میر کے ساتھ چلی جاؤں گی۔“

اس کے جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور دروازے کو پینے کی جرات نہ کر سکا، عورت کو لگم لگم ہونے کا موقع مل رہا ہو تو اس کی بات مان کر ہی اسے لگم دی جاسکتی ہے، حالانکہ وہ ماہ نور کو بچپن سے جانتا تھا ایک شرمیلی سی اور سیدھی سادی لڑکی جس نے شاید عامر کے علاوہ کبھی کسی سے بات بھی نہ کی ہو، وہ غیر مردوں سے ہمیشہ گھبراتی تھی، عامر دروازے کے پاس سے ہٹ گیا البتہ اسے اس بات کا یقین تھا کہ ماہ نور بدکردار نہیں ہے۔ وہ جس رویے کا اظہار کر رہی ہے وہ ایک طویل جھلاہٹ کا نتیجہ تھا، حالات سے مجبور ہو کر ایک عورت اگر اپنے شوہر کا گریبان پکڑ لے تو وہ الگ بات ہے، لیکن کسی مرد کا ہاتھ وہ اپنے گریبان تک بھی نہیں پہنچنے دے گی۔

وقت گزرتا رہا، پھر اچانک اسے ماہ نور کی خواب گاہ سے رونے کی آواز سنائی دی اور وہ فوراً ہی میز پر چڑھ کر کرسی پر کھڑے ہو کر روشندان کی طرف دیکھنے لگا، وہ بستر پر اوندھے منہ پڑی رو رہی تھی پھر اسے ماہ نور کی آواز سنائی دی۔

”شاہ میر خدا کے لیے میرے کمرے سے چلے جاؤ، میں عورت ہوں اور عورت کو بدنام ہونے میں کچھ وقت نہیں لگتا۔“

”نہیں ماہ نور، میں کروڑوں سے بھی زیادہ مال کے لیے اس کے ساتھ جاؤں گا۔“

اندازِ فکر

☆ جن کے دلوں میں
اللہ کا خوف ہے وہی
نصیحت پر عمل کرتے
ہیں۔

☆ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ تم بے فائدہ پیدا کئے گئے ہو؟
اور تم پر کچھ فرض نہیں ہے۔

☆ بدلہ لینے سے پہلے یہ ضرور خیال کر لیا کرو کہ تم اپنے
اللہ کے نزدیک کتنے قصور وار ہو؟

☆ جو نیک بندے ہیں وہ خیرات کرتے ہیں اور اس کا
پھل پاتے ہیں۔

☆ خیرات کر کے کسی پر احسان نہ جتاؤ۔

☆ تم ہماری یاد میں لگے رہو کہ ہمارے ہاں بھی تمہارا
ذکر خیر ہوتا رہے۔

☆ جو خوبی سے بھری ہوں ایسی تدابیر کے ساتھ بحث
کر۔

☆ پرہیزگاروں کو وہی خوبی سے جانتا ہے۔

☆ اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے عورتوں اور مردوں کا
جولی دامن کا ساتھ ہے۔

☆ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے اس کے قدم بقدم نہ چلو۔

☆ اگر دشمن صلح کر لینے کی خواہش ظاہر کرے تو تم بھی صلح
کرلو۔

☆ جب تمہیں سلام کے ذریعہ سے دعادی جائے تو اس
کے جواب میں بہتر دعا دو یا وہی کلمہ جواب میں کہہ دو۔

☆ آدمی بہتری کی دعا سے کبھی نہیں اکتاتا اور جب
تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی لمبی دعائیں کرتا ہے۔

☆ جب کوئی ہم سے دعا کرے تو ہم بھی دعا کرنے
والے کی دعا سنتے ہیں اور مناسب ہوتا ہے تو قبول بھی
کر لیتے ہیں۔

☆ اہل ایمان کے دل اللہ کی یاد سے سکون پاتے ہیں۔

☆ خیر دار رہو کہ دلوں کا چین اللہ کے ذکر ہی میں ہے۔

تھا، عامر تڑپتا کھتا رہا، ہر چند اس کا اپنی بیوی سے
کوئی ازدواجی رشتہ قائم نہیں ہو سکا تھا، لیکن وہ
ایک غیر مرد کے ساتھ تھا اپنی خواب گاہ میں ہو، یہ
بات بھی عامر سے برداشت نہیں ہو رہی تھی،
رات بھر وہ سوچوں میں ڈوبا رہا تھا اور پھر صبح کی
روشنی نمودار ہو گئی، پھر دروازہ کھلا اور ماہ نور تاشہ
لیے اس کے کمرے میں داخل ہو گئی، اس وقت
اس کے چہرے میں نرمی نظر آ رہی تھی۔

”میرا تمہارا بچپن کا ساتھ ہے عامر، لیکن
ذرا غور کرو جو کچھ ہوا ہے اس پر غور کرو کیا تم نے
میرے ساتھ اچھا کیا ہے، میں اگر چاہتی تو نجانے
کیا کر سکتی تھی، لیکن میں نے بھی تمہارے اعتماد کو
ٹھیس نہیں پہنچائی۔“ عامر پر خیال نگاہوں سے
اسے دیکھنے لگا، پھر بولا۔

”آخر تم کیا چاہتی ہو۔“

”بس میں چاہتی ہوں، میں چاہتی ہوں کہ
میں بھی ایک ایسی زندگی بسر کروں جو شوہر اور
بیوی کے درمیان ہوتی ہے، وہ جیسا بھی ہے تم
سے بہت اچھا ہے، میں اس سے شادی کرنا چاہتی
ہوں۔“

عامر کا چہرہ پہلا پڑ گیا، چند لمحات سوچتے
رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ”دیکھو میں نے کبھی تم
سے عشق نہیں کیا اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ تم میری
بیوی صرف اس لیے بنی ہو کہ میرے باپ نے
ایک ناجائز شرط لگا دی تھی، اس کی وجہ سے مجھے تم
سے شادی کرنا پڑی۔ لیکن مجھے اس بات کا
جواب دو کہ اگر تم مجھ سے علیحدہ ہو گئیں تو اس
دولت اور جائیداد کا کیا ہوگا۔“
”اس کا حل ہے عامر۔“

”کیا.....“

”تم خاموشی سے مجھے طلاق دیدو۔ ہم اس
بات کو عام نہیں کریں گے۔ میں خاموشی سے
قانونی اور مذہبی تقاضے پورے کروں گی اور شاہ
میر سے شادی کر لوں گی۔“

عامر کے چہرے پر کچھ غصے کے پھول تھے۔
 کی پر چھائیاں رقصاں رہیں پھر وہ بولا۔
 ”ٹھیک ہے، مگر میری شرط یہ ہے طلاق
 تحریری نہیں زبانی دوں گا اور زبانی طلاق تم
 جانتی ہو، ہو جایا کرتی ہے، دوسری شرط یہ ہے کہ
 تمہارا اور شاہ میر کا نکاح نامہ میری تحویل میں
 رہے گا، تم میری مرضی کے خلاف کبھی کسی اور کو
 اپنا شریک حیات ثابت نہیں کر سکو گی۔“

ریکارڈ ہے۔“
 ”تصویریں کیوں اتارنا چاہتے ہو۔“
 ”اس لیے کہ انسان مسرت بھرے لمحات
 میں گزری ہوئی مصیبتوں کو بھول جاتا ہے، میں
 چاہتا ہوں شاہ میر جھٹڑی کو یاد رکھے۔“ وہ مختلف
 زاویوں سے اس کی تصاویر اتارنے لگا، شاہ میر
 نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جو کچھ بھی ہے، لیکن میری حقیقت کبھی
 نہیں بھلائی جاسکے گی۔“
 ”اور تم جانتے ہو شاہ میر کہ ہم تینوں اس
 معاہدے کے پابند ہیں، کسی بھی وقت کسی کا بھی
 ذہن بھٹک سکتا ہے۔“

”میں جانتا ہوں میری زندگی تم دونوں
 کے رحم و کرم پر ہے۔ چنانچہ میں ایک اچھا انسان
 رہوں گا، تاکہ زندگی بچ سکے۔“
 ”ٹھیک ہے ماہ نو، جو کچھ ہو رہا ہے تم جانتی
 ہو کس طرح سے ہوگا۔“

”ہاں میں جانتی ہوں میں ایک ایسی دلہن
 بننے والی ہوں جس کے دولہا کے سر پر سہرا نہیں
 بلکہ گلے میں چھائی کا پھندا نظر آتا رہے گا۔“
 ”بہت ہی دکھ بھری کہانی ہے ماہ نو، تم
 میرے باپ کی آرزو کے مطابق میری شریک
 حیات بن کر میری زندگی میں آئیں، لیکن میں
 خود کو تمہارا اہل ثابت نہیں کر سکا، تم میری شریک
 حیات ہی نہیں بلکہ بچپن کی ساتھی بھی ہو اور یہ
 حقیقت ہے کہ شاید میری زندگی کی سب سے قیمتی
 چیز۔“

عامر نے اسے تین بار طلاق دیے دی اور
 ماہ نو زار و قطار رونے لگی، وہ جانتی تھی کہ طلاق
 عورت کو ایک کھوٹا سکھ بنا دیتی ہے۔ طلاق شدہ
 عورت کا کوئی مول نہیں ہوتا، لیکن کیا کرتی کوئی
 اور وقت ہوتا تو یہ اور اتنی جلدی کسی دوسرے مرد
 کے لیے نہیں ہوتی، لیکن

”تم ایک ہفتے میں صرف چوبیس گھنٹے کے
 لیے اس کا بیج میں آ کر رہو گی، باقی دن میرے
 ساتھ شہر میں رہا کرو گی۔“
 ”نہیں یہ بہت کم وقت ہے۔“ ماہ نو نے
 کہا۔

”میں احتیاطاً ایسا کر رہا ہوں، میں نہیں
 چاہتا کہ دنیا والوں کو اس بات کا اندازہ ہو، میری
 بدنامی ہوگی، تمہاری بھی ہوگی اور وہ پکڑ جائے
 گا۔“

”میں ہر پابندی قبول کر لوں گی لیکن صرف
 ایک شرط پر کہ آپ صحیح معنوں میں شاہ میر کو پناہ
 دیں گے اگر وہ بھی قانون کی گرفت میں آ گیا تو
 میری اور آپ کی دشمنی ہو جائے گی اور میں اس
 راز کو راز نہیں رکھوں گی اور دنیا والوں کو ساری
 صورت حال بتا دوں گی۔“

”یہ تمہاری بے جا شرط ہے، اگر شاہ میر کبھی
 اپنی حماقت کی وجہ سے قانون کی گرفت میں آ گیا
 تو میں کیا کر سکتی ہوں۔“

”اس کا خیال میں خود رکھوں گی اور اسی
 شرط پر سب کچھ ہوگا۔“

”چلو ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“ عامر نے
 کہا اور اس کے بعد ان اوزاروں کا بندوبست کیا
 گیا جس سے جھٹڑی کاٹی جاسکتی تھی، لیکن جھٹڑی
 کاٹنے سے پہلے عامر نے کہا۔

”میں ان شاہ میر کے لیے کچھ کر سکتی ہوں۔“

ایک بوڑھی عورت نے کہا۔ ”اے بیٹی، میں تمہارے دشمن، کیا خیریت پوچھنا بھی گناہ ہے۔“

”خیریت پوچھنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہمیشہ سر پر سوار رہا کریں، ہمیں شہر میں تنہائی میں بالکل سکون نہیں ملتا۔ جب دیکھو کوئی رشتے دار کوئی دولت کوئی کاروباری کچھ تو تنہائی کا موقع دیں۔“

”ارے ہاں عامر تمہارا وہ دوست کہاں ہے جو اس کا بیچ میں رہتا ہے۔“ عامر نے ہچکچاتے ہوئے دوسرے کمرے کی طرف دیکھا، پھر کہا۔

”چچا جان وہ تنہائی پسند ہے، کسی سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتا۔“

”چلو ہمارا کیا ہے، ایک آدھ دن رکتے ہیں، پھر واپس چلتے ہیں۔“

”وہ اصل میں چچی جان میرا شہر جانا بہت ضروری ہے۔“

اسی وقت ماہ نور نے کہا۔ ”ذرا میری ایک بات سنیں عامر۔“ عامر اس کے پیچھے چلتا ہوا دروازے سے باہر نکل آیا تو ماہ نور بولی۔

”یہ لوگ یہاں آگئے ہیں، آپ ایک دن کے لیے اور رک جائیں تو کیا ہرج ہے۔“

”یہ تمہاری حماقت کی وجہ سے آئے ہیں۔“ عامر نے غصے سے کہا۔

”اگر ہم چار دن یہاں نہ رکتے تو۔“

”میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ بہت سے مسئلے پیدا ہو جائیں گے۔“

”نہیں ہمیں ابھی یہاں سے چلنا ہو گا۔ آج میں تمہارے کہنے پر رک جاؤں گا تو تمہارے اور شاہ میر کے درمیان اشاروں میں بات چیت ہوگی، یہ بوڑھیاں بہت تیز طرار ہیں، چوری پکڑ لیں گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ واپس جانے پر مجبور ہو

حالات ایسے تھے کہ وہ ایک لمحے کے لیے اندر سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ پھر وہ عدت کے دن گزارنے لگی اور اس دوران شاہ میری اپنا حلیہ بدلنے لگا، اس نے بہت کچھ تبدیل کر لیا تھا اور اتنا بدل گیا تھا کہ دور سے پہچانا نہیں جاسکتا تھا۔

اس دوران ایک دوبار پولیس والے کا بیچ میں آئے بھی تھے، لیکن شاہ میر نے جو حلیہ بدلا تھا وہ بہت شاندار تھا اور ویسے بھی ماہ نور نے وہاں شاہ میر کے چھپنے کا معقول بندوبست کر لیا تھا۔ غرضیکہ اس طرح وقت گزرتا رہا، عامر معاہدے کے مطابق ان سے پوری طرح تعاون کر رہا تھا، لیکن اندر جو بے چینی تھی وہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی، کاش ماہ نور من مار کر اس کے ساتھ گزارہ کر لیتی، آخر کار عدت کے دن پورے ہو گئے اور دوسرا نکاح پڑھانے کا وقت آ گیا۔ یہ کام بھی عامر ہی کو کرنا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ کوئی قاضی رازدار نہیں بن سکتا، آخر ایک دن اس نے ایک قاضی سے بات کی اور آخر کار ماہ نور دوسری بار سہاگن بن گئی۔

اس کی زندگی میں بہار آگئی تھی، عامر نے طے کیا تھا کہ وہ کا بیچ میں صرف چوبیس گھنٹے کے لیے ہفتے میں ایک بار آئے گی کیونکہ سہاگ کی نئی نئی مسرت تھی، اس لیے اس کے التجا کرنے پر عامر تین چار دن تک وہاں ٹھہر گیا۔ اس وقت بڑی عجیب و غریب پوزیشن تھی، خود ماہ نور کو بھی عجیب محسوس ہو رہا تھا، پھر ایک دن اچانک رشتے کی دو عورتیں اپنے شوہروں اور دو بچوں کے ساتھ وہاں پہنچ گئیں، انہوں نے کہا کہ بیٹی کی دن سے تمہاری خیریت نہیں معلوم ہوئی تھی، ہم خیریت معلوم کرنے کے لیے آگئے تھے۔ عامر نے گھور کر ماہ نور کو دیکھا تو ماہ نور نے ناگواری سے کہا۔

”کمال کرتی ہیں آپ لوگ، ہم چار دن شہر نہ پہنچے تو مر گئے ہوں گے کیا۔“

”معاہدے کی رو سے ہمیں یہ بات زبان پر نہیں لانی چاہیے۔ تم نے مجھے پناہ دینے اور ہمیشہ حفاظت کرنے کا وعدہ کیا ہے۔“

”میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ لیکن مجھے عجیب سا لگ رہا ہے، کیا تم کسی کے سامنے خود کو بچے کا باپ کہہ سکتے ہو۔ معاہدے کے مطابق میں آج بھی ماہ نور کا شوہر اور اس کے بچے کا باپ تم محض میرے دوست ہو جو اس کا بچہ میں رہتے ہو۔“

شاہ میرے کوئی جواب نہ بن پڑا، لیکن ماہ نور نے دونوں ہاتھوں سے سرھام لیا اور پریشان لہجے میں بولی۔ ”آہ میں نے معاہدہ کرتے وقت اس بارے میں نہیں سوچا تھا۔“

”کیسا معاہدہ“ میں تمہارا شوہر ہوں اور تمہارے بچے کا باپ۔“ شاہ میرا بولا تو عامر نے چمک کر کہا۔

”نکاح نامہ میری تحویل میں ہے اور دنیا والے کچھ نہیں جانتے“ اس کے علاوہ ماہ نور نے اپنے وعدے کے لیے پابند ہوں اور اس کے مطابق تمہارے بچے کا برتھ شیفٹ میرے نام سے بنے گا، میرے خاندان میں اس بچے کی پیدائش کی خوشیاں منائی جائیں گی اگرچہ مجھے کسی بچے سے دلچسپی نہیں ہے، لیکن ان حالات کا کیا کیا جاسکتا ہے۔“

شاہ میرے پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ تقدیر اس سے بڑا بھانک مذاق کر رہی تھی۔ پہلے ماہ نور کو بیوی بنایا، لیکن اب اس کی بیوی دوسرے کے نام سے بچپانی جا رہی ہے، اپنا بچہ بھی دوسرے سے منسوب ہونے والا تھا، وہ بھی اسے باپ نہ کہتا جبکہ وہ اس کا اپنا باپ تھا، کاش میں قاتل نہ ہوتا تو ماہ نور بھی میرے نام سے ہوتی اور بچہ بھی میرے نام سے پچانا جاتا، دنیا میں نام سے تو سب رشتے ہیں، یہ ایک بہت بڑی سچائی تھی، مگر

میں اپنے کمرے میں آئی اور شاہ میرے پاس بیٹھ کر رونے لگی، کھل کر رو بھی نہیں سکتی تھی، دوسرے کمرے میں لوگ بیٹھے ہوئے تھے اس نے کہا۔

”تقدیر میرا سخت امتحان لے رہی ہے شاہ میر کیا کروں مجبوری ہے۔“

شاہ میر نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ”کاش اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایسی جگہ ہوتی جہاں میں آزادی کے ساتھ تمہارے ساتھ رہ سکتا۔ میرے جرم نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا، میں بھی ایک مجبور اور کمزور انسان کی طرح چھ دنوں تک تمہارا انتظار کروں گا۔“

دیر تک وہ ایک دوسرے سے محبت بھری باتیں کرتے رہے، پھر عامر کی آواز سنائی دی۔

”جلدی کرو، ہمیں جانا ہے۔“

وہ ہنچڑ گئے، ماہ نور اس کی بیوی نہیں رہی تھی اب، لیکن چھ دنوں تک اس کے اختیار میں تھی۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جنہیں تیرنا نہیں آتا، وہ دوسرے کو ڈوبتے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہا، چھ دن کی جدائی کے بعد ساتویں دن ان کی زندگی میں بہار آ جاتی تھی، یہ ایک طرح سے بہتری ہوتا ہے، تاکہ یکسانیت نہ پیدا ہو، پھر محبت کا شرمیلے کا وقت آ گیا، شاہ میر نے جب یہ خوشخبری سنی تو خوش ہو کر کہا۔

”ہمیں اپنی محبت کا انعام ملنے والا ہے۔ کیا ہوتی ہیں وقت کی کہانیاں، پہلے میں بھانسی کے تختے پر پہنچ رہا تھا، تقدیر نے مجھے تمہاری آغوش میں پہنچا دیا اور اب میں باپ بننے والا ہوں، جب یہ بات عامر کو معلوم ہوئی تو اس نے شاہ میر سے کہا۔

”کیوں اتنا خوش ہو رہے ہو۔“

”کیا باپ بن کر خوش نہیں ہوتی۔“

”ٹھیک ہے، لیکن دنیا کی نظر میں تم کیا ہو“

ایک مفرد و جرم ایک

اندازِ فکر

☆ آنہیں اندھی نہیں بلکہ وہ دل جو سینے میں ہیں اندھے ہیں۔

☆ اے محمد! اگر تم کہیں کج خلق اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے آس پاس سے ہٹ جاتے۔

☆ اس پر اللہ کی لعنت ہو جو اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے اور ان کے دلوں میں شبہ ڈال کر ان میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

☆ مومنین کے دل نیک ہوتے ہیں۔ ان سے اگر غلطی ہو جائے تو فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔

☆ نصیحت تو فوراً ہی لوگ پکڑتے ہیں جن کے دل میں اللہ کا خوف ہے۔

☆ جو صاحبِ دل ہے اس کے لئے قرآن کی نصیحت کافی ہے۔

☆ ہے جو کوئی اللہ کی خوش دلی کے ساتھ قرض دے کہ اللہ اس کے لئے نیک بڑا عدا ہے۔

☆ یہ لوگ صداقت سے گزر جاتے ہیں۔ ان کے دل تو ہیں لیکن سمجھ سے کام نہیں لیتے۔

☆ تمہارا سوتا ہوا دل اور دماغ بے دار ہو جائے کیا اتنی قابلیت بھی تم میں نہیں۔

☆ اللہ ظالموں کو اسی حد تک مہلت دے رہا ہے جس دن کہ مارے خوف کے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔

☆ اس دن سے پہلے پہلے جس دن کہ موت آکھڑی ہو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو۔

☆ نیک بات کی سفارش کا اجر قیامت کے دن یقیناً ملے گا۔

☆ اللہ کی راہ میں ناکارہ چیز کے دینے کا ارادہ تک بھی نہ کرنا کہ اس میں سے خرچ کرنے لگو حالانکہ وہی چیز تم کو دینا چاہیں تو تم اس کو کبھی خوشی سے نہ لو گے۔

☆☆☆

ہوں۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا اور یہی ہوا۔ آخر کار ماہ نور ایک بچے کی ماں بن گئی اور عامر کے گھر میں خوشیوں کا طوفان آ گیا۔

عامر ماہ نور اور شاہ میر کو جلانے کے لیے بڑی خوشیاں منا رہا تھا، رشتے داروں کا ہجوم تھا، ناچ گانے کی محفل جمی ہوئی تھی، لیکن ماہ نور خوشی اور غم کے ملے جلے تاثرات سے دو چار تھی، بہت ہی خوب صورت بیٹے کو جنم دیا تھا اس نے اور وہ بیٹا ہر رشتے دار کی گود میں جا رہا تھا، سب اسے چوم رہے تھے، تھے دے رہے تھے، لیکن اسے یہ غم ستا رہا تھا کہ جو باپ ہے وہ بیچارہ کالج میں اکیلا پڑا ہوگا، پھر وہ رشتے داروں کی بھیڑ سے نکل کر ایک کمرے میں گئی۔ عامر کو بلایا اور بولی۔

”ایسے موقع پر میں شاہ میر کو نہیں بھول سکتی، ساری خوشیاں اسی کی ہیں۔“

”تو میں کیا کروں۔“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی طرح وہ چھپ کر یا بھیس بدل کر آجائے اور اس خوشی میں شریک ہو سکے۔“

”ناگل ہو گئی ہو تم، وہ یہاں آئے اور کسی طرح پولیس والوں کی نظروں میں چھپنے لگے، ہاں اگر تم اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچانا چاہتی ہو تو بے شک بلاؤ۔“ وہ خاموش ہو گئی، پھر چند لمحات کے بعد بولی۔ ”تم اس کی ایک بات تو رکھ لو۔“

”کوئی بات۔“

”اس کی خواہش ہے کہ اس کے بیٹے کا نام اس کے نام پر رکھا جائے۔ میں نے اس کے لیے ایک نام بھی سوچ لیا ہے۔“

”ہرگز نہیں، یہ بچہ میرے نام سے منسوب ہے، میں اس کا نام اپنے نام کی مناسبت سے رکھوں گا۔“ ماہ نور خاموش ہو گئی، بہر حال عامر نے یہاں بھی خوشیاں منا لیں وہ ایک بیٹے کا

تنت مہارادما عجل گیا ہے کیا۔“ وہ سہم کر بولی۔ ”تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے غیرت میں آکر قتل کیا تھا، تم کوئی عادی مجرم نہیں ہو، میں تم سے کہے دیتی ہوں کہ عامر کو بھی قتل کرنے کے بارے میں نہ سوچنا، نہ میں تمہارا ساتھ دوں گی اور نہ تمہاری حمایت کروں گی۔“

”کیا تمہارے دل میں ابھی تک عامر کے لیے جگہ ہے۔“ وہ بچاری سے بولا۔

”میری بات سمجھنے کی کوشش کرو مجھے الزام نہ دو، عامر کی وجہ سے تم یہاں محفوظ ہو فرض کرو عامر کے دن پورے ہو جاتے ہیں وہ مرجاتا ہے تب اس کے تمام رشتے دار پوچھیں گے کہ تم اس کا بچ میں کیوں رہتے ہو، فرض کرو اگر تم اس کے دوست کی حیثیت سے یہاں رہتے بھی ہو تو وہ پوچھیں گے کہ میں تمہارے پاس یہاں کیوں آئی ہوں ابھی تو عامر ایک پردہ ہے، تم اس پردے کو چاک کر دینا چاہتے ہو۔“

شاہ میر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا، کوئی جواب نہیں تھا اس کے پاس، اس نے بچے پر جھک کر اسے چومتے ہوئے کہا۔

”بہ ہفتے میں صرف ایک دن کے لیے میرا ہوتا ہے، ابھی یہ نادان ہے جب رشتوں کو سمجھے گا تو میرے پاس آئے گا بھی نہیں، میں بھی اسے بیٹا نہیں کہہ سکوں گا، زیادہ سے زیادہ یہ مجھے اکل کہنا شروع کر دے گا۔“

”بھتا سوچتے جاؤ گے، الجھتے جاؤ گے، ہم آئندہ اولاد نہیں پیدا کریں گے، اس طرح تمہیں صرف ایک بچے کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا ہوگا اور تم اس کے عادی ہو جاؤ گے۔“

”ہاں ٹھیک کہتے ہو۔“

رات کے وقت عامر اپنے کمرے میں رہتا تھا، بچہ بھی اسی کے پاس رہنے لگا، جب وہ ایک سال کا ہوا تو ماہ نور نے اسے ہفتے میں ایک دن

باپ بن گیا ہے دنیا والوں کے سامنے مجرم رہ گیا، لیکن وہ سر پھرا قاتل اگر صدر راتر آیا تو اس کی خاطر پھانسی کے پھندے تک پہنچ جانا منظور کر لے گا، ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے اور بھی بہت سے بچے ہوں گے میں کیوں کسی کے بچوں کا باپ بنتا رہوں، میرا مجرم رکھنے کے لیے یہ ایک ہی کافی ہے، اب اسے شاہ میر کا سننے کی طرح جیسے لگا تھا، اگر وہ اس دنیا میں نہ رہے تو ماہ نور ایک بیوہ کی حیثیت سے ہی سہی عامر ہی کے رحم و کرم پر ہو جائے گی، کرنا چاہیے کچھ کرنا چاہیے۔

اسی طرح شاہ میر بھی بے چین تھا اور اپنی شدید کمزوری کا احساس اس پر شدید طاری ہو گیا تھا۔ پھر جب چھ دن کے بعد ماہ نور اس کے پاس آئی تو وہ ناراض تھا، اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”تم نے مجھ سے شادی کی تھی۔“

”کیا تم مجھے اپنی بیوی بنا کر بچھتا رہے ہو شاہ میر۔“

”آہ میرا کیا ہے، تم نے میری اور اپنی ساری کمزوریاں اس کے ہاتھوں میں دے دی ہیں۔“

”تو بتاؤ کیا کرتی، میں نے اس وقت اولاد کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔“

”سنو ماہ نور، سنو اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے، ہمارا بچہ ابھی کچھ سمجھتا نہیں، جب وہ بولنے اور سمجھنے لگے گا تو مجھے بھی باپ نہیں کہے گا، اس سے پہلے ہم اسے دور لے جائیں گے۔“

”مگر شاہ میر، قانون کی گرفت سے کیسے بچے گے۔“

”آہ تم مجھے اور بزدل نہ بناؤ۔“

”تم کیا چاہتے ہو۔“

”سنو اگر عامر ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سو جائے تو تم زیادہ سے زیادہ اس کی بیوہ کھلاؤ گی، دولت مند بیوہ وہ کاٹا ہمارے راستے سے نکل گیا ہے۔“

کمرے میں چلا گیا۔ ملازمہ دنگ رہ گئی تھی، اس کوٹھی میں آج تک ایسا کوئی کام نہیں ہوا تھا جس پر کسی کو کوئی تردد ہو پھر وہاں سے ہٹ کر ماہ نور کی خواب گاہ کے پاس پہنچی دروازے پر دستک دی تو دروازہ کھل گیا، ماہ نور کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔

”کیا مصیبت آگئی۔“
 ”بیم صاب“ کچھ کہتا ہے مجھے آپ سے۔“
 ”ہاں بولو۔“

”صاب آج بہت بری طرح سے بدلے ہوئے ہیں، تم میں میں ڈر رہی ہوں۔“ ملازمہ نے ساری بات ماہ نور کو بتا دیں اور ماہ نور کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
 ”میں نہیں باننے والی مگر خیر تم ان کے کمرے میں جاؤ، میں تمہارے پیچھے پیچھے آتی ہوں۔“ ملازمہ ہچکچانے لگی تو ماہ نور نے اسے ڈانٹ دیا۔

”جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ کرو سمجھیں وہی کرو۔“ بمشکل ملازمہ اس کے لیے تیار ہوئی تھی پھر خود کو پوری طرح سنبھال کر وہ عامر کے کمرے کی طرف چل پڑی دروازے تک پہنچی تھی کہ اسے ملازمہ کی چیخ سنائی دی۔ وہ دوڑتی ہوئی عامر کے کمرے سے نکلی تھی اور عامر شیطانی انداز میں اس کے پیچھے لپک رہا تھا۔ ماہ نور کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ ملازمہ بھاگ نکلتی تھی۔ عامر نے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے۔ اچھا ہوا تم آگئیں۔ حق بخدا ار رسید۔ میں آج بھی دنیا کی نظروں میں ہوں۔“

”تمہارا شوہر ہوں تمہارے ساتھ کوئی بھی سلوک کر سکتا ہوں، میرے خلاف کوئی کچھ نہیں کر سکے گا، بس نصیبوں کی بات ہے۔ بچپن سے تمہیں جانتا ہوں لیکن بس نبھانے کیا ہو گیا تھا

میں اور بھی رشتے دار تھے، وہ بھی بچے کی دلیہ بھال کرتے تھے، اس طرح شاہ میر کا بیٹا جس کا نام عامر نے اپنے نام کے ساتھ ظاہر رکھا تھا اپنے باپ سے دور ہو گیا۔ انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے، ایسا ہی ایک نیا کھیل عامر کے ساتھ ہوا، عامر کا ایک بچپن کا دوست جس کا نام مرزا محفوظ تھا اور جو طویل عرصے سے ملک سے باہر تھا واپس آیا، اس سے زیادہ رازدار عامر کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ عامر کی پوری ہسٹری اس نے بڑھی اور بولا۔

”کیسی باتیں کرتے ہو عامر، تم اٹھارہ برس کی عمر تک بالکل نارمل تھے، پھر تمہیں چپک نکل آئی اور یہ مرض بڑا موذی ہوتا ہے، یہ انسان کے اندر کوئی عیب چھوڑ ہو جاتا ہے جو تمہارے ساتھ ہوا، اس میں ہارمونز کی کمی ہو جاتی ہے، تمہارا علاج بالکل ممکن ہے اور ڈاکٹر مرزا محفوظ نے اس کا علاج شروع کر دیا اور عامر خوشی سے دیوانہ ہو گیا، اس کی کھوئی ہوئی زندگی واپس آگئی تھی، وہ ماہ نور کے بارے میں سوچ رہا تھا، ماہ نور اس کے بچپن کی ساتھی تھی اور اسے بے حد پسند کرتا تھا وہ لیکن اب صورت حال اتنی مختلف ہو گئی تھی وہ اپنے بارے میں تجربے کے لیے سوچنے لگا۔

جس وقت وہ گھر پہنچا رات کے دو بج رہے تھے، دروازہ کھولنے والی ایک نوجوان ملازمہ تھی اس گھر میں بڑا پاکیزہ سا ماحول تھا، اس لیے کسی کو کسی قسم کا اندیشہ نہیں تھا، ملازمہ کو دیکھ کر عامر کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی، وہ دروازے سے پیچھے ہٹی تو عامر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور ملازمہ چونک پڑی۔

”سنو، مجھے تم سے بہت ضروری کام ہے“
 دروازہ بند کر کے میرے کمرے میں آ جانا۔“
 ”صاحب جی، کیا کہہ رہے ہیں آپ۔“
 ”سوچ لو تمہیں آنا ہو گا۔ ورنہ تم اس نوکری پر نہیں رہ سکو گے۔“
 ”کہہ کر عامر اپنے

جواب نہیں ملا، عام صورت حال کے بارے میں پولیس کو اطلاع دے رہا تھا۔ اس نے اپنے دوست کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا تھا کہ وہ پتا نہیں کہاں چلا گیا، الغرض یہ کہ یہ سب کچھ ہو گیا تھا۔ جب دوسرے معاملات طے ہو گئے تو عامر اس کرائے کے قاتل سے ملا تو اس نے بتایا کہ اس نے عامر کے حکم کے مطابق حملہ کیا تھا، اندر موجود آدمی ہمارے چار آدمیوں کا ڈٹ کا مقابلہ کرتا رہا، مجبوراً اس پر گولی چلا نا پڑی، لیکن وہ ہماری دسترس سے نکل گیا، اس کے بعد پتا نہیں کہاں غائب ہو گیا تو میں نے پیٹرول چمڑک کر کالج کو آگ لگا دی۔

بڑا غلط ہو گیا، بڑا غلط ہو گیا، نجانے کیا کیا کاروائیاں ہوتی رہیں، ماہ نور سخت پریشان تھی، طرح طرح سے شاہ میر کو تلاش کیا گیا، لیکن اس کا کہیں پتا نہ چلا، ماہ نور کی آنکھوں میں غم کے تاثرات نمودار ہو گئے تھے۔ تقریباً دو ماہ گزر گئے جب اچانک ایک دن شاہ میر کا خط اسے ملا۔

”سمجھ میں نہیں آتا ماہ نور آپ کو کس نام سے مخاطب کروں، میں زندہ ہوں مجھ پر حملہ کیا گیا تھا، وہ لوگ مجھے قتل کر دینا چاہتے تھے۔ جب میں وہاں سے فرار ہوا تو مجھ پر گولی چلا دی گئی، میں وہاں سے بھاگا زخمی ہو گیا تھا، سخت پریشان رہا، ان دنوں جلے ہوئے کالج میں واپس پہنچ گیا، میں اپنے طور پر بھیجی کاروائی کر رہا ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ یہ سب کچھ کس نے کیا ہے، خیر اللہ مالک ہے۔ میں بہت جلد اس کالج کو درست کرا کر دوبارہ وہاں منتقل ہو جاؤں گا، سمجھ رہی ہونا تم، مجھے میرا بیٹا بہت یاد آتا ہے۔“

یہ خط جب عامر نے پڑھا تو وہ بولا۔ ”ٹھیک ہے وہ یہی کر سکتا تھا، یہی کر سکتا تھا وہ زندگی حقیقت یہ ہے کہ یہ کام ڈاکوؤں کا ہے، بلکہ اب تو ایک اور بات میری سمجھ میں آ رہی ہے، عامر سے طرح طرح سے ملاقات ہو گئی،

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ چپک کی وجہ سے میں بہت سی مردانہ صلاحیتوں سے محروم ہو گیا تھا، لیکن اب میں ٹھیک ہوں ماہ نور یہ الگ بات ہے کہ تقدیر نے مجھے تم سے علیحدہ کر دیا۔“

ماہ نور گم سمی اس کا منہ کھلی رہی تو وہ بولا۔ ”خیر کوئی بات نہیں، میں آج بھی تمہارا مخلص دوست ہوں، میں تمہارے مرضی کے خلاف تمہارا ہاتھ نہیں پکڑوں گا، جاؤ اپنے کمرے میں جا کر آرام سے سو جاؤ۔“ ماہ نور کچھ نہ بول سکی، کمرے میں آ کر خاموش بیٹھی رہی، اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو اس سے پہلے کہ وہ ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھاتی دوسری طرف سے عامر نے فون کا ریسیور اٹھا لیا، ماہ نور نے بھی ریسیور اٹھا لیا تھا۔

”کیا مسٹر عامر موجود ہیں۔“

”ہاں ہاں میں بول رہا ہوں۔“ عامر کی آواز سنائی دی۔

”میں علاقے کا ایس ایچ او ہوں، یہاں آپ کے کالج میں آگ لگ گئی ہے، فائر بریگیڈ والے آگ بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”ارے یہ کیسے ہو گیا۔“ عامر نے حیرانی کا مظاہرہ کیا لیکن دوسری طرف سے فون بند ہو گیا تھا، لیکن ماہ نور فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر دوڑی ہوئی خواب گاہ سے باہر آ گئی۔ اس نے عامر کے کمرے کے دروازے کو زور زور سے پینا تو دروازہ کھل گیا۔

”عامر آگ کیسے لگ گئی۔“

”مم..... مجھے کیا معلوم۔“

”جیسے تمہیں نہیں معلوم۔“

”آہ چلو جلدی چلو۔“

جب وہ کالج پہنچے تو وہ جل کر خاک ہو چکا تھا، ماہ نور بالگوں کی طرح شاہ میر کو تلاش کرنے لگی، لیکن وہ نہیں ملا، پولیس موجود تھی اور اس نے عامر سے طرح طرح سے ملاقات ہو گئی،

موت لے اسے نکل لیا ہو نجانے کیوں عامر کو اکثر محسوس ہوتا تھا کہ کسی نہ کسی وقت شاہ میر آئے گا اور اس کی گردن دیوچ کر اسے ہلاک کر دے گا۔ یوں وقت گزرتا رہا اور تقریباً پندرہ برس گزر گئے۔ شاہ میر کا کوئی پتا نہیں تھا اور عامر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک دن اس نے کہا۔

”ہماری طلاق کو اٹھارہ برس گزر چکے ہیں تم میرا کھاتی ہو اور پہنتی ہو میری چھت کے نیچے رہتی ہو لیکن زندگی شاہ میر کے لیے گزار رہی ہو۔“

”ہاں میں اس کے لیے زندگی گزار رہی ہوں۔“ ماہ نور نے مسکراتے ہوئے کہا اور عامر اس کی مسکراہٹ پر چونک پڑا یہ مسکراہٹ کچھ اور ہی کہانی سنارہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ماہ نور ایک بار پھر سے زندہ ہو گئی ہو اور وہ خوش ہو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ ماہ نور کی خوشی کا کیا راز ہے وہ چھپ چھپ کر اس کی نگرانی کرتا تھا لیکن کوئی خاص بات بھی نظر نہیں آئی تھی ادھر اس کا بیٹا بھی خوب بڑا ہو گیا تھا پھر ایک دن وہ اس کو قاتل کے قاتل کے اڈے پر پہنچا تو اسے پتا چلا کہ قاتل کو کچھ عرصے پہلے قتل کر دیا گیا ہے۔

”ارے ایسا کیسے ہوا۔“ عامر نے پوچھا اور نجانے کیوں اس کے دل میں ایک انوکھا خوف سرايت کر گیا۔ وہ ذہنی طور پر سخت مضطرب رہنے لگا اور پھر ایک ذہنی دپوائی کا شکار ہو کر اس نے سوچا کہ ماہ نور پر سختی کرنی چاہیے وہ کسی طرح قابو میں نہیں آئے گی بہت ضدی عورت ہے اسے شبہ ہوا کہ شاہ میر شاید واپس آ گیا ہے۔

ماہ نور کا بدلا ہوا انداز ضرور بتاتا تھا لیکن اب وہ کہاں چھپا ہوا ہے چنانچہ وہ ماہ نور پر کڑی نظر رکھنے لگا کہ وہ کہاں جاتی ہے کس سے ملتی ہے کس طرح وقت گزارتی ہے یہ ساری چیزیں اسے پریشان کیے ہوئے تھیں لیکن ماہ نور اپنی کونجی سے کم لگتی تھی سب سے بھی اس کا ملنے والا کوئی

جوان بیٹے بھی تھے ممکن ہے انہیں شاہ میر کی یہاں موجودگی کی خبر مل گئی ہو خیر وہ شوق سے وہاں آ کر پناہ لے مجھے اس سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔“

کا بیچ پھر مکمل ہو گیا لیکن شاہ میر وہاں نظر نہیں آیا یہ لوگ اس کی تلاش میں ناکام ہو گئے تھے عامر نے کہا۔

”میں تمہیں اب بھی پیشکش کرتا ہوں کہ اگر اس کا خیال دل سے نکل جائے تو تم مجھ سے نکاح پڑھوا سکتی ہو۔“

”کیا سمجھتے ہیں آپ مجھے میں بار بار شوہر بدلتی رہوں گی۔“

”سوچ لو میں شادیاں کر سکتا ہوں۔“

”آپ کر لیں میں نے کیا بگاڑنا ہے آپ کا۔“

”نہیں میں کسی اور کی طرف مائل نہیں ہو سکتا۔“

”چھوڑے ان باتوں کو۔“ پھر اس کے بعد زندگی گزرتی رہی ماہ نور کی حالت عجیب تھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شاہ میر آتے آتے کہاں رہ گیا ہے پھر وقت گزرتا رہا سال دو سال یہاں تک کہ پانچ سال گزر گئے عامر اس سے مستقبل بھی کہتا رہا کہ وہ اپنی ضد سے باز آ جائے۔

”نہیں میں شاہ میر کی واپسی کا انتظار کروں گی۔“

”جب انتظار کرتے کرتے تھک جاؤ تو مجھے بتا دینا۔“ عامر بھی دھن کا پکا تھا وہ اکثر کا بیچ آتا رہتا تھا اس کا بیٹا بھی اب بڑا ہوتا جا رہا تھا جو کہ اس کا نہیں تھا اور یہ بات صرف وہی جانتا تھا۔

ماہ نور بھی یہاں آتی تھی اور شاہ میر کو یاد کرتی رہتی تھی وہ آج بھی شاہ میر کے لیے آنسو بہاتی تھی ادھر شاہ میر لے غائب ہوا تھا جیسے

مسم کیا بھی ہو میں ایک بزنس میں ہوں اور کامیابی سے اپنے بزنس کو چلا رہا ہوں تو کیا میں اتنا بیوقوف ہو سکتا ہوں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا عامر۔“
”آج تک تم شاہ میر کی موجودگی کے متعلق مجھ سے چھپاتی رہی ہو، بولو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔“

”نہیں بالکل نہیں میں یہی سوچ رہی تھی کہ اس سلسلے میں مجھے کیا کرنا چاہیے جبکہ ڈاکٹر حمیدہ نے اس بات کی تصدیق کی ہے میں آپ کے بتانے کے لیے حوصلہ کر رہی تھی، مگر مجھے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔“

”بکو اس مت کرو وہ کہاں ہے تم نے اسے کہاں چھپا رکھا ہے۔“
”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے جو تمہیں نہیں بتایا جاسکتا۔“

”بتانا ہو گا تمہیں بتانا ہو گا“ میں نے بہت صبر کیا ہے، بہت انتظار کیا ہے اور یہ انتظار اس لیے کیا ہے کہ ایک نہ ایک دن میں تمہیں حاصل کر لوں گا، لیکن تم نے مجھے زبردست دھوکہ دیا ہے ماہ نور اور اگر تم نہیں بتاؤ گی تو میں رد عمل کا اظہار کروں گا۔“

”وہ کیا۔“ ماہ نور بدستور مسکرا کر بولی۔
اس کی مسکراہٹ میں شہد گھلا ہوا تھا۔
”میں تمہیں آئندہ اس کا بیج میں نہیں آنے دوں گا۔ تمہیں کوئی سے بھی نکلنے نہیں دوں گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا تا کہ تم ملنے والوں کو بتا دو گی اور ان کے سامنے طلاق مانگو گی، میں تمہیں طلاق بھی دے دوں گا اور تمہارے بیٹے کو بھی چھوڑ دوں گا، پھر دیکھوں گا کہ تمہارا قاتل شوہر تمہارے بیٹے کا مستقبل کیسے بنائے گا۔“

”سسن کیا آپ اپنے معاملے پر قائم رہے تھے آپ نے شاہ میر پر قاتلانہ حملہ کرایا تھا۔“

منع کیا تھا میں نے اپنے باپ کو کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتا، لیکن میری اس محرومی کے ساتھ ساتھ ہی میرے باپ نے مجھے اپنی دولت سے بھی محروم کر دینے کی دھمکی دی۔ اس کے بعد تو میرے لیے موت کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا۔ میں نے بحالت مجبوری ایک اور زندگی کو تباہ کرنے کا کام لے لیا، ماہ نور کو میرے ساتھ یہ نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن اب کیا کروں اس نے ماضی پر نگاہ دوڑائی تو اسے احساس ہوا کہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ مختلف کام ہوئے ہیں مثلاً یہ کہ کرائے کے اس قاتل کی موت کی مدت بھی اتنی ہی ہے جتنی مدت ماہ نور کے انداز میں تبدیلی ہونے کی، وہ میرے خدا میں حالات کو کیوں نہیں سمجھا، کچھ ہوا ہے ضرور ہوا ہے، وہ انہی سوچوں میں غم رہا، پھر اسے ایک شدید جھنجھلاہٹ کا احساس ہوا اس کا مطلب ہے کہ ماہ نور اور شاہ میر میری دولت پر عیش کرتے رہیں میں بالکل ہی بے غیرت اور بیوقوف آدمی ہوں، ماہ نور اس کے بچے پیدا کرتی رہے اور میں ان بچوں کا باپ بنتا رہوں انہی سوچوں میں تھا کہ ماہ نور شوخ رنگ کا لباس پہن کر مسکراتی ہوئی آگئی۔

عامر اس وقت بھی اپنے غصے کو برداشت کیا تھا۔ چپ چاپ اس کے ساتھ باہر آ کر کار میں بیٹھ گیا اور پھر کار کا بیج کی طرف چل پڑی، عامر مصلحتاً خاموش تھا، کوئی میں اس بات کا جھگڑا کرتا تو بات بڑھ جاتی وہ ماہ نور کے ماں بننے پر کھل کر اعتراض بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ دنیا والوں کے سامنے وہی اس کا شوہر تھا چنانچہ اپنی زبان سے کیا کہتا، لیکن کا بیج کے اندر داخل ہوتے ہی اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔

”ماہ نور۔“ اس نے سر دلچھے میں کہا۔
”ہاں خیریت کیا ہو گیا تمہیں۔“
”ماہ نور کب تک مکاریاں کرتی رہو گی تم۔“

خرکاروں کے جال میں پھنس گیا تھا، ان لوگوں نے اسے بیگانہ کمپ میں پہنچا دیا اور وہ تقریباً پندرہ برس تک قیدی کی حیثیت سے کام کرتا رہا، کئی بار اس نے فرار ہونے کے منصوبے بنائے لیکن ناکام رہا، کیا سمجھے عامر وہ واپس آ گیا ہے۔ معاہدے کے مطابق آج بھی ہم اسی طرح زندگی گزار سکتے ہیں۔“

”ہرگز نہیں، اب میں تمہارے کسی بچے کا باپ نہیں بنوں گا، اگر تم چاہتی ہو کہ تمہارے بیٹے کا مقدّر سنو رہ جائے اور وہ میری دولت کا مالک بن جائے تو شاہ میر کو چھوڑ دو، وہی راستے ہیں تم میری بات مان لو کی تو میں ہمیشہ کے لیے شاہ میر کی چھپ کر رہنے کے لیے یہ کانچ دے دوں گا، لیکن تم ادھر بھی نہیں آؤ گی، لیکن تم ادھر بھی نہیں آؤ گی، دوسرا راستہ یہ ہے کہ شاہ میر کو قانون کے حوالے کر دیا جائے۔“

”تو آپ کیا سمجھتے ہیں میں آپ کو چھوڑ دوں گی اور خاموش تماشا بن کر دیکھتی رہوں گی؟ آپ صرف میری وجہ سے اس وقت تک زندہ سلامت ہیں عامر صاحب، ورنہ شاہ میر آپ کے کرائے کے قاتل کو قتل کرنے کے بعد آپ کو بھی ختم کر دینا چاہتا تھا، میں نے اسے روکا ہے وہ خاموش ہو گیا ہے، سمجھ رہے ہیں آپ اس وقت بھی وہ شاید کانچ ہی میں موجود ہو۔“

ماہ نور کے الفاظ پر ایک لمحے کے لیے عامر لرز گیا تھا، اس نے کہا، ”کیا وہ موجود ہے۔“

”میں نہیں جانتی، لیکن اس کے لیے کوئی راستہ بند نہیں ہے، وہ بھی یہاں کانچ میں آ جاتے ہیں اور بھی ہماری کوشش میں۔“

”کک..... کیا..... کیا وہ کوشش میں بھی آتا ہے۔“

”سیدھا راستہ ہے، میرے بیٹے روم کا دروازہ بائیں باغ میں کھلتا ہے، وہاں آنے والے میں اس طرح آسانی ہو جاتی ہے۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“ عامر بولا۔

”نہیں عامر، میں جھوٹ نہیں بولتی لیکن تم جھوٹ بول رہے ہو، جس غنڈے کو تم نے یہاں بھیجا تھا، شاہ میر نے اسے اور اس کے آدمیوں کو اچھی طرح پہچان لیا تھا اور یہ تو آپ کو پتا چل چکا ہوگا کہ آپ کا وہ کرائے کا قاتل مارا گیا ہے، کس نے مارا ہے یہ بھی آپ اچھی طرح جانتے ہیں عامر..... اس کے دوسرے ساتھی خوفزدہ ہو گئے تھے، شاہ میر نے ان میں سے ایک ساتھی کو اپنے شکنجے میں لے کر اس سے وعدہ کیا کہ اگر وہ سچ سچ بتائے گا تو اسے زندہ چھوڑ دیا جائے گا، اس نے سچ بتا دیا۔“

”م..... میں..... میں..... میں تمہیں جھوٹا نظر آ رہا ہوں اور تم اس غنڈے ان بد معاشوں کی باتوں کو سچ سمجھ رہی ہو۔“

”سچ کیا ہے، یہ شاہ میر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس پر قاتلانہ حملہ کرایا گیا اور حملہ کرنے والے چور یا ڈاکو نہیں تھے جو صرف اسے قتل کرنے آئے تھے اور جب وہ ناکام ہوئے تو انہوں نے کانچ کو جلا دیا اور شاہ میر کی پناہ گاہ کو ختم کر دیا، آپ نے یہ پورا منصوبہ بنایا تھا، اپنی دانت میں آپ نے شاہ میر کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا۔“

”وہ کتنے عرصے سے یہاں آ رہا ہے، میرا مطلب ہے دوبارہ۔“ عامر نے اسے گھور کر کہا۔

”ایک سال ہو چکا ہے۔“ ماہ نور لاپرواہی سے بولی۔

”پورے سولہ برس تک وہ تم سے دور رہا، اس نے تمہاری کوئی خبر نہیں لی، میں نے شرافت سے تمہیں اپنی چھت کے نیچے رکھا، تم اس کو تسلیم نہیں کرتیں۔“

”اس نے مجھے خط لکھا تھا کہ وہ دس دن کے بعد مجھے آ کر ملے گا، لیکن وہ نہیں آ سکا، نصیب بگڑے ہیں، وہ اب مجھے نہیں ملے گا۔“

”گو کیا ہر شخص چوکیدار وغیرہ نے اسے جی نہیں دیکھا۔“

اسے سب کچھ بتا دے تاکہ شاہ میر کی محتاط ہو جائے۔

اس کے سوچنے تک عامر نے کار اسٹارٹ کی اور پھر تیزی سے اسے چلاتا ہوا کالج سے باہر نکل گیا، وہ شدید غصے کے عالم میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب یہ کھیل ختم ہو جانا چاہیے، کارڈ رائیو کرتے ہوئے وہ انہی سوچوں میں گم تھا، کالج سے آگے کا راستہ دیران تھا اور بہت کم ٹریفک اس پر ہوتا تھا، کار ابھی زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ اچانک اسے اپنی گردن پر لوہے کی ٹھنڈک محسوس ہوئی اور پھر آواز سنائی دی۔

”اسے ریوالور کہتے ہیں۔“ عامر کا پورا بدن تھر تھری کا شکار ہو گیا، اس نے شاہ میر کی آواز پہچان لی تھی، کار کی رفتار سست ہوئی تو شاہ میر نے کہا۔ ”گاڑی نہ روکنا اسے سست رفتاری سے چلاتے رہو۔“

”کک..... کیا شاہ میر تم، تم کہاں غائب رہے، میں تمہارے لیے بہت پریشان تھا۔“ جواب میں شاہ میر کا مدہم سا قبضہ سنائی دیا۔ پھر وہ بولا۔ ”واقعی تمہاری پریشانی میرے علم میں ہے، اس وقت بھی میں کالج کے دروازے پر کھڑا تمہاری باتیں سن رہا تھا، لیکن مجبوری ہے عامر مجبور ہے، ہم میں سے کسی ایک کو ختم ہو جانا چاہیے میں نہیں چاہتا کہ ماہ نور چکی کے دوپاٹوں کی طرح پستی رہے۔“

”تتمہارا، تمہارا کیا مطلب ہے تم تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔“

”ہاں مجبوری ہے، مجبوری ہے میرے دوست، میں ماہ نور کو مشکل میں گرفتار نہیں دیکھ سکتا۔“

”میری بات سنو، تم جو کہو گے میں ماننا رہوں گا اپنے اس ارادے سے باز آ جاؤ اور ہاں سنو، میں اپنی ساری دولت تمہارے بیٹے کے نام لکھ دوں گا۔“

”وہ بہت محتاط ہے کسی نے اسے نہیں دیکھا ہے۔“

”ماہ نور..... ماہ نور تم آخر کیا ہو، کیا ہو تم، تمہیں نہ اپنی عزت کا خیال ہے نہ میری۔“

”تمہیں مجھے اچھی طرح سے خیال ہے۔“

”تم نے مجھے بارود کے ڈھیر پر بٹھا دیا ہے ماہ نور، کسی وقت بھی دھا کہہ سکتا ہے میری عزت کی دھجیاں اڑ سکتی ہیں، لیکن سنو، آج بھی میں تمہیں اپنا کر رہوں گا، تمہیں شاہ میر کو چھوڑنا ہی پڑے گا اگر اپنے بیٹے کا مستقبل سنوارنا چاہتی ہو تو۔“ عامر نے ماہ نور کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور وہ ایک جھٹکے سے خود کو چھڑائی ہوئی بولی۔

”یہ مت بھولو کہ شاہ میر کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتا ہے، جب پہلی بار تم تیزاب سے میرا چہرہ بگاڑنے آئے تھے تو شاہ میر نے مجھے بتایا تھا، ایسا نہ ہو اس بار وہ تمہیں ظالم کے روپ میں دیکھے اور ہمیشہ کے لیے تمہارا قصہ ختم کر دے۔“

عامر کے بدن میں سرد لہریں دوڑ گئیں۔ اس نے سوچا کہ کہہ تو وہ ٹھیک رہی ہے، وہ قاتل بد معاش اچانک وہاں پہنچ سکتا ہے، ایک لمحے تک سوچتے رہنے کے بعد اس نے رخ بدلا اور تیزی سے پلٹ کر کالج سے باہر جانے لگا تو ماہ نور نے اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے کہا۔

”رگ جاؤ کہاں جا رہے ہو۔“

”جہنم میں جا رہا ہوں، تم رنگ رلیاں مٹاتی رہو۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل آیا اور کار کے اسٹیرنگ پر بیٹھ گیا، ماہ نور تذبذب کے عالم میں خاموش کھڑی اسے دیکھتی رہی، ایک طرف دماغ کہہ رہا تھا کہ عامر انتقام پولیس والوں کو شاہ میر کے خلاف رپورٹ دے سکتا ہے، دوسری طرف دل کہہ رہا تھا کہ وہ یہیں رکے اور شاہ میر آئے تو

پراہٹ سی اندر داخل ہوئے والا طاہر تھا، جس کے ہاتھ میں ریوالتور نظر آ رہا تھا دونوں دنگ رہ گئے، طاہر زہریلے لہجے میں بولا۔

”ہاں ماما میں نے پچھلی بار ڈیڈی کی ڈائری پڑھی تھی جہاں ہر ورق پر صرف ایک ہی جملہ لکھا ہوا تھا کہ وہ کسی شاہ میر نامی قاتل سے خوفزدہ ہیں، ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ ماہ نور میری ہو کر بھی میری نہیں ہے، ایک بد معاش سے دل لگا بیٹھی ہے اور کالج میں وہ دونوں رنگ رلیاں مناتے ہیں۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو طاہر پتا نہیں تمہاری ڈیڈی نے کیا الٹی سیدھی باتیں لکھی ہیں، میری بات سنو۔“

”ایک منٹ، ایک منٹ، تمام میں پوری طرح سمجھ گیا ہوں کہ جس شخص سے ڈیڈی خوفزدہ تھے وہ یہی ہے اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنے باپ کے دشمن سے بدلہ لینا تو میرا فرض بنتا ہے اور پھر ڈیڈی نے جو کچھ لکھا اس کا ثبوت آپ لوگ ابھی دے رہے ہیں، میں ایک غیرت مند باپ کا غیرت مند بیٹا ہوں۔“

”سنو طاہر جو کچھ میں کہہ رہا ہوں میری بات سنو بیٹے تم۔“

”خبردار مجھے بیٹا نہ کہنا اگر تمہاری ماں کے کمرے میں کوئی غیر شخص آتا تو کیا تم اسے برداشت کر لیتے میں ایک غیرت مند باپ کا بیٹا ہوں سمجھو۔“ یہ کہتے ہی طاہر نے شاہ میر پر گولیاں برسا دیں۔ ماہ نور ایک دلخراش چیخ کے ساتھ شاہ میر کے سامنے آئی تو تین گولیاں اس کے سینے پر بھی لگیں اور کچھ لمحوں کے بعد دو لاشیں کالج کے کمرے میں پڑی ہوئی تھیں اور طاہر نفرت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

﴿.....﴾

”نہیں عامر زنی سناپ نو زندگی دینا اپنی موت کے مترادف ہے اور ویسے بھی میرے بیٹے کا مسئلہ کوئی ہی نہیں ہے کیونکہ تمہاری موت کے بعد طاہر ہی تمام دولت اور جائیداد کا مالک ہوگا کیونکہ دنیا اسے تمہارا بیٹا سمجھتی ہے، میں نے اپنے بیٹے کو بیٹا کہہ کر بھی گلے نہیں لگایا، لیکن بس کبھی نہ کبھی کھیل ختم ہوتا ہی تھا، چلو گاڑی روکو۔“

”مم..... میری..... میری بات سنو۔“

”گاڑی روکو۔“ شاہ میر کی آواز میں ایسی غراہٹ تھی کہ عامر نے گاڑی روک دی۔

”میری بات سنو، میری بات سنو ہم اس کا کوئی اور حل نکال لیں گے، کوئی اور حل نکال لیں گے ہم اس کا۔“

”حل میرے پاس ہے، تمہیں نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ شاہ میر نے کہا اور اس کے بعد اس نے عامر کو گولی باردی۔ عامر کی موت کے پڑے چرچے ہوئے طرح طرح کی کہانیاں سنائی گئیں، خود ماہ نور بھی شدید غم کا شکار رہی، اس نے بیوگی کا سوگ بھی منایا، لیکن سب سے زیادہ متاثر طاہر تھا، وہ اپنے باپ کی موت پر صدمے سے چور تھا، شاہ میر اور ماہ نور اسے سمجھاتے رہتے تھے، لیکن اس بچارے کو کیا معلوم تھا کہ جس کا وہ ماتم کر رہا ہے اس سے اس کا خونی رشتہ نہیں ہے، لیکن پھر بھی اس پر بہت زیادہ اثر تھا۔ باپ کی موت کے بعد اس کے منہ سے کسی نے کوئی آواز نہیں سنی تھی، حالانکہ ماہ نور اسے بہت زیادہ پیار کرتی تھی، کافی دن اسی طرح گزر گئے، عامر کا چالیسواں ہو گیا اور اس طرح وقت کچھ اور گزر گیا۔ معمولات زندگی پھر سے جاری ہو گئے ابھی تک کوئی صحیح فیصلہ نہیں ہو پایا تھا کہ کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے۔ ماہ نور شاہ میر سے کالج ہی میں ملاقات کرتی تھی، ایک دن وہ کالج میں شاہ میر کے ساتھ اس کے سینے سے سر لگائے ہوئے بیٹھی تھی کہ ایک بکواس کر رہے